کاروان

حصہ ۱

ترتیب

[illegible]

"مشرق و مغرب کے علوم و فنون کا بہترین مرقع"

سالنامہ



کاروان

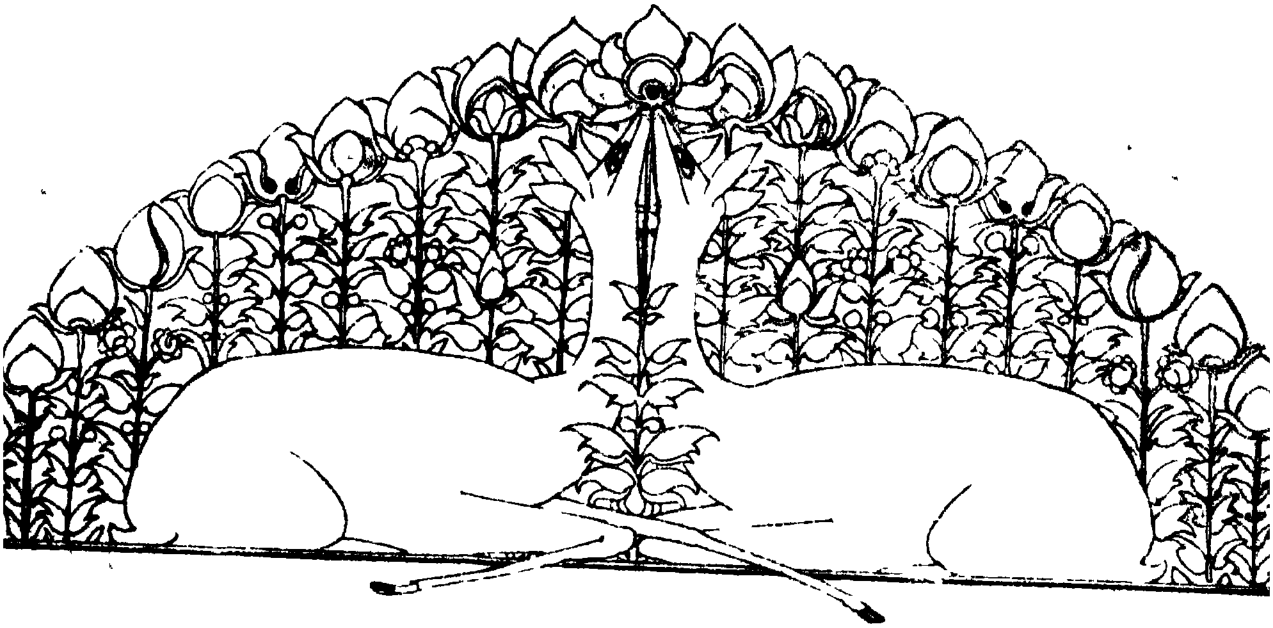
ماہوار

۱۹۳۴

عیسوی

کاروان چابک سواران لاہور

فہرستِ مضامین



سخنہائے گفتنی

کاروان اپنی زندگی کی دوسری منزل میں قدم رکھتا ہے۔ کاروان کے اجراء کے وقت جو تخیل پیش نظر تھا۔ اس سے انحراف نہ کرنا آسان نہ تھا لیکن عزم کے پکے ثابت قدم رہے۔ تعریف و توصیف سے ان کا سر نہ پھرا اور تنقید و تنقیص سے وہ آزردہ نہ ہوئے۔ اس سال کا کاروان پبلک کے سامنے ہے جس کا جی چاہے اس کی تعریف کرے جس کا جی چاہے۔ اسے بُرا کہے۔ کاروان کے کارکن توصیف و تعریض سے بے نیاز ہیں۔ اور بہرحال اپنا کام کرتے چلے جائینگے۔

× × × × × × × × × × × × × × × × ×

گزشتہ سال علامہ اقبال نے کاروان کے لئے ایک غزل عنایت فرمائی تھی اور اس سال صرف ایک شعر۔ لیکن اس عطیہ کو میں "حاصل گلچینیٔ باغِ حیات" سمجھتا ہوں۔ خاص طور پر اس لئے کہ میری درخواست کے جواب میں حضرت علامہ نے ارشاد فرمایا تھا۔ "تم غزل لے کر کیا کروگے۔ میں تمہیں ایک ہی شعر دیتا ہوں۔ لیکن ایسا شعر جسے بیسیوں اشعار سے بہتر جانتا ہوں"۔ میرا دل بلیوں اُچھلنے لگا اور میں نے قدرے سکوت کے بعد عرض کیا :-

"بریں مژدہ گرجاں فشانم رواست"

یہ شعر قارئین کے سامنے ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ اہل نظر اسے حرزِ جاں سمجھیں گے۔

× × × × × × × × × × × × × × ×

کاروان کے مضامین اور مضمون نگار اصحاب کے متعلق چند معروضات پیش کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ گذشتہ سال کاروان نے وعدہ کیا تھا کہ "آیندہ سال . . . . موجودہ سال سے بھی بلند تر ہوگے۔" یہ وعدہ وفا کرنے کی ہم نے کوشش کی ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ ہم ان کوششوں میں کامیاب ہوئے ہیں۔ میرے دوست تاثیر اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے مجھے وہ مدونہ نہ دے سکے جس کی میں امید لگائے بیٹھا تھا۔ حفیظ میرا غمزدہ اور غمخوار دوست سال بھر مصائب و آلام میں گرفتار رہا اور اب بھی گرفتار ہے۔ اس کے باوجود ہم حفیظ کی پانچ غزلیں اور ایک گیت شائع کر رہے ہیں اور یہ ایک ایسی کامیابی ہے کہ اس پر کاروان جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔ "علمی" مضامین میں جناب سید امتیاز علی تاج کا مضمون "اردو ڈراما کی مفاہتیں"۔ جناب محمود شیرانی کا مضمون "پنجاب میں اردو کا فراموش شدہ ورق" ڈاکٹر محی الدین احمد زور کا مضمون میرزا قتیل۔ میر حسن اور مثنوی بدر منیر کے متعلق۔ میرزا ویردی کا "اسلامی ظروف"۔ جناب سروری کا "نثری افسانوں کا ارتقا" اور آغا عبدالحمید کا "فلم سازی کا آرٹ" تمام معرکے کی چیزیں ہیں۔ جناب محمد عبداللہ چغتائی کے مضامین "معمار تاج" "جنٹائل بیلینی" اور اسلامی مصوری "انتہائی محنت وکاوش کا نتیجہ ہیں۔ پہلے دو کے لئے مواد مصنف نے فرانس و انگلستان کی سیاحت کے دوران میں مہیا کیا تھا۔ تیسرا مضمون دائرہ معارف اسلامیہ کے جلسے میں پڑھا گیا تھا اور سنتا ہوں کہ مولانا سید سلیمان ندوی اور پروفیسر شیرانی جیسے باکمال محقق اس کی تعریف میں رطب اللسان تھے مزاحیہ مضامین کا حصہ گذشتہ سال سے بہت بہتر ہے۔ گذشتہ سال سے بہتر ہی نہیں۔ میں سمجھتا ہوں تعریف و توصیف سے مستغنی ہے۔ جناب پطرس اور جناب رشید احمد صدیقی کے مزاحیہ مضامین جس رسالے میں یکجا ہو جائیں اس رسالے کو اور کیا چاہیئے۔ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو ہندوستان کی صحافت میں یہ پہلا موقع ہے کہ ایک ہی رسالے میں پطرس اور رشید احمد صدیقی بہ یک وقت جلوہ گر ہوئے ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اس قران السعدین پر میں جتنا بھی ناز کروں بجا ہے۔

"بر دستِ خویش بوسہ زند باغبان ما"

اس سال ہم دو انگارے (سکیچ) بھی شائع کر رہے ہیں۔ جناب آغا حیدر حسن کا "میرا مرزا" اور جناب نواب سجاد علی خاں نواب آف کرنال کا "اے۔ اے۔ اے۔" اردو زبان میں ادب کی اس صنف پر کم توجہ کی جاتی ہے۔ دونوں انگارے مزاحیہ انداز میں ہیں اور قابل داد ہیں ہم چاہتے ہیں کہ دیگر رسائل اور مضمون نگار بھی اس طرف توجہ کریں۔ فلک پیما کا "انسان کہ شیطان؟" اپنے رنگ کی واحد چیز ہے۔ نظم کا انتخاب۔ اس کا ترجمہ اور اس پر انتقاد۔ تینوں کے لئے فلک پیما مستحق مبارک باد ہے۔

کاروان کے افسانے دو حصوں میں منقسم ہیں۔ تراجم اور طبعزاد افسانے۔ تراجم میں سب سے پہلے میں جناب پطرس کے "سیب کا درخت" کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ (گالز وردی کا "دی ایپل ٹری" درحقیقت مختصر افسانہ نہیں "طویل مختصر افسانہ" ہے) بیشتر انگریز مصنفین کی یہ عادت ہے کہ وہ اپنی تحریروں میں مقامی رنگ کوٹ کوٹ کے بھر دیتے ہیں۔ یہ بات غالباً جان بل کی فطرت میں داخل ہے اور اسے دیگر اقوام سے متمیز کرتی ہے۔ روسی افسانہ نگار بھی مقامی رنگ پیش کرتا ہے۔ لیکن مقامی رنگ اس کے افسانوں کا جزو نہیں ہوتا۔ فرانسیسی افسانہ نگار بھی عام طور پر فرانسیسی مردوں اور عورتوں اور بازاروں اور گلیوں کا ذکر کرتا ہے۔ لیکن اس کی تحریروں میں ایک "عالمگیریت" ہوتی ہے۔ نام بدل دو۔ تھوڑا بہت ماحول بدل دو تو ۔ عام طور پر ۔ روسی اور فرانسیسی افسانہ میرے اور تیرے اور اِس کے اور اُس کے اور اِس ملک کے اور اُس ملک کے حالات کے مطابق ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے نو آموز افسانہ نگار نہایت آسانی سے روسی اور فرانسیسی افسانے اڑا کر پیچھے کرکے جاہل ایڈیٹروں کے پاس بھیج دیتے ہیں اور یہ حضرات ان "طبعزاد" افسانوں کو لمبی لمبی تعریفیں لکھ کر شائع کرتے ہیں۔ انگریزی افسانے

۔۔۔ طور پر ۔۔۔ اس عمل جراحی کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اور اسی لئے سفاکوں کی دراز دستیوں سے محفوظ رہتے ہیں۔ انگریزی افسانوں کی یہ خصوصیت ترجمے کے لئے بڑی مشکلیں پیدا کر دیتی ہے۔ گالزوردی کے "دی اپل ٹری" میں یہ خصوصیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ اور اس خصوصیت کے مشکل سے جناب پطرس جس کمال سے عہدہ برآ ہوئے ہیں وہ جناب پطرس ہی کا حصہ ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ "دی اپل ٹری" کا اس سے بہتر ترجمہ ممکن نہیں ۔۔۔ میں جانتا ہوں کہ یہ جملہ بعض حضرات کو آمادۂ پیکار کریگا۔ اور بعض حضرات کی آزردگی کا باعث ہوگا۔ لیکن خوف پیکار یا پاس مروت مجھے اخفائے حق پر آمادہ نہیں کر سکتا۔

ایک اور ترجمے کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں یعنی جناب عبدالمجید سالک کا آسکر وائلڈ کی ایک نظم کا ترجمہ جسے ہم "محبوبہ سے درخواست" کے زیر عنوان شائع کر رہے ہیں۔ میں نے کاروان کے لئے مضمون کی درخواست کی تو سالک صاحب نے کہا۔ تم آج کل کسی روزانہ اخبار کے ایڈیٹر نہیں اسی لئے تمہیں مضمون نگاریاں سوجھ رہی ہیں۔ میں بدستور اس مصیبت میں گرفتار ہوں جسے عرف عام میں ایڈیٹری کہتے ہیں۔ اس لئے میرا دماغ خالص ادب کی طرف مائل نہیں ہو سکتا۔ لیکن خیر اگر کوئی انگریزی نظم یا کہانی بھیج دو تو ترجمہ کر دونگا۔ میں نے دل میں سوچا سالک صاحب نے وعدہ تو کر ہی لیا ہے اب کوئی ایسا مشکل ترجمہ تجویز کروں کہ جھلا کے خود ہی کہ دیں۔ "بابا میں باز آیا میں طبعزاد چیز ہی لکھ دوں گا۔" گھر آکے میں نے کافی چھان بین کے بعد آسکر وائلڈ کی ایک نظم چنی۔ اور نشان لگا کر اُسے "انقلاب" کے دفتر میں بھیج دیا۔ اس یقین کے ساتھ بھیج دیا کہ اس کا کامیاب ترجمہ ناممکن ہے ۔۔۔ دو گھنٹے کے بعد دفتر انقلاب کے چپراسی نے کتاب میرے حوالہ کی۔ میں نے دل میں کہا۔ سالک صاحب نے ہار مان لی ہے اور بہت جلد مان لی ہے۔ لیکن جب میں نے کتاب کھولی تو ترجمہ اس کے اندر موجود تھا۔ اور ترجمہ بھی ایسا کہ میں عش عش کر اٹھا ۔۔۔ یہ سطور گویا اعتراف شکست ہیں اور اس لئے لکھ رہا ہوں "کہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔"

طبعزاد افسانوں میں سب سے پہلے جناب سید امتیاز علی تاج کا افسانہ ہے۔ آج سے تقریباً دو ماہ پہلے تاج صاحب نے مجھے یہ افسانہ سنایا اور کہا اس کا نام تجویز کرو۔ میں نے کہا "الفاظ کی جادوگری"۔ متعجب ہو کر میرا منہ تکنے لگے۔ میں نے ہنس کے کہا یہ نام اس لئے ہے کہ اس افسانے میں آپ نے فراعنۂ مصر کے محلات۔ آسیرس کے جشن۔ مے نوشوں کی مے نوشی۔ رقاصوں کے رقص کی وہ تصویر کھینچی ہے کہ سامع محسوس کرتا ہے کہ جسداً اس دنیا سے اس دنیا میں چلا گیا ہے اور نوجوان فرعون کی بدمست عشرتوں میں شامل ہے۔ رقاصہ حبشی النسل ہے۔ اس کا رنگ کالا ہے۔ اس کے ہونٹ موٹے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس میں شباب کی وہ بدمستی ہے کہ فرعون مصر تو خیر فرعون مصر تھا ہم اور آپ بھی ہوتے تو لپک کے اسے گود میں اٹھا لیتے۔ اگر یہ الفاظ کی جادوگری نہیں تو اور کیا ہے ۔۔۔ فنی اعتبار سے بھی جناب امتیاز کا یہ افسانہ بالکل نئی چیز ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں مسلمہ شاہکاروں سے قطعاً مختلف ہے۔ عام طور پر مختصر افسانہ نویس کامیابی کے لئے پلاٹ میں یا کردار میں ایک قسم کی "حرکت" پیدا کرتے ہیں۔ امتیاز صاحب کے افسانہ میں "حرکت" نام کو بھی نہیں تلاش سے بھی نہیں ملتی اور اس کے باوجود یہ افسانہ بے انتہا کامیاب ہے۔

چغتائی کا افسانہ بھی اپنے انداز کی واحد چیز ہے۔ چغتائی مصور ہے۔ جوشِ طبیعت دیکھئے کہ وہ الفاظ میں بھی تصویریں کھینچتا ہے۔ چغتائی کی تصویروں میں فنی کمال کے علاوہ شعریت اور تخیل کی وہ فراوانی ہوتی ہے۔ کہ ناظر متحیر ہو کے رہ جاتا ہے۔ تخیل اور شعریت کی یہ فراوانی اس کے افسانوں میں بھی عیاں ہے۔ بلکہ افسانوں میں تصاویر سے بھی زیادہ ہے۔ تصاویر میں چغتائی اپنی شعریت اور تخیل کو اپنے فنی کمال کے تابع کر دیتا ہے۔ اور دونوں کے مناسب امتزاج سے وہ چیز پیدا کرتا ہے کہ باید و شاید۔ لیکن چونکہ افسانہ نویسی کے فن پر اسے وہ قابو حاصل نہیں جو خطوط اور رنگوں پر ہے۔ اس لئے بار ہا وہ اپنے تخیل کے سامنے بے بس ہو جاتا ہے "یعنی تمہیں

ہے کہ تخیل چغتائی کا غلام نہیں بلکہ چغتائی تخیل کا غلام ہے۔

میرے ایک دوست کا ایک جرمن دوست جو چغتائی کا مداح ہے میرے مکان پر آیا کیونکہ اسے معلوم ہوا تھا کہ میرے پاس "چغتائی" کے چند شاہکار ہیں۔ تصویریں دیکھ کے وہ گھنٹوں سر دھنتا رہا۔ رات ہوگئی۔ اور کھانا کھانے کے بعد جب ہم دھوئیں کے بادل اُڑا رہے تھے میں نے اس سے کہا، تم مصور چغتائی کو جانتے ہو لیکن ادیب چغتائی سے واقف نہیں۔ میں تمہیں ادیب چغتائی سے بھی ملا سکتا ہوں۔ میں نے اسے چغتائی کے افسانے ترجمہ کرکے سنائے۔ "کچھ کہیں سے کچھ کہیں سے"۔ بے انتہا متاثر ہوا اور اس نے مجھ سے کہا۔ اگر چغتائی مصوری کے بجائے ادب کی طرف اپنی تمام توجہ مبذول کرتا تو ادب کی دنیا میں وہی رتبہ حاصل کرتا جو اُسے آرٹ کی دنیا میں حاصل ہے ——

× × × × × × × × × × × × × × ×

کاروان میں ہم تین ایک ایکٹ کے کھیل شائع کر رہے ہیں۔ جناب امتیاز کا کھیل "برفباری کی ایک رات" معرکہ آرا چیز ہے۔ ان کے افسانے کا ماحول رومانی ہے۔ ان کا کھیل " ریلسٹک " ہے۔ لیکن اس " ریلزم " میں بھی کس قدر رومان ہے! ایک چھوٹی سی کٹیا۔ رات۔ اور برفباری کا لاانتہائی سلسلہ۔ ایک مرد۔ ایک عورت۔ اور بس۔ چھوٹے چھوٹے جملے بولتے ہیں۔ لیکن ہر لفظ نشتر ہے اور ہر جملہ تیر

" تیر دگر آمد و دل و دست بہم دوخت "

ادب کی اس صنف کی جانب بھی ہمارے ادیبوں کی توجہ کم ہے۔ افسوس ہے کہ جو کھیل مہربانوں نے بھیجے معیار پر پورے نہ اترے۔ مجبور ہو کر میں نے خود دو کھیل لکھے۔ برے بھلے جیسے ہیں قارئین کے سامنے ہیں۔

حصۂ نظم کے لئے ہم نے بہت جدوجہد کی ہے۔ ز۔ خ۔ ش مرحومہ اور عبدالرحمٰن بجنوری کا غیر مطبوعہ کلام ہدیہ ناظرین ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی کی نظم " نربدا " پر ایک نادر چیز ہے اور مجھے یقین ہے کہ اہل نظر اسے سرمۂ چشم سمجھ کر آنکھوں میں جگہ دینگے —— فصاحت یار جنگ جلیل لکھنوی کی غزل۔ حضرت عزیز لکھنوی کی غزل۔ حضرت احسن مارہروی کی غزل۔ حضرت وحشت کی غزل۔ حضرت بسمل کی غزل۔ حضرت اصغر کی غزل۔ علامہ ابوالعلا ناطق کی غزل۔ میرزا یاس کی غزل۔ حضرت ثاقب کی غزل۔ حضرت قیس عظیم آبادی کی غزل۔ حضرت رسا کی غزل۔ حضرت تاثیر کی غزل۔ نظموں میں حضرت راشد کی نظم۔ حضرت فیض کی نظم۔ حضرت تاثیر کی نظم۔ حضرت ذوقی کی نظم۔ حضرت ممتاز حسن احسن کی نظم —— اس سے زیادہ کاروان کیا کر سکتا ہے۔ حضرت حفیظ نے جو جواہر ریزے کاروان کے لئے فراہم کئے ہیں ان کے متعلق میں کچھ نہیں کہونگا کہ حضرت حفیظ کا یہی حکم ہے۔

× × × × × × × × × × × × × × ×

ایک دن میں علامہ اقبال کے در دولت پر حاضر تھا۔ آپ حسب معمول فلسفہ و حکمت کے موتی بکھیر رہے تھے اور میں خاموشی کے ساتھ ان موتیوں سے اپنا دامن تہی بھرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ موضوع گفتگو بار بار بدل رہا تھا۔ مولانا برکات احمدؒ نے زمان و مکان کی بحث پر کیا خامہ فرسائی کی ہے؟ افسوس ہے کہ گذشتہ ایک صدی میں مسلمانان ہند نے ادق فلسفیانہ مسائل پر جو کچھ لکھا ہے وہ عوام بلکہ خواص سے بھی پوشیدہ ہے۔ قرآن میں ایک سورہ دہر ہے اور ایک سورہ عصر۔ دہر اور عصر میں کیا فرق ہے؟ اور سورہ دہر کو سورہ عصر اور سورہ عصر کو سورہ دہر کیوں نہیں کہا گیا؟ اسلامی مساجد اور اسلامی مقابر کی ساخت میں فنی لحاظ سے کیا فرق ہے؟

اور کیوں ہے ؟ قرطبہ کی مسجد میں شکوہ، سربلندی اور تمکنت کیوں ہے۔ تاج میں حسن۔ نزاکت اور پاکیزگی کیوں ہے۔ زندگی اور آرٹ کا آپس میں کیا تعلق ہے۔ عربی شاعری اور عجمی شاعری میں کیا فرق ہے ؟ ایران نے عربی شاعری سے کیا کچھ اخذ کیا اور اس میں کیا اضافہ کیا ؟ اردو شاعری نے ایرانی شاعری کا تتبع کیوں کیا۔ اور کس حد تک کیا۔ دہلی اور لکھنؤ کی زندگی زبان پر اور طرز بیان پر کہاں تک اثر انداز ہوئی ــــ

میں نے پوچھا کیا آپ کے نزدیک آرٹ بجائے خود کوئی حیثیت نہیں رکھتا ؟ قائم بالذات نہیں ؟ فرمایا۔ نہیں۔ اردو شاعری ہندوستان کے دورِ انحطاط کی پیداوار ہے۔ اس لئے کمزور۔ غیر فطری اور حد درجے کی مصنوعی ہے۔ آرٹ اقوام عالم کی زندگی کا عکس ہے۔ کسی قوم کے آرٹ کو دیکھ کر اس قوم کی نفسیاتی کیفیتوں کا صحیح نقشہ کھینچا جا سکتا ہے۔ لیکن آرٹ زندگی کا مظہر ہی نہیں۔ زندگی کا آرٹ کار بھی ہے۔ اور سچا آرٹسٹ وہ ہے جو اپنے کمال کو بنی نوع انسان کی بہتری کے لئے وقف کر دے۔

میں نے عرض کیا "فرحت" "محض فرحت" بھی انسانی زندگی کا ایک لازمی جزو ہے۔ اگر کوئی شعر کسی کو ہنسا دے۔ یا آمادۂ گریہ کر دے۔ کیونکہ بسا اوقات گریہ میں بھی فرحت پنہاں ہوتی ہے ــ تو یقیناً وہ شعر کامیاب ہے۔ فرمایا بیشک لیکن اردو شعرا بھی اپنی قوم کے لئے فرحت مہیا کرتے ہیں اور پرانے عربی شعرا بھی کیا کرتے تھے ! کتنا تفاوت ہے۔ عربی شاعری میں اور اردو شاعری میں وہی فرق ہے جو ایک سرفروش۔ جنگجو قوم میں اور عشرت زدہ قوم میں ہوتا ہے۔ اس کے معنے یہ نہیں کہ میرے نزدیک اس زمانے کی عربی شاعری صحیح قسم کی شاعری تھی۔ عرب کی زندگی کے عیوب عربی شاعری میں عیاں ہے۔ لیکن ان عیوب کی نوعیت اردو شاعری کے عیوب سے مختلف ہے۔ میرے نزدیک حقیقی آرٹسٹ وہ ہے جو اپنی قوم کا نبض شناس ہو اور آرٹ کو قومی امراض کے دفعیہ کا ذریعہ بنا دے۔ شاعر امرأ القیس کی طرح اشعر الشعرا ہونے کے باوجود قائدہم الی النار ہو سکتا ہے۔ اور شاعر ہی اپنے حسن کلام کی وجہ سے اس رتبے تک پہنچ سکتا ہے جس رتبے پر لبید پہنچا۔ کہ خود سرورِ کونینؐ کو اس سے ملنے کا شوق تھا۔ علاوہ ازیں جسے تم "کامیاب شعر" کہتے ہو وہ اور چیز ہے اور معیار پر پورا اترنے والا شعر اور چیز ہے۔ وہ شاعری جو آرٹ کے حقیقی معیار پر پوری اترتی ہے پیغمبری کا جزو ہے۔ وہ شاعری جو اس معیار پر پوری اترے یا نہ اترے لیکن فنی معیار پر پوری اترتی ہے "کامیاب" شاعری ہے۔

میں نے عرض کیا اردو کا کوئی شعر جسے آپ "کامیاب" سمجھتے ہوں یا جو آپ کو بہت پسند ہو فرمایئے۔

قدرے توقف کے بعد فرمایا بہت کم اردو اشعار میرے ذہن میں ہیں۔ اور یوں بھی شاید دل پر گہرا اثر چھوڑنے والے اشعار اردو میں کم ہیں۔ تم شعر سناتے جاؤ۔ جو شعر پسند ہوگا کہ دونگا۔ میں فکر میں غرق ہُوا۔ لیکن ابھی کچھ کہنے نہ پایا تھا کہ آپ نے پوچھا یہ کس کا شعر ہے :-

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے　　　عمر یونہی تمام ہوتی ہے

میں نے عرض کیا غالباً داغؔ کا ہے۔ فرمایا غالباً داغؔ کا نہیں۔ لیکن اچھا شعر ہے۔ ہر لحاظ سے کامیاب۔ شاعر نے ایک نقطۂ نظر کو چیدہ الفاظ میں اور مکمل طور پر بیان کر دیا ہے۔ یہ نقطۂ نظر مشرق میں عام ہے۔ مختلف شعرا نے مختلف پیرایوں میں یہی خیال ظاہر کیا ہے۔ غالباً ان تمام اشعار میں سے یہ شعر بہترین ہے۔ لیکن قابلِ غور بات یہ ہے کہ یہ نقطۂ نظر شاعر بلکہ جملہ قوم کی نفسیاتی کیفیت کا مظہر ہے۔ شاعر وقت کے سیلاب کے سامنے اپنے آپ کو بے حقیقت تصور کرتا ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ دن اور رات کے ایاب و ذہاب پر اس کی شخصیت مطلقاً اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ وہ "زمان" کو محض دن اور رات کا تسلسل سمجھتا ہے۔ حصولِ مدعا۔ کارکردگی اور جد و جہد کا ذریعہ نہیں

سمجھتا۔ وہ وقت کے دھارے پر ایک تنکا ہے۔ جسے موجیں اِدھر اُدھر جدھر چاہتی ہیں پٹک دیتی ہیں۔ وہ ان موجوں کے خلاف نبرد آزمائی نہیں کرتا۔ انہیں اپنی راہ پر نہیں لاتا۔ لانے کی کوشش بھی نہیں کرتا۔ کوشش کرنے کی خواہش بھی نہیں رکھتا ــــ "صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے" یہ احساس اس قوم یا اس قوم کے کسی فرد کا ہے جو سیلِ زمانہ کے سامنے اپنی بے بسی کا معترف ہے۔ معترف ہی نہیں۔ کامل طور پر آگاہ ہے۔ اس حد تک آگاہ ہے کہ اپنی بے بسی کو قانونِ قدرت کا جزو سمجھتا ہے۔ جدوجہد کرنے والی اقوام کی "صبح ہوتی" نہیں۔ وہ گویا "صبح کرتی" ہیں اور "شام کرتی" ہیں۔ وہ وقت کو دن اور رات اور مہینے اور سال کے پیمانے سے نہیں ناپتیں۔ بلکہ سعی اور "حصول" کے پیمانے سے ناپتی ہیں ــــ یہ سب کچھ ہے لیکن یہ شعر بہت اچھا ہے۔ کیونکہ جس خیال کو شاعر ادا کرنا چاہتا تھا اس خیال کو اس نے موثر طریقے سے ادا کر دیا ہے۔ "سیلِ زمانہ کے سامنے انسانی بے بسی" ــــ اس موضوع پر یہ بہت اچھا شعر ہے۔

میں نے عرض کیا آپ کے نزدیک کامیاب اشعار میں کیا خوبیاں ہوتی ہیں۔ مسکرا کے فرمایا بہت سی ہوتی ہونگی لیکن جدت اور فنی خوبی یہ دو تو بہرحال ضروری ہیں۔ میں نے عرض کیا تو کوئی اور شعر فرمائیے جو آپ کو پسند ہو اور اس معیار پر پورا اترے۔ ارشاد کیا تم شعر سناؤ ــــ

میں نے غالب کا یہ شعر پڑھا :۔

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت　　میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آبھی نہ سکوں

فرمایا اچھا شعر ہے کوئی اور شعر سناؤ۔ میں نے غالب کا ایک اور شعر پڑھا :۔

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی　　عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

فرمایا یہ بھی اچھا شعر ہے۔ غالب نے اس قسم کے اشعار بیدل کے تتبع میں کہے تھے۔ لیکن یہ رنگ اردو میں کامیاب نہ ہو سکا چنانچہ غالب نے اسے ترک کر دیا ــــ میں نے یہ شعر پڑھا :۔

نہ پوچھ حال مرا چوبِ خشکِ صحرا ہوں　　لگا کے آگ مجھے کارواں روانہ ہوا

اور درد کے یہ دو شعر :۔

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے　　ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے
ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ　　جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

فرمایا درد اردو زبان کا واحد صوفی شاعر ہے۔ "زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے۔ ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے" خوب شعر ہے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر زندگی کی بے پناہ کشاکش سے عاجز آ گیا ہے۔ تھک گیا ہے۔ لیکن نہیں۔ ابھی اس میں جان باقی ہے اور جب تک جان ہے وہ آمادۂ پیکار ہے۔ نفسیاتی لحاظ سے یہ شعر "صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے۔ عمر یونہی تمام ہوتی ہے" کا ضد ہے۔ دوسرا شعر "ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ۔ جب تلک بس چل سکے ساغر چلے" اردو شعرا کے عام انداز میں ہے۔

میں نے عرض کیا کیا یہ ممکن نہیں کہ دوسرے شعر میں بھی شاعر سعی اور انہماک فی المشاغل کا درس دے رہا ہو۔ فرمایا ممکن ہے لیکن قرین قیاس معلوم نہیں ہوتا۔

قدرے توقف کے بعد میں نے قاآنی کے یہ اشعار سنائے :۔

دل وقفِ تپش ہے بلنے گر وجہِ تپش دل کوئی نہیں
بسمل ہوں مگر کیوں بسمل ہوں فریاد کہ قاتل کوئی نہیں

خود حسن کمالِ حسن ہے یعنی حسن جہاں ہے کامل ہے
اور عشق مآلِ عشق ہے یعنی عشق یہاں کامل کوئی نہیں

دریائے محبت بے ساحل اور ساحل بے دریا بھی ہے
جو موج ڈبو دے ساحل ہے یوں نام کو ساحل کوئی نہیں

اور حفیظ کا یہ گیت :-

بنسری کی لے نہیں یہ آگ ہے
اور کوئی شے نہیں یہ آگ ہے

فرمایا مجھے حفیظ کا یہ رنگ پسند نہیں۔ لیکن "شاہنامۂ اسلام" کا رنگ اور انداز مجھے پسند ہے اور اس میں بہتر قسم کی شاعری ہے —— پھر فرمایا تمہیں میرزا محمد ہادی کا وہ شعر یاد ہے کہ نہیں۔ وہ —— ماتھے پہ بل پڑ گئے۔ یاد کرنے کی کوشش کر رہے تھے —— میں نے عرض کیا :-

اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز تھا حسن
بھولتا ہی نہیں عالم مجھے انگڑائی کا

میں نے عرض کیا۔ اس شعر کی آپ پہلے بھی تعریف فرما چکے ہیں۔ غالباً اسی لئے اس شعر پر بہت لے دے بھی ہوتی رہی ہے۔ فرمایا کس بنا پر ؟ میں نے کہا اس وقت خیال نہیں لیکن اتنا یاد ہے کہ مختلف رسالوں میں اس شعر پر لمبی لمبی تنقیدیں چھپتی رہی ہیں۔ فرمایا اپنا اپنا خیال ہے۔ مجھے یہ شعر بہت پسند ہے۔ فنی لحاظ سے اچھا ہے۔ خیال میں جدت ہے۔ پڑھنے والے کی آنکھوں کے سامنے تصویر کھنچ جاتی ہے۔
میں نے اکبر کا یہ شعر پڑھا :-

اک مسئلہ ہے تیغ کا اور اک سکوت کا
باقی جو ہے وہ تار ہے بس عنکبوت کا

فرمایا خوب ہے لیکن مجھے اکبر کا یہ شعر زیادہ پسند ہے :-

نادیدنی کی دید سے ہوتا ہے خونِ دل
بے دستِ پا کو دیدۂ بینا نہ چاہیئے

× × × × × × × × × × × × × × × ×

افسوس ہے کہ یہاں پہنچ کر فیضان کا یہ سلسلہ معاً منقطع ہو گیا۔ حضرت علامہ کی خدمت میں شرف باریابی حاصل کرنے کے لئے ایک نہ دو اکٹھے چھ آدمی آ گئے۔ میں مایوس اور آزردہ ہو کر چلا آیا۔ لیکن رستے میں میرے دل میں خیال آیا کہ اگر بعض احباب اور اہلِ قلم حضرات سے منتخب اشعار حاصل کئے جائیں اور انہیں کاروان میں شائع کر دیا جائے تو یقیناً "گرمیٔ محفل" میں اضافہ ہوگا۔ وقت کم تھا۔ لیکن میں نے تگ و دو کی اور اس تگ و دو کا نتیجہ کاروان کے کسی اور حصے میں قارئین ملاحظہ فرمائیں گے۔ میرا خیال ہے کہ منتخب اشعار کا یہ مجموعہ گوناگوں دلچسپیوں سے مملو ہے۔ اس سلسلے میں میں مولانا سید سلیمان ندوی اور سر عبدالقادر کا بے انتہا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے باوجود اپنی لاتعداد مصروفیتوں کے فوراً جواب باصواب بھیجا۔

گذشتہ سال کے کاروان پر جو ریویو کئے گئے تھے وہ حوصلہ افزا بھی تھے اور حوصلہ شکن بھی۔ مجموعی طور پر ہندوستان کے بیشتر رسائل نے ہماری محنت اور ہمت کی داد دی لیکن مقامِ افسوس ہے کہ "معارف" "علی گڑھ" "میگزین" اور ایک آدھ اور رسالے کو چھوڑ کر صوبجات متحدہ کے جملہ رسائل نے تنگ دلی کا ثبوت دیا۔ اس موضوع پر "نیازمندان لاہور" کی طرف سے چند معروضات کاروان کے کسی اور حصے میں شائع ہو رہی ہیں۔ ہر چند کہ کاروان "نیازمندان لاہور" کی تمام آرا سے متفق نہیں۔ تاہم ہماری یہ درخواست ہے کہ ان کی معروضات کا

ہمدردی اور غور سے مطالعہ کیا جائے۔ بعض معترضین کی خدمت میں ہم خود بھی ایک بات۔ فقط ایک بات عرض کرنا چاہتے ہیں: ————
پنجاب نے ایسے شاعر پیدا کئے ہیں جن کے اشعار اور تخیلات آپ کی زندگی کا جزو بن کر رہ گئے ہیں۔ آپ کے متبحر عالم ان کے اشعار پڑھ کے سر دھنتے ہیں۔ اور آپ کے بازاروں اور گلیوں میں آوارہ پھرنے والے لڑکے ان کے اشعار بے سری الاپوں میں گاتے ہیں اس کے باوجود جب آپ تنقید لکھنے بیٹھتے ہیں تو آپ کو سوائے "عرصۂ محشر" پہ اعتراض کرنے کے اور کچھ نہیں سوجھتی۔ ہمارے ہاں مزاحیہ نگار ہیں جن کے مضامین کیمبرج کے پروفیسر ترجمہ کرا کے سنتے ہیں اور مارے ہنسی کے لوٹ لوٹ جاتے ہیں۔ جن کے مضامین آپ بھی پڑھتے ہیں تو ہنستے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ نہ ہنسیں۔ لیکن ہنسنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اور اس کے باوجود جب تنقید لکھنے کا وقت آتا ہے۔ تو آپ "خسرہ" کی تذکیر و تانیث کی بحث چھیڑ کر اپنی فضیلت علمی ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں ڈرامہ نگار ہیں جنہوں نے اردو ڈرامہ میں اپنے سحر فن سے جان ڈال دی ہے۔ لیکن آپ کچھ فرماتے ہیں تو یہی کہ "سینچہ" کیوں لکھا۔ بیلچہ کیوں نہیں لکھا۔ کیا یہ مقام افسوس نہیں۔

قہر ہے گر نہ دو سخن کی داد
ظلم ہے گر کرو نہ مجھ کو پیار

× × × × × × × × × × × × × × × × ×

قارئین یہ سن کر خوش ہونگے کہ اس سال کارواں کا ایک خاص ایڈیشن جو ایک سو پچھتر کاپیوں پر مشتمل ہے اور جس کی قیمت فی جلد بارہ روپے ہے۔ شائع کیا جا رہا ہے۔ لیکن یہ ایڈیشن فروخت کے لئے مارکیٹ میں نہیں آئیگا۔ پچیس کاپیاں معاونین کارواں کے لئے علیحدہ کر لی جائینگی اور ہدیۃً ان کی خدمت میں پیش کی جائینگی۔ ایک سو پچاس کاپیوں کے لئے احباب کے دائرے سے آرڈر موصول ہو چکے ہیں۔ اگر آیندہ سال آرڈر زیادہ تعداد میں موصول ہوئے تو اس ایڈیشن کی تعداد بڑھا دی جائیگی۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ کارواں کی اشاعت سے کافی پہلے دفتر کارواں میں آرڈر پہنچ جائیں۔ اس سال کی طرح آیندہ سال کا یہ خاص ایڈیشن بھی بہتر کاغذ پر بہتر طباعت سے اور مجلد شائع ہوگا۔ آیندہ سال کا کارواں انشاء اللہ اس سال سے بھی بہتر ہوگا۔ ابھی سے تیاریاں شروع کر دی گئی ہیں اور امید ہے کہ دسمبر کے بجائے اکتوبر میں شائع ہوگا۔

۱۰ دسمبر ۱۹۳۲ء

مجید ملک

تصاویر

از "نقاد"

روجر فرائی جیسا نقاد جب مصوری پر کچھ لکھنے کے لئے قلم اٹھاتا ہے تو اسکا مطمح نظر صرف اسقدر ہوتا ہے کہ تصاویر کے محاسن آسان سے آسان طریقے سے قارئین پر واضح کر دے اور جو کچھ اس نے خود محسوس کیا ہے دوسروں تک جوں کا توں پہنچا دے۔ یا دوسرے الفاظ میں یہ سمجھئے کہ اسکا مدعا یہ ہوتا ہے کہ جن گوناگوں کیفیات نے مصور کو ایک نیا جہان پیدا کرنے پر آمادہ کر دیا ہے۔ ان کیفیات کو الفاظ کی شکل میں تبدیل کر دے۔ مصور ہمیشہ اپنی شخصیت سے رنگوں اور خطوں میں ایک ایسی قوت مضمر کر دینے کی قدرت چاہتا ہے جو ناظر کے دل میں بھی وہی جذبات بیدار کر دے جنکو مصور خود محسوس کرتا ہے۔ تصویر کو اگر سمجھانے کی کوشش کیجائے یا یوں کہیئے کہ خود اسے سمجھنے کی کوشش کیجائے تو یہ کوشش بالکل اسی طرح کی ہے جیسے چاند ستاروں یا بنی نوع انسان کو سمجھنے کی کوشش۔ ہم چاند کا نام کس بے پروائی سے لے لیتے ہیں۔ بچے تک چاند کا ذکر کرتے ہیں۔ اسیطرح بچہ بھی اور عمر طبعی پر پہنچا ہوا آدمی بھی جب کوئی تصویر دیکھتا ہے تو جھٹ کہ دیتا ہے کہ یہ تصویر ہے۔ لیکن چاند ستاروں اور انسان کی غرض و غایت اور حقیقت کے متعلق آج سے نہیں صدیوں سے بڑے بڑے شاعر فلسفہ دان اور سائنسدان متحیر ہیں۔ اسی طرح تصویروں کی ماہیت اور انکے کمال کے متعلق بڑے بڑے اہل الرائے سرنگوں ہیں۔ ایک مثال لیارڈو ڈونچی کی تصویر "مونالیزا" ہے جس پر دنیا بھر کے نقادوں نے تنقیدیں لکھی ہیں۔ صرف اس ایک تصویر پر کئی ایک مبسوط کتابیں موجود ہیں مگر جب مصنف یا نقاد اپنے احساسات اور جذبات کو ختم کرنے پر آتا ہے تو یہ کہکر خاموش ہو جاتا ہے کہ ابھی کائنات اور تصویر کے اندر بہت سے جذبات جوں کے توں محفوظ پڑے ہیں جنکو مصور اور قدرت نے اپنی تخلیق میں مخفی رکھا ہے اور جنہیں کوئی بھی روشنی میں نہیں لا سکتا۔

ہماری موجودہ تہذیب میں مصوری کو داخل ہوئے تھوڑا ہی عرصہ گزرا ہے۔ ابھی تک بہتیرے پڑھے لکھے اور تصویروں کو سمجھنے کا دعویٰ کرنیوالے اصحاب نے بھی بہت کم "اوریجنل" تصویریں دیکھی ہیں۔ قدیم مصور تو خیر پرانے ہو چکے ہیں۔ ان مدعیان سے اگر یہ پوچھا جائے کہ آپکے نزدیک جدید مشہور مصور کون کون سے ہیں تو وہ بغلیں جھانکنے لگینگے اور ان سے کچھ نہ بن پڑیگا۔

اردو علم و ادب میں تصویروں پر جو تنقیدیں ہیں وہ کچھ حقیقت نہیں رکھتیں۔ تصویروں کو خیر علیحدہ رکھئے جو تنقیدیں اسوقت تک ادبی شاہکاروں پر کی جا چکی ہیں وہ بھی اس قابل نہیں کہ انکے تراجم مغرب کے سامنے پیش کئے جائیں۔ ہمارے ادب میں تنقید کے حصے میں ان الفاظ کے سوا کہ "یہ ایک شاہکار ہے۔ اردو ادب اس سے پہلے ایسی کوئی تصنیف پیش نہیں کر سکا" اور کچھ موجود نہیں۔

کاروان کی اشاعت کا ایک مقصد ان علوم و فنون مشرقیہ کی ترویج ہے جو ہمارے اسلاف کو مرغوب و مقبول تھے۔ افسوس ہے کہ مشرقی روایات جو ہندوستان اور ایشیا میں فنون سے وابستہ تھیں تقریباً مٹ چکی ہیں۔ ان مٹے ہوئے علوم و فنون کو جدید علوم و فنون کے ساتھ پیش کرنا کاروان کا مقصد وحید ہے۔ اس کے علاوہ ایک اہم مقصد یہ بھی ہمارے پیش نظر ہے کہ ملک کے اہل نظر کو جو فن جیسی دولت سے لگاؤ رکھتے ہیں۔ ایک ایسی فضا میں لا کر کھڑا کر دیا جائے جس سے انکے ذوق سلیم کو ایک قسم کی غذا مل سکے۔ دنیائے ادب و فن کا سب سے اہم کام جو مصوروں اور شاعروں کے پیش نظر رہا ہے اور رہیگا صرف اس قدر ہے کہ وہ انسان کی شیرازہ بندی میں ممد ہوں اور انسان میں بیداری پیدا کر کے اچھے اور برے کو متمیز کرنے کی صلاحیت پیدا کر دیں۔ تصویروں کے شائع کرنے کا مقصد یہ نہیں کہ ورق کے ورق بھر دئے جائیں ان کا مقصد ادب اور فن کی ترجمانی کرنا ہے۔ جذبات کی ترجمانی کرنا صناع اور شاعر کا کام ہے انکو سمجھنا اور ان سے لطف اندوز ہونا صاحب نظر اور نقاد کا کام ہے۔

قدیم اور جدید مصوری کو ملک کے ادبی ذوق کے سامنے پیش کرنا ایک بہت بڑی خدمت ہے۔ اسکی اہمیت کو مدنظر رکھ کر پچھلے سال ہم نے قدیم ہندوستانی اور ایرانی تصویروں کے علاوہ جدید اسکولوں کی تصویریں بھی شائع کی تھیں۔ انمیں خصوصیت سے چغتائی سکول کے مصوروں کی تعداد زیادہ تھی۔ ان تصاویر کے علاوہ قدیم اور جدید سنگ تراشی۔ فوٹوگرافی۔ فن تعمیر اور کتابت کے نمونے بھی تھے۔ اس مرتبہ ہم پھر مختلف جدید مصوروں کی تصاویر قدیم ایرانی، مغربی اور جاپانی مصوروں کی تصاویر کے ساتھ ساتھ شائع کر رہے ہیں۔ امسال کاروان میں کم و بیش چالیس تصاویر شائع ہو رہی ہیں۔ یہ تصویریں خانہ پری کرنے کو یا تجارتی نقطہ نگہ کو سامنے رکھ کر شائع نہیں کی گئیں۔ جملہ تصاویر میں ایک خصوصیت ایک انوکھا پن ہے۔ نوآموز یہ تصاویر دیکھ کر حیران نہ ہوں۔ انہیں غور سے دیکھیں۔ انہیں سمجھنے کی کوشش کریں۔ آہستہ آہستہ یہی تصویریں آرٹ کے متعلق ایک صحیح قسم کا معیار قائم کرنے میں ان کی مدد

معاون ہونگی۔ ہم گذشتہ سال کی طرح اس مرتبہ بھی جناب چغتائی کی تین تصویریں شائع کر رہے ہیں "سوز تمام" "مریاں" اور "قلندر"۔ پچھلے سال ہم نے علامہ اقبال کا اردو کلام قدیم ایرانی طرز نگارش سے شائع کیا تھا۔ یہ حسین و جمیل تزئین تصویر سے بھی زیادہ قدر و احترام سے دیکھی گئی تھی اور اسے قدر دانان اقبال نے بے انتہا سراہا تھا۔ اس مرتبہ پھر ہم علامہ موصوف کے اشعار سے ابتدا کرتے ہیں۔ انہیں شعروں کے متعلق "سوز و ساز" کے نام کی تصویر ہے۔ یہ تصویر جناب چغتائی کے موقلم کا نتیجہ ہے۔ یہ تصویر مصور کے تخیل اور وسعت نظر کو اور اس قدرت کو جو اسے رنگوں پر ہے واضح کرتی ہے۔

شائقین کے اصرار پر جناب چغتائی یہ تصویر متعدد بار دہرا چکے ہیں اور اس کی کاپیاں ہندوستان کے مختلف حصوں میں اہل ذوق کے پاس موجود ہیں۔ ایک تصویر مہاراجہ بردوان کے پاس ہے ایک مہارانی کوچ بہار کے پاس ایک میجر۔ سی ہورڈ اندور کے پاس اور ایک نواب صاحب بہاول پور کے پاس۔ فنی اعتبار سے اس تصویر کی یہ آخری اور بہترین کوشش ہے جو کارواں میں شائع کی جا رہی ہے لیکن مصور اس پر بھی مطمئن نہیں یا شاید نہ رہے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ غالب کے ایڈیشن میں جناب چغتائی کو وہ فنی کمال نظر نہیں آتا جس کے اب وہ اپنے آپ کو اہل سمجھتے ہیں۔ یورپین ماہرین فن کی رائے ہے کہ غالب کا ایڈیشن چغتائی کی مصوری کا بہترین نمونہ ہے لیکن چغتائی خود اس دنیا سے بہت آگے نکل گیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ہر ایک کامل مصور اور شاعر اپنے گذشتہ شاہکاروں اور کارناموں کو پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔ ایک "جینیس" کی طبیعت کبھی اپنے گذشتہ کارناموں پر مطمئن نہیں ہوتی خواہ ان کی تکمیل میں کتنی ہی محنت اور کوشش کیوں نہ کی گئی ہو۔ افسوس ہے کہ چغتائی کے متعلق اسوقت تک جو کچھ مغربی زبانوں میں لکھا جا چکا ہے اسکا عشر عشیر بھی ہماری ملکی زبان میں موجود نہیں اور جو موجود ہے اس میں ایک فقرہ بھی ایسا نہیں جس کو مغربی تنقیدوں کے مقابلے میں پیش کیا جا سکے تاکہ وہ لوگ سمجھیں کہ ہم خود اپنے مصور کے متعلق کیا کچھ خیالات رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ چغتائی سے اردو دان حضرات کو روشناس کرانے کے لئے مغربی نقادوں کا مرہون منت ہونا پڑتا ہے۔ ایک مغربی نقاد لکھتا ہے:۔

"چغتائی ان مصوروں میں سے ہے جسکی تصویریں دیکھ کر روح میں ایک قسم کا ارتعاش پیدا ہوتا ہے وہ خود رومان کی دنیا میں رہتا ہے اور دیکھنے والوں کو بھی اس دنیا میں لیجانا چاہتا ہے"۔ نو آموز حضرات چغتائی کی تصاویر دیکھتے وقت اس رائے کو پیش نظر رکھ لیا کریں تو انہیں چغتائی کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

چغتائی کی دوسری تصویر "مریاں" پنجاب کی ایک دیہاتی لڑکی کی تصویر ہے اس تصویر کو دیکھ کر پنجاب کی فضا اور مقامی رنگ اور معصوم لڑکیوں کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ جن لوگوں نے پنجاب کے دیہات دیکھے ہیں یا ان کی رومان بھری کہانیاں سنی ہیں وہ اس تصویر سے پوری پوری طرح لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

تیسری تصویر "قلندر" ہے۔ مصوری کی دنیا میں خواہ وہ مغربی ہو یا مشرقی چغتائی کی یہ غیر فانی تخلیق ہمیشہ یادگار رہیگی۔ دور احیا کے مغربی مصوروں کو اور جدید مصوروں کو شبیہ سازی میں کمال حاصل ہے مگر یہ تصویر مشرقی مصوری کے تخیلی انداز کا ایک بہترین نمونہ ہے۔

"جاوی فاصہ" ڈاکٹر ابندرا ناتھ ٹیگور اور بنگال اسکول کی مصوری کا بہترین نمونہ کہی جا سکتی ہے۔ جدید ہندوستانی مصوری میں ٹیگور کی شخصیت کسی تعریف و توصیف کی محتاج نہیں۔ اجنٹا راجپوت مغل اور جاپانی طرز مصوری پر ٹیگور کو بہت قدرت حاصل ہے بیشتر نقادان فن کا خیال ہے کہ ٹیگور پر جاپانی مصوری کا اثر ہے لیکن ہمارا خیال ہے کہ اسکے کام میں مغل روایاتِ مصوری سب سے زیادہ نمایاں ہیں مثال کے طور پر اسکی تصاویر اورنگ زیب ابو الحسن شاہجہاں۔ قدیم بانسری وغیرہ پیش کیجا سکتی ہیں ٹیگور فنی اعتبار سے ایک قابل ترین مصور ہے ہندوستانی آرٹ کے احیاء کیلئے ٹیگور نے برسوں کوشش کی ہے چنانچہ جس طرح چغتائی مصوری کے پنجاب اسکول کا بانی ہے اسی طرح ٹیگور بنگال اسکول کا بانی ہے ٹیگور اسکول کی ابتدائی تصاویر ہندوستانی آرٹ کا بہترین نمونہ کہی جا سکتی ہیں۔ لیکن یہ بات قابل افسوس ہے کہ اب وہ قدیم روایات اور فنی خوبیاں جو ٹیگور نے برسوں کی محنت کے بعد پیدا کی تھیں آہستہ آہستہ مفقود ہوتی جا رہی ہیں۔

گذشتہ سال ہم نے پنجاب اسکول کے دو مصوروں یعنی اصغر اور میاں محمد حسین کی تصاویر شائع کی تھیں! اس سال ہم پنجاب اسکول کے ایک اور قابل مصور میاں عنایت اللہ کی ایک تصویر "راگنی" شائع کر رہے ہیں۔ میاں عنایت اللہ پنجاب اسکول کے اولین دور کے مصوروں میں سے ہیں وہ تمام فنی خوبیاں جو پنجاب اسکول کا طرۂ امتیاز ہیں یعنی خطوط کی پختگی باہم آہنگی۔ رنگوں کا دلکش امتزاج اور طرز ادا یہ سب کچھ اس تصویر میں موجود ہے۔

"شب شیراز" اور "نغمہ" اصغر کے فن کا نمونہ ہیں۔ اصغر کو پنجاب اسکول کے مصوروں میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس کی تصویریں ہندوستان کے دوسرے حصوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھی

جاتی ہیں۔ اس نوجوان مصور نے پنجاب اسکول کے لئے بہت کام کیا ہے۔ ہندوستانی مصوری میں جاپانی روایات کے ساتھ رنگ آمیزی اور فضا میں دلکشی زیبائش اور شعریت پیدا کرنے میں اصغر کو ید طولیٰ حاصل ہے۔

سولھویں اور سترھویں صدی میں مغل مصوروں کو شبیہ سازی پر جو قدرت حاصل تھی اسکا بہترین نمونہ راجہ جسونت سنگھ کی تصویر ہے۔ اس شبیہ میں مصور کو بہت بڑی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ یہ تصویر مسٹر شیوگر دہلی کے تصویر خانے سے لی گئی ہے۔

"خلوت" راجپوت مصوری کا ایک بہترین نمونہ ہے راجپوت مصوری مغل مصوری کی ایک شاخ ہے بہت سے راجپوت مصوروں نے کرشن رادھا کی تصاویر بنانے میں اپنا کمال دکھایا ہے۔ ان مصوروں کو فضا اور جذبات کی تصویر کھینچنے میں کمال حاصل تھا۔ اس اسکول نے بہت سے مصور پیدا کئے تھے۔ ملا رام اور گوبر دھن خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ تصویر ملا رام کی بنائی ہوئی ہے۔

"دربار شاہجہان" مغل مصوری کے انتہائی عروج کا زمانہ عہد شاہجہانی تھا۔ یہ تصویر اس زریں عہد کی ہے۔ ہمارے اسلاف کے بیشتر کارناموں کی طرح یہ نادر روزگار تصویر بھی یورپ (بوڈلین لائبریری آکسفورڈ) میں ہے۔ مہتمم لائبریری کی اجازت سے شائع کی جا رہی ہے۔

جاپانی مصوروں کو رنگ آمیزی اور فضا میں یکسانیت پیدا کرنے میں خصوصیت حاصل ہے۔ "ساون رت" چیکیو ہرن ایک جدید جاپانی مصور کی تصویر ہے۔ یہ مصور رنگ آمیزی اور فضا میں دلکشی پیدا کرنے میں دیگر جاپانی مصوروں سے کہیں بہتر ہے۔ یہ تصویر ٹوکیو دارالحکومت جاپان کی نمائش سے جناب چغتائی کے ایک جاپانی مصور دوست کی وساطت سے حاصل کی گئی ہے۔

کوزہ گری کے متعلق جو تصویریں شائع کی گئی ہیں یہ سب مسلمانوں کے فن کوزہ گری کے نمونے ہیں اور تمام تصاویر اسلامی کوزہ گری والے مضمون سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ مضمون میرزا دیری نے بڑی محنت اور کاوش سے لکھا ہے۔ اردو علم و ادب میں بالکل نئی اور اچھوتی چیز ہے۔ کاروان کو اس بات پر فخر حاصل ہے کہ وہ اردو علم و ادب میں نئے نئے موضوعات پر مضامین لکھوانے اور شائع کرنے میں کوشاں ہے۔ اسلامی کوزہ گری کے یہ تمام نمونے برٹش موزیم کی ملکیت ہیں۔ مہتمم عجائب خانہ کی اجازت سے شائع کئے جا رہے ہیں۔

"مجسمۂ اسکندر" یہ اطالوی مصور مائیکل انجیلو کی تخلیق ہے مائیکل دور احیا کا واحد مصور ہے جسے مصوری اور سنگتراشی پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ اس نے مصوری اور سنگتراشی کے بیمثال نمونے چھوڑے ہیں۔

"ماں اور بچہ" ایلن ہوز جدید سنگتراش کے فن کا کمال ہے۔ لائق سنگتراش نے قدیم فضا پیدا کرنے میں بہت بڑی کامیابی حاصل کی ہے۔

ڈورا گورڈن ایک نوجوان سنگتراش روسی لڑکی ہے۔ جدید سنگتراشی میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ "ایک چینی کا مجسمہ" اسی کا بنایا ہوا ہے۔ حال ہی میں اس نے اپنے تیار کردہ مجسموں کی نمائش لنڈن میں کی ہے۔ جہاں اسے بہت بڑی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

ہرمن گبل متوسط عہد کے سنگتراشوں سے تعلق رکھتا ہے۔ اپنے زمانے کا مشہور سنگتراش ہے۔ "مغرور ماں" کا مجسمہ اسی کا بنایا ہوا ہے۔

"بدھا" قدیم سنگتراشی کا نمونہ ہے۔ ہندو صناعوں نے مہاتما بدھ کی الفت سے متاثر ہو کر عجیب و غریب شاہکار پیش کئے تھے۔

"شبیہ مصور" بہزاد کا کمال ہے! ایرانی مصوروں میں جو حیثیت بہزاد کو حاصل ہے۔ وہ بہت کم مصوروں کو نصیب ہے قارئین کو یاد ہوگا کہ گذشتہ سال ہم نے بہزاد کی دو تصویریں شائع کی تھیں۔

"ایرانی شہزادی" ایرانی مصوری میں بہت سے اسکول مختلف بادشاہوں کے عہد میں قائم ہوئے۔ بعض اسکول آج تک مشہور ہیں۔ ہرات سکول ایرانی مصوری میں خاص شہرت رکھتا ہے۔ "ایرانی شہزادی" اسی ہرات اسکول کا کارنامہ ہے۔

یورپ میں فن تعمیر میں حیرت انگیز ترقی ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ظاہری خوبصورتی اور بناوٹ میں بھی نمایاں کامیابی حاصل کی گئی ہے۔ "جدید عمارت" انگلستان کے ایک پہاڑی مکان کے بالائی حصہ کا فوٹو ہے۔

"مینار تاج" یوں تو تاج محل تعمیر کی دنیا میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ لیکن اس کی جس جہت کا فوٹو شائع کیا گیا ہے۔ خوب چیز ہے۔ یہ فوٹو خاص طور پر کاروان کے لئے لیا گیا ہے۔

"اندھا فقیر" اس تصویر کا مصور آئن کارٹن جرمن مصور ہے۔ یہ تصویر جدید مغربی مصوری میں بالکل نئی چیز ہے۔ اس کا کمال محنت اور کوشش سے محسوس کیا جا سکتا ہے، اندھے فقیر کی تصویر جدید مغربی مصوری میں بہت بڑا درجہ رکھتی ہے۔

جدید فوٹوگرافی کے نمونے اسلئے شائع کئے گئے ہیں کہ قارئین اندازہ لگائیں کہ یورپ میں فنی اعتبار سے فوٹوگرافی کہاں تک تصویر کا درجہ حاصل کر چکی ہے۔ "مطالعہ" "تراش" اور "سرکس" تینوں غور طلب فوٹو ہیں۔

گذشتہ سال ہم نے سلطان محمد ثانی فاتح قسطنطنیہ کی تصویر عجائب خانہ استنبول سے حاصل کر کے شائع کی تھی! اس سال اس مصور کی ایک اور تصویر سلطان محمد ہی کی شائع کر رہے ہیں۔ اس تصویر کے لئے ہم برٹش موزیم کے مسٹر باسل گرے اور عزیز بے مہتمم عجائب خانہ آثار عتیقہ استنبول کے شکر گزار ہیں۔ اسکے ساتھ دو تصویریں اور بھی سلطان محمد کی شائع کی جا رہی ہیں۔ ایک تصویر نیشنل گیلری لنڈن کی ملکیت ہے۔ اور دوسری گذشتہ سال کی تصویر کا چھوٹا عکس ہے اسکے ساتھ جنتائل بلینی کے دو خاکے بھی شائع کئے جا رہے ہیں۔ یہ سب تصویریں جنٹائل بلینی والے مضمون سے تعلق رکھتی ہیں۔

"میر حسن کی تصویر" مثنوی بدر منیر کے قلمی مصور نسخے سے لی گئی ہے۔ اصل کتاب ۷ × ۱۲ انچ تقطیع پر ۶۹ تصاویر سے مزین ہے۔ سنہ ۱۱۹۸ھ تاریخ اختتام جو کتاب پر درج ہے اسکی رو سے یہ نسخہ معاصرانہ حیثیت رکھتا ہے۔ یہ نادر روزگار مخطوطہ یمین الدولہ ناظم الملک نواب سعادت علی خان کے کتبخانہ کی زینت رہ چکا ہے۔ آجکل آغا حیدر حسن پروفیسر نظام کالج کی ملکیت ہے۔

تصویر نظیر اکبر آبادی بھی ایک قلمی نسخہ کلیات نظیر سے لی گئی ہے۔ اس نسخہ میں قریب ۵۰ تصاویر ہیں۔ کاغذ اور تصاویر کے اعتبار سے یہ نسخہ مصنف کے عہد سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ کتاب بھی جناب آغا حیدر حسن کے مجموعہ میں ہے۔ ہم آغا صاحب کے بیحد مشکور ہیں کہ انہوں نے دونوں تصاویر کی اشاعت کی اجازت فرما کر ممنون احسان کیا۔

"بادہ حافظ" یہ تصویر مسٹر بن جی ساکن گیا کی بنائی ہوئی ہے۔ اگرچہ جدید مصوری میں یہ کوشش ابتدائی درجہ رکھتی ہے۔ تاہم مصور کو تصویر بنانے پر فنی قدرت حاصل ہے

یو۔پی کے تنقید نگاروں کی خدمت میں

ازنیازمندانِ لاہور

جتنی فرہنگیں اور جتنے فرہنگ طراز ہیں۔ یہ سب کتابیں اور یہ سب جامع مانند پیاز ہیں۔ تو بتو ادر لباس در لباس وہم در وہم اور قیاس در قیاس۔ پیاز کے چھلکے جس قدر اتارتے جاؤگے۔ چھلکوں کا ڈھیر لگ جائیگا۔ مغز نہ پاؤگے۔ (غالب)

"کاروان کا یہ دوسرا نمبر دنیا کے سامنے ہے۔ یہ رسالہ پنجاب کے چند نوجوانوں کی محنت کا نتیجہ ہے جنہوں نے پچھلے سال جناب چغتائی اور جناب تاثیر کے زیر قیادت اور اس سال جناب چغتائی اور جناب مجید ملک کے زیر ہدایت اس بات کی کوشش کی ہے۔ کہ حسب استطاعت ان فنون لطیفہ کے ذریعے سے جن کا ظہور سطح قرطاس پر ممکن یا سہل ہے۔ ہندوستان کے موجودہ اہل فن کے مزاج سے تعلیم یافتہ حضرات کو روشناس کرایا جائے۔ اس میں کسی صوبے کی قید نہیں۔ اور فہرست مضامین سے ظاہر ہوگا۔ کہ اس مبارک دریوزہ گری کے لئے ہندوستان کے سب صوبوں کے سامنے ہاتھ پھیلایا گیا ہے۔ اگر آپ کو اپنے بعض دلپسند نام اس فہرست میں نظر نہ آئیں۔ تو اس کو سائل کے استغنا پر نہیں۔ اس کی نامرادی پر محمول کیجئے۔

ادب و انشا کے نمونے پیش کرنے کے لئے زبان اردو کو منتخب کیا گیا ہے۔ نہ اس لئے کہ اور کوئی زبان درخور اعتنا نہیں۔ نہ اس لئے کہ پنجاب میں صرف یہی ایک زبان بولی یا سمجھی جاتی ہے۔ بلکہ اس لئے کہ پنجاب کے نوجوانوں کا وہ طبقہ جسے کاروان سے وابستگی کا فخر حاصل ہے۔ اپنی تعلیم۔ اپنی تہذیب۔ اپنی تربیت اور اپنے جذبات عقیدت و الفت کی وجہ سے اردو ہی کو اپنے لئے بہترین ذریعۂ اظہار سمجھتا ہے۔ مبصرین سے پوشیدہ نہیں۔ کہ اس وقت ہندوستان میں اردو کے تین مرکز ہیں۔ یو۔پی - حیدرآباد (دکن) اور لاہور۔ لیکن اہل بینش بھی یہ بات گاہے گاہے بھول جاتے ہیں۔ کہ یو پی میں یہ زبان خودرو ہے۔ حیدرآباد میں یہ زبان ایک والئ ملک کے سایہ عاطفت میں پل رہی ہے۔ اور صرف پنجاب ہی ایک ایسا علاقہ ہے۔ جہاں اس کی نشو و نما محض خونِ عشاق کی مرہون منت ہے۔ جس جگہ یہ زبان خودرو ہے وہاں خودبین بھی ہے۔ جہاں اتالیق شاہی سے تعلیم پا رہی ہے۔ وہاں عوام سے کچھ کھچ کے رہتی ہے۔ لیکن پنجاب میں اس زبان کی حالت ایک ہونہار تنومند نوجوان کی ہے جس کا خون گرم ہے اور جس کے اعضا میں لچک ہے۔ جو چھلانگیں مارتا جاتا ہے۔ اور اس بات کی پروا نہیں کرتا۔ کہ اس کا ہر قدم پگڈنڈی پر پڑتا ہے یا نہیں۔ اسے سمت کا اتنا ہی شعور ہے۔ جتنا کسی اور قدرتی نمو کو ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہ سوائے گرمئ حیات کے اور کسی بیرونی قوت کا احسان نہیں۔ لیکن قوت نامیہ خود وہی رستہ ڈھونڈتی ہے۔ جو بخط مستقیم کھلی روشنی اور تازہ ہوا کی طرف جاتا ہے۔

یہ کہنا کہ پنجاب نے یو پی سے کسب فیض نہیں کیا۔ یا یہ کہ پنجاب یو پی کی روایات سے یکقلم مقاطعہ کرنے پر تلا ہوا ہے۔ کذب اور مبالغہ ہوگا۔ یو پی کے اساتذۂ قدیم میں سے کون سا ایسا ہے۔ جسے پنجاب نے ایک بار، سو بار، ہزار بار نہیں پڑھا۔ وہ کون سا ایسا دیوان ہے

جس کی ورق گردانی نہیں کی۔ وہ کونسا ایسا شاہکار ہے۔ جسے حرزِ جان بنا کر نہیں رکھا۔ لیکن یو پی کے چشمے خشک ہو چکے۔ پیاس بجھانے کے لئے اب وہاں جانا بیسود ہے۔ اب پنجاب کی رہبری بجز اس کی اپنی قوت نامیہ کے کوئی چیز نہیں کرسکتی۔ یو پی میں ادب اردو ایک سسکتا ہوا سانپ ہے۔ جو کبھی کبھی ایک خفیف سی پھنکار مارتا ہے۔ اور بس۔ اب یو پی صرف اعتراض کرسکتا ہے۔ رہنمائی نہیں کرسکتا۔ اور نہیں جانتا۔ کہ اس کا چڑچڑاپن۔ اس کا مربیانہ انداز۔ اس کی طفلانہ تنقید یہ سب انحطاط کی نشانیاں ہیں۔ ہم جانتے ہیں۔ کہ یوں ایک خود بین ہستی کو اس کے انحطاط کی خبر سنانا بیرحمی ہے۔ لیکن یہ بیرحمی ایک نشتر زن کی بیرحمی ہے۔ اس میں معمول کی دلداری کا خیال کرنا فضول ہے۔

اس انحطاط کے ثبوت میں کوئی سی ایسی تنقید اٹھا کے دیکھ لیجئے۔ جو کسی یو پی کے مرتب کئے ہوئے رسالے میں چھپی ہو۔ اگر وہ تنقید ڈرامے پر ہے۔ تو ڈرامے کے اصولوں سے کچھ بحث نہیں۔ مناظر کی ترتیب سے کچھ واسطہ نہیں۔ سٹیج کی موزونیت سے کچھ تعلق نہیں۔ اگر نظم پر ہے تو شاعر کی نفسیات درخورِ اعتنا نہیں۔ اس کی جدت زیرِ غور نہیں۔ اس کی ذہنی کشمکش پر نظر نہیں۔ اگر افسانہ ہے۔ تو توازن کا ذکر نہیں۔ فضا کا احساس نہیں۔ مطلب کا شعور نہیں۔ اگر ترجمہ ہے تو فقروں کی ترکیب پر توجہ نہیں۔ اصل سے مقابلے کا حوصلہ نہیں۔ اجتہاد کو پرکھنے کی استعداد نہیں۔ صرف زبان کے اعتراضات پر زور ہے۔ اِس محاورے پر اُس لفظ پر۔ اِس حرف پر اُس نقطے پر نظریں گڑی ہوئی ہیں۔ نگاہ میں یہ وسعت نہیں اور طبیعت میں یہ بلندی نہیں۔ کہ کسی اور چیز کو جانچ سکیں۔ یا اصل مدعا کے متعلق چھوٹے منہ سے دو لفظ بھی کہنے کی توفیق پیدا کرسکیں۔ زمانہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ کاروان اردو کئی منزلیں طے کر گیا۔ لیکن حضرات یو پی ہنوز "تک" اور "تلک" کے پھیر میں ہیں۔ وہ زبان اردو کو اشوک کا ایک کتبہ سمجھے ہیں۔ جو دہلی یا لکھنو میں نصب ہے۔ اور جس کا تتبع ان پر بھی ضروری ہے۔ جو جمادات کی منزل سے آگے نکل چکے ہوں۔

گذشتہ سال کے کاروان پر کئی رسائل نے زبان کے اعتراض کئے تھے۔ لیکن ہم لوگ اس قسم کے اعتراضات سننے کے عادی ہو چکے ہیں۔ ہم یو پی کے حضرات کو اس مشغلے سے محروم نہیں کرنا چاہتے۔ اس انحطاط کے زمانے میں اب یو پی کے پاس صرف یہی ایک کھلونا رہ گیا ہے گو چڑچڑے پن کا یہ عالم ہے۔ کہ خود اس سے کھیل نہیں سکتے اور کسی اور کو کھیلنے نہیں دیتے۔ بے ہنر نقادوں کا ہنر اب یہی رہ گیا ہے۔ کہ جہاں پنجاب کا کوئی مضمون چھپے اس کے ہر چھوٹے سے چھوٹے فقرے کو ہر بڑی سے بڑی فرہنگ کے ساتھ پرکھیں۔ اہل قلم کی ہر قوت کو محض تذکیر و تانیث کے معیار سے ناپیں اور اس کے بعد ایک "فہرست اغلاط" مرتب کرکے فن تنقید کی گور پر لات ماردیں۔ مطالب یا فن یا حسن بیان کی طرف ڈر کے مارے صرف کنکھیوں سے دیکھ لیں۔ اور اگر باوجود اپنی نااہلی کے مرعوب ہوئے بغیر چارہ نہ ہو۔ تو اپنی بیچارگی کو "اچھا ہے" یا "خوب ہے" جیسے بے معنی فقروں سے ڈھانپ کر اپنی کم مائگی کو فہرست اغلاط کی طوالت سے پورا کرنے کی کوشش کریں۔ یا اگر کسی ریلوے بک سٹال سے کسی انگریز لال بجھکڑ کی کوئی ارزاں کتاب مبادیات انشا کے متعلق دستیاب ہو جائے۔ تو اس کے فرسودہ خیالات کے چھوسڑوں سے اپنی تھوڑی بہت ستر پوشی کرکے یہ سمجھ بیٹھیں کہ اب ہم علم و فن کی تمام آرائشوں سے مزین ہیں۔ اور کیا مشرق اور کیا مغرب دنیا بھر کا ادب ہمارے ہی گوشہ چشم سے کیمیا بننے کو ہماری دہلیز پر پڑا ہوا ہے۔

اگر یو پی کے سب رسالے اسی جہل سے مرکب ہوتے۔ تو اس مضمون کا لکھنا محض بیسود تھا۔ لیکن ان میں سے چند رسالے ایسے بھی ہیں جن کی ہر اشاعت کے ساتھ نہایت خوشگوار توقعات وابستہ ہوتی ہیں۔ اور جنہیں پنجاب کا ہر وہ ادب آشنا جسے اہل نظر کی تلاش رہتی ہے بہت شوق سے پڑھتا ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ ایسے رسالوں کے مرتب کرنے والے بھی باوجود اپنے علم اپنے ذوق اور اپنی متانتِ طبع کے

یو پی کے ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ہمارا روئے سخن اس وقت ان کی طرف ہے۔ اور ان میں سے دو رسالے خاص طور پر ایسے ہیں جن سے مخاطب ہونا خود ہمارے لئے فخر کا باعث ہے۔ ہماری مراد "علی گڑھ میگزین" اور "جامعہ" سے ہے۔

علی گڑھ کا خطہ مردم خیز خطہ ہے۔ اور اس کی زمین کا ہر ذرہ قابل احترام ہے۔ ہندوستان میں جہاں بھی کوئی ایسا شخص ہے جو تہذیب جدید کے ساتھ ٹکرانے سے پریشان نہیں ہوتا۔ لیکن پھر بھی اردو زبان کو اپنے لئے روح پرور تصور کرتا ہے۔ وہ علی گڑھ کے نام کو ہم قلم اور علی گڑھ کے مطبوعات کو ترقی کا پرچم سمجھتا ہے۔ لیکن علی گڑھ میگزین بھی جب کاروان پر تنقید لکھنے بیٹھا تو اس نے اس تنقید کا تقریباً نصف حصہ "زبان کی لغزشوں" کی نذر کر دیا۔ افسانوں پر پانچ سطروں کا ایک پیراگراف لکھا۔ اور وہ بھی ایسا جس میں علم کم اور متانت پوش بچپن زیادہ پایا جاتا ہے۔ تصاویر کے متعلق صرف اتنا لکھ دیا۔ کہ "سب کی سب دلکش اور دلاویز ہیں"۔ یہ الفاظ نہایت محفوظ ہیں لیکن نہ اتنی قدر کہ ان کے شگافوں میں سے تنقید نگار کا کورا پن نظر نہ آئے۔ البتہ یہ بڑے وثوق سے کہہ دیا۔ کہ "معراج" مؤنث ہے مذکر نہیں۔ اس کا جواب دراصل تو یہ ہے۔ کہ بہت اچھا صاحب معراج مؤنث ہی سہی۔ لیکن اس کی وجہ سے آپ کو صرف اتنی ہی زحمت اٹھانی پڑیگی۔ کہ جہاں "معراج تھا" لکھا ہے۔ وہاں پنسل سے "تھا" کی بجائے "تھی" کر لیجئے۔ قصہ ختم ہوگیا۔ اس کے بعد مضمون کو پڑھئے۔ اگر لطف آئے تو کہئے اچھا ہے ورنہ اس پر خاک ڈالئے۔ مفتیانہ انداز اختیار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ بقول آپ کے "ہم اس قسم کے اعتراضات سے آزردہ ہوتے ہیں"۔ ہمیں آزردہ کرنے سے کیا حاصل۔ اس غلطی کو اگر آپ نظر انداز کر دیتے۔ تو نہ صرف آپ کی تنقید کا معیار ہی بلند رہتا۔ بلکہ ہماری دلی عقیدت بھی متزلزل نہ ہونے پاتی۔ ناسخ نے کیا خوب کہا ہے:۔

کسی دل تک رسائی ہو سکے تو عرش ہے یہ بھی

عزیزو گر نہیں معراج ممکن عرش اعظم کا

شعر معمولی ہے لیکن جذبہ نہایت صحیح ہے۔ اور عجب نہیں کہ آپ اس سے متاثر ہوں۔

محولۂ بالا تنقید خود ایڈیٹر صاحب کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ حالانکہ تازہ ترین اشاعت میں انہوں نے "آغاز داستان" کے عنوان سے جو مضمون لکھا ہے۔ اس کے تقریباً ہر صفحے پر اس سے بدتر لغزشیں موجود ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

"سالنامہ کی خصوصیات اس کی دلچسپیاں و دلفریبیاں ہم سے نہ کہلوائیے" (عطف کا یہ غلط استعمال خاص علی گڑھ میگزین کا حصہ ہے۔ اور "خصوصیات کہلوانا" تو ایسا محاورہ ہے کہ کیا کہنے۔)

"چھوٹے ہوؤں سے ملنا" (پنجاب اس مطلب کو یوں ادا کرتا۔ تو آپ ہی مربیانہ تبسم سے فرماتے۔ کہ یہاں "بچھڑے ہوؤں" چاہیئے)

"سب سے زیادہ موجب مسرت خبر کابل یونیورسٹی کا قیام ہے۔" (جناب اہل زبان صاحب۔ کابل یونیورسٹی ابھی قائم نہیں ہوئی۔ جب قائم ہو جائیگی۔ تو جو آپ کا دل چاہے لکھ لیجئیگا۔ فی الحال تو جس خبر سے آپ کو مسرت ہوئی ہے۔ وہ قیام کی تجویز ہے)

"پہلے سے جو مضامین کی آخری تاریخ مقرر کی جاتی ہے...." (مضمون کی تاریخ نہیں ہوتی۔ مضمون بھیجنے یا پہنچنے کی تاریخ ہوتی ہے)

"تمام ضروری خبریں اور اہم اجتماعوں کے متعلق پچھلے نمبروں میں لکھا جا چکا ہے" (اس ایک فقرے میں صرف و نحو اور بیان کی اتنی غلطیاں ہیں۔ کہ ان میں سے دو ایک تو خود ہی آپ کو سوجھنی چاہئیں)

معلوم ہوتا ہے۔ آپ ہماری اصلاح میں اس قدر وقت ضائع کر دیتے ہیں۔ کہ خود کچھ سیکھنے سکھانے کی فرصت ہی نہیں ملتی لیکن پنجاب کا ایک رسالہ بھی ایسا نہیں۔ جو آپ پر نکتہ چینی کرنے کو اپنے لئے باعث فخر و ناز سمجھے۔ ہم مہینے کے مہینے خود یوپی کے رسالوں میں سے زبان۔ صرف و نحو اور انشا کی غلطیوں کی ایک طویل فہرست اہل بصیرت کی عبرت کے لئے مرتب کر سکتے ہیں۔ لیکن اب تک ہم نے یہ پیشہ اختیار نہیں کیا۔ اور سچ پوچھئے تو ہمیں اس کی فرصت بھی نہیں۔ یہ مشغلہ آپ ہی کو مبارک ہو۔ ہم آپ کی خوبیوں پر نظر رکھتے ہیں۔ کیونکہ ہم نوشت و خواند کو وجہ مسرت اور ذریعۂ اتحاد سمجھتے ہیں۔ آپ ہمارے نقائص کریدتے رہتے ہیں۔ آپ نے زبان کو اپنے لئے مرد تسمہ پا بنا لیا ہے۔ جو نحیف ہے۔ مگر جس نے آپ کا ٹینٹوا دبا رکھا ہے۔

"جامعہ" کی حالت اس سے بھی زیادہ قابل افسوس ہے۔ کیونکہ "جامعہ" کے حلقے میں بعض ایسی شاندار ہستیاں بھی شامل ہیں جن کی توجہ کو جذب کرنا بھی باعثِ سعادت ہے۔ ان کا جوش عمل اور ان کا تبحر علمی ہم ہیچ میرزوں کی تعریف و توصیف سے بالا تر ہے۔ پھر کیا یہ حیرت کا مقام نہیں۔ کہ یہ زبان کا جنون ان کی سلامت طبع کو بھی ملوث کر رہا ہے۔ اور وہ بھی تنقیص کے نشے سے بیخود ہو کر تفکر و تعمق سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ اس زبان درازی کا حوصلہ ہمیں صرف اس لئے ہوا۔ کہ "جامعہ" نے فہرست اغلاط میں "منزل گاہ" جیسے لفظ کو بھی شامل کر لیا۔ اور کہ دیا۔ کہ "یہ ترکیب صحیح نہیں۔ غالباً قافیہ کی مجبوری تھی"۔ یہی وہ ادعا اور تیقن ہے جس کی ایک موٹی سی تہ یوپی کے اکثر دماغوں پر جمی ہوئی ہے۔ اے کاش کہ فاضل تنقید نگار صاحب اپنے لہجے میں تھوڑا سا منکسرانہ مگر مخلصانہ تامل پیدا کر لیتے۔ اے کاش اب بھی کبھی کبھار وہ اپنا انداز طالب العلمانہ بنا لیا کریں۔ اور خشوع و خضوع کے ساتھ یہ شعر گایا کریں ؎

کس ندانست کہ منزل گہ مقصود کجاست
ایں قدر ہست کہ بانگ جرسے مے آید

لیکن ایسے پڑھ کر بھی وہ شاید یہی کہینگے۔ کہ "ترکیب صحیح نہیں۔ غالباً قافیہ کی مجبوری تھی"۔

"جامعہ" کے جس نمبر میں کاروان پر تنقید چھپی ہے۔ اسی نمبر میں زبان کی کئی دلچسپ غلطیاں موجود ہیں جنہیں ہم یہاں نقل کرنا سوئے ادب سمجھتے ہیں۔ لیکن ارباب "جامعہ" کا اشارہ پاتے ہی ہم ان کی خدمت میں پیش کرنے کو تیار ہیں۔

"جامعہ" کی تنقید کا انداز ضرورت سے زیادہ پیغمبرانہ ہے۔ اور "عمل پیہم" اور "قومی سیرت" اور "اصلاح مد نظر ہے" اور "ہمیں خوشی ہے" اور "ہمیں امید ہے" اور اسی قسم کی آیات سے "فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ" پر عمل کرنے کی کوشش بہت نمایاں ہے لیکن چونکہ یہ انداز جامعہ کا مستقل انداز ہے اور اس کے اغراض و مقاصد میں شامل ہے۔ اس لئے ہمیں اس پر اعتراض کرنے کا حق غالباً حاصل نہیں۔ تاہم اتنا عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ نقد و نظر کے اعتبار سے اس تنقید کا "وزن مخصوص" بہت کم ہے اور پڑھنے والے کو اس سے حاصل کچھ نہیں ہوتا۔ بجز اس احساس کے کہ تنقید نگار اپنے سینے میں دل درمند رکھتے ہیں۔ اور یہ احساس لاریب دونوں جہان میں امت مرحومہ کے لئے بھلائی کا موجب ہوگا۔

"پنجابی محاورے" خاص طور پر قابل بحث ہیں۔ "علی گڑھ میگزین" اور "جامعہ" دونوں نے ان کا ذکر کیا ہے۔ اور کنایۃً بالکل بجا فرمایا ہے کہ یہ محاورے ٹھیٹھ پنجاب کی پیداوار ہیں۔ یہاں تک تو ہمیں ان سے پورا اتفاق ہے۔ مثلاً پنجاب کے لوگ "مجھے جانا ہے" کی بجائے "میں نے جانا ہے" اور "میری سمجھ میں نہ آتا تھا" کی بجائے "مجھے سمجھ نہ آتا تھا" بولتے ہیں۔ لیکن یہ دونوں مقتدر رسالے اس بات

کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ کہ جب پنجاب نے اردو کو اپنا لیا ہے۔ تو اس قسم کے تصرفات لابُد ہیں۔ اور جوں جوں پنجاب میں اردو ترقی کریگی۔ ایسے تصرفات کی تعداد بجائے کم ہونے کے اور بڑھیگی۔ اس کے ثبوت اور جواز دونوں کے لئے کسی زبان کی تاریخ ارتقا کا مطالعہ کیجیے۔ اس کے بعد اگر آپ ذرا بلند نظری سے کام لیں۔ تو آپ پر روشن ہو جائیگا۔ کہ اگر اردو کو پنجاب میں نشو و نما نصیب ہونی ہے۔ تو ان تصرفات کے بغیر چارہ نہیں۔ بلکہ انہی کی بدولت پنجاب میں اردو کی جڑیں مضبوط ہونگی۔ اور وہ ایک اکتسابی زبان کے درجے سے ایک فطری زبان کے رتبے تک جا پہنچیگی۔ وہ وقت آن پہنچا ہے۔ جبکہ آپ اردو لغت کی کتابوں میں لکھنؤ۔ اور دہلی کے محاوروں کے پہلو بہ پہلو پنجاب کے محاورے بھی شامل کر لیں۔ چہ جائیکہ آپ ان کو اغلاط قرار دیں۔ پنجاب کے تعلیمیافتہ نوجوانوں کی تو اب یہ حالت ہو چلی ہے۔ کہ جہاں کوئی محاورہ باز "مجھے جانا ہے" کہتا ہے۔ پڑھے لکھے لوگ اُسے ملامت کرتے ہیں۔ کہ یہ کیا چیز فناتیوں کی زبان بول رہے ہو۔ اپنا پنجابی ڈھگوں کی طرح باتیں کرو۔ ریختی مت بولو۔ کاروان کی اس اشاعت میں جناب تاثیر کی نظم کا پہلا مصرعہ ہے

تو نے الفت مجھ سے کرنی ہے تو کر میرے لئے

ان سے کہا گیا۔ کہ "تو نے . . . . کرنی ہے" کی بجائے "تجھ کو الفت مجھ سے کرنی ہے" رکھ دیجئے۔ انہوں نے فرمایا۔ ہرگز نہیں۔ "تو نے الفت مجھ سے کرنی ہے" میں ترنم زیادہ ہے۔ میں مصدر کے ساتھ "نے" استعمال کرتا بھی ہوں اور نہیں بھی کرتا۔ مصرعے یا جملے کے ترنم کے مطابق۔ جہاں پنجابی محاورہ مجھے مفید مطلب نظر آتا ہے۔ وہاں میں بحیثیت پنجابی اردو خوان کے اسے استعمال کرنا اپنا حق سمجھتا ہوں۔ یوپی کے حضرات اس حق سے محروم ہیں۔ وہ مجبور ہوں تو ہوں میں مجبور نہیں"۔

"علی گڑھ میگزین" اور "جامعہ" دونوں بہترین ہندوستانی تہذیب کے علمبردار اور آئینہ دار ہیں جس فضا میں یہ رسالے تربیت پاتے ہیں۔ وہ ہندوستان کی بہترین علمی فضا ہے۔ اور ان کے مُدیر و معاون حضرات اہل پنجاب کے نزدیک بوجوہ محبوب و معتقد رہیں۔ ہم میں سے اکثر ایسے ہیں جن کو ان حضرات سے ذاتی تعارف کا فخر حاصل ہے۔ اور خدا گواہ ہے۔ کہ ان کا حسن اخلاق اور ان کی بالغ نظری ہمارے نزدیک مسلم اور ان کی صحبت کی یاد (ہرچند کہ وہ صحبت بہت مختصر تھی) بالیدگیٔ روح کا موجب ہے۔ لیکن جہاں ہماری عقیدت کا یہ عالم ہے۔ وہاں توقعات بھی کچھ کم نہیں۔ ہم یہ توقع رکھتے ہیں۔ کہ یہ دو رسالے ہندوستان بھر میں تنقید کی رہنمائی کرینگے۔ ادب و انشا کے معاملے میں ایسے معیار قائم کرینگے۔ جو کم از کم نصف صدی تک اہل قلم کے لئے مشعل ہدایت کا کام دیں۔ صوبجاتی اور بلدیاتی حدود سے باہر قدم رکھ کر کل ہندوستان میں اردو کے مستقبل پر غور کرینگے اور اپنے رویتے سے ایسے ایسے اصولوں کی نگہبانی کرینگے جن کی تائید ہمیشہ فرہنگ آصفیہ سے نہ ہو سکیگی۔ بلکہ جن کی بدولت خود فرہنگ آصفیہ رفتہ رفتہ بیکار ہو کر رہ جائیگی۔ تاکہ دنیا پر یہ ثابت ہو جائے کہ اردو ایک زندہ زبان ہے جو بڑھ رہی اور پھیل رہی ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں پنجاب اس زبان کو اپنے خون سے سینچنے کے لئے تیار ہے۔ اس لئے ظلم ہے اگر اس سے بار بار یہی کہا جائے۔ کہ تمہارا خون رذیل ہے۔ اور اس کے مقابلے میں بار بار ان مردہ ہڈیوں کو سراہا جائے جو مدت ہوئی بے مغز ہو چکیں۔ ہم آپ سے رہنمائی کی توقع رکھتے ہیں۔ رہزنی کو آپ کی شان کے شایان نہیں سمجھتے۔ ہم یہ توقع رکھتے ہیں۔ کہ آپ ہم نیازمندوں کو شرف باریابی بخش کر ہماری عقیدت اور اپنی دریا دلی سے بزم اردو کی زینت کو بڑھائینگے۔ نہ یہ کہ قلعۂ معلّے کے کھنڈروں پر نت نئے تالے ڈالتے چلے جائینگے۔

"نیازمندان لاہور"

میرزا ویردی

اسلامی کوزہ گری

دیگر فنون اسلامیہ کی طرح اسلامی کوزہ گری کے متعلق بھی ہماری تاریخ خاموش ہے۔ حالانکہ ظروف کی ظاہری شکل و شباہت ان کے مختلف اسماء اور ان کے مختلف استعمالات سے کسی ملک کے تمدن ہی کا پتہ نہیں ملتا۔ بلکہ ان کے باشندوں کی روزانہ زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ فن کوزہ گری کا تعلق "مٹی" یا "گل" یا "خاک" سے ہے اور حقیقت یہ ہے کہ "مٹی" سے دیگر آثار عتیقہ کے انکشاف میں بھی بہت مدد ملتی ہے۔ بہت سی قومیں صفحۂ ہستی سے مٹ چکی ہیں اور ان کے مقبوضات کے نشان تک بھی مٹ چکے ہیں لیکن ماہرین ارضیات نے اپنی دریافتوں سے وقتاً فوقتاً جو اطلاعات بہم پہنچائی ہیں ان سے ان ممالک کی صحیح تاریخ کے بارہ میں وہ مدد ملی ہے۔ جو حیّز کتب سے باہر تھی۔ اور جس کی بدولت ان اقوام کے فنون پر بہت روشنی پڑتی ہے۔ چنانچہ عراق و عجم اور دیگر اسلامی ممالک سے ایسے آثار برآمد ہوئے ہیں جن سے ہمارے علم میں بہت اضافہ ہوا ہے اور بعض تو اس قدر اہم ہیں کہ ان سے اسلامی ثقافت (کلچر) عیاں ہوتی ہے۔ یہ امر ظاہر ہے کہ تہذیب یافتہ اقوام کا کوئی گھر ظروف اور دیگر سامان سے مستغنی نہیں ہوتا۔ ہر قوم کے ہاں ظروف کے اسماء بھی ہوتے ہیں۔ مگر اس بارے میں وہ جامعیت کسی زبان کو حاصل نہیں ہے جو عربی و فارسی کو حاصل ہے۔ ان زبانوں میں برتنوں کے کئی نام ان کے مختلف حالات اور مختلف استعمالات کے مطابق ملینگے اور یہ بات مسلمانوں کی اعلےٰ ثقافت پر دال ہے۔ مثلاً لفظ کاس اس وقت استعمال ہوتا ہے جب پیالہ پینے کی شے یا شراب سے پر ہو ورنہ زجاجہ ہے۔ اسی طرح جب خوان میں کھانا ہو تو 'مائدہ' ہے ورنہ خوان ہے اور کوز (لوٹا) اس وقت ہے جب اس کے ساتھ ٹونٹی (عروہ) ہو ورنہ کوب ہے۔ دیگر زبانوں میں یہ جامعیت نہیں ہے۔

اسلام نے اوّل اوّل مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں پرورش پائی جہاں مسلمانوں کا ابتدائی زمانہ خلفائے راشدین کی حکومت میں گذرا۔ اس وقت اسلام کو صرف اتنی ہی ضرورت تھی کہ اسلام من حیث المذہب اپنی ہستی قائم رکھ سکے۔ لیکن جب خلفائے بنوامیہ و عباسیہ نے عراق و عجم کے مختلف شہروں کو اسلامی "حضارت" سے آراستہ و پیراستہ کیا تو آہستہ آہستہ ترقی تمدن کی وجہ سے ساز و سامان زندگی کے تنوع میں بھی اضافہ ہوگیا اور یہ امر قدرتاً جدید اختراع و ایجاد کا باعث ہوا۔ جہاں جہاں مسلمان آباد ہوئے انہوں نے خالص اسلامی "حضارت" کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ یہ درست ہے کہ ابتدا میں مسلمان مقامی غیر اسلامی طرزِ فن سے بیش و کم متاثر ہوتے رہے ہیں۔ مگر انجام کار انہوں نے ہمیشہ اپنا مخصوص اندازِ فن

اختیار کیا۔

قدیم کوزہ گری کے متعلق عرض ہے کہ یہ زیادہ تر پارتھی اور ساسانی روایات کوزہ گری کا تسلسل تھی مصقول بھی اور غیر مصقول بھی۔ ساسانی فن کے نایاب نمونے امریکہ و یورپ کے عجائب خانوں میں موجود ہیں جو طہران سے دستیاب ہوئے تھے۔ ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ تیسری صدی عیسوی سے متعلق ہیں۔ مصقول ظروف قدیم زمانے میں بھی مصر و عراق میں ملتے تھے کیونکہ جستی آمیزش کے چمکدار رنگ ان ہی ملکوں میں بنائے جاتے تھے۔ رنگوں میں سبز اور نیلا رنگ بہت استعمال ہوتے تھے۔ اور یہ رنگ خصوصیت سے مشرق قریب سے تعلق رکھتے ہیں۔ مسٹر بٹلر کا خیال ہے کہ مصقول برتنوں کی صنعت کی ابتدا روم و مصر نے کی۔ مگر ڈاکٹر سارے (جرمنی) کا نظریہ ہے کہ عراق نے کی۔ ڈاکٹر سارے کا نظریہ زیادہ قابل قبول معلوم ہوتا ہے۔ بعض ظروف پر سنہری رنگ و روغن معہ بیل بوٹوں کے نظر آتا ہے اور بعض تو کامل طور پر سونے کے ملمع سے منقوش ہوتے ہیں۔ یہ ملمع قدرے بعد کی ایجاد ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ سنہری صقل اصلی جست۔ فولاد اور سرمہ کی ملاوٹ سے تیار کیا جاتا تھا۔ عام طور پر سنہری زمین پر سبز یا نیلے رنگ کے بیل بوٹے چڑھائے جاتے تھے۔ ان ظروف کے لئے جو مٹی استعمال کی جاتی تھی بہت باریک اور زردی مائل سرخ رنگ کی ہوتی تھی۔ ان ظروف کے نمونے فسطاط (مصر) ایران اور سامرہ میں بھی ملتے ہیں۔

ان ابتدائی امور کو مدنظر رکھ کر ممالک اسلامیہ میں فن کوزہ گری کے ارتقا کی تاریخی حیثیت بیان کرنا ہمارا مقصود ہے۔

سامرّہ

سامرہ عراق میں بغداد اور تکریت کے مابین فرات کے اوپر کوئی ساٹھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ خلیفہ معتصم نے ۸۳۶ء میں سامرہ کو اپنا پایہ تخت قرار دیا۔ اور یہاں محلات۔ حمام مساجد وغیرہ تعمیر کیں جن کی خوبصورتی اور شان و شوکت کو مدنظر رکھ کر خلیفہ معتصم نے اس کے قدیم نام سامرہ کو "سُرَّ من رای" میں تبدیل کر دیا یعنی "جس نے دیکھا خوش ہوا"۔ یہ مقام آخر کار مسلمانوں کی ثقافت کا بہت بڑا مرکز بنا۔ ان محلات و آثار کے کھنڈر اب تک ملتے ہیں افسوس ہے کہ یہ شان و شوکت بہت تھوڑا عرصہ قائم رہی کیونکہ خلفائے عباسیہ پھر بغداد میں واپس آ گئے۔ سامرہ سے حال ہی میں بہت سے قدیم ظروف برآمد ہوئے ہیں جو فنی اعتبار سے بھی سامرہ کے ساتھ مختص ہیں۔ سامرہ کے قریب میں ان برتنوں کے پکانے کی قدیم بھٹیاں بھی ملی ہیں۔ ان برتنوں کو غور سے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شکل و شباہت پر دھات کے برتنوں کا اثر ہے۔ برٹش میوزیم میں ان کے بہت سے نمونے دیکھنے میں آتے ہیں۔ ان نمونوں سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ مختلف اقسام کے ظروف پر مختلف مصرفوں کے لئے مختلف اقسام کے خاص خاص چمکدار رنگ کئے جاتے تھے۔ لیکن یہاں کے ظروف میں شنگرف کا رنگ جو لعل کی جھلک مارتا ہے عام ہے۔ سنہری۔ بھورا اور ہلکا سبز رنگ بھی نظر آتا ہے۔ بعض اوقات محض ایک ہی رنگ میں تمام برتن مکمل نظر آتا ہے اور بعض اوقات ظروف پر کتبات کوفی رسم الخط میں ملتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ سامرہ کے ظروف پر چینی اثر ہے جو غالباً ان چینی تاجروں کے باعث ہوا جو عراق و عجم میں قدیم زمانہ سے مقیم تھے (یاقوت حموی نے بغداد کے ذکر

میں چینی تاجروں کی آمد اور موجودگی کا ذکر کیا ہے) با ایں ہمہ سامرہ کے ظروف میں امتیازی اسلامی شان تھی - اور ان ظروف کی وجہ سے سامرہ بہت مشہور ہوا - افسوس ہے کہ آخر سامرہ کی شان و شوکت مرور ایام سے جاتی رہی اور لوگوں نے اس کو بجائے "سُرَّ مَن رَاٰیَ" کے "سَاءَ مَن رَاٰیَ" کہنا شروع کیا یعنی جس نے دیکھا غمگین ہوا ٭

برہمناباد

یہ وہی برہمناباد ہے جسے بعض نے بہمناباد لکھا ہے - سندھ کے شمال میں پچاس میل کے فاصلہ پر واقع ہے - اسی مقام کا نام بعد میں مسلمانوں کی آمد سے منصورہ ہوا اور اب اسی مقام کو یا اس کے قریب کسی مقام کو بھکر کہتے ہیں - سندھ سے لے کر گجرات تک کا علاقہ قریباً ہمیشہ ایرانیوں اور عربوں سے آباد رہا کیونکہ یہ وہ مقام ہے جہاں یہ لوگ برّی اور بحری دونوں راستوں سے ہندوستان میں آئے - سندھ کا علاقہ خصوصیت سے ایرانیوں کی منزل گاہ بنا - چنانچہ بہمن بن اردشیر کے نام پر یہ بہمناآباد بھی کہلایا - خلیج فارس کے راستے سے اور وسط ایشیا کے راستے سے عراقی، عجمی تمدن سے بھی متاثر ہوا - موہنجوڈارو (سندھی - میرا مقام) اُسی وادی میں جو انکشافات ہوئے ہیں وہ بھی ثابت کرتے ہیں کہ یہ مقام صدیوں سے آباد تھا - اور برّی اور بحری راستوں سے دوسرے ممالک کے تجار کا بہت بڑا مرجع تھا - میرا خیال ہے کہ بہمناآباد اور موہنجوڈارو دراصل ایک ہی مقام ہے - ایرانیوں اور عربوں نے اسے آباد کیا - لیکن سنہ ۱۰۲۰ء میں ایک بہت ہیبت ناک زلزلہ آیا - اور یہ مقام ویران ہو گیا - صدیوں ویران رہنے کی وجہ سے تہذیب کے آثار بالکل محو ہو گئے - اور کھنڈر ریت اور مٹی میں دب گئے اب یہاں سے بیشمار ظروف برآمد ہوئے ہیں جن کے متعلق یہ رائے ہے کہ زیادہ تر سامرہ اور فسطاط کی طرز کے ہیں اور جن سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ قدیم ہی سے سندھ پر عراقی ثقافت کا اثر تھا - بعض ظروف سرخ - بعض بھورے - بعض سیاہی مائل ہیں - ان برتنوں میں بعض ایسے برتن بھی برآمد ہوئے ہیں جو آجکل کے مصری اور عراقی برتنوں سے مشابہت رکھتے ہیں - مثلاً بعض کوزوں میں پانی وغیرہ انڈیلنے کے لئے ٹونٹی کا ہونا اسلامی اثر کا نتیجہ ہے آج بھی تمام اسلامی دنیا میں ٹونٹی والے لوٹے کا رواج ہے - ہندو لوگ اس کے استعمال سے گریز کرتے ہیں (غالباً اس وجہ سے کہ) ان کو کبھی ٹونٹی دار لوٹے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی - یورپ کے عجائب خانوں میں ایسے بیشمار برتن موجود ہیں - بعض پر کوفی یا دیگر رسم الخط میں کتبات بھی ملتے ہیں - فنی اعتبار سے دیکھیں تو ہم ان برتنوں میں چینی اثر بھی دیکھتے ہیں جو غالباً سمرقند کے راستے سے یہاں پہنچا ہوگا ٭

اگرچہ اس ضمن میں برہمناآباد کے حالات بہت کم ملتے ہیں - تاہم یہ یقینی بات ہے کہ ابتدائے اسلام میں یہ شہر آباد تھا - اس کا ذکر فتوح البلدان میں بھی ملتا ہے - سنہ ۲۷۰ھ میں منصورہ (بہمناآباد) کا بادشاہ عبداللہ تھا جس کے زمانے میں ایک عراقی نے کشمیر کے راجہ مہروگ بن رائق کے حکم سے قرآن کریم کا ترجمہ ہندی زبان میں کیا تھا (عجائب الہند بزرگ بن شہریار صـ۲-۳ پیرس) اس مقام سے اسلامی ثقافت کے اثرات ہند کے دیگر مقامات پر بھی پہنچے یعنی گجرات کاٹھیاواڑ - سورت اور دکن تک گئے ٭

مصر

مصر کے جنوب میں فسطاط واقع ہے جسے عمرو بن العاص رح نے مصر کی فتح کے بعد آباد کیا جو دراصل قدیم مصر کا سب سے زیادہ آباد شہر تھا اور یہیں سے ابتدا میں حضارتِ اسلامی کو فروغ

ہوا۔ ۱۱۶۸ء میں یہاں آگ لگی جس سے قریب قریب تمام شہر تباہ ہوگیا اور از سر نو تعمیر کیا گیا۔ لیکن سلاطین مملوک نے پھر ۱۲۵۲ء میں تاخت و تاراج کیا۔ اس کے باقیات کو قاہرہ کہنا چاہیئے۔ یہاں بہت سے پہاڑ اور ٹیلے ہیں جن میں سے ایسے آثار برآمد ہوئے ہیں جو بہت دلچسپ اطلاعات کے مخزن ہیں ایک برتن پر نصر الشہاب الدین احمد سلطان مملوک ۱۳۴۲ء کا نام ملتا ہے جو برٹش میوزیم میں ہے۔

قبطی لوگ مصر کے قدیم باشندوں کی حیثیت سے ظہور اسلام کے وقت بھی ماہرین فن کوزہ گری تھے۔ افسوس ہے کہ اُس وقت کے کوئی اعلیٰ نمونے نہیں ملتے۔ بہرحال مسلمانوں کے زمانے میں اس فن کو چار چاند لگ گئے جس کا ثبوت اس وقت کے نمونوں سے ملتا ہے۔ مصر میں اس فن کی ترقی عراق و عجم کے کاریگروں کی مرہونِ منت تھی۔ اگرچہ طرز کے اعتبار سے یہاں کے برتن زیادہ تر سامرہ کے برتنوں سے مشابہ ہیں۔ خلفائے فاطمین کے زمانے کے مشہور سیاح ناصر خسرو علوی نے بھی ایسے ظروف کی مثالیں پیش کی ہیں۔ علیؑ بے بہجت نے مصر کے عجائب خانہ کے خزائن سے متعلق ایک گائڈ کے طور پر کتاب لکھی ہے جس میں کم و بیش ہر دور کے ظروف کو بیان کیا ہے۔ اور فاطمین کے دور کے ظروف کو بالخصوص بیان کیا ہے +

برٹش میوزیم لنڈن میں ایک طباق ہے جس پر بنانے والے کا نام تک لکھا ہے اور جس پر نیلے، سبز اور زرد چمک دار رنگوں سے بیل بوٹے بنائے گئے ہیں۔ مصر کے دیگر مقاموں کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ مثلاً قم۔ شیم۔ نیّوم۔ اعظمی وغیرہ کے۔ مصر کے متاخر زمانے کے ظروف سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اثر ہسپانیہ۔ الجیریا اور گرد و نواح کے دیگر اسلامی ممالک کے فن کوزہ گری پر ہوا۔ اور یہی اسلامی اثر ہسپانیہ سے تمام یورپ تک پہنچا۔ یورپ کے ایک مجموعہ میں ایک بہت بڑا کوزہ ہے جس پر صاف لکھا ہے "عمل یوسف دمشقی" اسی طرح ایک اور ظرف پر جو وکٹوریا میوزیم میں ہے لکھا ہے "موید المنصور سلطان مصر" دمشق کی ایک شمع پر لکھا ہے "مصور مصطفیٰ جمادی الاولیٰ سنہ ۹۵۶ھ۔ ان پر بیشتر نیلے رنگ کا روغن ہے۔ یہ چیزیں کافی تعداد میں رقہ۔ دمشق۔ بعلبک وغیرہ سے برآمد ہوئی ہیں۔ بعض برتنوں پر صاف "الشامی" "یمنی" "ہرمزی" "الوروزی" "غزل" "سواز" وغیرہ الفاظ لکھے ملتے ہیں۔ جن کی مختصر تعبیر یہ ہوسکتی ہے کہ یا تو یہ بنانے والوں کے نام ہیں یا یہ ظروف ان شہروں کی طرف منسوب ہیں جہاں یہ کام ہوتا ہے۔ شام، بعلبک، جروشلم، دمشق، رصافہ وغیرہ میں جو اکتشافات ہوئے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان شہروں میں فن کوزہ گری نے ایک خاص طرز اختیار کرلی تھی جس طرز نے ترکی کوزہ گری پر بہت اثر کیا +

ریّ

ری وہ مقام ہے جسے امام المفسرین فخر الدینؒ رازی کا شہر ہونے کا فخر حاصل ہے۔ اس کے قدیم کھنڈر طہران کے قریب ملتے ہیں۔ یہ شہر اسلام کی ابتدائی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتا تھا اسلامی ثقافت کا بہت بڑا مرکز تھا۔ لیکن افسوس کہ سنہ ۱۲۲۰ء کی تاتاری یورش نے ویران کر دیا۔ یہ شہر آج تک محقق مستشرقین کی آماجگاہ ہے۔ یہ لوگ یہاں سے مفید مطلب معلومات حاصل کرکے تاریخی الجھنوں کو سلجھاتے ہیں +

ری کے ظروف کی ساخت سامرہ، سوس وغیرہ کے ظروف کی ساخت سے ملتی ہے لیکن وسط ایشیائی اور فغفوری برتنوں کا اثر بھی ان سے عیاں ہے۔ یہاں کے ظروف دیگر ممالک سے مختلف شکل کے ہیں۔ عام طور پر زیادہ کشادہ ہیں۔ طشتوں

کچھ مینڈے بہت خوبصورت ہیں۔ سنگاروانوں پر کلفیاں ہیں۔ اور ابھرے ہوئے نقش ونگار۔ ان برتنوں کا رنگ نیلگوں سبز ہے۔ یہاں کے برتن اتنی شہرت رکھتے ہیں کہ ہوشیار سوداگر "رے کے برتن" کہ کر تجارت کرتے ہیں۔ اس طرح سے ان کو منافع زیادہ ملتا ہے۔ رے کے کھنڈروں میں سے قدیم بھٹیاں بھی نکل چکی ہیں اخیر زمانے کے ظروف پر مصوری ونقاشی کے وہ نمونے بھی نظر آتے ہیں جو کتابی تصاویر سے بالکل مشابہ ہیں حقیقت یہ ہے کہ انہیں مصورین نے ان ظروف پر مصوری کی ہے جنہوں نے قرطاس کتاب پر تصاویر بنائی ہیں۔ چنانچہ برٹش میوزیم میں ایک طشت ہے جس پر بہرام گور کو مصروف شکار دکھایا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصورین نے اول اس تصویر کو برتنوں پر بنایا اور بعد میں کاغذ پر تصویر کو منتقل کیا۔ غار ہائے اجنٹا کی اول غار میں چھت پر خسرو شیریں کی تصویر ہے۔ وہی تصویر ایک پلیٹ پر بھی نظر آتی ہے جس کے کئی نمونے کلکتہ کے انڈین موزیم میں ہیں۔ بعض برتنوں پر علم ہندسہ کی نہایت عمدہ گرہیں بنی ہوئی ہیں جو مسلمانوں کی فنی خصوصیات کا پتہ دیتی ہیں۔ رنگوں میں سے سفید سرخ۔ زرد اور سبز رنگ عام نظر آتے ہیں۔ ساتویں صدی ہجری کے ایرانی ظروف میں خصوصیت سے اعلیٰ معیار فن نظر آتا ہے کیونکہ ان میں نزاکت حد سے زیادہ ہے۔ ان کی گردنیں گاؤدم ہیں۔ نقاشی کا طریقہ بھی نیا ہے۔ جو اول زمانہ سے مختلف اور چینی ظروف سے مشابہ ہے۔ فریڈرک میوزیم برلن میں چند اسلامی ظروف پر "۶۱۰ھ و ۶۰۲ھ" منقوش ہیں۔ کلیکسن نمونے پر "۸۷۳ھ ۸۷۸ھ ۸۸۵ھ اور ۹۰۰ھ خوبصورت اور پیچدار بیل بوٹوں سے مزین ہیں۔ بہت سے نمونے ایک مقام کبشہ کے ہیں جو کوہ قاف میں ایک پہاڑی مقام ہے مگر بعض ماہرین کی رائے ہے کہ یہ نمونے داغستان کے ہیں اور نویں صدی ہجری کے ظروف کا تسلسل ہیں ✦

رَقّہ

رقہ بھی سامرہ کی طرح اہم ہے یاد رہے کہ اس نام کے چار مقام ملتے ہیں لیکن یہاں اس رقہ سے مراد ہے جو فرات پر حلب کے مشرق میں ایک سو میل کے فاصلہ پر ہے۔ اسے سکندر اعظم نے آباد کیا تھا۔ مسلمانوں نے اس پر ۶۳۳ء میں قبضہ کیا۔ خلیفہ ہارون الرشید نے یہاں اپنے لئے ایک محل بنوایا تھا۔ یاقوت حموی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ محل اس کے زمانے میں نیست و نابود ہو چکا تھا۔ اگرچہ ابو الفدا کے زمانے میں اس کے کھنڈر موجود تھے۔ رقہ سے کئی نمونے برتنوں کے ٹکڑوں کی صورت میں ملے ہیں اور بعض سالم طشت بھی جو یورپ کے مجامیع میں دیکھے جا سکتے ہیں عمیق معائنے کے بعد یہ رائے قائم ہوتی ہے کہ یہ نمونے ۱۳۰۰ء سے قبل کے ہیں ✦

رقہ کے ظروف میں ایک خاص بات یہ ہے کہ ان کی مٹی میں ریت زیادہ ہے۔ اس امر کا فیصلہ مشکل ہے کہ آیا یہ ریت قدرتی طور پر مٹی میں موجود تھی یا کاریگر خود ملاتے تھے۔ ان برتنوں پر ہلکا سا سبز روغن نظر آتا ہے اور چمک معمول سے زیادہ ہے۔ یہاں سے بعض بہت قدیم نمونے بھی برآمد ہو چکے ہیں۔ لیکن اسلامی ظروف کا نشان امتیاز یہ ہے کہ ان پر عموماً طاؤسی نیل کی تہ ہے اور سیاہی مائل روغن ہے۔ برٹش موزیم میں ایک طشت ہے جو کسی زمانہ میں پیٹرا کے گرجا سینٹ سیلیا کی دیوار میں لگا ہوا تھا۔ یہ امر رقہ کی تاریخ ظروف گری [illegible] الجھاتا ہے۔ رقہ اور ملک شام کے ظروف میں فرق کم ہے۔ ان ظروف کا بیشتر مجموعہ دمشق کے عجائب گھر میں ہے۔ یہ ظروف کسی حد تک مقام رسافہ سے بھی تعلق رکھتے ہیں جو دراصل بازنطینی شہر ہے ✦

سمرقند

سمرقند میں آج بھی ساسانیوں کے عہد کے ظروف مل جاتے ہیں۔ ان ظروف کے نمونے زیادہ تر روس میں اور کچھ لنڈن کے وکٹوریہ البرٹ میوزیم میں ہیں۔ ان ظروف میں عموماً سرخ زمین پر سفید یا نسواری خطوط منقوش ہوتے ہیں اور عربی و فارسی کتبات بھی جو بیل بوٹوں اور دیگر نقوش کے ساتھ خوب میل کھاتے ہیں۔ ڈیزائن میں ہم مرکز دوائر کثرت سے نظر آتے ہیں۔ سمرقند کے بعض ظروف برہمنا آباد کے برتنوں سے مشابہ ہیں۔ ہسپانی سفیر کلیویگو جو تیمور کے زمانہ میں سمرقند آیا تھا بیان کرتا ہے کہ تیمور دمشق سے بہت سے کاریگر ریشم کا کام کرنے والے اور بہت سے صنّاع برتن بنانے والے اپنے ہمراہ لایا تھا۔ چنانچہ تیمور کے زمانہ میں ان فنون کو بیشمار فروغ ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے متاخر زمانہ کے برتنوں میں بعض خصوصیات عراقی ظروف کی سی ہیں ؛

سلطان آباد

یہاں اعلیٰ اور مختلف اقسام و طرز کے ظروف بنتے تھے۔ مگر یہ مقام کسی حد تک ایک معمہ ہے کیونکہ ایران میں سلطان آباد بہت سے ہیں۔ یہ سلطان آباد جہاں اس فن نے کمال حاصل کیا قم اور ہمدان کے مابین واقع تھا۔ جغرافیہ اسلام میں سلطان آباد کا وجود سنہ ۱۲۰۰ء سے قبل نہ تھا ؛

برٹش میوزیم میں سلطان آباد کا ایک برتن موجود ہے۔ سلطان آباد کو اسلامی کوزہ گری کے سلسلے میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ تاہم فن کے اعتبار سے سلطان آباد کے ظروف رے اور سامرہ کے ظروف سے مختلف ہیں۔ یہاں صراحیاں اور بڑے طشت بنتے تھے جو آج تک موجود ہیں۔ ان پر جانوروں کی تصاویر بھی ہیں۔ اور آدمیوں کی بھی۔ ان ظروف پر بھی چینی اثر نمایاں ہے۔ کیلکیین مجموعہ میں ایک نمونہ ہے جس پر سنہ ۱۲۷۶ء کی تاریخ ہے۔ دیگر نمونے سنہ ۱۲۲۷ء و سنہ ۱۲۳۷ء کے ہیں۔ سلطان آباد کے ظروف کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ساخت گرد و نواح کے شہروں مثلاً ہمدان قم۔ مشہد۔ کاشان وغیرہ کے ظروف سے بالکل مختلف ہے۔ محققین متفق ہیں کہ ایران کے علم و ادب میں کاشان۔ حمص۔ کوفہ بصرہ بغداد۔ سراف۔ کرمان۔ اصفہان۔ شیراز۔ طوس۔ نیشاپور وغیرہ کی صنعت کوزہ گری کا بہت سا حصہ ہے۔ ہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ سلطان آباد کا بنا ہوا ایک بہت بڑا مٹکا جس پر آدمیوں کی تصاویر ہیں اور جو سنہ ۱۲۸۵ کی ساخت ہے امریکہ کے میٹروپولیٹن موزیم میں ہے ؛

ترکی ظروف

مصقول ظروف مشرق قریب میں ساتویں سے دسویں صدی ہجری تک استعمال ہوتے رہے۔ ترکی صقل کے بہترین نمونے قونیہ کے مدرسے کے دیواری نقوش ہیں۔ آٹھویں صدی ہجری کے نمونے بروسہ اور نصاع میں ملتے ہیں جو زیادہ تر رنگین ہیں اور نیلگوں۔ ہرمزی۔ سفید۔ سیاہ اور زرد رنگ کے امتزاج کا نتیجہ ہیں۔ ان پر خط طغرا میں کتبات بھی ہیں۔ اشکال علم ہندسہ اور دیگر نقش و نگار بھی۔ نقش و نگار رسمی قسم کے ہیں۔ یعنی مناظر قدرت کی نقل نہیں اور یہ امر شبہ پیدا کرتا ہے کہ یہاں کا فن ہرات کی صنعت سے اثر پذیر ہوا۔ قسطنطنیہ کے بعض محلات و عمارات میں اسی قسم کا کام فرشوں پر نظر آتا ہے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ بعض دیواری نقوش ایرانی کاریگروں کے اسماء سے مزین ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایرانی کاریگروں کی محنت کا نتیجہ

ہیں بات یہ ہے کہ سلطان سلیم اول نے ۱۵۱۴ء میں تبریز کو فتح کیا اور کئی صناع اپنے ہمراہ قسطنطنیہ لے گیا۔

دسویں صدی ہجری سے قبل مشرق قریب میں کوزہ گری کا چرچا کم نظر آتا ہے۔ ترکی ظروف میں نقش و نگار پر اور آرائشی طرز کتابت پر زور ہے۔ شمعدان خدا جانے کیوں اتنا مقبول ہے کہ ترکوں کے ہاں بیسیوں انواع کے شمعدان ملتے ہیں۔ شاید شمعدان بنانے میں ترکوں نے خاص مہارت اور شہرت حاصل کر لی تھی۔ ان شمعدانوں پر کئی قسم کے آرائشی خطوط اور کتبات ہیں۔ ایک ترکی شمعدان جو ۹۵۹ھ کی ساخت ہے آجکل برٹش میوزیم میں ہے۔ غالباً مقام تطیعہ میں بنایا گیا تھا۔ ترکی ظروف کی طرز ساخت ایک حد تک ایرانی یا شامی طرز سے مشابہ ہے۔ چینی اثر بھی ہے مگر ان ظروف پر جو بیل بوٹے ہیں خالصاً عربی ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ ترکی کا فن کوزہ گری دمشق کے فن کا مرہون منت ہے۔ ترک دمشق سے بہت سے آثار ۱۵۱۶ء میں فتح قسطنطنیہ کے موقع پر لے گئے تھے۔ اور اگرچہ بروسہ جہاں ترکی علوم و فنون نے بہت ترقی حاصل کی۔ کاریگروں کا شہر تھا۔ تاہم قسطنطنیہ کے دارالخلافہ بننے کے بعد وہ پہلی سی بات نہ رہی۔

مقام نصاع میں بھی ایک بہت بڑا کارخانہ مصقول اینٹوں اور ظروف کا تھا۔ سلطان مراد ثالث نے ۱۵۸۹ء میں اپنے کسی اہلکار کو نصاع میں لکھا "تم جلد کاشانی اینٹیں (LUSTRED TILES) ارسال کرو تاکہ ان کو قسطنطنیہ کے نئے ایوان میں استعمال کیا جائے" مورخ سعدالدین کا بیان ہے کہ "نصاع کی مٹی اس قدر چکنی ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ شاید اس قدر کہ دنیا کافی ہو کہ چین کے اور یہاں کے برتنوں میں فرق کم ہے بلکہ تمیز کرنا دشوار ہے" قسطنطنیہ میں بھی ظروف ساز موجود تھے۔ مورخ چلپی کے بیان کے مطابق ۱۶۹۸ء میں ظروف سازوں کی دکانیں "بیشمار" تھیں۔ احمد خاں (۱۶۰۳-۱۶۱۷ء) کے زمانہ میں کل تین سو تھیں۔ آہستہ آہستہ نیست و نابود ہو گئیں۔ اگرچہ ان کا وجود بارھویں صدی ہجری تک رہا۔ ترکی ظروف ایک لحاظ سے دنیا کے ظروف سے نرالے تھے۔ ان کی لمبی لمبی گردنیں ہوتی تھیں اور سنہری پیٹ اور ان پر حواشی۔ علاوہ ازیں ان میں ایک خاص قسم کی نزاکت بھی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ "کوزہ گری" کی تاریخ میں ان برتنوں سے ایک نئی طرز کا اضافہ ہوا۔ اور ترکی ظروف کو سب سے زیادہ جو بات متمیز کرتی ہے وہ ان کے حواشی ہیں۔ مقام آزنیک کے ظروف جو خالص ترکی الاصل ہیں من حیث الفن الگ طرز رکھتے ہیں۔ ترکی ظروف پر بعض اوقات جہازوں یا کشتیوں کی تصاویر بھی ملتی ہیں جس سے دو نتیجے نکل سکتے ہیں ایک تو یہ کہ ایسے ظروف محض جہازوں میں استعمال کئے جاتے تھے اور دوسرا یہ کہ اس زمانے میں ترکوں کو جہاز رانی کا بہت شوق تھا۔

اندلس

اندلس میں مسلمانوں کی ابتدا اموی خاندان سے ہوئی جو اپنے ہمراہ خالص اسلامی تہذیب کے اثرات لائے۔ اس زمانے کے بعض پرانے ظروف کھردرے اور بھدے سے ملتے ہیں۔ ان ظروف کا گوتھ قوم کے آثار سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ امر متفق علیہ ہے کہ جب مسلمانوں کا اندلس پر غلبہ ہوا تو عمدہ عمدہ ظروف (فنی اعتبار سے) بننے شروع ہوئے۔ اندلسی عربوں نے اس فن کو مصر اور شام کے کاریگروں سے سیکھا تھا۔

معری اندلسی ظروف کا ذکر جابجا کرتا ہے۔ مرسینہ المیریا میں ملاگا کے عمدہ صقل شدہ ظروف کا ذکر ہے۔ ملاگا غرناطہ میں واقع تھا جو اخیر زمانہ تک عربوں کے قبضے میں رہا۔ احمد بن العمرالیمی العمری بیان کرتا ہے کہ یہاں جو ظروف تیار ہوتے تھے ویسے ظروف دنیا بھر میں کہیں نہ تھے۔ ابن بطوطہ و ابن

ببب غرناطہ کے حالات میں لکھتے ہیں کہ قصر غرناطہ میں دو برتن
ہیں جن میں سے ایک کا نام "طشت الحمرا" تھا۔ اس پر
ی کتبات بھی تھے۔ غرناطہ کے ظروف سینٹ پیٹرز برگ۔ پلرمو
متقلیہ) اور سٹاک ہولم میں موجود ہیں۔ یوسف ثالث کے عہد کے
روف بھی عجائب خانوں میں ملتے ہیں محققین کا بیان ہے کہ جب
بیلا اور فرڈیننڈ نے ملاکا پر قبضہ کیا تو یہ فن بالکل مٹ گیا ؎

نتاخر زمانے کے ایرانی ظروف

زمانہ بدل چکا تھا سلسلہ حمل و نقل میں ترقی ہو چکی تھی اور
لوں کی معیشت میں انقلاب ہو چکا تھا۔ متاخر زمانہ میں شاہانِ
ران کا سامان تعیش دیگر ممالک سے آتا تھا۔ چنانچہ یہاں بجائے
ں کے کہ فن کوزہ گری کو فروغ ہوتا کسی حد تک تنزل ہوا۔
ینی ظروف براہ راست چین سے منگائے جاتے تھے۔ اس
ایک وجہ یہ بھی تھی کہ طبائع میں تنوع کا مادہ زیادہ ہو گیا تھا اور
یسے سیاسی اعتبار سے بھی مختلف ممالک کے درمیان تعلقات
ستانہ تھے۔ بہر حال ایران میں بھی نئی طرز کے ظروف اور سازو
امان اختراع کیے گئے۔ اور ان کے نقش و نگار میں بھی جدتیں
یدا کی گئیں۔ سلطان حسین بائقرا کے زمانہ میں نقاش حاجی محمد اسی
ر کے لئے مامور تھا کہ برتنوں وغیرہ پر روغن اور نقش و نگار کیا
رے۔ حاجی محمد میر علی شیر نوائی کے کتب خانہ کا مہتمم بھی تھا حبیب السیر
ں لکھا ہے کہ "در فن تصویر و تذہیب مہارت تمام داشت و چند
اہ ہمت بر پختن چینی فغفوری گماشت بعد از تجربہ بسیار و ارتکاب
شقت بیشمار جسم ظروف و اوانی کہ میساخت با چینی بغایت پیشیہ
لشت اما رنگ و صفائش چنانچہ می باید" مصوری میں اس کے
عکس ایک خالص ایرانی طرز پیدا ہو چکی تھی جو ہر قسم کے بیرونی
ر سے مبرا تھی۔ یہی زمانہ بہزاد کا زمانہ تھا ؎

برٹش میوزیم کے ایک طشت پر لکھا ہے۔ "نقاش کمینہ زاری سنہ ۱۰۲۵
عمل محمود معمار یزدی" اس پر ایسے مناظر کی تصاویر ہیں جن میں
درخت۔ پودے۔ راج ہنس۔ ہرن وغیرہ ہیں۔ ان مناظر سے
چینی اثر کا پتہ چلتا ہے۔ اسی طرح اور کئی نمونے صراحیوں آفتابوں
اور طشتوں کے نظر آتے ہیں جو ظاہر طور پر تو چینی اثر سے بیگانہ ہیں
لیکن اگر انہیں نگاہِ غائر سے دیکھا جائے۔ خاص طور پر بیل بوٹوں
کو۔ تو ان میں چینی رجحانات پائے جاتے ہیں۔ برٹش موزیم میں ایک
سنہری ایرانی طشت ہے جس پر کنول وغیرہ چینی طرز میں منقوش
ہیں۔ اس طشت کے کنارے پر تاریخ سنہ ۱۱۰۹ھ لکھی ہے۔
ایک اور طشت پر "ملکیت احمد عمل محمد علی سنہ ۱۲۳۲ھ لکھا ہے

برٹش میوزیم میں علاوہ ان طشتوں کے بیشمار ٹکڑے ایسے
برتنوں کے بھی ہیں جو بیجا پور سے دستیاب ہوئے۔
اورنگ زیب عالمگیر کے عہد کی ایک تحریر سے بھی
یہ پتہ چلتا ہے کہ بیجا پور میں عمدہ برتن بنتے تھے۔ غرضیکہ بیشتر
ممالک اسلامی میں یہ فن اعلےٰ معیار پر تھا۔ اگرچہ اس کا ذکر
تاریخ میں نہیں ملتا۔ جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ لوگوں کی طبائع ایسے
فنون کے ذکر کی طرف کم راغب تھیں۔ شمالی ہند میں ملتان۔
جالندھر۔ سرہند وغیرہ خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ملتان تو
آج تک مشہور ہے۔ اور یہاں کام بھی خوب ہوتا ہے داغستان
میں جو ظروف بنتے ہیں وہ دیکھنے میں اعلےٰ نہیں مگر نقاشی کے
اعتبار سے بہت عمدہ ہیں۔ ان پر سبز۔ زرد۔ نیلگوں شنگرفی
نارنجی اور جامنی رنگ ہیں۔ زیادہ تر ترکی ظروف سے مشابہ ہیں
ان کے بہترین نمونے لندن کے البرٹ موزیم میں دیکھے جا سکتے
ہیں۔ برٹش میوزیم میں ایک برتن ہے جس پر تاریخ ساخت سنہ ۸۷ھ
مکتوب ہے اور چند ظروف بعد کے بھی ہیں۔ برتنوں کا رنگ
عموماً سیاہ ہے ؎

میرزا ویردی

مجید ملک

نکات

آرٹ کے متعلق چند اشارے

•

۱۔ بت (یعنی آرٹسٹ خاک کو الوہیت بخش دیتا ہے)

۲۔ تصویر (یعنی محض فنی کمال کافی نہیں ہوتا)

۳۔ حسن (یعنی آرٹسٹ کی نگاہ میں حسن کا معیار وہ نہیں جو عوام کی نگاہ میں ہے)

بت

بت شکن نے کہا میں اس مٹی کے بت کو توڑ دونگا۔
پجاری کے دل پر چوٹ لگی۔ اس نے کہا اے بت شکن یہ مٹی کا بت نہیں یہ خدا ہے۔
بت شکن کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا۔ اس نے کہا یہ بت ہے۔ یہ خاک ہے۔ اور میں اسے خاک میں ملا دونگا۔
پجاری نے رو کر کہا میں جانتا ہوں کہ تیری آہنی تلوار کی ایک ضرب سے یہ خاک ہو جائیگا بلکہ خاک سے بھی بدتر لیکن اے بت شکن اس وقت یہ خدا ہے۔
اور جب یہ خاک میں مل کر خاک ہو جائیگا۔ میں اِس خدا کو یاد کرتا رہونگا اور اس کے تصور میں اپنی زندگی گزار دونگا۔
اور میری طرح اور سینکڑوں بھی جنکو قدرت نے چشم بصیرت دی ہے۔
اور ہمارے دل اس کی یاد سے۔ اس کے تصور سے سکون اور اطمینان حاصل کرتے رہینگے۔ ہم نیک کام کرتے رہینگے۔ ہم غریبوں پر رحم کھاتے رہینگے۔ ہم ظالموں سے لڑتے رہینگے۔ ہم مظلوموں کی مدد کرتے رہینگے۔
اور اے بت شکن کیا جو کچھ ہم کرتے ہیں۔ اور جو کچھ ہم کرتے رہینگے برا ہے۔
بت شکن نے کہا تم بے جان پتھر کی پرستش کرتے ہو۔
پجاری نے کہا اے بت شکن ہمارا خدا پتھر نہیں۔ اگر ہمارے دل پر غیظ و غضب قبضہ کرلیں تو یہ ہمیں حلم اور نرمی کی تلقین کرتا ہے۔ اگر حق اور باطل برسرپیکار ہوں تو یہ ہمیں حق کی حمایت پر اکساتا ہے۔ اگر گناہ کی چمک سے ہماری آنکھیں خیرہ ہو جائیں۔ اگر ہوس ہمیں راہ راست سے منحرف کر دے تو یہ ہمیں نجات کا راستہ بتاتا ہے۔ اے بت شکن تو ان آنکھوں کو دیکھ۔ اس پیشانی کو دیکھ۔ ابروؤں کے اس خم کو دیکھ۔ ان ہونٹوں کو دیکھ۔ دیکھ۔ سن اس وقت بھی یہ ہونٹ تجھ سے کچھ کہہ رہے ہیں۔
لیکن بت شکن نے اپنی فولادی تلوار کی ایک ضرب سے بت کو پاش پاش کر دیا۔
پجاری روتا ہوا اٹھا۔ اس نے ریزوں کو اٹھا کے مندر کے صحن سے باہر پھینک دیا اور کہا ہائے وہ محنت خاک میں مل گئی جس نے خاک کو حقیقی خدا بنا دیا تھا۔

تصویر

کہتے ہیں ایک مصور نے ایک عورت کی تصویر کھینچی۔ اور جب وہ تصویر کھینچ چکا تو اس نے اپنے دوستوں کو بلایا اور کہا۔ دیکھو میں نے ایک عورت کی تصویر کھینچی ہے۔

اور جب دوستوں نے تصویر کو دیکھا تو کہا

اس کے بال بادلوں والی رات کی طرح کالے ہیں۔

اور اس کی آنکھوں میں شہاب ثاقب کی چمک ہے۔

اور اس کے ہونٹ شفق کی طرح رنگین ہیں۔

مصور ان کی باتیں سنتا رہا۔ اور اس نے کہا ہاں اس کے بالوں میں رات کی سیاہی ہے۔ اور آنکھوں میں تارے کی چمک اور ہونٹوں میں شفق کی رنگینی۔ لیکن اس میں جان نہیں۔

یہ تصویر ناکام ہے

اور مصور نے ایک اور تصویر کھینچی

اس نے اپنا سینہ چیر کر دل میں سے خون نکالا۔ اور اس خون سے تصویر بنائی۔

اور جب یہ تصویر تیار ہوئی تو اس کے بالوں میں بادلوں والی رات کی سیاہی تھی۔

اور آنکھوں میں شہاب ثاقب کا نور

اور ہونٹوں میں شفق کی سرخی

اور سینے میں عقاب کے پروں کا تناؤ

اور کمر میں چیتے کی کمر کی لچک

اور اعضا میں ہرنی کی سبک اندامی

مصور نے اپنے دوستوں کو بلایا اور کہا اس تصویر کو دیکھو۔

اور دوست آئے اور تصویر کو دیکھتے رہے۔

انھوں نے بالوں اور آنکھوں اور ہونٹوں کے متعلق کچھ نہ کہا۔

لیکن تصویر کے سامنے ان کے سر جھک گئے اور جھکے رہے۔

حسن

حسین عورت نے کہا :۔

اے مصور تو اپنی تصویروں کا ذکر کرتا ہے تو تیری آواز میں لرزش سی پیدا ہو جاتی ہے۔ تو ان کے خد و خال۔ ان کی رنگت اور ان کے تناسب پر کئی کئی پہر غور کرتا رہتا ہے۔ اور میں نے سنا ہے کہ بارہا تو راتوں کی تاریکی میں تصویروں کو یاد کر کے سیماب کی طرح تڑپتا ہے۔

اے مصور کیا تجھے ان تصویروں سے محبت ہے۔ ان تصویروں سے جن میں جان نہیں۔ جو اگر تو ان کو مس کرے تو برف کی طرح سرد اور پتھر کی طرح سخت ہوتی ہیں۔ جو تیری باتوں کا جواب نہیں دے سکتیں۔ جن کی آنکھیں لطف دیدار سے محروم ہیں۔ ہونٹ لطف ملامست سے اور دہن لطف اظہار سے۔ جن میں حرارت نہیں۔ خون نہیں۔ جو تجھ کو چھو بھی نہیں سکتیں۔

اے مصور تو ان تصویروں کی پرستش کرتا ہے۔ لیکن یہ پرستش کے لائق نہیں۔ تو میری پرستش کر۔ میں تیری پرستش کے لائق ہوں۔

مصور نے جواب دیا۔ میری تصویروں میں جان نہیں حسن ہے۔ تجھ میں جان ہے۔ لیکن حسن نہیں اور میں حسن کی پرستش کرتا ہوں۔

حسین عورت نے اپنے سر کو بلند کیا اور کہا۔

اے مصور میرے حسن کی دور دور دھوم ہے۔ اس نواح کے نوجوان میری خاطر سمندر کا سینہ چیر کر موتی لاتے ہیں۔ اور گھنے جنگلوں میں شیروں سے لڑتے ہیں۔ ادھیڑ عمر کے آدمی اپنے خوبصورت ابلق گھوڑوں پر سوار ہو کر مجھے دیکھنے آتے ہیں اور میرے سامنے اپنے کارناموں کی داستانیں دہراتے ہیں۔ بوڑھے میرے پاس پوشیدہ پیغامات بھیجتے ہیں اور میرے قدموں پر سونے اور چاندی کے انبار لگانے کے وعدے کرتے ہیں۔ اے مصور۔ تو کیسے کہتا ہے کہ میں حسین نہیں۔

مصور نے کہا تو حسین نہیں۔ اور وہ جو تیری خاطر سمندروں سے موتی لاتے ہیں اور جنگلوں میں شیروں سے لڑتے ہیں۔ اور وہ جو ابلق گھوڑوں پر سوار ہوتے ہیں اور تجھے اپنی بہادری کی داستانیں سناتے ہیں۔ اور وہ جو تیرے پاس پوشیدہ پیغام بھیجتے ہیں اور تیرے قدموں پر سونے اور چاندی کے انبار لگاتے ہیں۔ وہ تجھ سے۔ تیرے حسن سے محبت نہیں کرتے بلکہ اپنے آپ سے محبت کرتے ہیں۔

وہ اپنی جوانی۔ اور اپنی عنقریب گزر جانے والی جوانی۔ اور اپنی گزری ہوئی جوانی سے محبت کرتے ہیں۔

وہ تیری پرستش نہیں کرتے بلکہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ تو ان کی پرستش کرے۔

اور تو حسین نہیں۔ کیونکہ اگر تو حسین ہوتی تو یہ لوگ اسی طرح تیری پرستش کرتے جس طرح میں تصویروں کی پرستش کرتا ہوں۔

مجید ملک

مولوی عبدالحق

اُردُو

اردو ایک ہندوستانی زبان ہے جو مختلف اسباب و وجوہ کی بنا پر ہندوستان کی مشترکہ زبان کہلانے کی مستحق ہے۔ یہ ایک مخلوط زبان ہے۔ جس کی تعمیر و تشکیل کے واسطے تنہا ہندی، آریائی یا فارسی زبانیں اپنا اپنا دعویٰ پیش نہیں کر سکتیں بلکہ اس کی لغوی اور نحوی نشوونما دونوں زبانوں کے تمدنی اور لسانی ذخیرے سے حاصل کی گئی ہے اور ہندو اور مسلم تہذیبوں کے سنگم کی ایک نہ مٹنے والی یادگار ہے ✦

شمال مغرب سے مسلمان فاتحین کی آمد پر اس کی داغ بیل ہندوستان میں رکھی گئی۔ سلطان محمود غزنوی اور اس کے فرزند مسعود کے عہد حکومت میں تلک ناتھ اور دیگر ہندو دربار غزنین میں ممتاز عہدوں پر فائز تھے۔ محمود کے وقت میں ہندو فوج بھی وہاں رہتی تھی۔ جس کا سپہ سالار سوندرا راؤ تھا۔ غزنوی خاندان کے آخری تاجداروں نے غزنی چھوڑ کر پنجاب میں اقامت اختیار کر لی تھی اور اپنی سلطنت کے اختتام تک وہیں قیام پذیر رہے ان امور کا لازمی نتیجہ ہندو اور مسلمانوں کا باہمی میل جول تھا۔ مسعود کی سلطنت کے کئی عمائدین و رؤسا جنہیں ترکوں کے حملے نے بے خانماں بنا دیا تھا۔ لاہور میں آ کر پناہ گزین ہوئے اس روزمرہ کے ارتباط نے اس زبان پر جو دونوں مختلف اقوام میں قدر مشترک بن گئی تھی گہرا اثر کیا۔ چنانچہ ہم راجہ پرتھوی راج کے درباری شاعر چند بردائی کے شاہکار "پرتھی راج راسو" میں اس بات کے نمایاں اثرات پاتے ہیں۔ وہ خود لکھتا ہے کہ اس نے قرآن کی زبان کا استعمال کیا ہے۔ درحقیقت اس کی کتاب میں فارسی و عربی کے کافی الفاظ نظر آتے ہیں ✦

اردو ترکی زبان کا لفظ ہے اس کے معنی امرا و سلاطین کی فرودگاہ یا پڑاؤ ہیں اور چونکہ ترک، اہل ایران اور ہندوستانی سب اکٹھے شاہی کیمپ میں رہا کرتے تھے اس لئے ان کی مخلوط زبان، زبانِ اہلِ اردو (چھاؤنی کے لوگوں کی زبان) کہلانے لگی۔ کچھ عرصہ کے بعد زبان کا نام ہی "اردو" ہو گیا۔ مسلمان فاتحین کی زبان فارسی تھی۔ جسے شاہی زبان ہونے کا فخر حاصل تھا۔ لیکن عام لوگوں کی زبان ہندی ہی رہی جو پراکرت سے سنسکرت کے ذریعہ بنی تھی۔ عوام کی اس زبان پر فارسی کا عمل دخل ہونے لگا۔ اور اس طرح اردو معرضِ وجود میں آئی۔ سر جارج گریرسن اپنی کتاب "پیمائشِ لسانیِ ہندوستان" میں اردو کو صرف مغربی ہندی کی شاخ بتلاتے ہیں ان کا یہ نظریہ فارسی کے اس نمایاں اثر کو جو اردو زبان پر پڑا ہے نظر انداز کر دیتا ہے۔ اردو نے صرف الفاظ ہی فارسی سے مستعار نہیں لئے بلکہ تمام اقسامِ نظم، عروض، مضامین، اسلوبِ بیان، خیال بندی، تلمیحات، گرامر، خصوصیاتِ بندش وغیرہ سب کچھ فارسی ہی سے مستعار لی ہیں حتیٰ کہ اردو نثر بھی فارسی کے رنگ میں ڈھلی ہوئی ہے اس کو نہ صرف ہندی کی شاخ کہا جا سکتا ہے اور نہ صرف فارسی کی بلکہ مخلوط خصوصیات کی ایک علیحدہ زبان ہے ✦

پہلا فارسی شاعر جس نے ہندی الفاظ کا استعمال کیا

امیر خسرو (۶۵۳ھ - ۷۲۵ھ = ۱۲۵۵ء - ۱۳۲۵ء)
تھا۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے اور مختلف تذکروں میں بھی لکھا ہے کہ امیر خسرو نے اپنا بہت سا کلام ہندی میں رقم کیا لیکن بدقسمتی سے اب وہ مفقود ہے۔ اگرچہ بعض ریختے اب بھی مثال کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں۔ جن میں ایک مصرعہ ہندی کا اور ایک فارسی کا ہے اور کئی منظوم دو سخنے اسی مخلوط زبان میں پائے جاتے ہیں +

امیر خسرو کے کافی عرصہ بعد تک یہی طریقہ رائج رہا کہ ایک مصرعہ فارسی اور ایک ہندی میں لکھا جائے۔ اور اسی وجہ سے اس قسم کی نظم کا نام " ریختہ " قرار پایا۔" ریختن " کثیر المعانی لفظ ہے۔ اس کے ایک معنی ہیں نئی چیز کو موزون کرنا۔ جب امیر خسرو کو ہندی اور فارسی مقفّٰی مصرعے بنانے میں کامیابی حاصل ہوئی تو ریختہ کے معنی موسیقی کی اصطلاح کے لئے جانے لگے۔ اس اصطلاح سے موسیقی میں یہ مقصد قرار پایا کہ جو فارسی خیال ہندوی کے مطابق ہو اور جس میں دونوں زبانوں کے سرود ایک تال اور ایک راگ میں بندھے ہوں۔ اس کو " ریختہ " کہا جائے کچھ عرصہ بعد ریختے نے موسیقی سے نکل کر عمومیت حاصل کر لی اور اس کا اطلاق ایسے کلام منظوم پر ہونے لگا جس میں دو زبانوں کا اتحاد ہو۔ اس سے تھوڑا عرصہ بعد نظم کی ہر صنف اسی نام سے پکاری جانے لگی۔ اور بالآخر زبان کا نام بھی ریختہ پڑ گیا۔ چنانچہ لفظ " ریختہ " اردو زبان کے مختلف النوع ہونے کا مزید ثبوت ہے +

کافی عرصہ تک یہ زبان ہندی یا ہندوی کے نام سے موسوم رہی اس کے بعد ریختہ نام پڑا۔ اور آخر کار اس کا نام اردو ہو گیا اس نام نے غیر معمولی ہر دلعزیزی حاصل کی۔ اور آج تک یہ زبان اسی نام سے پکاری جاتی ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے دنوں میں اردو کو " ہندوستانی " کہا جاتا تھا جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ہندوستان کی دیگر زبانوں میں سے صرف یہی مشترکہ زبان کہلانے کی مستحق ہے +

اگرچہ اردو زبان نے دوابہ گنگ وجمن یا زیادہ صحیح کہا جائے تو دلّی اور اس کے قرب وجوار میں جنم لیا لیکن علمی و ادبی قالب اس نے سرزمین دکن میں اختیار کیا۔ وہ اشخاص جنہوں نے اس کا سب سے پہلے استعمال کیا صوفیائے کرام تھے جو صحیح معنوں میں اس کے مربّی و سرپرست کہلا سکتے ہیں جس طرح گوتم بدھ نے سنسکرت کی بجائے پالی زبان اختیار کی تھی تاکہ وہ اپنا الہامی پیغام عام لوگوں تک پہنچا سکے اسی طرح ان صوفیوں نے بھی یہ محسوس کیا کہ عوام تک رسائی حاصل کرنے کے لئے انہیں کی زبان کو آلہ کار بنایا جائے لہذا انہوں نے فارسی وعربی کو چھوڑ کر اردو زبان اختیار کی۔ جب یہ بزرگ اپنی تعلیم کی اشاعت کے دوران میں دکن کے مختلف حصوں مثلاً دولت آباد، گلبرگہ، احمد آباد، بیجاپور۔ پٹن (گجرات) وغیرہ پہنچے تو انھوں نے مذہبی تلقین کا کام اسی زبان میں شروع کیا جس کو اپنے ساتھ دلی سے لائے تھے۔ چنانچہ ان میں سے بعض نے (مثال کے طور پر سید محمدؒ بندہ نواز جو دکن میں ۱۳۹۸ء = ۸۰۰ھ میں آئے اور جن کا مزار گلبرگہ میں ہے) رسالے، اشعار اور دیگر کتب اسی زبان میں تصنیف کیں۔ ان کے نقش قدم پر چل کر ان کے شاگردوں اور مریدوں نے متعدد کتابیں لکھیں اور اس زبان کو ہر دلعزیز بنانے کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ انھوں نے عربی و فارسی الفاظ کثرت سے استعمال کر کے فارسی رسم الخط کو اختیار کیا۔ اس بات نے اسے ہندی زبان سے علیحدہ کر دیا

بندہ نواز کے علاوہ جن کی کتاب معراج العاشقین شائع ہو چکی ہے دیگر صوفیائے کرام نے بھی اردو زبان کو اپنے خیالات نظم و نثر میں ادا کرنے کے لئے استعمال کیا۔ میران جی المتخلص بہ شمس العشاق (متوفی ۹۰۲ھ) جو بیجاپور کے بزرگان کرام میں سے تھے اور

بندہ نواز کے پیرو تھے۔ ان کا بیٹا اور جانشین شاہ برہان جانم (متوفی ۹۹۰ھ) اور ان کا بیٹا امین الدین علاء (متوفی ۱۰۷۶ھ) دکنی اردو میں بڑے پایہ کے نظم و نثر نگار تھے۔ اسی طرح گجرات میں بھی اس نئی زبان کو قبولیت حاصل کرنے کا فخر صوفیائے کرام کے ذریعہ ہوا۔ جن میں صوفی شاہ علی محمد جیو (متوفی ۹۷۳ھ) سب سے پیش پیش ہیں۔ وہ بڑے پایہ کے شاعر تھے ان کے کلام کا مجموعہ "جواہرالاسرار" کے نام سے موسوم ہے۔ دیگر صوفی شعرا میں سے مصنف مثنوی "خوب ترنگ" (محررہ ۹۸۶ھ = ۱۵۸۷ء) اور امین مصنف "یوسف زلیخا" (تالیف ۱۱۰۹ھ = ۱۶۷۹ء) قابلِ ذکر ہیں۔ یہ سب گجرات کے رہنے والے تھے ۔

دکن میں اردو زبان کے تین بڑے مرکز تھے (۱) گولکنڈہ شاہان قطب شاہی کا دارالخلافہ (۲) بیجاپور شاہان عادل شاہی کا پایۂ تخت (۳) احمد آباد (گجرات) — اور یہ بات خالی از دلچسپی نہیں کہ تینوں جگہ کی مروّجہ زبان میں تھوڑا بہت مقامی فرق ضرور پایا جاتا ہے ۔

قطب شاہی خاندان کے تمام فرمانروا علوم و فنون کے بڑے سرپرست تھے۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ (۸۹۹ھ - ۱۰۹۰ھ = ۱۵۸۰ء — ۱۶۱۱ء) جس کا مجموعۂ کلیات بہت ضخیم ہے بڑا عالی دماغ شاعر تھا۔ اس کے دو جانشین سلطان محمد قطب شاہ (۱۰۲۰ھ — ۱۰۳۵ھ = ۱۶۱۱ء — ۱۶۲۶ء) اور سلطان عبداللہ قطب شاہ (۱۰۳۵ھ — ۱۰۸۳ھ = ۱۶۲۶ء — ۱۶۷۲ء) نیز ابوالحسن تاناشاہ (۱۰۸۳ھ — ۱۱۱۸ھ = ۱۶۷۲ء — ۱۶۸۷ء) اس خاندان کے آخری فرمانروا سب کے سب نہایت بلند پایہ شاعر تھے اور اکثر زبان اردو میں شعر کہا کرتے تھے۔ اس زمانہ کے دیگر قابلِ ذکر شعرا مندرجہ ذیل ہیں :-

۱۔ **وجہی** ۔ اس نے محمد قلی قطب شاہ کی داستانِ عشق اپنی مثنوی موسومہ بہ "قطب و مشتری" میں نظم کی یہ ۱۰۱۸ھ میں لکھی گئی ۔

۲۔ **شہاب الدین قریشی** مصنف "بھوگ بال"

۳۔ **شیخ احمد شریف** مصنف مثنوی "علم الادویہ"

۴۔ **غواصی** مصنف سیف الملوک و بدیع الجمال (۱۰۳۵ھ) و طوطی نامہ (۱۰۴۹ھ) ۔

۵۔ **ابن نشاطی** مصنف پھول بن (۱۰۷۶ھ) ۔

۶۔ **رضی یا قطبی** مترجم تحفۃ النصائح (پند کا تحفہ)

۷۔ طبعی مصنف بہرام و گل اندام

۸۔ والہ مصنف طالب و موہنی

۹۔ مظفر مصنف ظفر نامۂ عشق

(آخری چار شعرا عبداللہ قطب شاہ کے زمانے میں ہوئے ہیں)

۱۰۔ فیض مصنف رضوان شاہ و روح افزا ۔

۱۱۔ شاہی و } یہ دونوں مرثیہ گو تھے
۱۲۔ مرزا

۱۳۔ حیدرآباد کا نوری و دیگر شعرا تاناشاہ کے عہدِ حکومت میں ہوئے ۔

عادل شاہی فرمانروا بھی علوم و فنون کے قدردان و سرپرست تھے۔ محمد عادل شاہ (۱۰۳۵ھ — ۱۰۶۷ھ = ۱۶۲۶ء — ۱۶۵۶ء) کے عہدِ حکومت میں چار بڑے شاعر تھے :-

۱۔ حسن **شوقی** مصنف فتح نامہ نظام شاہ (تالی کوٹا کی لڑائی کا بیان) و میزبانیٔ عادل شاہ ۔

۲۔ **مقیمی** (مرزا مقیم خان) مصنف فتح نامہ بکھیری (جس میں عادل شاہ کی فتح کا ذکر ہے) و عشقیہ نظم مہیار و چندربدن (بدن ؟)

۳۔ **رستمی** (کمال خان) ایک ضخیم مثنوی "خاور نامہ" کا مصنف جس میں خلیفہ چہارم حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی لڑائیوں کا حال

درج ہے (تالیف ۱۰۵۹ھ)
۴۔ **ملک خوشنود** مصنف "جنت سنگار" (بہرام کی کہانی تالیف ۱۰۵۵ھ)۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی (۹۸۸ھ - ۱۰۳۵ھ = ۱۵۸۰ء — ۱۶۲۶ء) جسے فن موسیقی میں ید طولیٰ حاصل تھا اور نورس کا جو ہندی گانوں کی کتاب بھی مصنف ہونے کی وجہ سے "جگت گرو" کہلاتا تھا۔ اس بادشاہ نے دکھنی اردو کو فارسی کے بجائے درباری زبان قرار دیا۔

علی عادل شاہ ثانی (۱۰۶۷ھ - ۱۰۸۳ھ = ۱۶۵۶ء - ۱۶۷۳ء) اردو میں بہت دلچسپی لیتا تھا۔ اس کے عہد سلطنت میں دکھنی اردو نگاروں میں مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں:-

۱۔ **ملا نصرتی**۔ گلشن عشق و علی نامہ کا مشہور و معروف مصنف
۲۔ **ایاغی** (محمد امین) مصنف نجات نامہ (۱۰۷۶ھ) و شمائل نامہ۔
۳۔ **سید بلاقی** مصنف معراج نامہ (۱۰۶۵ھ)

سکندر عادل شاہ کے عہد حکومت میں شعراء ذیل دیکھنے میں آتے ہیں:-

۱۔ **شاہ امین الدین علاء** (جن کا ذکر اوپر آچکا ہے)
۲۔ **عبدالمومن** بیجاپور کا مصنف عشق نامہ (جس میں سید محمد جونپوری بانی فرقہ مہدویہ کا ذکر ہے)۔
۳۔ **ہاشمی** مصنف یوسف زلیخا جو اپنے زمانے کا مشہور ترین اور سب سے بڑا شاعر ہے۔ مادرزاد اندھا تھا اور غالباً اسی نے سب سے پہلے ریختی کی بنیاد رکھی جس کو رنگین کے ہاتھوں فروغ ملا (اس کا ذکر آگے آئیگا)۔

گوگی کا قاضی محمود بحری مصنف "من لگن" (۱۱۱۲ھ = ۱۷۰۰ء) وجدی مصنف "پنچھی باچا" (شیخ عطار کی منطق الطیر کا مترجم) اسی قبیل کے کئی اور شعرا بھی بارھویں صدی ہجری میں ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اورنگ زیب نے دکن فتح کرلیا تھا۔ نثر میں سب سے پہلے جو کتب زبانِ اردو میں لکھی گئیں وہ دکھنی روزمرہ میں تھیں۔ صوفیائے کرام کے اقوال کے علاوہ (جیسے شاہ راجو، سید قتال، سید محمد بندہ نواز، شاہ امین الدین علاء) چند رسالے تصوف پر بھی لکھے گئے۔ جو اب تک موجود ہیں۔ لیکن ادبی لحاظ سے انہیں کوئی اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ اس کے علاوہ ادبیات و دینیات میں دیگر معرکہ الآرا تصانیف ہیں مثلاً "شرح تمہید" جو حیدرآباد کے سید میران (متوفی ۱۰۷۴ھ = ۱۶۶۳ء) نے قاضی عین القضاۃ (متوفی ۵۳۳ھ = ۱۱۳۷ء) کی فارسی کتاب "تمہیدات" سے دکھنی اردو میں ترجمہ کی۔

وجہی جس کا اوپر ذکر آچکا ہے علاوہ شاعر ہونے کے ایک نثر کی کتاب الموسوم بہ "سب رس" یا "حسن و دل" (جس میں عشق و حسن کی معرکہ آرائی درج ہے) کا بھی مصنف ہے۔ اس کتاب کی عبارت ادبی شان رکھتی ہے اس سے پیشتر سب تصانیف مذہبی رنگ یا تصوف میں ہیں۔ اس کا پیرایہ بیان تمثیلی ہے۔ تمام کتاب مقفیٰ عبارت میں ہے اور ۱۰۴۵ھ مطابق ۱۶۳۵ء میں تصنیف کی گئی۔ اس عہد کی نثر کی دوسری کتاب ترجمہ شمائل الاتقیا (۱۰۸۰ھ = ۱۶۷۰ء) ہے جس کا ترجمہ میراں یعقوب نے رکن عماد الدین جو برہان الدین (متوفی ۷۳۲ھ = ۱۳۳۲ء) دولت آباد کے مرید تھے کی فارسی کتاب سے کیا۔ اسی عہد میں اور بھی بہت سی کتب تصنیف ہوئیں۔

اس ابتدائی زبان میں جس طرح کہ فارسی و عربی الفاظ ہندی زبان میں ہندی زبان میں خواہ مخواہ شامل ہوگئے تھے اسی طرح سے مصنفین نے ہندو مسلمان دونوں کے قصص و روایات کو بھی اپنا موضوع بنایا۔ چنانچہ کئی منظوم کہانیاں فارسی سے ترجمہ کی گئیں اور کئی کہانیاں سنسکرت اور ہندی کی مقبول عام لوائتو سے اخذ ہوئیں مثلاً "نل دمن" یا نصرتی کی مشہور و معروف مثنوی

"گلشن عشق" (منوہر اور مالتی کی عشقیہ داستان) یا "کامروپ کلا کی داستان"۔ صوفیائے کرام کی کتب میں تینوں زبانوں فارسی، عربی، ہندی کے الفاظ کثرت سے دیکھنے میں آتے ہیں۔ شعرا نے بھی تینوں زبانوں سے تشبیہات اور استعارے لے کر اپنے کلام میں استعمال کیے ہیں۔

لیکن اردو زبان کی بنیاد صحیح طور پر اس وقت پڑی جب فارسی رسم الخط اور فارسی یا عربی علم عروض اختیار کیے گئے۔ ملک محمد جائسی کی "پدماوت" (۹۴۳ھ = ۱۵۴۰ء) میں اگرچہ عربی اور فارسی کے الفاظ معدودے چند ہیں تاہم رسم الخط فارسی ہی اختیار کیا گیا ہے۔ نیز نظموں کی کثیر تعداد فارسی بحروں میں ہے۔ محمد عباسی نے خالص ہندی کو فارسی رسم الخط میں تحریر کر کے اس وقت کی ہندو مسلم تہذیب کی آمیزش کا ٹھیک ٹھیک نقشہ کھینچا ہے۔ بعد کے مصنفین اس سے بھی دو قدم آگے بڑھے انہوں نے اپنی نظم و نثر میں ہندی، عربی، فارسی ہر سہ السنہ کے الفاظ باہم استعمال کرنے شروع کیے اور اس طرح اس رشتہ کو اور بھی مضبوط کر دیا۔ فارسی عروض اختیار کرنے کی وجہ سے اس نئی زبان کی بنیادیں اور بھی مستحکم ہو گئیں اور اس کا سبب فارسی تہذیب و تمدن کا اثر تھا جو اس وقت سب پر مستولی تھا۔ غیر ملکی عروض اختیار کرنے سے گویا غیر ملکی موسیقی بھی اثر انداز ہونے لگی چنانچہ ان بحور و نغمات کی امداد سے اردو زبان کے خصائص اور اخلاقی طرز کلام میں ایک نئی شان پیدا ہو گئی۔

جدید اردو شاعری کی ابتدا محمد شاہ (۱۱۳۱ھ — ۱۱۶۱ھ = ۱۷۱۹ء — ۱۷۴۸ء) کے عہد حکومت میں ہوئی۔ ولی دکھنی (۱۰۹۹ھ — ۱۱۵۹ھ = ۱۶۸۸ء — ۱۷۴۴ء) نے بھی دلی کے اساتذہ سے بہت کچھ حاصل کیا اور انہیں کے تاثرات سے متاثر ہوا۔ اس کے کلام میں تخیل کی بلندی و شستگی پائی جاتی ہے اور اس کی یہ دلی کوشش ہوتی ہے کہ شستہ الفاظ و محاورات استعمال کیے جائیں اس کے اشعار میں ہندی اور فارسی عنصر بلحاظ لغت و نفس مضمون مساوی تناسب رکھتا ہے اس کا ہمعصر سراج بھی اچھا شاعر ہے اور اس سے زیادہ صاف زبان استعمال کرتا ہے۔

اردو شاعری کا ارتقائی زمانہ میر تقی (۱۱۳۷ھ — ۱۲۲۵ھ = ۱۷۱۳ء — ۱۷۹۴ء) سے شروع ہوتا ہے۔ میر کی شاعری ان کی زندگی کا آئینہ ہے۔ وہ ایک ایسے صالح درویش کے صاحبزادہ تھے جس نے جماعت سے تمام تعلقات منقطع کر کے دنیا سے انزوا اختیار کر لیا تھا۔ لہذا ان کی ابتدائی عمر کا وہ زمانہ جس میں اثر پذیری کی خاصیت بہت زیادہ ہوتی ہے درویشوں کی صحبت میں گزرا۔ گیارہ برس کی عمر میں والد کا انتقال ہو گیا۔ اس پر انھوں نے اپنے وطن آگرہ سے دلی کی جانب ہجرت کی تا کہ کوئی ذریعۂ معاش حاصل کریں۔ اس وقت شاہان مغلیہ کی سلطنت کی بنیادیں متزلزل ہو چکی تھیں۔ مرہٹوں اور جاٹوں کی لوٹ مار اور احمد شاہ درانی کے پے در پے حملوں نے اس کے رہے سہے وقار کو بھی خاک میں ملا دیا تھا۔ ان باتوں سے ان کے آبگینۂ دل پر ٹھیس لگی۔ ان کی شاعری میں قنوطیت و حزن و یاس کا محرک یہی امر ہے۔ ان کے اشعار میں ترنم اور طرز بیان میں دل آویزی، سادگی اور حلاوت پائی جاتی ہے۔ یہ ایسی خوبیاں ہیں جو دیگر شعرا میں بہت کم ملتی ہیں۔ میر کی غزلیات و مثنویات اردو ادب میں بہترین خیال کی جاتی ہیں اور ان کی برتری اردو کے قریباً تمام شعرا نے تسلیم کی ہے۔ وہ خلیق اور خوددار تھے مگر ان کی خودداری و تمکنت بد دماغی کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ وہ بیحد ضابطہ و با اصول زندگی بسر کرتے تھے۔ شاہ عالم (۱۷۵۹ء — ۱۸۰۶ء) کے عہد حکومت میں جب شاعری کا بازار سرد پڑ گیا اور کوئی معاون و سرپرست نہ رہا تو بیشتر شعرا نے لکھنؤ کا رخ کیا جو اس وقت ایک ذی شان سلطنت کا پایۂ تخت تھا

میر بھی نواب آصف الدولہ کے مدعو کرنے پر لکھنؤ چلے گئے اور اپنی وفات ۱۷۹۹ء تک وہیں رہے ۔

سودا (۱۱۲۵ھ — ۱۱۹۵ھ = ۱۷۱۳ء — ۱۷۸۱ء) میر کے ہمعصر شاعر تھے لیکن میر کے مقابلہ میں ان کا رتبہ بہت کم ہے وہ نہایت مغلوب الغضب انسان تھے اور اپنے متعلق کسی قسم کی تنقید برداشت نہ کر سکتے تھے جس سے ذرا ناخوش ہوتے ہجوؤں کا طومار باندھ دیتے۔ لیکن اس کے باوجود وہ ایک اعلیٰ درجہ کے شاعر تھے۔ خواجہ میر درد (۱۱۳۳ھ — ۱۱۹۹ھ = ۱۷۲۱ء — ۱۷۸۴ء) کا شستہ و پاکیزہ کلام اس زمانے کے صوفیانہ خیالات کا آئینہ دار ہے حقیقت شناس میر حسن (متوفی ۱۲۰۱ھ = ۱۷۸۶ء) جو میر درد کے پیرو تھے اپنے اشعار میں اس زمانے کے معاشرتی و اخلاقی حالات کا نقشہ کھینچتے ہیں ان کی شہرہ آفاق مثنوی "سحر البیان" جس میں وہ قدرتی مناظر و انسانی جذبات کی تصویر بطریقِ احسن کھینچتے ہیں سب مثنویوں میں بہترین سمجھی جاتی ہے اور مقبولِ خاص و عام ہے ۔

اب رنگین و انشا (متوفی ۱۲۳۳ھ = ۱۸۱۷ء) کا دور آتا ہے۔ سودا، میر، و میر حسن کی طرح یہ دونوں بزرگ بھی لکھنؤ ہجرت کر گئے تھے جو اس وقت کی شائستگی، عیاشی، عشرتی مجالس اور بیہودگیوں کا مرکز تھا اور یہ خصوصیت اس عہد کی شاعری میں نمایاں ہے۔ رنگین عام طور پر ریختی کے موجد خیال کئے جاتے ہیں ریختی اصنافِ سخن میں سے ایک صنف ہے جس میں ہر بات عورتوں کے متعلق اور عورتوں ہی کی زبان و محاورات میں لکھی جاتی ہے وہ ہندی الفاظ استعمال کرنے کے بیحد شائق ہیں لیکن ان کا معیار بہت پست ہے ان کے اشعار عاشقانہ اور فحش خیالات سے مملو ہیں۔ اس کے خلاف انشا کے کلام میں ہوا پرستی کے بجائے خوش طبعی کا عنصر غالب ہے مگر بدقسمتی سے وہ ایسے زوال کے وقت پیدا ہوئے جب فخر و حریت کے بجائے غلامانہ ذہنیت اور نکبت کا دور دورہ تھا وہ زندگی کو دل لگی سمجھتے ہیں ان کے اشعار میں رنگ آمیزی بہت زیادہ ہے لیکن احساسات و حسیات کا فقدان ہے۔ ساتھ ہی یہ بات بھی نظر انداز نہیں کرنی چاہئے کہ وہ موجد اصطلاحات ہیں اگرچہ ان اصطلاحات نے زبانِ اردو میں رخنہ اندازی بھی کی مگر اپنی جدت اور ندرت کی وجہ سے اپنا جواب آپ ہیں چنانچہ اُن کا علم و ادب پر بُرا اور اچھا دونوں طرح کا اثر ہوا اور ان کی کتاب "دریائے لطافت" اس بات کا بین ثبوت ہے کہ اُنہیں زبان پر پوری پوری قدرت تھی ۔

نظیر (متوفی ۱۸۳۰ء) اردو ادب میں یکہ و واحد حیثیت کا مالک ہے۔ عام طور پر بنظرِ تحقیر دیکھا جاتا ہے اور کئی تذکرہ نگاروں نے اسے شاعر ماننے سے بھی انکار کر دیا ہے۔ لیکن وہ ایک خالص ہندوستانی شاعر ہے۔ اگرچہ سوقیانہ روش اس کے کلام پر حاوی ہے تاہم وہ اپنی قدرتی نقاشی میں بےنظیر ہے اس کی وہ نظمیں بہترین ہیں جن میں وہ اپنے وطن کے راگ الاپتا ہے یا ان عام مضامین پر خامہ فرسائی کرتا ہے جو بوڑھوں، بچوں اور غریب و امیر سب کے لئے یکساں طور پر خوش آیند ہیں ہندوستان کے قدرتی مناظر کی طرح اس کا تخیل بھی بہت سرسبز و شاداب ہے۔ اس کی متعدد نظمیں جانوروں اور پرندوں کے متعلق ہیں (مثلاً ریچھ کا بچہ، گلہری کا بچہ وغیرہ) وہ کنایتہً اس وقت کے معاشرتی رسم و رواج پر تنقیدی نگاہ ڈالتا ہے۔ اس نے اپنی بعض نظموں میں فرحت و انبساط کے ان مناظر کا جو ہندوستانی تہواروں کے موقعوں پر دیکھے جاتے ہیں مرقع کھینچا ہے۔ موسموں کی جو صحیح تصویر اتاری ہے اس کا طرز تحریر اکثر بے ربط ہے اور اشعار نقائص و عیوب سے پُر ہیں۔ نہ ہی اُسے لفظوں کے انتخاب کا صحیح احساس ہے تاہم وہ عوام کا شاعر ہے اور اپنے اور اپنی تیز بیانی کے درمیان کسی چیز کو حائل نہیں دیکھنا چاہتا ۔

ذوقؔ (متوفی ۱۲۷۲ھ = ۱۸۵۵ء) ان ندیم فارسی شعرا کے مقلد ہیں جنہوں نے ادبی لفاظی کو فن لطیف میں تبدیل کر دیا۔ ان کے قصائد جو زیادہ تر مغلیہ خاندان کے آخری تاجدار کی مدح و ثنا میں رقم کئے گئے ہیں اردو ادب میں اعلیٰ درجہ رکھتے ہیں ان کی غزلیں اتنی بلند پایہ نہیں کیونکہ ان کی طبیعت کو تغزل سے زیادہ مناسبت نہ تھی۔

اُس وقت اردو شاعری ایک خاص حالت پر قائم تھی اس دور کی شاعری زیادہ تر تقلیدی، سوقیانہ اور جذبات سے خالی ہے اور شعرا بار بار انہیں مستعمل و فرسودہ خیالات و مضامین کا اعادہ کرتے ہیں جن کو متقدمین ہزارہا بار استعمال کر چکے ہیں حتیٰ کہ الفاظ تک وہی ہیں۔ ایسے وقت میں غالبؔ آسمان ادب پر ایک درخشندہ ستارے کی مانند جلوہ گر ہوتے ہیں۔

غالبؔ (۱۲۱۲ھ – ۱۲۸۶ھ = ۱۷۸۷ء – ۱۸۶۹ء) ایک جنگجو خاندان کے رکن تھے اور ایک ترکوں کا جوشیلا خون جو ان کی رگوں میں موجزن تھا ان کی نظم میں بھی دوڑتا نظر آتا ہے۔ طالب علمی کے زمانے سے شعر و شاعری کی طرف رغبت کی۔ لیکن ان کے کلام کی اصلی خوبیاں اور محاسن غدر ۱۸۵۷ء کے بعد ظاہر ہوئے۔ یہ بغاوت دو متضاد و متباین طاقتوں کے مجادلہ کا مظہر یا نتیجہ تھی اور اُن چیزوں کے لئے تباہ کن ثابت ہوئی جو فنا نہ ہونے والی تھیں۔ غالبؔ مغلیہ سلطنت اور اس کے آئین کی مکمل تباہی سے بیحد متاثر ہوئے اور اسی تاثر نے ان کی شاعری پر دلگدازی اور رقت کا وہ رنگ چڑھا دیا جو اس میں جدت و طلاقت پیدا کرتا ہے۔ دنیا کی دیگر نامی گرامی ہستیوں کی طرح یہ بھی اپنے زمانے سے بہت پہلے عالم وجود میں آگئے اور اسی وجہ سے معاصرین میں ان کی کوئی علمی قدر نہیں ہوئی۔ وہ اردو شاعری کی موجودہ تحریک کے پیشرو تھے۔ اردو ادب کی قلمرو میں ایک مثال بھی ایسی موجود نہیں جو غالبؔ سے بلحاظ جدت، بلحاظ بلندیٔ تخیل گوئے سبقت لے جا سکے۔ غالبؔ سب سے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے فلسفیانہ خیالات کی اردو شاعری میں ترویج کی۔ اسی وجہ سے ان کے اشعار فلسفہ، تصوف اور رقت و اثر کا دلکش اجتماع پیش کرتے ہیں۔ ان کا طرز بیان تزئینی و پرمعنی ہے اور کانوں کو بہت بھلا معلوم ہوتا ہے۔ نقص یہ ہے کہ محاورات زیادہ تر فارسی کے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کے بیشتر اشعار سلیس اور سادہ ہیں۔

فارسی مراثی میں حضرت امام حسینؓ کی شہادت پر سب سے زیادہ مشہور مرثیہ "ہفت بند" محتشم کاشی کا ہے۔ اردو کے مرثیہ گو بھی اسی کو نمونہ بنائے ہوئے تھے۔ لیکن اس صنف میں انیسؔ (۱۸۰۲ء — ۱۸۷۴ء) و دبیرؔ (۱۸۰۳ء — ۱۸۷۵ء) نے بیحد ترقی کی ہے۔ ان کی نظموں کی ادبی فضیلت و مذہبی جوش نے ان کا مرتبہ اردو ادب میں بہت بلند کر دیا ہے۔ انیسؔ لڑائیوں کے مناظر کا نقشہ ایسی وضاحت سے کھینچتے ہیں اور کربلا کے شہدا کا ایسا چربہ اتارتے ہیں کہ تمام واقعات آنکھوں کے سامنے پھر جاتے ہیں۔ اشعار فصیح اور شاندار ہیں اور بعض جگہ اس قدر سادہ ہیں کہ روزمرہ میں استعمال کئے جا سکتے ہیں لیکن حزن و یاس کا پردہ تمام نظموں پر پڑا ہوا ہے۔ بجائے اس کے کہ امامؑ کے بہادرانہ کاموں کو جوشیلے رزمیہ کلام میں بیان کریں انیسؔ و دبیرؔ ان کی تکالیف و مصائب اور ان کی شہادت پر عورتوں کی طرح ماتم کرتے ہیں حضرت امام حسینؓ کے لئے ان مرثیوں میں وہ خاص صفات نہیں بیان ہوئیں جو اُن شہدا میں پائی جاتی ہیں جنہوں نے حق کی خاطر جان دی۔ لیکن ان نقائص کے باوجود انیسؔ کو شاعری کے فن اور زبان پر پوری قدرت حاصل ہے۔

لکھنؤ کے تنزل کا زمانہ اردو ادبیات کی تاریخ میں ایک غیر اہم اور ردِّ عمل کا دور ہے شعرا کے مضامین و اسلوب بیان میں کوئی جدت نہیں پائی جاتی اور ان کے اشعار حشو و زوائد و دور از کار تشبیہات سے پر ہیں۔ آتش اور ناسخ دونوں اپنے فن میں کمال ہیں لیکن وہ اس قابل نہیں کہ اردو کے بڑے شعرائی صف میں انہیں جگہ دی جائے۔ ان کے پیرووں اور شاگردوں کے شاعرانہ کمالات ذو معنی کلام اور صنعت ایہام تک محدود ہیں۔ دیا شنکر نسیم (۱۸۱۱ء — ۱۸۴۳ء) کی مثنوی جو انہیں ایام میں لکھی گئی مستورانہ چابکدستی کا بہترین نمونہ ہے۔ اس کا شمار بہترین نظموں میں کیا جاتا اگر اس میں تشبیہات و پرشکوہ الفاظ کا کثرت سے استعمال عیب کی حد تک نہ پہنچ جاتا۔ شوق کی متعدد مثنویاں لفظی مرقعوں اور اس وقت کی سوسائٹی کے آزادانہ اور بیہودہ رسم و رواج کا نمونہ ہیں اور ان کے لکھنے میں شاعر نے اپنے خیالات واجد علی شاہ لکھنؤ کے آخری فرمانروا کے رنگیلے دربار سے لیئے ہیں لیکن اگر نظر تعمق سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس نے ہزل کو بھی اپنے آرٹ کے ساتھ ملا دیا ہے۔ آخر میں اس کی مثنویوں کے متعلق یہی کہا جاسکتا ہے کہ شاعر نے اپنے فن کو چھچھورپن اور ابتذال پر قربان کر دیا ہے ٭

داغ (۱۸۳۱ء — ۱۹۰۵ء): امیر (۱۸۲۸ء — ۱۹۰۰ء) کے بعد اردو شاعری کی وہ بنیادیں جو میر تقی نے رکھی تھیں جدا جدا ہوگئیں۔ ان دونوں کی شاعری میں نمایاں طور پر انحطاط کے اثرات پائے جاتے ہیں دونوں اسی لکیر کے فقیر ہیں جس میں عموماً بے معنی لیکن بعض وقت خوبصورت ایہامی و تجنیسی الفاظ پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ داغ کو طرز بیان پر پوری قدرت حاصل ہے اور انہوں نے اردو میں روزمرّہ، محاورہ اور دیگر خوش آہنگ الفاظ کو نظم میں کھپا کر اردو زبان میں وسعت پیدا کر دی ہے ٭

تنزل کے اس عہد میں جب شاعری محض تقلیدی رہ گئی تھی، مغرب کا اثر ملک کی ذہنی زندگی میں سرایت کرنے لگا۔ اہل فرنگ نے ہندوستانی دماغوں کے لئے خیالات کی ایک نئی دنیا پیدا کر دی پرانی روایات میں تبدیلی ہوئی۔ موجودہ سائنس نے مادیات (Objective Arts) کے ذریعہ سے باطنی انانیت (Self-egoism) کو جگہ دی۔ عربی، فارسی کے شان و شوکت والے الفاظ اور مقفّے زبان کے بجائے سادہ اور نیچرل طرز بیان اختیار کیا گیا۔ غرضیکہ اردو علم و ادب میں نشاۃ ثانیہ کا دور شروع ہوا ٭

محمد حسین آزاد اس عہد کی خوبیوں کا بے نظیر مجسمہ ہیں وہ پہلے شاعر ہیں جو مغربی علم و ادب کے چشمے سے اچھی طرح سیراب ہوئے مسجّع نثر اور لسانیات (علم السنہ) کے زبردست ماہر تھے لیکن بحیثیت شاعر زیادہ مشہور نہیں۔ حالی پانی پت میں ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے اور ۱۳۳۲ھ مطابق ۱۹۱۴ء میں انتقال کر گئے۔ ان کا بچپن اور جوانی دلّی میں بسر ہوئے جبکہ مغلیہ سلطنت دائمی نیند سو جانے والی تھی اور معاشرتی و سیاسی تغیرات روز کا معمول تھے حالی نے مغلیہ سلطنت کے سورج کو غروب ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ سو ان باتوں نے ان کی حساس طبیعت پر گہرا اثر کیا اگرچہ وہ ادبی لحاظ سے غالب و شیفتہ کے شاگرد تھے لیکن ذہنی طور پر وہ صحیح معنوں میں عرب قبل از اسلام کے نامور شعرا کے پیرو تھے ٭

ان کی ابتدائی نظمیں اسی پرانی تقلید میں تھیں لیکن رفتہ رفتہ زمانے کے انقلاب نے ان پر اپنا اثر ڈالا۔ اور ان کی توجہ نیچر کی طرف مبذول کرائی۔ انہوں نے اپنے اردگرد کی سوسائٹی کا مطالعہ بنظر تعمق شروع کیا۔ علی گڑھ کی تحریک ان کے ناصحانہ انتہا کی محرک ہوئی۔ سرسید احمد خان کی کوششوں سے ہندوستان میں نئی تہذیب کا دور دورہ شروع ہوا اور ہندوستانی مسلمانوں کی

دماغی و معاشرتی زندگی میں ایک نئی لہر دوڑنے لگی۔ حالی موجودہ دور کی اس نئی تحریک کے پہلے شاعر تھے۔ انھوں نے اپنے "مسدس" میں صرف مردہ تاریخ کو ہی از سرِ نو زندہ نہیں کیا بلکہ ہندوستانی مسلمانوں کے قومی جذبات کا بھی پوری طرح خاکہ کھینچا ہے اگرچہ ان کی شاعری میں یاس پسندی کا عنصر غالب ہے لیکن جن کے لئے ان کی جوش بھری تمنائیں بیتاب ہیں اور اس عمارت کو دوبارہ تعمیر کرنے کی آرزو مند ہیں۔ ایک بڑے شاعر ہونے کے علاوہ حالی ہندوستانیوں کے لئے انگریزی ادب کے ترجمان بھی ہیں لیکن وہ صحیح معنوں میں حقیقت شناس ہیں اور مغربی خیالات کی بہتی ہوئی تیز رَو میں ان کے قدم بالکل نہیں ڈگمگاتے۔ حالی سے قبل کا لٹریچر ایک خاص جماعت کے خیالات کا آئینہ دار تھا مگر انھوں نے اس کا دروازہ عوام الناس کے لئے کھول دیا۔ اور اپنے جذبات کا اظہار ایسی زبان میں کیا جو ان کے اس مقصد کی تکمیل کے لئے لازمی اور ضروری تھا۔ اس اقدام سے جیسا کہ عیاں تھا مخالفانہ تنقیدوں کا طوفان امڈ آیا۔ لیکن ضروریاتِ زمانہ نے ان کے مخالفوں کے خلاف انھیں سچا ثابت کر دیا۔ ان کی زبان بے عیب ہے اور وہ ہندی الفاظ کا اپنے اشعار میں نہایت خوبصورتی و صفائی سے استعمال کرتے ہیں +

نئے خیالات کے اس بے پناہ سیلاب کے سامنے جو پرانے رسم و رواج کو بہا کرلے جا رہا تھا۔ اکبر حسین (۱۸۴۶ء – ۱۹۲۱ء) نے اپنی آواز کو مشرقی تہذیب کی حمایت میں بلند کیا۔ یورپ اور اس کی بیہودہ رسوم کے مداحوں کو اپنے طعنوں کا ہدف بنایا۔ یہاں تک کہ علی گڑھ کی موجودہ تحریک بھی ان سے اپنا دامن نہ بچا سکی۔ انھوں نے اسلام اور اسلامی تہذیب کو خطرات سے گھرے ہوئے اور مغربی مادیات کی بے پناہ لہروں میں بہتے ہوئے دیکھا اور اس لئے اپنی شاعری کا نصب العین یہی قرار دیا کہ اپنے ہموطنوں کو اس مصیبت اور آفت سے بچایا جائے۔ ان خیالاتِ نو کو انھوں نے تنقید و تنقیص کے لئے استعمال کیا۔ کیونکہ انھیں ان کوتاہ نظر ہندوستانیوں سے جو یورپ کی کورانہ تقلید کر رہے تھے سخت نفرت تھی۔ ان کا طرزِ بیان شستہ، پاکیزہ، اور زندہ دلی کی تصویر ہے اور انھوں نے اپنی وسیع علمیت کی بنا پر صنائع و بدائع کا التزام بھی کیا ہے۔ لیکن بہ یقین یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ آیندہ نسلوں میں بھی قبولیت حاصل کر سکینگے یا نہیں اگرچہ وہ بلند پایہ شاعر نہیں ہیں تاہم ان کا سرمایہ متقدمین کا شرمندۂ احسان نہیں ہے +

جدید اردو شاعری میں تین شخصیتیں نہایت اہم اور معروف ہیں۔ غالب۔ حالی۔ اقبال۔ غالب کا بلند تخیل اور فلسفیانہ خیالات پرانی شاعری ہی کے تاثرات ہیں۔ لیکن ان کے کلام کی گہرائیوں میں قنوطیت پنہاں ہے۔ حالی سب سے پہلا شخص ہے جس نے قدیم شان و شوکت کے کھنڈروں پر کھڑے ہو کر آنسو بہائے لیکن اب بھی ان کے دل میں اس زبردست خواہش کی آگ بھڑک رہی ہے کہ ان متزلزل عمارات کو پھر نئے سرے سے تعمیری صورت میں لایا جائے۔ اقبال میں نہ غالب کی سی بلند پروازی ہے اور نہ حالی کی سی رقت۔ لیکن ان میں حوصلہ، جوش، اور قوتِ تعمیری بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اگرچہ یہ مغربیت کے شیدائی نہیں لیکن اس کے باوجود انھوں نے مغربی تخیل سے اکتساب کیا ہے اس لئے ان کا شاعرانہ نظریہ اور بھی بلند ہوگیا ہے۔ ابتدا میں ان کی شاعری کا رنگ حب الوطنی پر مبنی تھا۔ لیکن بعد میں ان کے خیالات پر پین اسلامک (PAN - ISLAMIC) رنگ غالب آگیا۔ مسلمانوں کو ان کا پیغام یہ ہے کہ اپنے مذہب پر جم کر اپنے اصولوں کو متحد کریں اور گذشتہ زمانے کے اسلام کے شیدائیوں جیسے خصائص پیدا کریں۔ وہ اس زمانے کا خواب دیکھتے ہیں جب اسلام ایک دن نہ صرف ایشیا، بلکہ تمام دنیا

کے لئے موجب نجات بن جائے۔ اب انہوں نے اپنی تمام دماغی قابلیت اردو ادبیات کے بجائے فارسی ادبیات کی طرف مبذول کرلی ہے کیونکہ ان کے خیال میں ان کی ملکی زبان اردو کی بہ نسبت فارسی زبان ان کا یہ عالم گیر پیام تمام دنیا میں پہنچانے کے لئے زیادہ مفید اور کارآمد ہو سکتی ہے ۔

اردو نثر کی ابتدا کا ذکر اوپر ہو چکا ہے اس زبان کی ابتدائی تصنیف و تالیف بھی دکن ہی سے شروع ہوئی لیکن اس وقت کی مصنفات کا نفس مضمون زیادہ تر مذہب و تصوف ہی تھا اور سوائے "سب رس" (۱۰۴۵ھ = ۱۶۳۵ء) کے جو مسجع و مقفیٰ عبارت میں لکھی ہوئی ہے کوئی بھی ادبی اہمیت نہیں رکھتی۔ شمالی ہندوستان میں غدر کے بعد تک تصنیفات کا سلسلہ فارسی ہی میں رہا اور عموماً خط و کتابت بھی اسی زبان میں کی جاتی تھی۔ دلی کے شاہ رفیع الدینؒ (۱۱۶۳ھ — ۱۲۳۳ھ = ۱۷۵۰ء — ۱۸۱۸ء) و عبدالقادر (۱۱۵۷ھ — ۱۲۳۰ھ = ۱۷۴۸ء — ۱۸۱۵ء) دونوں نے قرآن شریف کا اردو ترجمہ کیا۔ لیکن ان کے تراجم بالکل لفظ بلفظ تھے۔ موجودہ نثر کی بنیاد فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں رکھی گئی جس کا سنگ بنیاد لارڈ ولزلے نے ۱۸۰۰ء میں رکھا تھا۔ جو زبانیں وہاں پڑھائی جاتی تھیں ان میں سے فارسی اور ہندوستانی یا اردو پر زیادہ توجہ دی جاتی تھی۔ ڈاکٹر جان گلکرائسٹ جو کالج کے مہتمم تھے اور اردو زبان میں بڑی دلچسپی لیتے تھے صحیح طور پر اردو کے مربی و سرپرست کہلانے کے مستحق ہیں وہ کئی ہندوستانی کتابوں کے مؤلف بھی تھے۔ اسی زمانے میں میر امن مؤلف "باغ و بہار" یا قصہ "چہار درویش" (۱۸۰۱ء — ۱۸۰۲ء) اور میر شیر علی افسوس مؤلف "آرائش محفل" (۱۸۰۵ء) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مذکورہ بالا دونوں کتابیں زبان و خوبی بیان کے لحاظ سے قابل ستائش ہیں۔ خاص طور پر "باغ و بہار" ادبیاتِ اردو میں ہمیشہ کے لئے موجب فخر و مباہات رہیگی ان تراجم و تالیفات کا جو فورٹ ولیم کالج کے زیر سایہ لکھی جا رہی تھیں ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ کہ اردو کے مصنفین میں سادہ و صاف زبان کے استعمال کا شوق پیدا ہو گیا۔ پرانی مسجع و مقفیٰ عبارتیں اور فارسی و عربی کے ثقیل الفاظ کا رواج کم ہونے لگا۔ لیکن ان میں سے زیادہ کتابیں کہانیوں اور افسانوں کے متعلق تھیں اور یہ کام سرسید احمد خاں (۱۸۱۳ء — ۱۸۹۸ء) کو سرانجام دینا تھا کہ وہ متین اور علمی مضامین فصیح و سادہ زبان میں لکھ کر آیندہ نسلوں کے لئے مشعل راہ بنیں ان کے رسالہ "تہذیب الاخلاق" نے اردو زبان میں انقلاب برپا کر دیا۔

اور یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانے کے مشہور نثار۔ وہی ہیں جو یا تو براہِ راست سرسید احمد خاں کے زیر اثر رہے یا دلی کالج سے متعلق تھے جہاں مضامین اردو زبان میں پڑھائے جاتے تھے اور دیگر زبانوں سے اردو میں تراجم بھی کئے جاتے تھے۔ اس موقعہ پر غالب کے خطوط بھی نظرانداز نہیں کئے جا سکتے۔ جو "اردوئے معلّے" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں ۔

عہدِ حاضر کے مشہور نثار مندرجہ ذیل ہیں :-

محمد حسین آزاد - ان کی تحریر شستہ و پاکیزہ ہے اگرچہ ان کی کتابیں تصنع سے نہیں بچ سکیں لیکن اپنے اندر سادگی و رنگینی کا ایک خاص پہلو لئے ہوئے ہیں ان کی کتاب "آب حیات" جو شعرا کی سوانح عمری ہے اردو ادبیات میں ہمیشہ زندہ رہیگی ۔

خواجہ الطاف حسین حالی - نظم و نثر دونوں میں یکتائے فن تھے ان کا طرز تحریر متین اور زوردار ہونے کے علاوہ فصیح ہے وہ اردو ادبیات میں تنقید اور سوانح نگاری کے موجد ہیں۔ ان کی تصانیف حیاتِ سعدیؒ، یادگارِ غالب اور مقدمہ شعر و شاعری اردو علم و ادب میں شاندار اضافہ ہیں اور ان کی کتاب "حیاتِ جاوید" (سرسید احمد کی سوانح عمری) اردو نثر کی چوٹی کی کتابوں میں ہے ۔

نذیر احمد (۱۸۳۱ء — ۱۹۱۲ء) بڑے عالی پایہ مصنف اور

مقرر تھے۔ انہیں زبان پر حیرت انگیز قدرت حاصل تھی۔ وہ عربی و فارسی محاورات و الفاظ کا استعمال کثرت سے کرتے تھے لیکن باوجود اس کے ان کی زوردار زبان پڑھنے والوں کے دلوں میں تیر و نشتر کا کام کرتی ہے۔ اُن کے ناول مثال کے طور پر مرأۃ العروس' توبۃ النصوح' فسانۂ مبتلا' اردو کے قدردانوں میں ہمیشہ بڑے ذوق و شوق سے پڑھے جائینگے۔ قرآن شریف کا جو ترجمہ انہوں نے اردو زبان میں کیا ہے وہ بلا شک و شبہ دیگر تمام تراجم سے بہتر و برتر ہے +

شبلی (۱۸۵۷ء — ۱۹۱۴ء) علی گڑھ میں پروفیسر تھے۔ تاریخ کا ذوق صحیح معنوں میں انہوں نے ہی اردو دان طبقہ میں پیدا کیا۔ منجملہ بہادران اسلام کے سوانح لکھنے کے انہوں نے کئی کتب مذہب اسلام کے متعلق لکھیں وہ ایک مشہور ادبی نقاد تھے +

ناول نگاری اردو ادبیات میں رتن ناتھ سرشار (۱۸۴۷ء — ۱۹۰۲ء) سے شروع ہوتی ہے اُن کی شہرہ آفاق کتاب "فسانۂ آزاد" اگرچہ صحیح طور پر ناول نہیں کہی جا سکتی لیکن اس میں لکھنؤ کی سوسائٹی کا نقشہ نہایت خوش اسلوبی سے کھینچا گیا ہے +

عبدالحلیم شرر (۱۸۶۰ء — ۱۹۲۶ء) کے ناول زیادہ تر تاریخی ہیں۔ لیکن کردار نگاری کے لحاظ سے کمزور ہیں۔ درحقیقت نذیر احمدؒ کے چند ناولوں کے سوا اردو زبان میں کوئی بھی بلند پایہ ناول نہیں لکھا گیا۔ شرر کے ناولوں نے اگرچہ ادبی ذوق پیدا کر دیا لیکن اس سے زیادہ انھوں نے کوئی خدمت انجام نہیں دی +

ہندوستان میں انگریزوں کی آمد پر ڈراما کو بھی ترقی دینے کا شوق پیدا ہوا۔ اور پہلے پہل پارسی لوگوں نے اسے قبولیت عامہ کا جامہ پہنایا چنانچہ کئی معمولی ڈرامے اور ڈرامہ نویس پیدا ہو گئے۔ لیکن اس وقت تک ایک ڈراما بھی ایسا نہیں لکھا گیا جو خاص طور پر قابل ذکر ہو +

اگرچہ شروع میں انگریزی زبان کے اثر نے ہندوستانی نوجوانوں کو اپنی زبان اردو سے برگشتہ کر دیا جس کا سبب موجودہ طرز تعلیم تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ جب ان کے ادبی ذوق میں پختگی و متانت آ گئی انہوں نے اپنی مادری زبان کی طرف جوش اور سرگرمی سے رجوع کیا۔ اور سائنس و آرٹ پر یورپ کی زبانوں سے تراجم کر کے اپنی زبان میں وسعت پیدا کر دی۔ چنانچہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن و عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن معہ دار الترجمہ اردو زبان کی ترقی کے لئے پیش پیش نظر آتی ہیں۔ غرضیکہ لوگوں میں اپنی زبان کے لئے احساس پیدا ہو گیا ہے اور وہ اس کی ترقی میں کوشاں نظر آتے ہیں اور گذشتہ چند سالوں میں بہت سے رسائل اردو کی ترقی کے لئے جاری ہو گئے ہیں جن میں سے متعدد اس زبان کی خدمت بطریقِ احسن سرانجام دے رہے ہیں +

مترجم: سردار عبدالحمید

بجنوری

صبحِ بنارس

جوگی کی صدا

یہ نتھری نتھری آنکھیں   یہ لمبی لمبی پلکیں
یہ تیکھی تیکھی چتون   یہ سندر سندر درشن

مایہ ہے سب مایہ ہے

یہ گورے گورے گال   یہ کالے کالے بال
یہ پیاری پیاری گردن   یہ ابھرا ابھرا جوبن

مایہ ہے سب مایہ ہے

کل جھوٹا ہے سنسار   اک سچا سرجن ہار

عبدالرحمن بجنوری (مرحوم)

سید محی الدین قادری زورؔ

بدر منیر اور مرزا قتیل

میر حسن (۱۱۴۰ تا ۱۲۰۱ھ) کی مثنوی سحرالبیان (مصنفہ ۱۱۹۹ھ) جو مثنوی "بے نظیر و بدر منیر" کے نام سے مشہور ہے، اردو زبان کی بہترین مثنوی سمجھی جاتی ہے۔ زبان کی لطافتوں اور اسلوب کی حلاوتوں کے علاوہ موضوع کی دلکشی اور رجال قصہ کے گوناگوں کردار اس کو اردو کا ایک واقعی بے نظیر شہ کار ثابت کرتے ہیں۔

اس مثنوی کو جو غیر معمولی وقعت اور مقبولیت حاصل ہوئی اس کا اندازہ صرف اس امر سے ہو سکتا ہے کہ اس کے مصنف کے دوسرے کارناموں کو گہن لگ گیا، اور بہت کم لوگ واقف ہیں کہ میر حسن اپنے عصر کے بہترین قصیدہ گو تھے، اور مرزا رفیع کے انتقال کے بعد لکھنؤ میں ان کی ٹکر کا کوئی شاعر موجود نہ تھا۔ انہوں نے نہ صرف اعلیٰ پائے کے قصیدے لکھے، بلکہ سحرالبیان کے علاوہ آٹھ اور مثنویاں بھی لکھیں، مگر ان سبھوں کو "بے نظیر و بدر منیر" کی تابناکیوں نے ماند کر دیا۔ انہوں نے غزلوں کا ایک دیوان بھی مرتب کیا تھا جس میں چار ہزار سے زیادہ شعر موجود ہیں، اور جو اپنی بعض خصوصیتوں ہیں۔ خاص کر ادا بندی کے لحاظ سے نہایت دلچسپ ہے۔ ان کے علاوہ بیس ترکیب بند اور ڈیڑھ سو رباعیاں لکھیں جو اپنے موضوعوں اور شکلوں کی گوناگونی کے باعث قابل ذکر ہیں[1]۔

لیکن میر حسن کا یہ تمام کلام اب تک غیر مطبوعہ ہے۔ اس کے مخطوطے بھی نہایت کم یاب ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہماری گذشتہ نسلیں اور خود میر حسن کے معاصرین بھی "سحرالبیان" کی سحر طرازیوں میں اس قدر محو ہو گئے کہ ان کے دوسرے کلام کے مطالعہ کا خیال بھی نہیں کیا۔

میر حسن نے جس زمانے میں یہ مثنوی لکھی وہ لکھنؤ کا عہد زریں تھا، اور اطراف ہندوستان کے اکثر صاحبان فضل و کمال وہاں موجود تھے۔ شعر و شاعری کا ذوق رکھنے والوں میں سوداؔ، میرؔ، سوزؔ، قتیلؔ، فغاںؔ، مصحفیؔ، انشاؔ، جرأتؔ اور رنگینؔ وہ ارباب کمال تھے جنہوں نے لکھنؤ میں اردو ادب اور شعر و شاعری کو معراج کمال تک پہنچا دیا۔ ہمارے قیام یورپ کے زمانہ میں اردو زبان اور ادب کے ارتقائی مدارج اور تحریکات پر تحقیق و تفتیش کے سلسلہ میں برٹش میوزیم میں ایک ایسی قلمی کتاب ہماری نظر سے گذری جس میں اس عہد کی علمی و ادبی مشغولیتیں بھی ضمناً قلمبند کر دی گئی ہیں، اور چونکہ ضمناً ہیں اسی لئے بہت دلچسپ ہیں، اور ان کی صداقت اور غیر جانبداری پر کم شبہ ہو سکتا ہے۔

---

[1] یہ تفصیل برٹش میوزیم کے "کلیات میر حسن" کے مخطوطہ کے مطالعہ سے حاصل کی گئی ہے۔

اس مخطوطہ کا نام "تنبیہ الجاہلین" ہے، جس کو سداسکھ نیاز دہلوی نے ۱۲۳۴ھ میں تکمیل کو پہنچایا۔ وہ غالباً ۱۱۵۹ھ میں پیدا ہوئے مرزا نجف خاں کے زمانے میں آگرہ کے قریب پرگنہ باڑی کے سررشتہ دار تھے۔ اختتام ملازمت پر آگرہ میں چند روز قیام کیا اور پھر دہلی چلے گئے۔ چونکہ سیر و سیاحت کا شوق تھا ۶۵ برس کی عمر میں الٰہ آباد کے ارادے سے دہلی سے نکلے۔ لکھنؤ میں بھی کئی سال تک قیام رہا۔ چنانچہ اس قیام کے تاثرات میں یہ کتاب "تنبیہ الجاہلین" لکھی گئی۔ اس وقت ان کی عمر قریب ۷۵ سال کی تھی اور پانچ سال سے وہ اس کی ترتیب میں مصروف تھے۔

اس کتاب کے علاوہ سداسکھ دہلوی نے ایک اور کتاب "منتخب التواریخ" بھی مرتب کی تھی جس میں غزنویوں کے عہد سے اکبر ثانی تک کے تاریخی حالات درج تھے۔ سرہنری ایلیٹ نے ان کی اولاد سے الٰہ آباد میں یہ کتاب حاصل کی تھی چنانچہ اس کے متعلق اپنی "تاریخ ہند" کی آٹھویں جلد میں چھ صفحات وقف کئے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سداسکھ کا اصل منشا یہ تھا کہ بہادرشاہ اول سے اپنے زمانے تک کے حالات تفصیل سے لکھیں چنانچہ اس میں عہد شاہ عالم کی نسبت خاص کر اہم مواد درج تھا۔

سرہنری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سداسکھ آخر عمر میں انگریزی حکومت کے تحت چنار میں ملازم بھی تھے۔ انہوں نے دس سال کے عرصہ میں قریب ایک سو پچیس ہزار (۱۲۵۰۰۰) اردو فارسی اور بھاکا شعر لکھے اور پانچ ہزار صفحات کی نثر بھی لکھی۔ چنانچہ ان کاموں کے بعد "منتخب التواریخ" شروع کی تھی جس کی تکمیل کے بعد انہوں نے الٰہ آباد ہی میں وفات پائی۔ ان کا خاندان وہیں سکونت پذیر ہو گیا۔

"تنبیہ الجاہلین" کو سداسکھ دہلوی نے آٹھ مقالوں میں تقسیم کیا ہے جن کی تفصیل دلچسپی سے خالی نہیں:۔

مقالہ اول میں ہندوستان کے مختلف مذاہب کا ذکر

مقالہ دوم میں شرح اقوام براہمنہ و راجپوتیہ وغیرہ

مقالہ سوم میں دوازدہ سالہ قحط، طہارت اور دیوکرم وغیرہ

مقالہ چہارم میں تنبیہ فرقہ وغیرہ

مقالہ پنجم میں ذکر روایاتِ غریب دیدہ و شنیدہ

مقالہ ششم میں درسخن ہائے عجیب و حالاتِ حیوانات بری و بحری

مقالہ ہفتم میں احوال زمان ماضی

مقالہ ہشتم میں در بعضے علوم کہ فارسیاں ازاں اطلاع ندارند

اس کتاب کا تحقیقی مطالعہ اس عہد کے ہندو رسم و رواج اور عام تمدن سے متعلق متعدد حالات پر روشنی ڈال سکتا ہے۔ ہر مقالہ معلومات سے پر ہے۔ افسوس ہے کہ نقل کرنے والے کا خط خراب ہے، اور الفاظ غلط ملط کر دئے ہیں۔ اکثر مقالوں میں مصنف کی ذہنی ترتیب نہایت علمی تھی، لیکن کاتب نے بہت سے حصے چھوڑ دئے ہیں اور جا بجا ذیلی عنوانات کے تحت لکھا ہے کہ "تشریح آں نگاشتن ضرور نیست"۔ مقالہ ہفتم پورا چھوڑ دیا گیا ہے۔ مقالہ ہشتم کا بھی ابتدائی تہائی حصہ غائب ہے۔ البتہ اس کا آخری حصہ موجود ہے جس میں اردو شاعروں کے متعلق بھی نہایت اہم معلومات درج ہیں۔

سداسکھ دہلوی نے دہلی اور لکھنؤ دونوں جگہوں کے اردو اور فارسی شاعروں سے ملاقاتیں کی تھیں، اور ان سے فیض صحبت حاصل کیا تھا،

جس کا ذکر جا بجا موجود ہے۔ شیخ علیؒ حزیںؔ، مرزا مظہرؔ، محمدؐ فاخر مکینؔ، خواجہ میر دردؔ اور اشرف علیؒ خاں فغاںؔ سے ملاقات تھی، اور ان کی ملاقاتوں کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ مرزا قتیلؔ اور مرزا سوداؔ سے گہری دوستی تھی۔ راجہ ٹکیت رائے، جھاؤلال اور حسن رضا خاں کے یہاں بھی رسائی تھی۔

لکھنؤ کے شاعروں کے سلسلے میں ان کے قلم سے ایک ایسی اہم بات نکل گئی ہے جس کے اظہار کے لئے یہ مضمون قلمبند کیا گیا ہے میر حسن کا ذکر کرکے سدا سکھ نے لکھا ہے:۔

"میر حسن در تمام عمر خود در مثنوی کہ زیادہ از دو ہزار پانصد بیت نخواہد بود صرف کرد۔ مرزا قتیل بسیار اصلاح دادہ اند"۔

اردو زبان کے ایک بہترین شہ کار کی تصنیف کے متعلق یہ واقعہ آج تک ایک راز سربستہ رہا ہے، اور اردو ادب کا تاریخی یا تنقیدی مطالعہ کرنے والے اس کو یقیناً حیرت اور دلچسپی سے پڑھینگے۔

مرزا قتیلؔ اصل میں فارسی شاعری کے ماہر اور استاد تھے اور حیات مرزا غالب کا مطالعہ کرنے والے واقف ہیں کہ مرزا ان کی فارسی دانی پر اعتراض کرکے اپنے ہمعصروں کے کیسے نشانۂ ملامت بن گئے، اور آخر عمر تک مخالفتوں اور پریشانیوں میں گھرے رہے۔ لیکن قتیل کا اردو ذوق اور خدمات بھی اس قدر اعلےٰ پائے کی تھیں کہ ادب اردو کی کوئی تاریخ ان کے ذکر سے خالی نہیں رہ سکتی۔

اردو زبان کی ساخت اور قواعد وضوابط کی نسبت جب پہلی دفعہ قلم اٹھایا جاتا ہے تو قتیل ہی کی مدد اور مشورے کے ساتھ۔ چنانچہ انشاءاللہ خاں کی "دریائے لطافت" تمتہ سے عنوان تک انہی کی مرہون منت ہے چنانچہ انشاؔ اس کتاب کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:۔

"این ہمہ فرصت بدست نیامد کہ تنہا رنگ بر چہرۂ این نقش بدیع کنم۔ میرزا محمدؐ حسن قتیل را نیز کہ لاو کہوکا او بے تامل رد کردۂ من و پسندیدۂ او پسندیدۂ این کمترین بیان است، و از صغر سن میانۂ من داد در ہر چیز حصۂ برادرانہ قرار پذیرفتہ شریک این دولت ابد مدت ساختم و باہم چنین مقرر شد کہ خطبہ کتاب و لغت و محاورۂ اردو ہر چہ صحت و سقم آن باشد، و مصطلحات شاہجہان آباد، و علم و صرف و نحو این زبان راقم مذنب یعنی کمترین بندۂ درگاہ آسمان جاہ انشاؔ نویسد، و منطق و عروض و قافیہ و بیان و بدیع را رو بقلم درآورد۔ و چون بندہ را بیشتر با نظم سروکار ماند، و او را با نظم و نثر ہر دو، چند سطرے کہ مینویسیم نگاہ داشتن آن نیز موقوف بر پسند اوست . . . .

و در تسمیہ کتاب ہم کہ صاحب چار نام پاکیزہ است، مشارک یکدگریم دو نام از زبان راقم چکیدہ۔ یکے ارشاد ناظمی . . . . . و دیگر بحر السعادت و دو نام دیگر دو گوہر است کہ از نیسان زبانش بارید یکے دریائے لطافت و دیگر حقیقت اردو"۔

ظاہر ہے کہ جو شخص انشاؔ جیسے بلند پایہ ادیب و شاعر کا ممدوح اور بچپن سے حریف و جلیس اور معین و مددگار رہا ہو، اس کا ادبی ذوق کس پائے کا ہوگا۔ یہ بھی مرزا قتیل کی سلامتئ ذوق کی دلیل ہے کہ انہی کا رکھا ہوا نام "دریائے لطافت" چل پڑا اور انشاؔ کے نام رکھے۔

اس موقعہ پر مرزا قتیل کی استادی اور طرز اصلاح کی نسبت سدا سکھ دہلوی کا بیان بھی نقل کردینا ضروری ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"دریں ولا مرزا قتیل خان بسیار منعم آمد۔ خود بے نظیر و بے بدیل، و لطف دیگر این است کہ ہر کسے کہ سخن خود بحضور ایشان می خواند غائبانہ حاضرانہ تعریف او می کنند۔ کمال خاطرداری می نمایند۔ بہ لطافت می فرمایند کہ اگر بجائے این فلاں حرف می بود بدانست خود بہتر بود۔ اصلاح سخن باین خوبی می دہند"۔

قتیل کی نسبت میر حسن اور انشاؔ ہی کے ایک اور بڑے ہمعصر مصحفی اپنے اردو اور فارسی شاعروں کے تذکروں میں خاص طور پر رطب اللسان

ہیں۔ ان کا "تذکرہ شعرائے فارسی" اصل میں قتیل ہی کے مواد اور کاوشوں پر مبنی ہے جیساکہ انہوں نے دیباچہ میں لکھا ہے :۔

"مرزا محمد حسن قتیل تخلص کہ مفصل احوال ایشاں درحروف اتصاف سمت تحریر خواہد پذیرفت، درایامیکہ مجلس مشاعرہ بہ عنبر خانہ زینتِ انعقاد داشت از سیاحت لشکر نواب ذوالفقار الدولہ بہادر بشاہجہان آباد گذر افگندہ زمزمۂ غزل فارسی بگوش ایں مزاج دان سخن رسانیدہ باعث شعر فارسی خواندن در مجلس ریختہ گویاں گردید. . . . . اکثر دراں روزہا باہم ہمطرح بودیم و از یکدگر گوئے سبقت می ربودیم وچوں مرزائے مذبور خیلی سیاحت کردہ در مجلس وضیع وشریف رسیدہ، نظم و نثر از اشعار و احوال معاصرین جستہ جستہ بر بیاض خاطر خود منقوش داشت۔ روزے آں ہمہ رطب ویابس را بنظر قبول من زیبا نمود۔ فسون تالیف تذکرۂ معاصرین بگوشم دمیدہ آسامی چند از آنہا بقلم تحریر من در آورد۔ ومسودۂ احوال بعضے را بر بیاض مختصرے بدست من نویسانیدہ۔"

غرض قتیل کی نسبت ان کے معاصرین کی تحریروں سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک شریف اور با اخلاص اہل علم اور ادیب تھے۔ اور ہر ایک کی خاموش مدد کیا کرتے تھے۔ بہت ممکن ہے کہ میر حسن کی مثنوی نگاری میں بھی مدد کی ہو اور "سحرالبیان" میں اصلاحیں دی ہوں جن کا ذکر انشار اور مصحفی کی طرح میر حسن نے اپنی کتاب میں نہیں کیا۔ اور یہ بھی ضروری نہ تھا کیونکہ نظم میں نثر کی کتابوں کی طرح دیباچہ یا مقدمہ وغیرہ میں اس قسم کے امور کے ذکر کا عام طور پر رواج نہ تھا۔ البتہ کتاب کے آخر میں انہوں نے مرزا قتیل کی تعریف کی ہے، اور یہ ضرور لکھا ہے کہ انہوں نے ان سے مثنوی سنی اور اس کی تاریخ لکھی - میر حسن لکھتے ہیں :-

میرے ایک مشفق ہیں مرزا قتیل — جو ہیں شاہراہِ سخن کی دلیل
سنی مثنوی جب یہ مجھ سے تمام — دیا اس کی تاریخ کو انتظام
زبس شعر کہتے ہیں وہ فارسی — ہر اک شعر ان کا ہے جوں آرسی
انہوں نے شتابی اٹھا کر قلم — یہ تاریخ کی فارسی میں رقم
"بتفتیش تاریخِ ایں مثنوی — کہ گفتش حسن شاعرِ دھلوی
زدم غوطہ در بحرِ فکرِ رسا — کہ آرم بکف گوہرِ مدعا
بگوشم ز ہاتف رسید ایں ندا — برایں مثنوی باد ہر دل فدا"

کیا تعجب ہے کہ سدا سکھ نیاز دہلوی کا مندرجہ بالا بیان کہ مرزا قتیل نے میر حسن کی مثنوی میں بہت اصلاح دی ہے، میر حسن کے مصرع "کہ ہے شاہراہِ سخن کی دلیل" کی تفسیر ہو !!

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

ناگا میاںؒ

گاڑی بان

جب گاڑی بان لایا گیا تماشائیوں نے ایک ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔ مختلف قسم کی آوازوں کے درمیان کبھی کبھی ایک ایسی آواز سنائی دے جاتی تھی جیسے کوئی چیخ رہا ہو۔

گاڑی بان تفکرات میں کھویا ہوا نظر آتا تھا۔ اس کے قدم بھاری بھاری معلوم دیتے تھے۔ یہ مختصر سا راستہ اس کے لئے ایک دشوار گزار منزل سے کم نہ تھا۔

وہ حاکم عدالت کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا گیا۔ اس کا رنگ زرد تھا۔ لوگوں کی آنکھیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ سب کو دیکھ رہا تھا۔ لیکن کسی کو پہچان نہ سکتا تھا۔ آخر ایک قانون دان نے اس کی طرف سے ایک درخواست پڑھی جس میں اس کے بچوں اور بیوی کی طرف سے آنسو بہائے گئے تھے۔

عدالت نے پوچھا: "کیا تم مجرم ہو"؟

قیدی نے نگاہ اٹھا کر سامنے کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں امید کی دھیمی دھیمی روشنی جھلک رہی تھی۔ اس نے جرأت سے کہا۔

"جی نہیں۔ میں مجرم نہیں۔ میں ایک سیدھا سادا گاڑی بان ہوں۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کا باپ اور ایک ذمہ دار انسان۔ قدرت کی جانب سے مجھ پر بہت سے فرائض عائد ہیں۔"

پھر اس نے اپنے ہم پیشہ لوگوں کو دیکھا جو ہمدردی سے اس کے جوابات پر کان لگائے ہوئے تھے۔ اس نے ان کے چہروں سے استقلال حاصل کرتے ہوئے کہا:۔

"میں ایک گاڑی بان ہوں۔ گاڑی بانی میرا آبائی پیشہ ہے۔ میرا باپ بھی گاڑی بان تھا۔ بڑا دیانتدار۔ ابھی تک عزت سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس نے اپنی زندگی میں نہ سزا پائی نہ کبھی جرم کیا۔ لوگ کہتے ہیں وہ ایک صحیح قسم کا گاڑی بان صرف گاڑی بان تھا۔"

— "جی ہاں گھوڑا گاڑی میرا ہے لیکن میرے سر پر کچھ قرضہ بھی ہے۔ کچھ دن ہوئے میں نے اپنی لڑکی کی شادی کی ہے۔"

— "میرا داماد؟ وہ ایک بڑھئی کا لڑکا ہے۔ خود بھی بڑھئی کا کام کرتا ہے۔ میں مطمئن ہوں۔ وہ بڑا خلیق ہے۔ چھوٹے بڑے سب کی عزت کرتا ہے۔"

—"جی ہاں جو کچھ بیان کرونگا حلفیہ بیان کرونگا۔"

—"میں اس پیشہ کو پسند کرتا ہوں یا نہیں یہ میری موجودہ حالت سے پوچھئے۔"

—"جی نہیں میری زندگی میں یہ پہلا موقع ہے کہ میں یہاں اس رسوائی سے لایا گیا ہوں۔"

—"یہ غلط ہے کہ میں سزا یافتہ ہوں نہ میرا باپ سزا یافتہ تھا۔ نہ میں کبھی گواہی دینے یہاں آیا ہوں۔"

—"نشہ؟ جی نہیں۔ ہاں جوا ضرور کھیلتا ہوں لیکن وہ بھی سال میں ایک بار۔ اس کا نتیجہ اچھا ہو یا برا یہ میں ہمیشہ قسمت پر چھوڑ دیتا ہوں۔"

—"قول و فعل کا پابند ہوں۔ جو کچھ کہوں اس پر پورا اترنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

"یہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ جو کچھ بیان کرونگا حرف بحرف درست ہوگا۔"

"شام ہو چکی تھی میں روزی کی فکر میں کھڑا آنے جانے والوں کا منہ تک رہا تھا۔ میرے ہاں اولاد کی کثرت ہے۔ میں روزی کمانے میں کچھ غیر معمولی طور پر لالچی واقع ہوا ہوں۔ جب اڈے میں کھڑا ہوتا ہوں۔ یہی خیال کرتا ہوں کہ جو آتا ہے مجھے ڈھونڈتا آتا ہے۔"

"تاریکی پھیل رہی تھی۔ میں نے اپنے پیچھے ایک آواز سنی۔ آواز میں ایک وقار سا تھا۔ میں نے بے چینی سے پلٹ کر دیکھا۔ مجھے یقین تھا کہ میری روزی کھچی آرہی ہے۔ سردی کی شدت سے فضا میں دھند اور غبار تھا۔ سواری سر سے پاؤں تک ایک بڑا لبادہ اوڑھے میرے پیچھے کھڑی تھی۔ میں نے پوچھا۔ 'آپ کہاں جائینگے'؟

—"جوار کے قریب۔"

میں جوار کا نام سن کر کانپ اٹھا لیکن سواری بیٹھ چکی تھی اور میں گھوڑا چلانے پر مجبور ہو چکا تھا۔ میں نے اپنے دل سے کہا۔ جوار بہت دور ہے۔ بہت ہی دور۔ دریا کے پار گھنے درختوں میں۔ جنگلوں کے درمیان جہاں انتقام کھلم کھلا کھیلتا ہے ——— میرے بچے۔ میری دنیا۔ میرے فرائض۔ سب میری یاد سے ایک آوارہ لہر کی طرح بل کھا کر گذر گئے۔ میں بالکل خاموش تھا۔ اتنا بھی خیال نہ کر سکا کہ یہ کام اس سنسان اور بھیانک رات میں میرے لئے کس قدر مشکل ہوگا۔ جوار جس کا نام سن کر دن کے وقت بھی دل خوف کھانے لگتا ہے پاؤں لڑکھڑانے لگتے ہیں۔ مجھے وہاں جانا تھا۔ آخر اس وقت وہاں کیا ہوگا۔ جہاں سانپ زہر اگلتے ہیں اور مہیب درندے اپنی خوفناک آوازوں کے ساتھ دہاڑتے ہیں۔

میں گھوڑا ہانکے جا رہا تھا۔ میں نے کہیں دور کچھ روشنی دیکھی جیسے چراغ ٹمٹما رہا ہو۔ پھر کھنڈروں کے نشان۔ ایک گنبد۔ کچھ شکستہ دیواریں یہ سب مجھے یکے بعد دیگرے نظر آئے اور میرے خوف و ہراس کو ایزاد کرنے میں مددگار ہوئے۔ اس ضمن میں جو جو خیالات میرے ذہن میں آئے میں انہیں محض وہم سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ آخر میں نے جرأت سے منہ پھیر کر سواری کو دیکھا سواری نہایت مطمئن۔ متین صورت بنائے میری پیٹھ سے پیٹھ لگائے بیٹھی تھی۔ میں گاڑی کے ہچکولوں کے باوجود اپنی جگہ پر بیٹھا تھا مختلف قسم کے خیال سرعت سے میرے ذہن میں رنگ رنگ کی تصویریں بن کر آرہے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ میں کمزور ہوتا جا رہا ہوں۔ میں اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ سب کچھ وہم ہے۔ 'تم گاڑیبان ہو۔ یہ تمہارا آبائی پیشہ ہے۔

تمہاری اور تمہارے بچوں کی روزی کا وسیلہ۔ اندھیرا ہے تو کیا؟ دور جانا ہے تو کیا؟ یہ مزدوری ہے۔ گاڑیبان کا کام سواری کو اس کے مقام تک پہنچانا ہے۔ اگر تم اپنا کام دیانت داری سے انجام دوگے تو تمہارا حق تمہیں مل جائیگا"۔

میرے دل نے اس قسم کے بہت سے دلائل پیش کئے۔ مگر وہم جو میرا تعاقب کر رہا تھا سحر سے کم نہ تھا۔ سواری کی وحشت خیز خاموشی بھیانک خواب کی طرح میرا گلا دبا رہی تھی۔ میں مضطرب تھا۔ حلق سے آواز تک نہ نکلتی تھی۔ گویا قوت گویائی کھو چکا تھا......... بعض اوقات کچھ ایسا محسوس ہوتا کہ گھوڑا گاڑی۔ سواری سب کا بوجھ مجھ پر ہے اور میں ان کے نیچے روندا جا رہا ہوں۔ گھوڑا ڈگر پر برابر بغیر کسی بیچینی کے چلا جا رہا تھا۔ اس تمام عرصے میں کوئی بات نہ ہوئی۔ نہ میں نے سواری کو مخاطب کیا نہ سواری نے مجھ سے کوئی سوال کیا۔ جس کا میں جواب دیتا۔

ہم دریا کے پل پر سے گذر چکے تھے۔ گاڑی کے پہیوں کی آواز بلند اور کچھ ناآشنا سی معلوم ہو رہی تھی۔ آخر کار سواری کو مخاطب کرنے کی غرض سے میں نے دیدہ دانستہ گھوڑے کو غلط راہ پر ڈال دیا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ سواری اس پر معترض ہوگی اور میں فوراً جلدی جلدی تین چار سوال کر دونگا۔ وہ جس طرح بھی بن پڑا اپنے وسوسوں کو اطمینان سے بدل لونگا۔ اسوقت میرے لئے بہترین موقع ہوگا کہ میں اس کا اور اس کے ارادوں کا غور و خوض سے مطالعہ کروں۔ اور ادھر جانے کی غرض و غایت کو سمجھ لوں۔ میں نے بار بار اس کی طرف دیکھا لیکن اس کی خاموشی میں کوئی فرق نہ آیا۔ دریا کا پل چھوڑتے ہی اس نئے راستے پر پہنچ کے مجھے کچھ ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ یہ کوئی غار ہے جس کے اندر ہم اندھا دھند چلے جا رہے ہیں۔ اگر یہ راہ ایک غار ہی ہے تو یقیناً اس کا کہیں اختتام بھی ہوگا۔ وہاں موت کے قہقہے فضا میں چکر کاٹ رہے ہونگے۔ اور ان دہشتناک ہنگاموں میں زندگی ناممکن ہوگی۔

کبھی یہ خیال آتا کہ ہم کھڑے ہیں۔ دریا کا پانی ہمارے پاؤں کے نیچے پھیل گیا ہے۔ کبھی یہ تصور ہوتا کہ گھوڑا گاڑی میرے ہاتھ سے چھوٹ کر بہت دور نکل گئی ہے اور میں بغیر کچھ سوچے سمجھے بھاگا جا رہا ہوں۔ ان تصور کو تکمیل دینے کی خاطر میں نے چاہا کہ گھوڑا گاڑی چھوڑ کر دیوانوں کی طرح بھاگ نکلوں۔ میری بیوی کن حسرتوں کے ساتھ میری راہ تک رہی ہوگی۔ کمسن بچوں کی یاد۔ ان کی باتیں پھر روزی کا خیال اور یہ خوف کہ اگر میں ایسا کرونگا تو سواری کا خوفناک پنجہ میری گردن پر ہوگا۔ میں گھٹ کر مر جاؤنگا۔ میرے بچوں کی دنیا اندھیر ہو جائیگی! ـــــ میں ان وسوسوں اور الجھنوں میں سے گذر رہا تھا۔ مجھے ایسا احساس ہوا کہ کوئی آدمی سسکیاں لے رہا ہے۔ کیا یہ میری سواری کی آواز ہے؟ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ لیکن سواری گنگوں کی طرح خاموش۔ بہروں کی طرح بے پروا اور اندھوں کی طرح بیحرکت تھی ـــ ٹنڈ منڈ درختوں کے خوفناک سائے دور دور دکھائی دیتے تھے۔ گھوڑا ذرا بھی تھکا ہوا معلوم نہ ہوتا تھا نہایت وفادار۔ بڑا طاقتور۔ میری روزی کا ذریعہ محنت و مزدوری کا سہارا سب کچھ وہی تھا۔ وہ اپنی رفتار چلا جا رہا تھا۔ میری منزل میرے وہم و گمان سے دور خدا جانے ہم کہاں کہاں سے گذر رہے تھے۔ ہر طرف پریشانی ہی پریشانی تھی۔ کوئی اس مصیبت میں پرسان نہ تھا۔ سواری کی مستقل خاموشی نے میرے خوف پر قبضہ کر رکھا تھا۔" کرتا تو کیا کرتا" ـــــ

سردی کی وجہ سے میرا رواں رواں کانپ رہا تھا۔ باگ تھامنے کی بھی طاقت نہ رہی تھی۔ ہاتھ ٹھنڈ کے مارے سن ہو چکے تھے۔ اس مایوسی کی حالت میں ہم ایک ایسی جگہ پر پہنچے جہاں سے دو راستے الگ الگ نکلتے تھے۔ یہاں ایک نڈر انسان نہایت مضبوط اور توانا ملا۔ وہ آگے بڑھا اور میرا گھوڑا تھام کر بولا۔" ادھر کوئی راستہ نہیں۔ گھوڑے کا رخ بدلو"۔ میں فقط اس کے پاؤں دیکھ

سکتا تھا"۔ بڑے بھدے اور بھاری بھاری کھیتی باڑی کرنے والوں کے سے معلوم ہوتے تھے۔ غالباً کوئی کاشتکار تھا۔ اس کی صورت سے وحشت ٹپکتی تھی۔ اس کی آواز نہایت کرخت تھی۔ میری یہ حالت تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ اس نے تحکمانہ طور پر کہا تم کون ہو؟ وہ پیچھے کون ہے؟ کہاں سے آئے ہو؟ کہاں جاؤ گے؟ میں بےحس و حرکت بیٹھا زبان میں قوت گویائی پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا اس سے پہلے کہ میں کچھ کہوں وہ بولا "یہ وہ جگہ ہے جہاں شہری لوگ برسوں دیکھنے میں نہیں آتے۔ تم اس تاریک اور سرد رات میں اندھا دھند کدھر جا رہے ہو؟" میں نے کہا۔ "ہم جوار کی طرف جا رہے ہیں۔ یہ پیچھے میری سواری ہے اور میں خود ایک غریب گاڑی بان ہوں"۔ وہ کچھ جواب دئے بغیر لپک کر گاڑی پر پیچھے سواری کے ساتھ جا بیٹھا اور ترش آواز میں بولا۔ "گاڑی کا رخ بدلو جوار اس طرف نہیں"۔ گاڑی کا رخ بدلنے میں شاید کچھ تاخیر ہوئی ہوگی کہ وہ اپنی جگہ سے چونک کر اٹھا اور گاڑی سے کود پڑا اس نے گھوڑے کو لگام سے پکڑ کر اس کا رُخ دوسری طرف بدل دیا۔ اور خود گھوڑے کے ساتھ ساتھ قدم قدم چلنے لگا۔ جب گھوڑا رفتار پکڑ چکا اور راہ پر ہولیا تو پیچھے بیٹھنے کے بجائے میرے ساتھ آ بیٹھا" مضبوط اور نڈر انسان خوف زدہ معلوم ہوتا تھا۔ مجھ میں قدرے قوت آ گئی تھی۔ میرا حوصلہ بڑھ گیا۔" یہ ضرور کوئی مزدور ہے"۔ میں بھی مزدور ہوں یہ میری مدد کریگا۔ اور وہ راز جو خوف اور دہشت بن گیا ہے۔ دیکھتے دیکھتے اس کا انکشاف ہو جائیگا۔ لیکن میرا یہ خیال بہت جلد غلط ثابت ہُوا۔ مجھے محسوس ہُوا کہ وہ مجھ سے بھی زیادہ خوف زدہ ہے۔ رفتہ رفتہ اس کا جسم سرد ہوتا جا رہا تھا۔ غالباً وہ کانپ رہا تھا۔ اب صرف گھوڑے کے قدموں اور اس کے ہانپنے کی آواز آ رہی تھی۔ کون تھا جو رہبری کرتا۔ ہم تینوں یقیناً علیحدہ علیحدہ اپنے انجام پر غور کر رہے تھے۔

وہ راستہ جو میں نے انتہائی پریشانی سے کاٹا تھا پھر دوبارہ جوں توں کرکے نصف سے زیادہ ختم ہو چکا تھا۔ کسان نے میرے بازو پر زور سے ایک چٹکی لی۔ قریب تھا کہ میری چیخ نکل جائے میں نے اپنے آپ کو اس کے رحم پر چھوڑ دیا۔ اس نے پوچھا یہ پیچھے کون ہے؟ میں نے کہا میں نہیں جانتا۔ وہ بولا "خاموش میں سب کچھ جانتا ہوں"۔ کبھی کبھی وہ بے سبب مجھ پر ہاتھ رکھنے کی کوشش کرتا۔ کبھی میرے ساتھ لگ جاتا۔ کبھی ادھر دیکھتا کبھی ادھر دیکھتا کبھی میرا منہ تکنے لگتا۔ اب گھوڑے کی باگ اس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ گھوڑے کو جلدی جلدی چلا رہا تھا۔ اس کے ہونٹ بڑے بڑے تھے۔ بالوں کی بناوٹ عجیب قسم کی تھی۔ چہرہ غیر معمولی وجاہت اور صحت کے سبب چمک رہا تھا۔ بےفکری اور تازہ ہوا میں پلا ہُوا جسم پتھر کے مانند نظر آتا تھا۔ لیکن سواری کی دہشت سے یوں معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے اس پر سحر کر دیا ہے۔ وہ اپنی پریشانی کو ہر امکانی کوشش سے چھپانے کی کوشش کر رہا تھا ـــ

ہم آہستہ آہستہ دوبارہ پل کے قریب پہنچ گئے۔ درختوں کے ڈراؤنے اور گھنے جھنڈ ختم ہو چکے تھے۔ میں دعا مانگ رہا تھا کہ سلامتی سے پل پر پہنچ جاؤں۔ گھوڑا گھاٹی پر اس طرح چڑھ رہا تھا جیسے موت اس کا تعاقب کر رہی ہو۔ وہ جگہ پھر آ گئی تھی جہاں سے میں نے دیدہ دانستہ اپنے لئے غلط راستہ اختیار کیا تھا۔ میں نے سواری کو دیکھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔" جیسے کوئی رو رہا ہو" ـــ یکایک ایک جھٹکا لگا۔ غالباً پہیئے کے نیچے کوئی پتھر آ گیا تھا۔ قریب تھا کہ ہم سب گر جاتے۔ سواری نے گردن اٹھائی۔ میں نے بڑی جرأت کے ساتھ کاشتکار سے کہا۔ "یہاں سے جوار

کتنی دور ہوگا۔ کیونکہ ہمیں جوار جانا ہے۔ میری آواز کسی قدر بلند تھی۔ اس میں ایک قسم کی تندی اور حوصلہ پایا جاتا تھا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ موت سے زیادہ میرے لئے یہاں کچھ نہیں۔ کاشتکار میری آواز سے چونک اٹھا۔ میں نے سواری کی طرف دیکھا۔ اس وقت اس میں ایک بے بسی اور بیکسی نظر آتی تھی۔ اس کی حالت نے میرے دل پر گہرا اثر کیا۔ میں نے اس کی آنکھیں دیکھیں۔ ان میں ایک چمک تھی اور وہ خوبصورت تھیں۔

پل کے قریب ایک پرانا بڑھ کا درخت تھا۔ جس کے نیچے سے کچھ آوازیں آ رہی تھیں۔ غالباً مسافر تھے۔ رات وہیں ٹھہرے ہونگے کاشتکار کے الفاظ۔ مجھے ابھی تک یاد ہیں۔ "جوار بہت دور ہے۔ وہاں قتل و خون کی خوفناک وارداتیں ہو رہی ہیں۔ تم وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔ سرکاری ملازموں نے اس کے گرد و نواح میں ڈیرے ڈال دئے ہیں۔ وہاں سے نہ کوئی آ سکتا ہے اور نہ جا سکتا ہے"۔ یہ کہ کر وہ گاڑی سے کود گیا تھا۔ اور سواری کو بڑے غور سے دیکھتا ہوا بغیر کچھ کہے درختوں کی آڑ میں گم ہو گیا تھا۔

اب تمام ماحول بدل چکا تھا۔ میں نے ہوشیاری سے گھوڑے کو جلدی جلدی چلانا شروع کیا۔ اس کا رخ شہر کی جانب تھا۔ سواری ابھی تک اپنے خیال میں سرنگوں تھی۔ مجھے اب اس سے ہمدردی سی پیدا ہوگئی تھی۔ "ہم پل چھوڑ کر بہت دور نکل آئے تھے۔ وہ یقیناً رو رہی تھی۔ شاید اس کی کسی بڑی آرزو کو ٹھیس لگی تھی۔ لیکن میرے دماغ میں ایک ہی خیال چکر کاٹ رہا تھا کہ راستہ ختم ہو جائے اور میں گھوڑا گاڑی لیکر گھر کی راہ لوں میرا بدن تکان سے چور چور ہو چکا تھا۔ رات قریب الاختتام تھی۔ شہر کے آثار کچھ کچھ نظر آنے لگے تھے۔ میری حالت پہلے سے بہت بہتر تھی۔ یکایک مجھے معلوم ہوا کہ کسی نے میرے شانوں پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔ میرے تمام جسم میں ایک لہر سی دوڑ گئی۔ خاموش فضا میں ایک چیخ گونجی۔ اس ہراس کے عالم میں میں نے کاشتکار سے مدد چاہی۔ لیکن وہ جا چکا تھا۔ اس کا گرم گرم جسم اور پھولا ہوا سانس، اب کچھ بھی باقی نہ تھا"۔

۔۔ گاڑی چلتے چلتے خود بخود رک گئی۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا اور میں زمین پر گر پڑا۔ گھوڑے نے اپنا منہ ہمدردی سے مجھ پر رکھ دیا۔ یہ کچھ یاد نہیں کہ میں کب تک بےحس و حرکت پڑا رہا۔ جب ہوش آیا تو اٹھنے کی کوشش کی۔ میں نے دیکھا زمین پر کچھ چاندی کے سکے گرے پڑے تھے اور ایک سایہ جیسے چاند بادلوں اور درختوں کے پیچھے سے گذر رہا ہو سڑک کی دوسری جانب جا رہا تھا۔

یہ واقعہ اس جگہ پیش آیا تھا جہاں ایک شکستہ گنبد اور چند قدیم دیواریں اپنے بنانے والوں کی یاد میں کھڑی آنسو بہا رہی ہیں۔ کوئی آواز کوئی آہٹ سنائی نہ دیتی تھی۔ میں گھوڑا گاڑی سنبھال گھر کی طرف روانہ ہوا۔ تکان اور ڈر کے مارے بالکل ناطاقت ہو چکا تھا۔ گھوڑے کی رہی سہی طاقت سے آخر میں گھر تک پہنچ گیا۔ بچے بے خبر سوئے تھے۔ دروازے میں میری بیوی بیٹھی اونگھ رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ تمام رات اس نے میری راہ دیکھتے دیکھتے کاٹ دی ہے میں مصیبت میں گرفتار مردے سے بدتر۔ دل میں ہمت نہ پاؤں میں سکت چارپائی تک پہنچ کر چت لیٹ گیا۔ کون بتا سکتا ہے مجھے خود معلوم نہیں کہ اس کے بعد کیا پیش آیا تھا۔ صرف اس قدر یاد ہے کہ دن چڑھ چکا تھا۔ میری بیوی نے مجھے شانوں سے پکڑ کر اٹھایا اور گاڑی کے پاس لا کر کھڑا کر دیا۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ گاڑی خون سے لت پت ہو رہی ہے اور سپاہی میرے ارد گرد کھڑے ہیں۔ رات کے تمام واقعات میری آنکھوں کے سامنے یکے بعد دیگرے گذر رہے تھے۔ میں خاموش

بےحس و حرکت کھڑا گاڑی کو تک رہا تھا۔ خون آلودہ گاڑی میرے سامنے کھڑی تھی۔

لوگ جوق در جوق آ رہے تھے۔ ہجوم کافی سے زیادہ جمع ہوگیا تھا۔ یہ واقعات جو میں نے بیان کرنے کی کوشش کی ہے کسی کی سمجھ میں نہ آتے تھے

ایک نے کہا۔ "یہ گاڑی بان کا کام ہے۔"

دوسرا بولا۔ "یہ جوار کیونکر پہنچا ؟" "اس نے جاگیردار کو کس طرح قتل کیا"۔ اس نے کس کی مدد سے کامیابی حاصل کی"؟ .... .

....

کہتے ہیں تو ما شہر کی مشہور رقاصہ، جاگیردار کی داشتہ، کل شام تک شہر کے بازاروں میں موجود تھی۔

ناگا میاں

بدنامی

مری قسمت میں لکھا تھا کہ تو بدنام ہو جائے
تری شہرت قتیلِ خنجرِ الزام ہو جائے
قیامت ہے کہ تجھ پر انگلیاں اٹھیں حریفوں کی
ترا ننھا سا دل وقفِ غمِ ایام ہو جائے
مری جاں چل کہیں ایسی جگہ چل کر رہیں دونوں
جہاں حیرت گلوگیر صدائے عام ہو جائے
افق کے پاس وہ اک گلستاں ہے اسکے دامن میں
ہمارا رنج و غم غرقِ مئے گلفام ہو جائے

مجید ملک

رحمٰن چغتائی

مشورہ

نوجوان بادشاہ نے تخت پر جلوہ فرما ہوتے ہی کہا ــــ "میں سکہ بدل دونگا"
کامل سکوت گردنیں لہروں کی طرح بل کھا کر جھک گئیں
بادشاہ نے سلسلہ کلام جاری رکھا ــــ "مجھے قوانین میں تبدیلیاں کرنی ہیں".
ایک سانس تک سنائی نہ دیتا تھا۔
بادشاہ نے کہا حکومت طاقت۔ سب بادشاہت کے نشانات ہیں۔
مجمع میں ایک حرکت سی ہوئی جیسے کوئی لہر ابھرے اور کھو جائے۔
بادشاہ بولا۔ موتی۔ زمرد۔ الماس مجھے اپنے تاج کے لئے بیش بہا جواہر درکار ہیں۔
آواز آئی اے بادشاہ بادشاہوں کی ایسی ہی خواہشیں ہوتی ہیں۔
بادشاہ نے شانوں کو جھٹکا اور کہا بادشاہ کی نظریں مستقبل کی نظریں ہیں۔
اے بادشاہ پہلے بادشاہوں کا بھی یہی خیال تھا۔
بادشاہ کی پیشانی پر بل آ گئے اس نے کہا "جہانداری بغیر قتل و خون کے ممکن نہیں" اس کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔
اے بادشاہ پہلے بادشاہوں کا بھی یہی قول تھا
بادشاہ نے جھنجھلا کر کہا۔ "میں ماؤں سے بچے چھین لونگا
اے بادشاہ پہلے بادشاہوں کا بھی یہی عمل تھا۔
وقار اور تمکنت کے احساس سے بادشاہ نے سر اور بلند کر دیا۔
آخر مجھے کیا کرنا ہے"؟
دربار میں ایک سر جھک گیا
اے بادشاہ تجھے یہی کرنا ہے۔

رحمٰن چغتائی

احسن مارہروی

احسن الکلام

زباں سے جو گلۂ آسماں نکلتا ہے
فریب خوردۂ وہم و گماں نکلتا ہے

یہ چشمِ تر سے سرشکِ رواں نکلتا ہے
کہ آبرو لئے اک رازداں نکلتا ہے

یہی ہے وقتِ مددِ جذبِ دل ترے صدقے
وہ میری خاک سے دامن کشاں نکلتا ہے

سلگ رہی ہے تپِ غم سے آگ سینے میں
نفس نہیں یہ اُسی کا دھواں نکلتا ہے

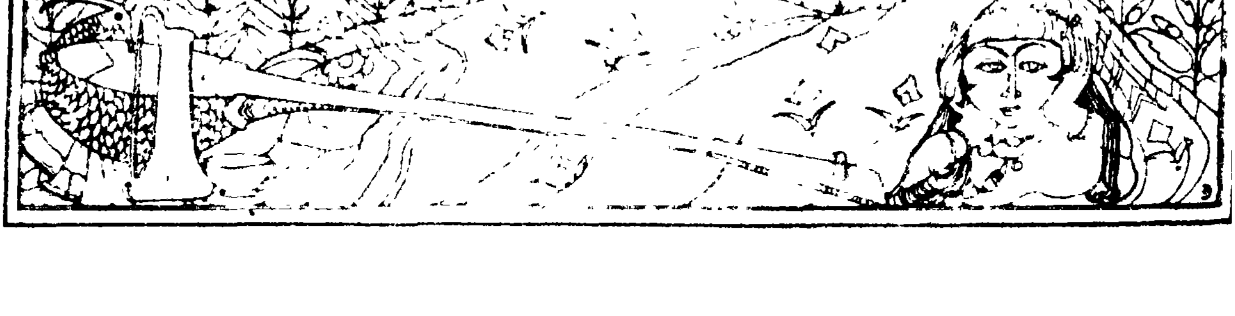
وہ کوئے حسن جہاں کوئی جا نہ سکتا تھا
وہاں سے روز اب اک کارواں نکلتا ہے

وہ خارِ غم جو ہے پیوستِ قلبِ عاشق میں
بغیر اُن کے نکالے کہاں نکلتا ہے

نکل سکا کسی قوت سے جو نہ الفت میں
وہ کام تجھ سے دلِ ناتواں نکلتا ہے

کئے ہیں اس نے شہید احسن اتنے وقتِ خرام
کہ ہر قدم پہ لحد کا نشاں نکلتا ہے

احسن مارہروی



آغا عبدالحمید

فلم کاری کا آرٹ

اس مختصر سے مضمون میں فلمی موضوع (جس پر کہانی کا دار و مدار ہوتا ہے) کی ڈھال، ماحول کی تخلیق اور کیمرے کی حرکت اور مختلف زوایائے نگاہ سے کچھ بحث کی جائے گی اور اس سلسلہ میں فن اور "فنا پا" میں تمیز کرنے کی کوشش کی جائیگی۔

نفس مضمون پر کچھ کہنے سے پہلے قارئین کی توجہ دو ایک باتوں کی طرف مبذول کرانا شاید غیر ضروری نہ ہوگا۔ ہندوستان میں صنعت فلم کاری کی جو حالت ہے۔ وہ آپ سے پوشیدہ نہیں۔ اس کے متعلق تفصیل سے کچھ لکھنا فضول معلوم ہوتا ہے۔ چند ایک اہم باتوں کا ذکر نفس مضمون میں کیا جائیگا سینما پر لکھنے میں سب سے بڑی دقت یہ پیش آتی ہے کہ وہ فلمیں جن کے متعلق دنیا کے تمام بڑے بڑے نقاد متفق ہیں کہ وہ اس صنعت کی بہترین مظہر ہیں۔ ہندوستان میں نہیں دکھائی جاتیں۔ میرا مطلب روسی فلموں سے ہے علاوہ ازیں چند ایک بہترین امریکن فلمیں بھی پنجاب میں نہیں دکھائی گئیں۔ ہندوستانی ناطق فلموں میں اب تک صرف ایک فلم "پورن بھگت" ایسی ہے جس کو درمیانہ درجہ کی کامیابی حاصل ہوئی ہے (میرا مطلب مالی کامیابی سے نہیں بلکہ صناعانہ کامیابی سے ہے) خاموش فلموں کی حالت اس سے بھی زیادہ قابل رحم تھی۔ کسی نقاد کا ایک ایسی صنعت کی بہترین تخلیق سے بے بہرہ ہونا جس پر وہ تنقید کرنا چاہتا ہے ایک حد تک مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔ تاہم یہ ایک ایسی مجبوری ہے جس کا کوئی علاج نہیں۔ اس مضمون میں حتی الوسع انہیں فلموں سے بحث کی گئی ہے جو ہندوستان میں دکھائی جا چکی ہیں۔ یہاں فن اور "فنا پا" کا فرق واضح کر دینا شاید غیر ضروری نہ ہوگا۔ جہاں تک سینما کا تعلق ہے "فنا پا" سے فن کی ایسی نمائش مراد ہے جو بے موقع ہو اور جس سے موضوع پر مزید روشنی پڑنے کے بجائے صرف یہی ظاہر ہو کہ ڈائرکیٹر نے محض اپنی کاریگری دکھلانے کے لئے اُپج کی ہے۔ جیسا کہ آگے چل کر ظاہر ہوگا کیمرے کی حرکت اور اس کا غیر معمولی زاویوں سے زندگی کو دیکھنا ایک بہت کار آمد چیز ہے لیکن ایسے مفید اور خالص فنی طریقوں کے بیجا استعمال کا نتیجہ ہمیشہ فنا پا ہی ہوتا ہے۔

آجکل جس کثرت سے اردو میں سینما کے متعلق اخبار اور رسالے شائع ہو رہے ہیں (گو وہ ایکٹرسوں کی تصاویر چھاپنے اور ان کے عشاق اور تنخواہوں کی فہرستیں دینے ہی پر اکتفا کرتے ہیں) اور جس شوق سے ادبی رسائل بھی ستارگان فلم کی تصاویر سے اپنے اوراق مزین کرتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس فن کی مبادیات اور فلم کی بناوٹ سے عوام واقف ہونگے۔ اس بازاری اور محض اعداد و شمار بتانے والے ادب کے علاوہ چند ایک قابل قدر مضامین بھی لکھے گئے ہیں جن میں پروفیسر بخاری کا "فلم کا وسیلۂ اظہار" خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

فلم تصاویر کے ایک ایسے سلسلے کا نام ہے جن کو یکے بعد دیگرے دکھانے سے حرکت کا احساس ہوتا ہے۔ یہ تصاویر

متحرک کیمرے سے لی جاتی ہیں اور مصنوعی روشنی سے پردے پر دکھائی جاتی ہیں۔ ہر ایک تصویر کے بعد پردے پر ایک لمحے کے لئے تاریکی چھا جاتی ہے۔ لیکن چونکہ ایک سیکنڈ میں ۱۶ سے لے کر تیس تک تصویریں دکھائی جاتی ہیں تماشائی تاریکی کے وقفوں کو محسوس نہیں کرتا اور وہ اشیا جن کی تصاویر بنائی گئی ہیں حرکت کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ فلم کا ایک ٹکڑا جس کی ایک ہی وقت میں تصویر لی گئی ہو "شاٹ" یا فلمپارہ کہلاتا ہے۔ جب کیمرہ دوبارہ حرکت کرتا ہے تو دوسرا شاٹ شروع ہو جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ "شاٹ جب ترتیب اور تسلسل کے ساتھ دکھائے جائیں تو انہیں فلم کہا جاتا ہے"۔ یہ یاد رہے کہ کسی فلم کی کامیابی کا انحصار زیادہ تر "ترتیب اور تسلسل" پر ہے تصویر لیتے وقت شاٹوں میں وہ ترتیب نہیں ہوتی جو فلم دکھاتے وقت ہوتی ہے۔ اس لئے فلم بن چکنے کے بعد اس کو کاٹ کر پھر جوڑا جاتا ہے اور

"فلم کی قطع و برید اور از سرنو شیرازہ بندی جسے تدوین یا ایڈیٹنگ کہتے ہیں فلمسازی کا اہم مرحلہ ہے اور بعض ڈائریکٹر خصوصاً روسی ماہرین تو درحقیقت فن اسی کو سمجھتے ہیں"۔ (پروفیسر بخاری)

چونکہ فلم ایک صوری فن ہے اس لئے موضوع خواہ مرئی ہو خواہ غیر مرئی اس کو تصاویر ہی میں پیش کرنا ہوتا ہے۔ لہذا کامیاب ڈائریکٹر وہی ہے جو ایک غیر مرئی موضوع کے لئے بھی ایسی تصاویر منتخب کرتا ہے جن سے تماشائی پر ان کا مفہوم بغیر کسی وقت کے عیاں ہو جاتا ہے۔ فلم میں چونکہ ہمیشہ ڈرامائی عنصر ہوتا ہے اسلئے حرکت اور عمل اس کے جزو لاینفک ہیں۔

"عمل ڈرامے کی جان ہے اور فلم میں بھی اسے یہی حیثیت حاصل ہے۔ کیونکہ فلم میں تو کوئی ایسی چیز دکھائی ہی نہیں جاتی جس کی ظاہری حالت اس کی تمام کیفیات کی ترجمان نہ ہو اور جس میں حرکت اور اس کا اتار چڑھاؤ، اس کا تھم جانا یا روک دیا جانا یا حرکات کا باہمی تصادم نہ دکھایا جائے۔ تمام صوری فنون میں یہ امتیاز فلم ہی کو حاصل ہے کہ مسلسل حرکت اور روانی کو اس کا اصل موضوع قرار دیا جا سکتا ہے"۔ (پروفیسر بخاری)

مجھے اس سے اتفاق نہیں کہ "فلم میں تو کوئی ایسی چیز دکھائی ہی نہیں جاتی جس میں واضح طور پر حرکت نظر نہ آئے"۔ کیونکہ حرکت سے مراد صرف معمول (جس کی تصویر لی گئی ہے) کی حرکت ہی سے نہیں بلکہ محسوسات کی اس حرکت سے بھی ہے جو بیجان اشیا کی تصاویر کی مناسب ترتیب سے پیدا ہوتی ہے۔ عمل اور حرکت کو زیادہ واضح کرنے کے لئے کیمرے کو بھی حرکت دی جاتی ہے۔ وہ ایکٹر کے ساتھ چلتا ہے گھوڑوں کے ساتھ دوڑتا ہے۔ ہوائی جہازوں کے ساتھ اڑتا اور کشتیوں کے ساتھ تیرتا ہے بلکہ ضرورت کے وقت پانی میں غوطہ بھی لگا جاتا ہے اور سمندر کی ان گہرائیوں تک پہنچ جاتا ہے جہاں انسان کی آنکھ کام نہیں کر سکتی۔ محسوسات کی حرکت کے لئے کیمرہ "دیکھتا ہے۔ سنتا ہے چھوتا ہے سونگھتا ہے چکھتا ہے گویا وہ انسانوں کی طرح حواس خمسہ رکھتا ہے .... اور فلمکار کو بڑی آسانی یہ ہے کہ کیمرہ کی وسیع طاقت اور قوت اسے سہارا دینے کو موجود ہے"۔ اسی طرح مختلف زوایائے نگاہ سے تصویر لینے کا مطلب بھی عمل کو زیادہ واضح کرنا یا کسی نفسیاتی کیفیت کے اظہار سے محسوسات کو ہیجان میں لانا ہوتا ہے۔ لیکن جہاں کیمرے کی حرکت اور غیر معمولی زوایائے نگاہ بلا ضرورت استعمال کئے جائیں وہاں فلم پر برا اثر ہوتا ہے اور نتیجہ فنا پا۔ فرض کیجئے دو آدمی سیڑھیوں کے نیچے کھڑے باتیں کر رہے ہیں۔ ان میں سے ایک سیڑھیوں پر چڑھنا شروع کر دیتا ہے اور دوسرا نیچے کھڑا رہتا ہے۔ اب اگر سیڑھیوں پر چڑھنے والے کی تصویر نیچے سے لی جائے تو وہ اس آدمی کا زاویہ نگاہ ظاہر کرے گی جو نیچے کھڑا ہے۔ اسی

طرح اگر نیچے کھڑے ہوئے آدمی کی تصویر اوپر سے لی جائے تو وہ سیڑھیوں پر چڑھنے والے کا زاویہ نگاہ ظاہر کریگی۔ دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ ایک سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے آدمی کی تصویر ایک غیر معمولی زاویہ نگاہ سے اس لئے لی جائے کہ اس کی نفسیاتی کیفیت ظاہر ہو۔ "سان لوئی رے کا پل" میں ایک لڑکا سیڑھیوں پر چڑھتا ہوا دکھایا گیا ہے جو خودکشی کا ارادہ رکھتا ہے۔ تصویر لیتے وقت کیمرہ چھت سے لٹکایا گیا ہے۔ لڑکا اپنے کندھوں کو سمیٹے ہوئے، اپنے بازوؤں کو لٹکائے ہوئے گھسیٹ گھسیٹ کر قدم بڑھا رہا ہے۔ اوپر سے تصویر لینے سے اسکا سر سینے میں دھنسا ہوا اور اس کا ارادہ خوفناک معلوم ہوتا ہے۔ جہاں ان دونوں میں سے کوئی بات بھی نہ ہو یعنی نہ تو کسی کردار کا زاویہ نگاہ دکھانا ہو اور نہ کوئی نفسیاتی کیفیت ہی ظاہر کرنی ہو وہاں ایک شخص کا سیڑھیوں پر چڑھتے وقت غیر معمولی زاویہ نگاہ سے دکھایا جانا بے معنی ہو جاتا ہے اور ناظرین کی توجہ خواہ مخواہ کیمرہ کی طرف مبذول ہو جاتی ہے۔

کردار کی نفسیاتی تحلیل کیلئے غیر معمولی زوایائے نگاہ کے استعمال کی ایک بہت اچھی مثال امریکن ڈائریکٹر لوبش کی "دی مین آئی کلڈ" ہے۔ ایک حساس فرانسیسی نوجوان جو کسی تھیٹر میں آرگن بجانے پر ملازم ہے جنگ عظیم میں سپاہی بن جاتا ہے اور دوران جنگ میں ایک نوجوان جرمن سپاہی کو سنگین سے مار دیتا ہے۔ اس کی حساس طبیعت اس کی ضمیر کو ملامت پر مجبور کرتی ہے اور وہ خود کو ایک قاتل خیال کرتا ہے۔ چنانچہ وہ جرمن نوجوان کے والدین سے ملنے اور ان سے معافی مانگنے کا ارادہ کرتا ہے فلم اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب جنگ عظیم کے اختتام پر صلح کی خوشیاں منائی جارہی ہیں۔ پہلا سین ایک گرجے کا ہے جس میں پادری اس مبارک وقت کے لئے خدا کا شکریہ اور آیندہ کے لئے دعا کر رہا ہے۔ وہ تمام حاضرین کو اس پر مبارکباد دے رہا ہے کہ وہ جنگ سے دست بردار ہو چکے ہیں تصویر گرجے سے لی گئی ہے۔ سامنے پادری کھڑا ہے اور سامعین کی صرف تلواریں نظر آتی ہیں۔ جن کے دستے چمک رہے ہیں۔ کیمرہ حرکت کرنا شروع کرتا ہے اور تلواروں کو خوب واضح کرتا ہوا پادری تک جا پہنچتا ہے اس منظر میں ڈائریکٹر نے بہت طنز سے کام لیا ہے اور اس جھوٹ اور دغا کو ظاہر کیا ہے جس کے مرتکب وہ لوگ ہیں جو صلح کے وقت بھی ہتھیار لگائے ہوئے ہیں۔

اس سے اگلا سین اس جلوس کا ہے جو اس خوشی میں نکالا گیا ہے۔ تصویر ایک ایسے آدمی کی ٹانگوں میں سے لی گئی ہے جس کی ایک ٹانگ لڑائی میں کٹ چکی ہے۔ اس سے خوب ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی دماغی کیفیت کیا ہوگی جسے خوشی کے اس اظہار سے وہ وقت یاد آتا ہے جب اس کی ٹانگ کٹ گئی تھی۔ جلوس ——— جس میں کئی باجے بج رہے ہیں اور لوگ رہ رہ کر نعرے لگا رہے ہیں ——— ایک ہسپتال کے قریب سے گزرتا ہے جس کے ایک نوٹس بورڈ کو کیمرہ خوب واضح کرتا ہے۔ اس پر لکھا ہے "خاموش"! پھر ہسپتال کے مریض دکھائے گئے ہیں جو اس شور سے ڈر کر چیخنے لگتے ہیں۔ اس سارے منظر میں ہجوم کی سنگدلی اور بے پروائی پر طنز ہے۔

اس شور و غوغا سے مقابلے کے لئے وہ فرانسیسی نوجوان دکھایا جاتا ہے جس کو گرجا کی ٹن ٹن، باجوں کی آواز اور لوگوں کے نعرے اس وقت کی یاد دلا رہے ہیں جب وہ ——— اپنی دانست میں ——— قتل کا مرتکب ہوا تھا۔ الفاظ میں صوری تاثرات کا بیان بہت مشکل ہے اگر ان تمام مناظر میں کیمرہ کی حرکت اور مختلف زوایائے نگاہ تفصیل سے بیان کئے جائیں تو کئی صفحات صرف ہو جائیں اور پھر بھی شاید وہ تاثرات بیان نہ ہو سکیں جو فلم دیکھنے سے ہوتے ہیں۔ اس فلم میں ایک ایسی احدیت اور روانی ہے اور اس کے شاٹ ایک دوسرے میں اس طرح ڈھلتے چلے جاتے

ہیں ۔کہ ہمیں کہیں بھی ان کی علیحدگی کا احساس نہیں ہوتا ۔

اس کے برعکس مثال ہمیں مائکل سٹون کی فلم " بارش" میں ملے گی ۔جس میں ان چیزوں کا غلط استعمال کیا گیا ہے ۔ اس فلم کی کہانی " تائیس " کی کہانی سے بہت ملتی جلتی ہے ۔ایک پادری ایک فاحشہ عورت کو نیکی کی طرف راغب کرتا ہے اور جب وہ گناہ کی زندگی سے توبہ کر لیتی ہے تو پادری خود اپنا زہد اس کے آغوش میں ڈبو دیتا ہے ۔اس فلم میں دو باتوں کا دکھانا خاص طور پر مشکل تھا ۔ایک تو ان کیفیات کا اظہار تھا جن کے زیر اثر لڑکی فواحشات سے متنفر ہونا قبول کر لیتی ہے اور دوسرے ان کا جو پادری کو زہد سے بہکا کر گناہ سے پیوستہ کر دیتے ہیں یہ یاد رہے کہ ان تمام نفسیاتی کیفیات کو صوری ذرائع سے ظاہر کرنا ہے ۔یہاں نہ تو الفاظ (مکالمہ) سے کام چل سکتا ہے اور نہ ایکٹروں کے چہرے بگاڑنے سے ۔مائکل سٹون کو ان دونوں موقعوں پر ناکامی ہوئی ہے ۔لیکن یہ ایک شاندار ناکامی ہے اور کئی معمولی کامیابیوں سے بہتر۔ناکامی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ فلم میں بحیثیت مجموعی کوئی احدیت اور تسلسل نہ تھا ۔تمام مناظر علیحدہ علیحدہ معلوم ہوتے تھے اور ہر منظر کے اختتام پر یہی احساس ہوتا تھا کہ فلم ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیگی اس لئے جن مناظر میں لڑکی اور پادری کی جذباتی جنگ دکھائی گئی ہے ان کی باقی مناظر نے مدد نہیں کی اور ان میں وہ اثر پیدا نہیں ہوا جسکے پیدا ہو سکنے کا بہت امکان تھا ۔

مثال کے طور پر وہ سین لیا جاتا ہے جس میں لڑکی گناہ سے توبہ کرتی ہے ۔پادری سیڑھیوں کے اوپر کھڑا ہے اور اس کی تصویر نیچے سے لی گئی ہے ۔لڑکی نیچے کھڑی ہے اور اس کی تصویر اوپر سے لی گئی ہے (یہ عام ڈائریکٹر بھی جانتے ہیں کہ جس چیز کی عظمت دکھانی ہو اس کی تصویر اوپر سے لی جاتی ہے) لڑکی پادری کے وعظ سے تنگ آ گئی ہے اور اسے برا بھلا کہنا شروع کرتی ہے ۔اس کی آواز بلند اور تیز ہے ۔پادری اسے خاموش کرنا چاہتا ہے لیکن لڑکی کی آواز بلند ہوتی جاتی ہے ۔وہ دھیمی آواز میں دعا مانگنا شروع کرتا ہے ۔لڑکی پر دعا کا اثر ہوتا ہے اور اس کی آواز دھیمی ہوتی جاتی ہے ساتھ ساتھ پادری کی آواز بلند ہوتی جاتی ہے ۔کچھ عرصے کے بعد لڑکی خاموش ہو جاتی ہے اور پادری بلند آواز میں دعا پڑھتا رہتا ہے پھر لڑکی بھی آہستہ آہستہ دعا مانگنا شروع کر دیتی ہے ۔آخر میں دونوں بلند آواز میں دعا مانگتے دکھائی دیتے ہیں ۔اس سارے سین کا ہم پر وہ نفسیاتی اثر نہیں ہوتا جو ڈائریکٹر دکھانا چاہتا تھا ۔آوازوں کے گھٹنے بڑھنے اور کیمرہ کے مختلف زوایائے نگاہ کا آپ ایک "گراف" بنا سکتے ہیں ۔اس سین میں فناپاہی فناپا نظر آتا ہے ۔ "بارش" میں جگہ جگہ کیمرے کی ایسی حرکت دکھائی گئی ہے جو نہ صرف بے ضرورت ہے بلکہ ہماری توجہ دوسری طرف مبذول کراتی ہے ۔علاوہ ازیں بارش کا کوئی اثر کردار پر معلوم نہیں ہوتا حالانکہ ڈائریکٹر کا مقصد یہ دکھانا تھا کہ متواتر بارش ایک تھکا دینے والی اور خوفناک چیز ہے ۔مائکل سٹون اپنی فلم " آل کوائٹ آن دی ویسٹرن فرنٹ " (مغربی محاذ پر سکوت) میں بہت کامیاب رہا ہے کیونکہ اس میں چند ایک ایسے مہیب جنگی منظر پیش کرنے تھے جن سے بلا واسطہ ہمارے دلوں میں ہمدردی نفرت اور رحم کے جذبات کو موجزن کرنا تھا ۔اس کا موضوع مرئی تھا ۔ اور وہ ایک "خاص" مصوری فلم تھا ۔" بارش" میں کردار کی نفسیاتی تحلیل لازم تھی اور مائکل سٹون میں اس کی اہلیت نہیں ۔

فلم بنانے سے پیشتر ڈائریکٹر کے دماغ میں فلم کا بحیثیت کل ایک نقشہ ہونا چاہئے ۔دوسرے الفاظ میں کیمرے میں بننے سے پہلے اس کے دماغ میں فلم مکمل ہو جانی چاہئے ۔روس کے مشہور ڈائریکٹر آئی سن سٹائن نے تو یہاں تک کہ دیا ہے

کہ فلمکار کے لئے ضروری ہے کہ وہ فلم بنانے سے پہلے فیصلہ کرلے کہ اونے سے اونے ایکٹر کے کوٹ کے بٹن کس طرح کے ہونگے یعنی اس کو تمام جزئیات پر حاوی ہونا چاہئے۔ ہماری ہندوستانی فلموں میں یہی نقص ہے کہ فلمکار فلم بنانے سے پہلے کچھ نہیں سوچتا۔ اس کے مناظر میں کوئی ربط کوئی تسلسل اور کوئی انتظام نہیں ہوتا۔ کہانی کا کوئی نشو و ارتقا نظر نہیں آتا۔ مناظر ایک دوسرے میں ڈھلتے نہیں۔ ہر ایک سین کو دھکیل کر پردے پر لایا جاتا ہے۔

پربھارت فلم کمپنی کی "جلتی نشانی" اور "مایا مچھندر" کو لیجئے۔ ان کو عام فلموں سے بڑھ کر کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اوّل الذکر ایک سیدھی سادی کہانی ہے۔ لیکن اس میں بھی تسلسل نام کو نہیں۔ شروع ہی میں کہانی کے خاتمے کا پتہ چل جاتا ہے اس لئے لازم تھا کہ پیرایہ بیان ہی کو دلچسپ بنایا جاتا لیکن یہ بھی نہ ہو سکا۔ فوٹو گرافی عام ہندوستانی فلموں کے مقابلے میں اچھی ہے۔ لیکن سایہ نہ ہونے کی وجہ سے تصویر بے جان نظر آتی ہے "مایا مچھندر" میں بہت حد تک ممکن تھا کہ گرو اور چیلے کی باہمی کشمکش ایک عظیم الشان چیز بن جاتی اور دنیا کی ہوس اور نیکی کی یہ جنگ فلم کو اعلےٰ درجہ کا بنا دیتی لیکن سوائے گرو اور چیلے کی کرامات اور شعبدہ بازیوں کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ ڈائریکٹر غیر ضروری چیزوں میں اپنے اصلی مقصد کو کھو گیا ہے۔ چند ایک سین بذات خود بہت اچھے ہیں لیکن ساری فلم میں ان کی کوئی اہمیت نہیں۔

ہندوستانی فلمکار جزئیات کے قریبی شاٹ یعنی "کلوز اپ" سے بہت کم کام لیتے ہیں۔ حالانکہ اس سے مغربی فلمکاروں نے حیرت انگیز کام لیا ہے۔

"کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ شروع میں سینما کو تھیئیٹر پر صرف اس لئے ترجیح دی جاتی تھی کہ وہ 'کل' دکھا سکتا ہے اور سٹیج صرف جزئیات کو۔ اب ہم پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا ہے کہ سینما اصلیت میں تھیئیٹر پر اس لئے فوقیت لے گیا ہے کہ وہ جزئیات کو دکھا سکتا ہے۔ حالانکہ تھیئیٹر کی سٹیج اس سے عاجز ہے اس کو 'کل' دکھانا پڑتا ہے۔ درحقیقت سینما ایک ایسی صنعت ہے جس میں صرف خاص خاص جزئیات چن لی جاتی ہیں اور اس انتخاب سے باقی ان جزئیات کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے جو اس لئے چھوڑ دی جاتی ہیں کہ تخیل خود ان کو پیدا کرے۔ اسی لئے ایک اعلےٰ پایہ کی فلم ہمارے دماغ کے لئے بہترین قسم کی خوراک مہیا کرتی ہے۔" (مس کاکس ہیڈ)

وہ اس شاندار محل کا صرف خاکہ پیش کرتی ہے جو ہمارے تخیل کو خود تعمیر کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے فلم میں کوئی ایسی چیز نہیں دکھا[نی] چاہئے جس کی کوئی اہمیت نہ ہو۔ اور کسی منظر کا وہی حصہ پیش کر[نا] چاہئے جس سے دماغ سارے منظر کا تصور کر سکے۔ غیر ضروری حصہ پیش کرنا نہ صرف بیکار ہوتا ہے بلکہ حاضرین کی توجہ کو دوسر[ی] طرف مبذول کر دیتا ہے۔ "سان لوئی رے کا پل" میں ایک لڑ[کا] دکھایا گیا ہے جو ایک رقاصہ پر عاشق ہے اور ہر رات اس [کا] رقص دیکھنے جاتا ہے۔ رقص شروع ہونے سے پہلے لڑکے کو دکھایا گیا ہے اس کے ساتھ اور کئی آدمی بیٹھے ہیں اور وہ ا[س] میں دلچسپی لے رہا ہے۔ لیکن جب رقص شروع ہو جاتا ہے [تو] لڑکے کا صرف چہرہ ہی دکھایا جاتا ہے باقی تمام پردہ سیاہ [ہے۔] اس سے اس کا انہماک، اس کے پاس بیٹھے ہوئے لوگوں [کی] بے پروائی اور اس کے ہیجان آفرین جذبات خوب نمایاں ہ[و] جاتے ہیں۔

ہندوستانی فلموں میں "پورن بھگت" ہی ایک ایسی فلم ہ[ے] جس میں یہ دونو باتیں دکھائی دیتی ہیں۔ یعنی فلم کو بحیثیت کل سوچا گیا ہے اور جزئیات کو نمایاں کرکے پیرایۂ بیان کو دلچسپ

بنایا گیا ہے ۔ اندھے فقیر کا ہر اہم واقعے کے اختتام پر گانا یونانی ڈرامہ میں کورس کے گانے کی کیفیت پیدا کرتا ہے ۔ لیکن "پورن بھگت" کی کامیابی کا راز شاید موسیقی کا شاندار اور صحیح استعمال ہے۔ "عالم آرا" کی طرح شہزادے کی سالگرہ پہ بھاگ نہیں گایا جاتا ۔ کردار کی جذباتی حالت جو الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتی موسیقی سے بیان کی ہے۔ ہندوستانی آلات موسیقی کو انگریزی آرکسٹرا کی طرز پر بجا کر ان میں ہم آہنگی پیدا کی گئی ہے ۔ اگرچہ "پورن بھگت" میں کئی نقائص اور فروگذاشتیں ہیں ۔ تاہم فلم کو دیکھ کر یہ تو محسوس ہوتا ہے کہ اس کا بنانے والا کوئی ذی شعور اور باسمجھ انسان ہے دیوکی بوس واقعی مبارکباد کے مستحق ہیں ۔ عام ہندوستانی فلم دیکھ کر تو یہ خیال ہوتا ہے کہ کوئی پریشان دماغ آدمی کہانی سنا رہا ہے اور ایک نہایت ہی بھدا مصور اس کو "باتصویر" بنا رہا ہے ۔

ہندوستانی فلموں میں ترتیب کا کچھ خیال نہیں ہوتا ۔ اس بات کو نہیں سوچا جاتا کہ فلاں سین اگر فلاں کے بعد آئے تو زیادہ مؤثر ہوگا یا پہلے آئے تو ۔ جہاں تک ترتیب کا تعلق ہے فلمکار کو دو باتوں کا خیال رکھنا چاہئے ۔ ایک تو شاٹوں کی ترتیب اور دوسرے شاٹ لیتے وقت فلمی مواد کی ترتیب ۔ فرض کیجئے ہمارے سامنے ذیل کے تین شاٹ ہیں ۔ ایک آدمی کا غمگین چہرہ دکھایا گیا ہے ۔ پھر ایک لڑکی کی تصویر اور پھر اسی آدمی کا متبسم چہرہ ۔ اگر ان تینوں شاٹوں کو اسی ترتیب سے جوڑ دیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایک غمگین آدمی لڑکی کی تصویر دیکھ کر خوش ہو گیا ہے ۔ لیکن اگر پہلے شاٹ کو تیسرے سے بدل دیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ شخص لڑکی کی تصویر دیکھ کر مغموم ہو گیا ہے ۔

فلمی مواد کی بھی ایک زمانی سمت ہوئی چاہئے ۔ اس کا شروع اور اخیر بدلتے وقت اس کے معنی بھی بدل جاتے ہیں ۔ اگر پانی میں ایک کنکر پھینکا جائے تو اس سے دائرے بننے شروع ہو جاتے ہیں جو پھیلتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ اب اگر اسی شاٹ کو الٹا کر دیا جائے تو دائرے کم اور آخر ایک نقطہ پر ختم ہوتے ہوئے دکھائی دینگے دائروں کو پھیلتے ہوئے دیکھ کر طبیعت میں وسعت اور کشادگی اور کسی قدر خوشی کا احساس ہوگا ۔ دوسری حالت میں طبیعت پر بوجھ معلوم ہوگا اور اس طرح کی کیفیت ہوگی جو دم گھٹنے سے ہوتی ہے اسی طرح ایک مکان کے گرنے سے جو اثر ہوگا وہ اس سے مختلف ہوگا جو مکان کے تعمیر ہونے سے ہوتا ہے ۔ ہندوستانی تو کیا بعض مغربی ڈائرکیٹر بھی اس بات سے نا واقف معلوم ہوتے ہیں

ماحول کی پیدائش کے لئے اکثر اوقات ڈائرکیٹر کو ایسے مناظر لانے پڑتے ہیں ۔ جن کا موضوع سے صرف بالواسطہ تعلق ہوتا ہے اس وقت یہ احتیاط لازم ہے کہ ایسے مناظر دوسرے مناظر میں اس طرح ڈھلتے جائیں کہ ان کی اجنبیت یا علیحدگی کا احساس نہ ہو چہ جائیکہ "حاتم طائی" کی طرح موضوع سے تعلق رکھنے والے مناظر کو بھی اس بے ربطی سے پیش کیا جائے کہ فلم کا ہر ٹکڑا الگ الگ معلوم ہو ۔ ماحول کی پیدائش سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ خاص خاص سین زیادہ مؤثر ہو جاتے ہیں ۔ مثلاً اگر ایک المناک افسانہ دکھانا مقصود ہو تو اس کے لئے ضروری ہے کہ جگہ جگہ غم کی طرف اشارہ کیا جائے تاکہ اخیر میں دیکھنے والوں پر بہت اثر ہو ۔

ہندوستانی کامیڈی کی ناکامی کی ایک بڑی وجہ ماحول کی پیدائش سے بے پروائی ہے ۔ ہنسانے کے لئے ضروری ہے کہ سامعین ایکٹر سے ہمدردی رکھتے ہوں ۔ کیونکہ اگر کوئی شخص ہمیں رلانے کی کوشش میں ناکام رہے تو اس پر رحم آتا ہے لیکن اگر کوئی شخص ہنسانے کی کوشش میں ناکام رہے تو اس پر غصہ آتا ہے۔ کامیڈی میں ضروری ہے کہ شروع شروع میں مذاق کا رنگ پیدا کیا جائے ۔ اس کے بعد اگر کوئی بھونڈی چیز بھی آ جائے تو ناگوار نہیں گزرتی ۔ ہمارے ہاں شروع ہی میں کوئی ایسا مذاق کیا جاتا ہے جس پر ایکٹر سے نفرت ہو جاتی ہے اور پھر باقی وقت میں غصہ آتا رہتا ہے ۔

ہماری کامیڈی کی ناکامی کی دوسری وجہ یہ ہے کہ ہم مغرب کی نقل کرتے ہیں۔ ہماری فلموں میں اسی قسم کے مذاق ہوتے ہیں جو ہم مغربی فلموں میں دیکھتے ہیں۔ جب تک ہم اپنی ظرافت کو کام میں نہ لائینگے ہم کامیاب نہیں ہو سکتے۔

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں مناظر کا انتخاب اور اس بات کی دریافت کہ وہ کس زاویہ سے دکھائے جائینگے بہت اہم باتیں ہیں

"فلم کے سامنے ساری کائنات اور زمانہ کا لامتناہی سلسلہ پڑا ہے۔ اسے اختیار ہے کہ زمان و مکان کے دامن میں جتنے رنگا رنگ جلوے ہیں ان میں جسے چاہے منتخب کرے۔۔۔ البتہ انتخاب بہت اہم کام ہے۔" (پروفیسر بخاری)

زیادہ افسوس کا مقام یہی ہے کہ ہمارے فلمکاروں کی نظر انتخاب بہت کمزور ہے۔ کوئی منظر بذات خود کتنا ہی دلکش کیوں نہ ہو اگر اس کا اصلی موضوع سے کچھ تعلق نہیں تو بیکار ہے۔ "جلتی نشانی" میں اونٹوں کی ایک قطار کھجوروں کے درختوں کے پاس سے گزرتی ہوئی دکھائی گئی ہے اور سورج غروب ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ منظر بذات خود بہت خوبصورت ہے لیکن اس کا فلم سے کچھ تعلق نہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی دوسری فلم سے کاٹ کر اس میں جوڑ دیا گیا ہے۔ ایک انگریزی فلم "ٹیل می ٹو نائٹ" میں اٹلی کے دلکش پہاڑوں، جھیلوں اور وادیوں کے مناظر بڑی افراط سے دکھائے گئے ہیں لیکن کہانی میں ایک ایسی رومانیت اور قدرتی مناظر کا ایک ایسا عنصر پایا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ فلم کا ایک حصہ بن گیا ہے۔ ایک امریکن فلم "کیمرٹ" میں ایک خوبصورت منظر کو بڑی خوبصورتی سے استعمال کیا گیا ہے۔ ایک نوجوان کسی بوڑھے ڈیوک کی داشتہ پر عاشق ہو جاتا ہے اور اس کے ہمراہ چند دن کے لئے کسی اور جگہ چلا جاتا ہے۔ وہاں ایک باغ کا سین ہے جس میں بہت خوبصورت درخت اور پھول اُگ رہے ہیں۔ مدھم روشنی درختوں کے پتوں سے چھن چھن کر آ رہی ہے۔ ننھی ننھی تیتریاں اور بھونرے اڑ رہے ہیں جو روشنی میں گزرتے وقت بہت چمکتے ہیں۔ اس منظر میں دونوں کی رومانی محبت دکھانی منظور ہے۔ اس لئے باغ غیر معمولی طور پر خوبصورت نظر آتا ہے۔ جب نوجوان سے لڑکی چھن جاتی ہے تو ہر چیز اپنا اصلی رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ محبت میں ہر معمولی سے معمولی چیز بھی رومانی نظر آتی ہے۔

ان مثالوں سے واضح ہو گیا ہوگا کہ کسی ایسے خوبصورت منظر کا انتخاب جو موضوع سے تعلق نہ رکھتا ہو اور کیمرے کی بلا ضرورت حرکت کا نتیجہ ہو۔ اکثر فلم کے لئے خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ یہ چیزیں فلم کی کامیابی کے لئے ضروری نہیں ہیں۔ چارلی چپلن کی آخری فلم "سٹی لائٹس" میں نہ تو کیمرے کا زاویۂ نگاہ ہی غیر معمولی ہے اور نہ اس کی حرکت ہی کچھ زیادہ نمایاں ہے لیکن پھر بھی فلم بہت کامیاب ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ کہنہ مشق چپلن اپنے فن سے خوب واقف ہے۔ فنی اعتبار سے فلم میں کہیں بھی تصنع نظر نہیں آتا یا دوسرے الفاظ میں چپلن نے فن کو موضوع پر سبقت نہیں دی اور فن کا کمال بھی یہی ہے کہ فن نظر نہ آئے۔ اگر معاملہ اس کے برعکس ہے تو جان لیجئے کہ ڈائریکٹر نے فن سے نہیں بلکہ فنا پا سے کام لیا ہے۔

ایک ناول نویس کی طرح ایک ڈائریکٹر بھی زندگی پر تنقید کرتا ہے۔ وہ اکثر بلا ارادہ ایسے مناظر منتخب کرتا ہے۔ جس سے اس کی طبیعت کے میلان کا پتہ چلتا ہے۔ لوبش کی ہر فلم میں تھوڑی بہت کلبیت نظر آتی ہے جو کامیڈی میں زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے۔ شاید کلبیت اس کے فلسفہ زندگی کا اہم جزو نہ ہو تاہم یہ تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کی طبیعت میں اس کا ایک گہرا رنگ موجود ہے۔ جن ڈائریکٹروں کا کوئی خاص نقطہ نظر ہوتا ہے وہ اکثر اس کی تکرار کرتے ہیں۔ مثلاً جوزف فان سٹرن برگ میں ایک مصنوعی قسم کی رومان آلود جذبات پرستی ہے جس کی تکرار "مراکو" "ڈس آنرڈ" "شنگھائی ایکسپریس" اور دوسری فلموں میں ہوتی ہے

ہندوستانی فلموں میں ابھی ایسی باتوں کی توقع پیش از وقت ہے۔ ابھی تو یہی غنیمت ہے کہ کوئی سیدھی اور سلجھی ہوئی فلم نظر آجائے جس میں جگہ جگہ جھول نہ پڑتی ہو۔ ہندوستانی فلموں کا مستقبل بڑا شاندار ہوسکتا ہے۔ ہمارے ہاں بلند سے بلند پہاڑ دلکش منظر، جھیلیں، ریگستان اور خوبصورت عمارات کی کوئی کمی نہیں۔ آج تک کسی نے ان کو مناسب طریقے پر استعمال نہیں کیا۔ ہمارے ہاں جو کہانیوں اور روایتوں کا ایک ذخیرہ پڑا ہے اس کو کسی نے چھیڑا تک نہیں۔ لیکن میں مایوسی کا قائل نہیں بہت ممکن ہے کہ اب اس وقت کوئی ایسی فلم ہندوستان میں بن رہی ہو جو ان سب شکایات کو بیکار بنادے۔

آغا عبدالحمید

نگار خانۂ چین

رفیق

شام کا اندھیرا پھیلتے ہی گل و بلبل کی عشق بازیاں ختم ہوگئیں۔ بھونرے اپنے محبوب پھولوں سے اُکتا کر جدا ہوگئے۔

رات کا پچھلا پہر آپہنچا۔ تاروں کی محفل برخاست ہونے لگی۔ لے لو۔ وہ ایک ایک کر کے سب کے سب آسمان سے رخصت ہوگئے۔

لیکن میں اور چینگ کی پہاڑی ہم ایک دوسرے کی رفاقت سے کبھی سیر نہیں ہوتے۔ چاہے ہم کتنا ہی عرصہ اکٹھے رہیں۔

غلام عباس

عبدالقادر سروری

نثری افسانوں کا ارتقا

فورٹ ولیم کالج کے قیام تک

نظمیں، خصوصاً قصہ دار نظمیں، زبانوں کی اولین یادگار ہوتی ہیں۔ اسی طرح کی نظموں میں قوموں کے جذبۂ قصہ گوئی کا اظہار سب سے پہلے ہوتا ہے۔ اور انہی کے ذریعے قصہ خوانی اور قصہ سننے کا ذوق افراد قوم میں سرایت کر جاتا ہے۔ لیکن قومی ذہن جب کافی طور پر نشوونما پا چکتے ہیں اور مربوط اور مسلسل خیالات کے اظہار پر انہیں قدرت حاصل ہو جاتی ہے۔ تو نظم کی بندشیں ان کو اپنے راستے میں حائل معلوم ہونے لگتی ہیں۔ عموماً اسی وقت سے نثر میں اظہار خیال کی کوششیں شروع ہوتی ہیں۔ پہلے پہل تو سیدھی سادی زبان میں خیالات ظاہر کئے جاتے ہیں۔ لیکن جیسے جیسے قومی احساس شعریت کو ترقی ہوتی جاتی ہے نثر میں بھی حسن پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے

نظم کی طرح نثر میں بھی، سب سے پہلی قابل گفتنی چیز جو قوموں کو نظر آتی ہے۔ وہ اپنے اسلاف کے کارنامے ہیں۔ جو رفتہ رفتہ مبالغہ آمیز (یعنی افسانوں اور داستانوں کی) شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے۔ کہ زبان کے نشوونما کی ابتدائی حالت میں چند شائستہ زبانیں اور ان کا ادب اس کے اردگرد موجود ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں ترقی یافتہ زبانوں سے وہ فطرتاً متاثر ہوتی ہے۔ انشا پردازوں کے لئے بنے بنائے سانچے مہیا مل جاتے ہیں۔ ان سے وہ صرف فراخدلی کے ساتھ استفادہ کرتے ہیں۔ بلکہ بعض وقت انہیں زبانوں کی ادبی صورتوں پر، یہ اپنے ادب کی بنیادیں قائم کر لیتے ہیں۔

بعینہ یہ حال اردو زبان کا ہے۔ اس کے تشکیلی دور میں، فارسی زبان کا وسیع اور متنوع ادب، اس کے اطراف پر موجود تھا۔ اس لئے ابتدائی زمانے کے انشا پردازوں نے فطرتاً اس سے استفادہ کیا۔ شاعری میں فارسی شعر کی صنفوں کے ساتھ، فارسی تلمیحات اور فارسی اسالیب بھی بعینہ یا کچھ تغیر کے ساتھ اردو میں منتقل ہو گئے۔ فارسی کے افسانوی ذخیرے سے بھی اردو ادیبوں نے کافی فائدہ اٹھایا۔ چنانچہ ابتدائی دور میں فارسی قصوں اور داستانوں کی طرز کے بہت سے قصے اردو زبان میں لکھے گئے۔ منظوم اردو قصوں پر پہلے پہل کچھ اثر ہندوستانی زبانوں کا رہا۔ لیکن نثری قصہ نگاری کی ابتدا براہ راست فارسی کے اثر کے تحت ہوئی۔ چنانچہ اولین ادبی قصہ "سبرس" یا قصہ حسن و دل" فارسی ہی کے ایک مقبول قصے کا آزاد ترجمہ ہے۔

"سبرس" کا مصنف وجہی ابراہیم قطب شاہ (۹۵۷ھ - ۹۸۸ھ) والیٔ گولکنڈہ کے دربار کا مشہور شاعر تھا۔ اس نے "قطب مشتری" کے نام سے ایک مشہور قصّہ بھی لکھا ہے۔ جو دکنی ادب کا بیش بہا کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ "سبرس" (۱۰۴۵ھ) کی تصنیف کا زمانہ درحقیقت منظوم قصّوں کا دور ہے۔ دنیا کی زبانوں کے نثری قصّے عموماً بعد کی پیداوار ہوتے ہیں۔ لیکن اردو میں نثری قصّے بھی، منظوم قصّوں کے عہد ہی سے لکھے جانے لگے تھے۔ چنانچہ وجہی، نثری اور منظوم قصّوں کا سب سے پہلا مصنف ہے۔ جس طرح اس کی تصنیف "قطب مشتری" کو منظوم قصّوں میں اولیّت کا شرف حاصل ہے۔ اسی طرح نثری قصّے کا بھی وہ موجد ہے۔

"سبرس" یا "قصّہ حسن و دل" فارسی زبان میں بھی ایک سے زیادہ مرتبہ لکھا جاچکا تھا۔ اس کی اسی مقبولیت نے، وجہی کو ترجمہ کرنے پر ابھارا۔ لیکن ترجمہ اصل کا لفظ بلفظ پابند نہیں ہے۔ وجہی نے اس میں حسب ضرورت تصرفات بھی کئے ہیں۔

"سبرس" کا اصل مقصد معرفت اور تصوف کے بعض مسائل کی توضیح ہے۔ لیکن یہ چیز قصّے کی دلچسپی پر کسی حالت میں بھی اثر انداز نہیں ہوتی۔ پورا قصّہ ایک تمثیل کے پیرایہ میں لکھا گیا ہے۔ اشخاص قصّہ کے نام بھی ایک معنی رکھتے ہیں۔ دل اس کا ہیرو اور حسن اس قصّے کی ہیروئین ہے۔ حسن کی تلاش میں دل کو جو ہفت خواں طے کرنے پڑتے ہیں۔ اسی سے قصّے کا پلاٹ پیدا ہوتا ہے۔

یہ عشقیہ مہماتی قصّہ ہے۔ اور بہت ہی نفاست اور خوبی کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ اس کی دلچسپی، بعد کے اکثر قصّوں سے بہت زیادہ، اور اس کی فضا گو نصب العینی اور رومانی سہی، لیکن بہت ہی موثر ہے۔ یہ اتفاقی بات ہے۔ کہ اردو کا یہ اولین قصّہ مرصّع اسلوب میں لکھا گیا ہے۔ لیکن پھر بھی اس میں ایک سادگی اور ایک لطف ہے۔ جو بعد کے مرصّع قصّوں میں بہت کم نظر آتا ہے۔ اگر زبان کی قدامت کا لحاظ نہ ہو۔ تو یہ قصّہ اب بھی فرصت کے اوقات کا بہترین مطالعہ ثابت ہوگا۔

فارسی قصّے اگر ان اولین اردو مصنفین کے پیش نظر نہ ہوتے۔ تو اس دور تشکیل میں "سبرس" جیسے بسیط اور نفیس قصّے کا لکھا جانا ناممکن تھا۔ یہ اردو ادب کی خوش نصیبی تھی۔ طرح اندازی کے لئے فارسی ادب کے ایسے نفیس نمونے اسے مل گئے۔ قصّہ نگاری کے اس خاص انداز کی ابتدا جو وجہی سے ہوئی۔ وہ اردو افسانہ نگاری کے قدیم دور کے اختتام تک برابر قائم رہی۔ چنانچہ دکنی ادب کے ابتدائی عہد سے لے کر زوال لکھنؤ تک کے طویل عرصہ میں جتنے قصّے اردو میں لکھے گئے۔ وہ تقریباً تمام کے تمام اسی طرز کے ہیں۔ صرف چند قصّے ایسے ملتے ہیں، جن میں مرصّع اسلوب کا لحاظ کم کیا گیا ہے۔ اس میں مصنف قصّہ کے طبعی رجحانات کو بھی بہت دخل ہے۔

"سبرس" کے بعد کئی قصّے لکھے گئے ہوں گے۔ لیکن ان میں سے اب بہت کم دستیاب ہوتے ہیں۔ دوسرا قصّہ جو ملتا ہے۔ وہ دکنی سلطنتوں کے زوال کے قریب کا ہے۔ یہ قصّہ "توتا کہانی" کے نام سے مشہور ہے۔ لیکن اس کے مصنف کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ سنہ تصنیف ۱۱۴۲ھ ہے۔ یہ "سبرس" کے قریباً ایک سو سال بعد لکھا گیا۔ اور فارسی ہی کے ایک مقبول قصّے کا ترجمہ ہے۔ اصل قصّہ "طوطی نامہ" سنسکرت کے قصّے "شکاسپ تتی" سے ماخوذ تھا۔ سب سے پہلے ملا ضیاء نخشبی نے اس کی باون[۵۲] حکایتوں کا ترجمہ "طوطی نامہ" کے نام سے فارسی میں کیا تھا۔ گیارھویں صدی ہجری میں ملا محمد قادری نے ضیاء نخشبی کے "طوطی نامہ" سے پینتیس[۳۵] قصّوں کو سلیس فارسی زبان میں لکھا۔ اردو کا اولین "طوطی نامہ" ملا محمد ہی کے منتخبہ قصّوں کا ترجمہ ہے۔

"سبرس" کے مقابلہ میں "توتا کہانی" کا اسلوب بہت سادہ اور سلیس ہے۔ اس کا سبب خود ملا محمد کا قصّہ معلوم ہوتا ہے۔ جو سادہ زبان میں لکھا گیا تھا۔ ورنہ وجہی کے مرصّع قصّے کے پیش نظر ہوتے ہوئے "توتا کہانی" کا ایسے سادہ اسلوب میں لکھا جانا تعجب سے خالی نہ

تا۔ بہرحال اردو کے سلیس قصوں میں "توتا کہانی" سب سے پہلا قصہ ہے۔ بعد میں فورٹ ولیم کالج (کلکتہ) کے انشا پرداز، سید حیدر بخش حیدری نے اپنا مشہور کارنامہ "توتا کہانی" لکھتے ہوئے اسی کو پیش نظر رکھا۔ دکنی "توتا کہانی" اور حیدری کی "توتا کہانی" میں اسالیب بہت ملتے جلتے ہیں۔

سنسکرت میں لقمان کی حکایتوں کی طرز کے قصوں کو بہت عروج ہوا تھا۔ سنسکرت کے یہ تمثیلی قصے زیادہ بسیط اور زیادہ نفیس ہیں۔ ہندوستان کے صناع ایسے قصے معاشرتی اور اخلاقی مقصد سے لکھتے تھے۔ لیکن یہ اس حسن کے ساتھ ترتیب کئے جاتے تھے۔ کہ اصل قصہ کی دلچسپی میں کسی طرح بھی حارج نہیں ہوتا تھا۔ "انوار سہیلی" اس کا ثبوت ہے۔ "توتا کہانی" بھی "انوار سہیلی" کی ٹکر کا قصہ ہے لیکن اس ماخوذ ترجمے میں، وہ وسیع تنوع نہیں ہے جو "انوار سہیلی" کے قصوں میں موجود ہے۔ پھر بھی "توتا کہانی" "سب رس" سے زیادہ قبول قصہ ثابت ہوا۔ اور اردو میں یہ نہ صرف ایک سے زیادہ مرتبہ دہرایا گیا۔ بلکہ بعض اچھی قصوں پر بھی اس کا اثر پڑا۔

دکنی ادب کے زریں دور میں یہی دو قابل ذکر قصے پیدا ہوئے۔ اس میں شک نہیں کہ دکنی سلطنتوں کے زوال کے بعد بھی منظوم قصے یہاں عرصے تک لکھے جاتے رہے لیکن نثری قصے بہت کم دستیاب ہوتے ہیں۔

بیجا پور اور گولکنڈہ کی سلطنتوں کی تباہی کے بعد دہلی میں اردو ادب کو فروغ نصیب ہوا لیکن دہلی میں زیادہ تر شعر و سخن کے چرچے رہے۔ اور شعری اصناف ہی کو یہاں ترقی ہوئی۔ نثری ادب کی طرف دہلی کے انشا پردازوں نے توجہ ہی نہیں کی۔ ابتدائی زمانہ ایسے شعرا کی کاوشوں پر مشتمل ہے۔ جو فارسی زبان کے شاعر تھے۔ اور تفریح طبع کے لئے اردو میں بھی شعر کہہ لیا کرتے تھے۔ ایسے زمانہ میں نثر کی طرف توجہ نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن تعجب تو یہ ہے۔ کہ دہلی کی شاعری کے زریں عہد یعنی میر اور سودا کے زمانے میں بھی نثر میں کچھ نہیں لکھا گیا۔ ٹھیٹ اردو شعرا بھی جب کوئی چیز نثر میں لکھتے ہوتی۔ فارسی میں لکھتے۔ میر تقی میر کا تذکرہ فارسی ہی میں لکھا گیا۔

دہلی کے اس زریں عہد میں صرف ایک نثری کارنامہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اور وہ اتفاق سے قصہ ہی ہے مشہور ہے۔ کہ سودا نے میر کی مثنوی "شعلۂ عشق" کو نثر میں لکھا تھا لیکن اب یہ نثر لاپتہ ہے۔ اس کو چھوڑ کر جعفر زٹلی کی چند عبارتوں اور فضلی کی "دہ مجلس" (ترجمہ روضۃ الشہدا) کے علاوہ دہلی کی تباہی سے پہلے شاید ہی کوئی نثری چیز یہاں لکھی گئی ہو۔

دہلی کی تباہی کے بعد یہاں کے ارباب سخن جب لکھنؤ پہنچے۔ تو لکھنؤ کے ادبی حلقوں میں ان کی بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ دہلی کے ترانہ سنجوں سے وہ ایسے مسحور ہوئے۔ کہ عرصہ تک شعر و سخن کی دلچسپیوں میں غرق رہے۔ اسی کو انہوں نے ترقی دی۔ اور اسی میں جدتیں پیدا کیں۔ کئی منظوم قصے لکھے جن میں سے ایک اردو منظوم قصہ گوئی کا معراج کمال ہے۔ لیکن نثر میں فورٹ ولیم کالج کے قیام یا لکھنؤ کے تنزل سے پہلے، بہت کم لکھا گیا۔

نواب شجاع الدولہ (۱۷۵۳ء - ۱۷۷۵ء) کے عہد حکومت میں شمالی ہند کا سب سے پہلا نثری قصہ وجود میں آیا۔ یہ عطا حسین خاں تحسین اٹاوی کا قصہ "نو طرز مرصع" ہے۔ جو ۱۷۷۵ء کے قریب لکھا گیا۔ تحسین انگریزوں کی ملازمت میں رہ چکے تھے۔ لیکن پھر بھی ان کی طبیعت مرصع نگاری کی طرف مائل تھی۔ چنانچہ اپنے زمانہ میں یہ "مرصع رقم" کے لقب سے مشہور تھے۔ تحسین کا قصہ فارسی کے "چہار درویش" کا ترجمہ ہے۔ جس کو میر امن دہلوی کے قلم نے لازوال بنا دیا ہے۔ میر امن کا اسلوب جس قدر سادہ ہے۔ تحسین کا اسلوب اسی قدر مرصع اور پیچیدہ۔ تحسین کے قصے کو اب دلچسپی کی خاطر کوئی نہیں پڑھتا۔ بلکہ یہ ایک تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔

لکھنؤ کے مشہور شاعر انشاء اللہ خاں انشا۔ ایک داستان کے بھی مصنف ہیں۔ جو اب چھپ چکی ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے۔ کہ یہ ٹھیٹ اردو زبان میں لکھی گئی تھی۔ فارسی یا عربی الفاظ کے اخراج کا اس میں التزام کیا گیا ہے۔

لکھنؤ کے زوال سے پہلے پہلے ایک اور اہم قصہ بھی یہاں لکھا گیا۔ یہ قصہ "فسانہ عجائب" ہے۔ اور اس کے مصنف رجب علی بیگ سرور ہیں۔ قدیم ادبی دور کے ختم سے پہلے کا یہی ایک قصہ ہے۔ جو فورٹ کالج سے باہر اور اس کالج کی کارگزاری کے زمانہ میں لکھا گیا۔

رجب علی بیگ سرور لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ اسی سماج اور اسی ماحول میں ان کا ادبی کردار بنا جس میں آتش، ناسخ، دبیر، و انیس جیسے صناع دماغوں کی پرورش ہوئی۔ سرور قدیم مرصع اسلوب کے سب سے آخری مستند استاد سمجھے جاتے ہیں۔

سرور شاعر بھی تھے لیکن ان کی زندگی کا بڑا کارنامہ ان کے قصے ہیں۔ انہوں نے کل چار قصے لکھے تھے: "شگوفہ محبت" "شبستان سرور" "شرر عشق" اور "فسانہ عجائب"۔ "شبستان سرور" الف لیلہ کے چند قصوں کا ترجمہ ہے۔ جو سرور نے اپنے خاص انداز میں نہایت خوبی سے کیا ہے۔ باقی قصے ان کی اپنی فکر کے نتائج ہیں۔ لیکن ان سب میں "فسانہ عجائب" کئی حیثیتوں سے اہم ہے۔ یہ قصہ اسلوب کی نزاکت، روزمرہ اور محاورہ کے لطف اور سب سے زیادہ عشقیہ مہمات کی دلچسپیوں کے باعث ہمیشہ زندہ رہے گا۔

"فسانہ عجائب" کے خاکے (پلاٹ) میں واقعات بہت گتھے ہوئے ہیں۔ اور مہمات کی دلچسپیوں کے ساتھ ساتھ بزمیہ اور حیرت زا واقعات کے اختلاط کا یہ عجیب و غریب مجموعہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قصہ فوق الفطرت یا فوق العادت واقعات سے پُر ہے۔ اس کے کردار انفرادی امتیازات سے عاری اور انسانی جذبات اور احساسات سے بیگانہ ہیں نصب العینیت اور رومانیت کا اردو میں یہ قابل ذکر کارنامہ ہے۔ جس کو اسلوب کی ندرت نے ہمارے ادب کے لئے ناقابل فراموش بنا دیا ہے۔

سرور کا قصہ بہت زیادہ طولانی بھی نہیں۔ کہ اس کے پڑھنے کے خیال ہی سے انسان گھبرا جائے۔ یہی اسباب ہیں۔ کہ سرور کا قصہ زندہ رہا۔ حالانکہ اس سے زیادہ محنت اور تخیل کی سعی مسلسل کے عجیب و غریب نمونے جیسے "طلسم ہوش ربا" اور "بوستان خیال" وغیرہ ایک عجائب روزگار، تخلیق انسانی کی طرح صرف دیکھنے کے لئے رہ گئے ہیں۔ انہیں استعمال کرنے کی جرأت بہت کم لوگ کرتے ہیں۔
"فسانہ عجائب" پر قدیم قصہ نگاری کا عہد ختم ہو جاتا ہے۔

عبدالقادر سروری

"بہر کجا کہ رسیدیم کاروان پیداست"

رشید احمد صدیقی

—"کاروان پیداست"

کہتے ہیں ایک بار تین بزرگ ہمسفر ہوئے، ایک نائی، ایک گنجا ایک فلسفی۔ رات کا وقت ہوا اور طے یہ پایا کہ ہر شخص باری باری سوئے جاگے۔ ترتیب یہ قرار پائی کہ سب سے پہلے نائی پہرہ دے اس کے بعد فلسفی اور اس کے بعد گنجا۔ چنانچہ موخرالذکر دونوں بزرگ سو رہے اور نائی پہرہ دیتا رہا۔ کچھ دیر تک تو نائی جاگتا رہا۔ لیکن آخر طبیعت اکتائی تو اس نے سوچا کہ کوئی شغل کرنا چاہیئے ورنہ وقت کٹنا دوبھر ہو جائیگا چنانچہ اس نے کسوت کھول کر استرہ نکالا اور بیٹھے بیٹھے فلاسفر کا سر مونڈ دیا۔ وقت معینہ ختم ہونے پر اس نے فلسفی کو جگا دیا اور خود سو رہا۔ فلسفی نے جمائی لے کر اتفاقاً سر پر ہاتھ پھیرا تو چونک پڑا اور متحیر ہو کر بولا۔ "باری تو میری تھی اس کمبخت نائی نے گنجے کو کیوں جگا دیا!"

مجید صاحب اور مجھ میں بالمشافہ یہ طے ہوا تھا کہ ہوسکا تو کاروان کے لئے مضمون لکھ دونگا۔ بات آئی گئی ہوئی۔ مجید صاحب کو یہ یقین کہ میں مضمون لکھ دونگا۔ اور مجھے یہ تقویت کہ آخر اپنے اختیار کی بات ہے چنانچہ مجید صاحب نے یاددہانی کے لئے تار بھی بھیجے لیکن میں دنیا کی بے ثباتی پر ہنستا رہا۔

ایک روز دروازے پر ایک موٹر آکر رکی۔ میں نے ہر قسم کی موٹر دیکھی ہے لیکن یہ موٹر اپنی سج دھج اور شور و شغب میں نرالی تھی رکی رہتی تو معلوم ہوتا کوئی سنیاسی حبس دم کئے ہوئے ہے۔ چلنے والی ہوتی تو معلوم ہوتا جاپان میں زلزلہ آرہا ہے، چلتی تو پھر

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

ڈاکٹر بٹ صاحب نمودار ہوئے، ایک نعرہ لگایا، کہاں ہے رشید، نوکر، بچے، اعزا سب بھاگ کر گھر میں آئے باوجود اس کے کہ میں اپنے مکان کے اس کمرہ میں تھا جہاں اندر صحن کی آواز بھی بمشکل پہنچ سکتی تھی اس خلفشار نے مجھے بھی سراسیمہ کر دیا، باہر نکلا تو آواز آئی ارے مجید کا خط آیا ہے تم نے کاروان کے لئے مضمون لکھا یا نہیں۔ پہلے تو میں نے ذہن میں اس امر کا جائزہ لیا کہ مکان میں کوئی شخص بیمار تو نہیں ہے۔ جب اس طرف سے اطمینان ہوا تو کسی قدر دلیر ہو کر بولا، کیسا مضمون؟ ڈاکٹر صاحب بولے ناک میں دم ہے۔ تم نے کاروان کے لئے مجید سے مضمون لکھنے کا وعدہ کیا ہوا تھا۔ اس کا خط آیا ہے کہ مضمون لے کر بھیج دیا جائے۔ میں نے کہا جناب لکھنے یا نہ لکھنے کا وعدہ تو میں نے ان سے کیا تھا، آپ مجھ پر کیسے مسلط ہوگئے۔ بولے سلام علیکم، گاڑی پر لرزہ طاری ہوا، محلہ والوں کے کان کھڑے ہوئے، انجن نے زقند بھری اور سوار و سواری دونوں غائب!

برق تھی، صرصر تھی یا تھا زلزلہ

ٹائیفائڈ نے درود فرمایا گھر میں بچی بیمار ہوئی - خیال آیا ڈاکٹر صاحب کے ہاں چلوں' ساتھ ہی ساتھ مضمون کا خیال آیا جس کا کوسوں پتہ نہ تھا' معاً جھوٹ بولنے کی تحریک ہوئی' ایک مصرعہ بھی ذہن میں آگیا اور ایسا رواں اور شگفتہ کہ دیکھتے دیکھتے پوری نظم مرتب ہوگئی -

ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی پر پہنچا - یہ کوٹھی میرس روڈ پر ابھی حال ہی میں تیار ہوئی ہے' نہایت وسیع' نہایت خوش قطع' سامنے گھاس کا کشادہ میدان' آمد و رفت کا راستہ بھی نہایت ستھرا' ہموار اور کشادہ ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ہوئی - انفلوئنزا میں مبتلا' دیکھتے ہی بولے خوب آئے کوٹھی کا نام تجویز کرو' میں نے کہا یہ آپ نے روکار پر لکھا رکھا ہے' فرمایا حمید بٹ اور محمود بٹ ہیں نے کہا یہ کوٹھی کا نام ہے یا خاندان کا شجرہ نسب' کہنے لگے ہرج ہی کیا ہے' میں نے کہا ایسا نام بھی کیا جس کو نہ ثواب سے لگاؤ نہ آرٹ سے تعلق' ثواب کی خاطر رکھتے تو کراماً کاتبین میں کیا قباحت تھی اور آرٹ مدنظر تھا تو یاجوج ماجوج رکھتے - الکتا کر بولے' ناک میں دم ہے' آخر تمہیں کچھ بتاؤ' لیکن میں منزل ولزل کا قائل نہیں' میں نے کہا پھر ظاہر ہے بٹ کدہ نام رکھیے' ہندوستانی حکومت اور اردو رسم الخط بدلتے بدلتے بتکدہ رہ جائیگا !

فرمایا کہو کہاں چلے' میں نے کہا بچی ٹائیفائڈ میں مبتلا ہے - کہنے لگے حال سناؤ' میں نے حال کہنا شروع کیا اور ڈاکٹر صاحب نے نسخہ لکھنا' میں نے ابھی بحر بھی متیقن نہیں کی تھی ڈاکٹر صاحب نے پوری نظم تیار کر دی - اتنے میں طائیہ بی دوڑی آئیں اور فرمایا باجی نے کہا ہے آپ نے کارواں کے لئے مضمون نہیں لکھا - میں نے کہا باجی سے کہ دیجئے کہ اس پھیر میں نہ پڑیں اڈیٹر اور مضمون نگار کے معاملات سے ان کو کوئی تعلق نہ ہونا چاہیئے - ڈاکٹر صاحب نے دونوں کو للکارا کہ کمرے سے نکل جاؤ - طائیہ بی تو بیچاری گھبرا کر بھاگ کھڑی ہوئیں - میں نے کہا جناب والا' آپ کا یہ حکم بحیثیت مالک مکان کے ہے یا بحیثیت ڈاکٹر کے' فرمایا بحیثیت ڈاکٹر کے - تم کو معلوم ہے انفلوئنزا متعدی ہوتا ہے - میں نے کہا جناب من انفلوئنزا کا متعدی ہونا مسلم لیکن آپ کا بد اخلاق یا بد حواس ہونا کہاں تک روا ہے - آپ ڈاکٹروں نے مرض کو اور مولویوں نے مذہب کو ہوّا بنا رکھا ہے - مرض میں مبتلا ہو کر جاں بحق ہونا اتنا بڑا سانحہ عظیم نہیں جتنا کہ مریض سے بھاگنا بزدلی اور شقاوت ہے - کہنے لگے لفاظی اور لسانی کسی اور وقت کے لئے ملتوی کرو یہ تو بتاؤ مضمون بھی لکھا یا نہیں - اس کے لئے میں تیار ہو کر آیا تھا' بولا عنقریب ختم ہونے والا ہے' لیکن بچی کی بیماری کو کیا کروں' فرمایا اچھی ہو جائیگی مضمون تیار کر لو' میں نے کہا لیکن مشکل یہ ہے کہ مضمون لکھنا اتنا آسان نہیں ہے جتنا آپ کا نسخہ لکھ ڈالنا' کہنے لگے تو پھر تم نے لکھنے کا وعدہ کیوں کیا ہوا تھا - میں نے عرض کیا' ڈاکٹر صاحب وعدہ کر لینا تو بس ایسا ہی ہے جیسے آپ نے کہا سلام علیکم میں نے کہا وعلیکم السلام - ایک اضطراری فعل کا جواب دوسرے اضطراری فعل سے دے دیا گیا - اس کے ایفا پر آپ کا اصرار کرنا یقیناً "حق آسائش میں خلل اندازی" ہے - فرمایا - اچھا رخصت سلام علیکم

تعطیلوں میں بارش' اور چوروں کی یورش ہوئی اس پر لطف یہ کہ مکان کے ایک حصّہ کی توسیع ہو رہی تھی - بارش اور سلسلۂ تعمیر نے "کاشانہ کا کیا یہ رنگ"

کہ ہو گئے مرے دیوار و در در و دیوار

بچی ٹائیفائیڈ میں مبتلا' دن بھر تو ڈاکٹروں اور دواخانوں کی سیر رہتی' رات بھر تیمار داری کا سلسلہ جاری رہتا - میں نے ایک بار تنگ آ کر کہا تیمار داری سے تو بہتر ٹائیفائیڈ میں مبتلا ہو جانا ہے - بیوی نے کہا خاموش ہو جاؤ' اللہ کی مصلحت میں چون و چرا کی گنجایش نہیں - میں نے کہا چون و چرا کون کرتا ہے - رات بھر بیمار بچی کو گود میں لے کر ٹہلانے میں ایسے فقرے نکل ہی جاتے ہیں - اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم مذہب کے معاملہ

میں بھی مجھ سے مشتبہ ہو جاؤ۔ مصلحت کی قائل تو مجھ سے زیادہ تم ہو نہیں سکتیں۔ دکھنی نہیں چوروں کی وجہ سے تمام لوگ کس درجہ پریشان اور سراسیمہ ہیں۔ ہم تم کس قدر بےفکر ہیں۔ یہی چوروں سے نجات کا باعث ہو گئی ورنہ مکان ٹوٹا ہوا ہے چور گھس آتے تو پہلوی تمہاری بے پردگی تو ہوتی ہی تمہاری کفایت شعاری اور میری زرپاشی دونوں کا سامان مسروقہ بن جاتیں۔ بیوی نے کہا اچھا چپ رہو اس کے وقت چوروں کا ذکر نہیں کرتے لیکن آخر یہ کیا۔ میں نکالن چھیڑنے کو کس نے کہا تھا۔ میں نے کہا کس نے تمہیں مصیبت کہیں کہہ کر آتی ہے۔ ضرورت اور اتفاق کس کے بس کے ہیں۔ تمہیں بتاؤ ہماری تمہاری شادی کو کس نے کہا تھا کہ عین طوفان کی حالت میں ہو اور رخصتی طوفان نوح اور کشتی نوح میں ہو۔ بیوی نے جھلا کر کہا کہاں کی بات کہاں پہنچا دی تم تو مجھے ہمیشہ سے وبال جان ہی سمجھتے ہے۔ میں نے کہا بڑی مشکل ہے میں نے چوروں کا تذکرہ کیا تو تم نے کہا رات کے وقت اس کا ذکر نہ کرو۔ میں نے سوچا (نیت شب بخیر) شادی کا قصہ چھیڑ دوں اس پر تم چراغ پا ہو گئیں۔

تمہیں بتاؤ یہ انداز گفتگو کیا ہے

اتنے میں بچی نے ایک چیخ ماری اور میں پھر دکی چلنے لگا۔ اور موسیقی کی وہ دھن شروع کر دی جو موسیقی کی ایجاد سے بہت پہلے مدون ہو چکی تھی۔ اب بارش کا سلسلہ شروع ہوا۔ ہوا چلنے لگی، شب کی تاریکی و خاموشی میں ایک طرح کا نم آلود سکر پیدا ہوا جس نے رفتہ رفتہ دماغ، اعضا اور عضلات میں سرایت کرنا شروع کیا۔ اس وقت میں زندگی کا ماحصل یا زندگی کی تمام زبونی و درماندگی کا معاوضہ اس آرام کی نیند سے تعبیر کر رہا تھا جو مجھے اپنے اس صاف ستھرے بستر پر میسر آسکتی تھی جس پر میں نے اکثر نہایت بیقراری اور مایوسی کی راتیں گزاری تھیں۔ زندگی کے بعض لمحات بھی کس درجہ عجیب ہوتے ہیں جب انسان بے اختیار یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ ان سے عہدہ برا یا لطف اندوز ہونے کے لئے اپنی قیمتی ترین متاع بھی قربان کی جا سکتی ہے!

مریض بچی کو میں نے چارپائی پر آہستہ سے سلا دیا۔ خیال آیا کہ بیوی کو جگا کر خود سو رہوں۔ اتنے میں چوکیدار کی چیخ سنائی دی ہمارے محلہ کے چوکیدار کی آواز ایسی ہوتی ہے گویا چور دیکھ کر مارے خوف کے اس کی چیخ نکل گئی ہے۔ بیوی اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ بستر سے یہ معلوم ہوتا تھا گویا میں نے ہی چیخ ماری ہے، فرمایا دیکھتے نہیں بچی بیمار ہے۔ میں نے کہا اس میں دیکھنے کی کون سی بات ہے۔ میں تو اس کے علاوہ یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ آپ آرام فرما رہی ہیں چوکیدار چیخ رہا ہے، بارش ہو رہی ہے اور میں الو کی طرح بیٹھا ہوں فرمایا تو اس میں میرا کیا قصور ہے کہ آپ کس طرح بیٹھے ہوئے ہیں اچھا اب جا کر سو رہیئے تھوڑی دیر میں صبح ہو جائیگی، آپ کو ڈاکٹر بٹ صاحب کے پاس جانا ہے۔ اور ہاں اس دن آمنہ بھی کہتی تھیں کہ آپ نے کوئی مضمون لکھنے کا وعدہ کیا تھا جسے آپ نے پورا نہیں کیا۔ اب میرے تحمل کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا میں نے جھجھک کر کہا وعدہ تو میں نے کیا تھا آپ کیوں سر پر سوار ہو گئیں۔ جی ہر آیا لکھونگا جی میں نہ آیا نہ لکھونگا۔ نیکبخت دلیل بہا شوہر نہ مجاہد اتنا بھی تو لحاظ ہونا چاہیئے کہ ڈاکٹر بٹ صاحب جو گورنر ... کرتے ہیں، ان کی ایک ذرا سی فرمائش تو پوری نہیں ہوتی سا ... سر پر اٹھائے پھرتے ہیں۔ خدا جانے لوگوں کو کیا ہوا ہے کہ مضمون کے لئے آپ کی خوشامد کیا کرتے ہیں۔ آپ کا مضمون میری سمجھ میں تو کبھی آیا نہیں۔ میں نے کہا جس دن یہ مضمون آپ کی سمجھ میں آگیا اسی دن میں خودکشی بھی کر لونگا۔ فرمایا خودکشی کے اس سے بہتر مواقع بھی پیش آیا کئے ہیں لیکن آپ نے اپنا ارادہ ملتوی رکھا۔ اب اس وعدہ فراموشی کے موقعہ کو ہاتھ سے نہ جانے دیجئے۔

میں نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا، اس لئے نہیں کہ اس سے رفع شر مقصود تھا بلکہ کوئی جواب ہی نہ سوجھا، جا کر چارپائی پر دراز ہو گیا۔ خواب دیکھتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کی موٹر پر کار ...

کا انبار ہے، موٹر بے تحاشا اور بدحواس چلا آ رہا ہے کھڑ کھڑ کھڑ کھڑ دھڑ دھڑ، دھڑ دھڑ، تڑ تڑ، تڑتڑ، چڑ چڑ، چڑ چڑ اور .... ارار را دھڑام، میرے اوپر سے گذر گیا، آنکھ کھل گئی تو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب مجھ کو دیکھنے آئے ہیں اور دروازہ پر کھڑے نعرے لگا رہے ہیں!

ڈاکٹر خان بیمار ہوئے، ایک آدھ دن ملاقات نہیں ہوئی میں نے خیال کیا المورڑہ سے بیوی بچے نہیں آئے ہیں ممکن ہے کسی فکر میں ہوں بالآخر معلوم ہوا کہ بیمار ہیں کوئی کہتا ہے ملیریا ہے کوئی کہتا ہے ٹائیفائڈ ہے۔ چنانچہ وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ واقعی بیمار ہیں اور ان کے طالب علم تیمارداری میں مصروف ہیں۔ میں نے پوچھا کیسا مزاج ہے تو اس قدر آہستہ جواب دیا گویا المورڑہ سے آواز آ رہی ہے بخار ہے۔ میں نے کہا اللہ رحم کرے لیکن یہ بتائیے کہ بیٹھے کیوں جا رہے ہیں۔ بخار ہے تو ہوا کرے، سراسیمہ ہونے کی کون سی بات ہے۔ ذرا اور نحیف آواز میں بولے ٹائیفائڈ ہوا تو؟ میں نے کہا میں اپنے سارے قرضے ابھی معاف کیے دیتا ہوں۔ اس پر تو خان صاحب چونکتے ہوئے آواز میں کرارا پن پیدا ہوا، بولے 'کیسا قرض' ارے تم میرے مقروض ہو یا میں تمہارا۔ میں نے کہا بھائی کسی کا قرض ہو یہ موقعہ تو صرف معاف کر دینے کا ہے، بولے غچہ دیتے ہو، میں نے کہا خاموش ہو جائیے، بیماری میں رد و قدح نہیں کرتے۔

خون کا معائنہ کیا گیا، اصغر صاحب نے فرمایا، ٹائیفائڈ تو ہے نہیں، ملیریا البتہ ہے، میں نے کہا آپ مریضوں کے نہیں بلکہ طالب علموں کے ڈاکٹر ہیں آپ کی رائے لینے کے کوئی معنے نہیں اور دینا اس سے زیادہ مہمل، فرمایا، آپ احمق ہیں، ٹمپریچر چارٹ دیکھو تو معلوم ہو گراف کا موجودہ نشیب و فراز کبھی ٹائیفائڈ کا نہیں ہو سکتا۔ میں نے کہا ٹائیفائڈ اور ملیریا دونوں ہوں تو کیا ہو، فرمایا ممکن ہے میں نے کہا آپ کے فیصلہ کا یہی حال ہے تو تھوڑی سی ہومیوپیتھک پڑھ ڈالئے، کہنے لگے خوب یاد دلایا، ٹائیفائڈ میں ہومیوپیتھک علاج بڑا کارگر ہوتا ہے اگر یہ متیقن ہو جائے تو یقیناً ہومیوپیتھک علاج کرنا چاہئے۔ میں نے عرض کیا کہ جب تک مرض یا علاج متیقن نہ ہو اور آپ کی رائے ہو تو میں زعفران سے آیت شفا لکھ کر پلانے کا انتظام کروں۔ ڈاکٹر صاحب بولے مذاق کی کون سی بات ہے، کیا معلوم زعفران کی یہ مقدار بجائے خود ہومیوپیتھک خوراک ہوتی ہو۔ میں نے کہا۔ آپ تو بحیثیت ایک سائنسدان کے زعفران کے معتقد ہو گئے۔ ڈاکٹر خان صاحب آیت شفا کے قائل ہیں، ڈاکٹر خان نے منغض ہو کر کہا کہ تم دونوں یہاں سے دفع ہو تو میری جان بچ جائے اور مجھ پر بڑا احسان ہو اگر آپ لوگ میرے پاس باری باری آیا کریں۔

بخار قائم رہا، انار، سنگترہ کا عرق، آش جو، مسہل سب کچھ دیا گیا، ایک پیش نہ گئی۔ ایک دن حسب معمول میں اور اصغر صاحب مریض کو دیکھنے گئے تو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر نے منع کر دیا ہے کہ کوئی شخص مریض کے پاس نہ جائے۔ حال دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ دوا اور غذا دونوں سے بیزار ہیں اور برابر پیچ و تاب کھاتے رہتے ہیں۔ اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ ہم سب دخل در نامعقولات دیتے۔ چنانچہ مریض کے پاس پہنچے پوچھا آخر دوا کیوں نہیں پیتے فرمایا کوئی چیز استعمال نہیں کرونگا۔ معدہ میں کوئی چیز نہیں ٹھہرتی۔ بخار کا وہی عالم ہے۔ میں نے کہا دوا تو ہر حال میں پینی پڑے گی۔ آپ کو جو تکلیف یا شکایت ہے اس کا دفعیہ صرف دوا سے ممکن ہے۔ اصغر صاحب اور مجھکو دیکھئے تندرستی میں بھی دوا ترک نہیں کرتے، اصغر صاحب نے چمک کر فرمایا، جھوٹے ہو،

تم ہی تندرستی میں دوا پیتے ہوگے۔ ڈاکٹر خان نے کہا باتیں مت کرو میں کچھ نہ کرونگا۔ میں نے کہا اسے خوب سمجھ لیجئے آپ کی ایک پیش نہ جائیگی۔ آپ تو بچوں اور جاہلوں کی سی بات کرتے ہیں، آپ کے عزیز شاگرد آپ کی جتنی اور جیسی خدمت کرتے ہیں اس کو دیکھ کر اصغر صاحب کو رشک ہے، کہنے لگے اتنی اور ایسی خدمت میری ہو تو میں بیمار ہونے کے لئے تیار ہوں، اصغر صاحب نے کہا تم دنیا بھر کے جھوٹے ہیا ٹے ہو، میں نے کب کہا کہ میں بیمار ہونے کے لئے تیار ہوں۔ ڈاکٹر خان کچھ مسکرانے پر آمادہ ہوئے تو میں نے کہا دوا پی لیجئے، فرمایا بکو مت، میں نے کہا آپ کے اس جواب سے تو مجھے اندیشہ ہوتا ہے کہ آپ کا مسکرانے پر آمادہ ہونا محض منافقت تھی، خیر آپ کچھ ہی کیوں نہ کریں دوا تو پینی ہی پڑیگی، بولے معاف کیجئے اور تشریف لے جائیے۔ میں نے کہا مجھے نہایت تعجب ہے آپ کی تندرستی میں مجھے کبھی یہ خطرہ نہیں گذرا کہ آپ اس درجہ بے تکلے اور ضدی ہیں۔ میں تو آپ کو ان لوگوں میں سمجھتا تھا جو دوستوں کی تالیف قلوب کے لئے دنیا کی بڑی سی بڑی حماقت کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں، فرمایا لا بھائی جان ہی لینے پر آمادہ ہے تو سب کچھ کرونگا، سوڈا اور دودھ دیا گیا اس کے بعد دوا پلائی گئی اور ہم سب مکان واپس آئے۔

الموڑہ سے بیوی بچے آئے، بخار اور تیمار دار کم ہونے لگے ایک دن ہم سب شام کو ڈاکٹر خان کے ہاں پہنچے تو لوگوں نے اندر جانے سے منع کیا کہ آج اضمحلال زیادہ ہے۔ میں نے کہا آج ہی تو ہماری موجودگی زیادہ ضروری ہے۔ پردہ کرایا گیا۔ ہم لوگ اندر پہنچے تو واقعی ڈاکٹر صاحب نڈھال پائے گئے، نہایت نحیف آواز سے بولے، طبیعت بہت درماندہ ہے، حرکت کرنے میں بھی تکلف ہوتا ہے۔ میں نے کہا یہ علامت اچھی ہے بخار اور نشہ دونوں کی یکساں خاصیت ہے، اترتے ہیں تو اضمحلال بڑھتا ہے، کہنے لگے بکو اس مت کرو، میں نے کہا جناب مذاق ختم کیجئے۔ جب آپ کو معلوم ہو گیا کہ بخار نہیں رہا تو مرض بھی نہیں رہا اس لئے آپ کو خوش ہونا چاہئے آپ کے مسرور اور مطمئن ہونے سے بیوی بچے تیمار دار سب خوش ہونگے مرشد کا قول آپ کو نہیں یاد رہا کہ خوش رہنا اکاسما سے زیادہ مفید اور مقوی ہے ڈاکٹر خان مسکرائے، بولے اچھا ہو جاؤں تو تمہاری خبر لوں۔

میں نے کہا آپ نے کچھ اور بھی سنا خان صاحب جرمنی جانے والے ہیں اور اصغر صاحب حج کرنے والے ہیں۔ اصغر صاحب بولے، آپ احمق ہیں، خان صاحب حج کو جا رہے ہیں اور میرا ارادہ جرمنی جانے کا ہے۔ میں نے کہا یہ تو آپ لوگ ایک بار کر چکے ہیں لیکن اس کا خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا۔ میری رائے یہ ہے کہ اب آپ حج کرنے جائیں اور خان صاحب جرمنی ہو آئیں۔ اس طور پر ہندوستان مذہب اور آرٹ یا مولوی اور عورت کی کشاکش سے آزاد ہو جائیگا۔ ڈاکٹر خان بولے اور جناب خود کیوں نہیں ہو آتے میں نے کہا میں اور آپ دونوں وجود معطل ہیں، میں شیروانی پاجامہ پر ہیٹ لگاتا ہوں اور آپ کوٹ پتلوں میں مزارات پر جاتے ہیں، ایک ساحل سے بے نیاز دوسرا کشتی سے محروم! ڈاکٹر خان اس طرح پر شگفتہ ہوئے گویا وہ اپنی بیماری بھول آئے تھے۔

ہم لوگ باہر نکلے، اور ابھی آخری زینہ سے اتر ہی رہے تھے کہ ڈاکٹر بٹ صاحب اپنی بھونچال پر سوار آدھمکے اور دور ہی سے للکارا تم لوگ مریض کے پاس کیسے پہنچے۔ میں نے کہا کیا نہ پہنچتے۔ ڈاکٹر صاحب نے بگڑ کر فرمایا، میں نے ہدایت کر دی تھی کہ کوئی شخص مریض کے پاس نہ جائے میں نے کہا ہم لوگ شخص کب ہیں، ہم تو علاج ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ناک میں دم ہے اور کیوں جی مضمون لکھا۔ اب میری باری تھی، میں نے کہا ناک میں دم ہے، ڈاکٹر صاحب نے فرمایا اچھا رخصت سلام علیکم، ہم لوگ ٹانگے پر بیٹھ کر واپس ہوئے۔

راستہ میں اصغر صاحب نے فرمایا اور کیوں جی آٹھ دس دن سے تانگے پر یہاں آتے جاتے ہیں، کرایہ کون دیا کرتا ہے۔ میں نے کہا تانگے والے سے پوچھئے، بگڑ کر فرمایا "تانگے والے سے کیوں پوچھا جائے۔ تم جو مفت خوری کرتے ہو" میں نے کہا اور کبھی آپ کو یہ بھی خیال آیا ہے میں تعظیماً برابر آگے بیٹھتا ہوں۔ دنیا جانتی ہے جو شخص تانگے پر آگے بیٹھتا ہے اس کا کرایہ معاف ہوتا ہے۔

اصغر صاحب نے فرمایا یہ سب صحیح لیکن آخر آپ خود کیوں نہیں تانگہ کرتے۔ میں نے کہا سوال سینیر اور جونیر کا ہے۔ میں پہلے بھی آپ کو بتا چکا ہوں کہ سفر سواری میں ایک شخص کو سردار بنا لیا جاتا ہے بقیہ جتنے لوگ ہوتے ہیں وہ اس کی متابعت کرتے ہیں۔ سینیر اور جونیر میں فرق یہ ہے کہ میں (جونیر) آپ (سینیر) کی معیت میں ہوں تو پھر میرا خوشگوار فرض ہوگا کہ میں "تانگہ پکڑ لاؤں" اسباب بار کراؤں، کرایہ چکاؤں، دوکان پر جائیں تو آپ تانگے ہی پر بیٹھے رہیں، میں کپڑے موزے، جوتے جوڑے، پھل پھلری لا لا کر آپ کو دکھاؤں کوئی فقیر آجائے تو مار بھگاؤں یا آپ کے پیسے میں سے خیرات دے دوں مجھے کوئی چیز پسند آجائے تو آپ خرید دیں۔ کہیں بحث مباحثہ کی نوبت آجائے تو قبل اس کے کہ آپ غلط اردو بولنے پر مجبور ہوں میں غلط انگریزی بولنے لگوں۔ برج کی صحبت ہو اور ہم آپ ایک طرف ہوں تو اگر آپ ایک نو ٹرمپ کہیں تو میں دو نو ٹرمپ کہوں۔ دشمن آپ کو ڈبل کرے تو میں "ری ڈبل" کر دوں۔ آپ غلطی کریں تو مجھے برا بھلا کہہ لیں مجھے بحیثیت جونیر کے کوئی حق نہ ہوگا کہ اپنے سینیر کے خلاف کوئی لفظ منہ سے نکالوں۔

اصغر صاحب نے فرمایا، شکریہ، لیکن آپ خود کیوں نہ سینیر بنیں۔ میں نے کہا سینیر بننا آسان نہیں ہے۔ اس کے لئے صورت شکل، وضع قطع، رکھ رکھاؤ ضروری ہے، مجھے اکثر میٹنگ وغیرہ میں شریک ہونے کے لئے باہر جانا پڑتا ہے۔ فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لیتا ہوں لیکن بعض اوقات ایسی دشواریاں پیش آئی ہیں اور ایسی رسوائی ہوئی کہ اکثر جی میں آیا ہے کہ فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لے کر تھرڈ کلاس میں بیٹھ جاؤں۔ اول تو قلی پوچھتا ہے کہ صاحب انٹر کلاس میں اسباب رکھوں؟ اس کے بعد ہر بڑے اسٹیشن پر ٹکٹ کلکٹر آتا ہے۔ خوانچہ والے دہی بڑے پیش کرتے ہیں اور پانی والا تاملوٹ اور بالٹی دکھاتا ہے!

ایک بار ایک صاحب بہادر بھی ہمسفر تھے، کمپارٹمنٹ میں داخل ہوا ہی تھا کہ نہایت 'دلنوازی' لہجہ میں فرمایا یہ تو فرسٹ کلاس ہے۔ میں نے ان کی اطلاع سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا تو بولے یہ سکنڈ کلاس نہیں ہے۔ میں اب بھی خاموش رہا، ارشاد ہوا انٹر کلاس آگے ہے، میں نے کہا گاڑی چھوٹنے والی ہے فرمایا تو تھرڈ میں بیٹھ جاؤ۔ میں نے عرض کیا سفر لمبا ہے اس میں بڑی تکلیف ہوتی ہے، فرمایا یہ فرسٹ کلاس ہے مقدمہ چلایا جائیگا۔ میں نے کہا شکریہ لیکن ہم دونوں ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔ اب تک ہم دونوں صحیح انگریزی بول رہے تھے اس لئے کسی قسم کی ناہمواری نہیں پیدا ہوئی۔ صاحب نے سگرٹ سلگا کر کچھ اور فرمایا جس کو میں نہیں سمجھا۔ میں نے ڈبیا میں سے ایک پان نکال کر منہ میں رکھا اور عرض کیا مکرر ارشاد ہو، فرمایا ہم بولا "تم دوسری گاڑی میں جانا مانگتا" میں نے عرض کیا "ہم سمجھا 'بٹ' یہی جگہ بیٹھنے مانگتا"۔ صاحب کے چہرے کا رنگ متغیر ہونے لگا۔ ادھر خاکسار نے بھی خلاف معمول اپنے چہرہ پر کچھ آثار تبخیر پائے۔ صاحب نے انگریزی میں فرمایا تم کہاں جا رہے ہو، میں نے بھی انگریزی میں کہا اور تم کہاں جا رہے ہو۔ فرمایا جہنم کو میں نے کہا مجھے رفیق سفر سمجھئے لیکن میرا ٹکٹ واپسی کا ہے۔ صاحب بہادر ہنس پڑے کہنے لگے جب منزل ایک ہے تو درجہ سفر کے ایک ہونے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ بولے کیا کام کرتے ہو میں نے کہا جاہلوں کو مہذب بناتا ہوں، صاحب کسی قدر سرگرجبیں ہو کر بولے یعنی؟ میں نے کہا یونیورسٹی میں معلم ہوں۔

صاحب بہادر نے لپک کر نہایت گرمجوشی سے ہاتھ ملایا معذرت چاہی اور اپنے طالب علمی کے قصے سناتے رہے۔ ایک اسٹیشن پر صاحب بہادر اتر پڑے۔ ٹکٹ بابو نے آ کر مجھ سے ٹکٹ مانگا۔ میں نے نکال کر دکھا دیا۔ لیکن اس کو کچھ اطمینان نہیں ہوا۔ اس نے صاحب بہادر کی طرف اس طور پر دیکھا گویا وہ چاہتا تھا کہ موصوف احتیاطاً اپنا ٹکٹ دیکھ لیں۔ صاحب بہادر نے میری طرف دیکھ کر پوچھا کیا معاملہ ہے میں نے کہا میرے دوست کو یہ اندیشہ ہے کہ کہیں میں نے آپ کا ٹکٹ تو نہیں نکال لیا۔

میں نے اصغر صاحب سے عرض کیا کہ ان حالات کو دیکھتے ہوئے خدارا انصاف فرمائیے مجھ میں سینیر بننے کی کہاں تک صلاحیت ہے دوسری طرف اپنے آپ کو ملاحظہ فرمائیے۔ آپ اور وائس چانسلر صاحب بہادر سے زیادہ یونیورسٹی میں نہ کوئی خوش لباس ہے اور نہ جامہ زیب۔ آپ کا پاندان میری بیوی کے سنگاردان سے زیادہ خوبصورت ہے' ابلا پانی پیتے ہیں' ٹیکے لگواتے ہیں' مکھی زندہ نہیں رہنے دیتے قاعدہ سے برج کھیلتے ہیں خواہ قاعدہ کے سبب سے بنتے ہوئے گیم کے بجائے دو چار ہاتھ ڈاؤن ہی کیوں نہ ہو جائیں سالن میں مرچ نہیں کھاتے' چائے میں دودھ نہیں ڈالتے' بدتمیزی معاف نہیں کرتے' قرض کا تقاضا نہیں کرتے' دن میں ایک بار خط بناتے ہیں اور دو بار غسل کرتے ہیں' نہ کبھی کلاس چھوڑتے ہیں اور نہ ٹرین۔ میں تو فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لوں تو کسی کو یقین نہ آئے آپ بے ٹکٹ بھی سفر کریں تو کسی کو قریب آنے کی ہمت نہ پڑے۔ آپ سے ہاتھ ملانے کے لوگ متمنی اور منتظر میرا سلام لینے سے مستغنی اور بیزار۔ آپ ہی انصاف کیجئے ایسی حالت میں کون سینیر بننے کا مستحق اور سزاوار ہے۔

فرمایا آپ ہیں احمق' مسخرہ بننے کی کوشش فرماتے ہیں' ذرا آئینہ میں شکل تو ملاحظہ فرمائیے' میں نے کہا آپ کے یہ خیالات قطعاً غلط فہمی پر مبنی ہیں۔ میں احمق نہیں اس لئے کہ چندہ دیتا ہوں خیرات نہیں کرتا' پردہ کا حامی ہوں بال میں رقص کرتا ہوں۔ غریب پر آنچ آئے تو گورنمنٹ کا ساتھ دیتا ہوں اپنے اوپر آفت آئے تو جہاد کی تلقین کرتا ہوں۔ رہی مسخرگی اس کا الزام یوں غلط ہے کہ یہ بجائے خود کوئی مرض نہیں ہے بلکہ علامت مرض ہے۔ آپ درباداری کا مطالبہ نہ کریں میں مسخرگی سے دست بردار ہو جاؤں۔ آئینہ میں شکل دیکھنے کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ جونیر کی شکل ہی ایسی ہوتی ہے مرشد کا مقولہ نہیں سنا ہے' زمانے تھے دنیا میں رہنے کے صرف دو مقصد ہیں نشاط یا نجات یعنی قلوپطرا یا سقراط۔ فرمایا جناب کا مسلک کیا ہے میں نے کہا وہی' خودکشی یا شہادت' کہنے لگے شکل تو سقراط ہی کی پائی ہے میں نے عرض کیا اس وقت یونیورسٹی کو قلوپطرا سے زیادہ سقراط ہی کی ضرورت ہے۔ ایک طرف سے صدا آئی'

' اور کاروان کو ایک مضمون کی "

ایک صاحب نے مجید صاحب کا تار لا کر دیا کہ ابھی ابھی گھر پر آیا تھا۔

اب پانی سر سے گذر چکا تھا' ارادہ کر کے بیٹھا کہ مضمون لکھوں گا' خیال آیا کہ کمرہ میلا ہے' تمام چیزیں بے ترتیب ہیں' ان کی صفائی کرلوں تو پھر اطمینان سے لکھوں۔ چنانچہ کمرہ صاف کیا گیا۔ سب چیزیں قرینے سے رکھی گئیں' قلم اٹھایا تو معلوم ہوا سیاہی نہیں' فوراً ایک ڈپو پہنچا کہ سیاہی کی شیشی خرید دوں' وہاں معلوم ہوا ایک ڈپو کی چھت ٹپک رہی ہے' فلاں کتاب نہیں آئی پارسلو کی بلٹیاں وی۔ پی آئی ہیں' روپے کا انتظام کیجئے۔ ایک خریدار منیجر سے الجھے ہوئے ہیں۔ منشی اور دفتری کی جھک جھک ہو رہی ہے۔ کتابوں اور کاپیوں کا آرڈر بھیجنا ہے' اسٹیشنری کی قیمت نہیں لگائی گئی ہے۔ تین گھنٹے اس کے نذر ہوئے۔ شام ہوگئی' مکان واپس آیا تو معلوم ہوا کہ داخلہ کے سلسلہ میں لڑکے معہ والدین

آئے ہوئے ہیں۔ تھرڈ کلاس پاس ہوئے ہیں گھر سے ایک پیسہ کی امداد نہیں ہو سکتی۔ فیس معاف ہونی چاہیئے، قرض حسنہ دلوایئے، آفتاب ہال میں جگہ مل جائے۔ سیکنڈ ہینڈ کتابوں کا بندوبست کیجئے۔ فرنیچر گھر سے دیجئے۔ شیخ حبیب صاحب سے ملایئے، وائس چانسلر صاحب کے ہاں لے چلئے۔ قوم کی غفلت مسلمان بچوں کی تباہی پر ان کے ساتھ ماتم کرتا رہا اور ماحضر کھانا کھلاتا رہا۔

۹ بجے رات کو زنانخانہ میں داخل ہوا تو معلوم ہوا کہ دو ایک صاحب بیمار ہیں۔ ایک صاحب کھانا کھانے سے انکار کرتے ہیں دوسرے صاحب اس قدر کھا رہے ہیں کہ ان کی صحت خطرہ میں ہے اور ماں عنقریب ایسا سلوک کرنے والی ہے جس سے ان کے اعضا و جوارح خطرہ میں ہیں۔ ان کے نصفیئے فیصل کرکے بیٹھا تھا کہ اب کلاس پڑھانے کے لئے کچھ پڑھ لوں۔ کچھ دیر تک مراقبہ میں رہا کہ ایک طرف سے سسکنے کی آواز آئی جو رفتہ رفتہ بلند ہوتی گئی۔ پوچھا کیا ہے آواز آئی پانی پیونگا جب تک پانی مہیا کیا جائے، ایک دوسرے بزرگ نے ایک نالہ سر کیا، ان کی خدمت میں حاضر ہوا، فرمایا ہم بھی پانی پیئنگے۔ ان کے حکم کی بھی تعمیل کی گئی۔ واپس آکر پھر کتابیں اٹھائیں۔ اقبال سے رجوع کیا گیا، کل کا سبق ہے "ارتقا" نظم نکالی گئی

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

بات تو ٹھیک ہے لیکن آج کل کے مسلمان نوجوان اسے سمجھینگے کس طور پر؟ "چراغ مصطفوی" پر ایمان نہیں "شرار بولہبی" کے قائل نہیں، اچھا مسئلہ خیر و شر سے بحث کی جائیگی لیکن خیر و شر کو سمجھ سکتے تو "چراغ مصطفوی" اور "شرار بولہبی" کے سمجھنے میں کون چیز حائل تھی۔ اچھا یہ بھی نہ سہی، سرمایہ دار اور مزدور کی مثال سے سمجھانے کی کوشش کرونگا، چلو آگے بڑھو،

حیات شعلہ مزاج و غیور و شور انگیز
سرشت اس کی ہے مشکل کشی، جفا طلبی

اس شعر کا سمجھانا ذرا دشوار ہے، ایسی حیات جس نے "مشکل کشی" اور "جفا طلبی" سے ترکیب پائی ہو ان نوجوانوں کی سمجھ میں کیسے آئیگی جو حیات کا مفہوم یہ سمجھتے ہوں کہ ان کی کفالت کے ذمہ داران کے والدین یا مسلم یونیورسٹی ہو اور ہندوستان کی آزادی کے ذمہ دار ہندو، تکلیف ہو تو چیخنے لگیں راحت ہو تو کسی اور کی چیخ سنائی نہ دے اچھا ان کو مثال دے کر سمجھایا جائیگا۔ مسلمانوں کی تاریخ تو ان کے نزدیک افسانہ کہن ہے، ممکن ہے موجودہ ترکوں کی مثال ان کی سمجھ میں آجائے لیکن اگر کوئی "شمشیر بے نیام" یہ بول اٹھا کہ موجودہ ترک مسلمان کب ہیں تو کیا جواب ہوگا۔ کچھ ہرج نہیں، حکومت ترکیہ جدیدہ اور حکومت ترکیہ اسلامیہ کے مظاہر شخصی بھی دو ہیں، مصطفے کمال اور رؤف بے لیکن اسلامی حکومت، ممکن ہے ہندی مسلمانوں کی سمجھ میں نہ آئے کیونکہ اس چیز کو وہابیت اور برطانوی کابینۂ وزارت دونوں برا سمجھتے ہیں اس لئے اخلاق اور عقل دونوں اعتبار سے یہ قابل احتراز ہے۔ بہرحال اس پر مفصل بحث کرنی ضروری ہے۔ ہاں یہ بھی دیکھ لینا چاہئے، گر بعد کے اشعار مشکل ہوئے تو پھر محفوظ طریقہ کار، فریقین کے لئے یہی ہوگا کہ ساغر اور شراب کے قصہ کو اور پھیلا کر بیان کیا جائے، گھنٹہ ختم ہو جائیگا اور جان بچ جائیگی۔

اسی کشاکش پیہم سے زندہ ہیں اقوام
یہی ہے راز تب و تاب ملت عربی
مغاں کہ دانہ انگور آب می سازند
ستارہ می شکنند آفتاب می سازند

اچھا تو اس بحث ہی کو کیوں اٹھایا جائے، "مشکل کشی" اور "جفا طلبی" کا فلسفہ موجودہ جرمن قوم کی مثال سے سمجھایا جائیگا۔

چلیے ساری دقت حل ہو گئی۔ ان مسلمان نوجوانوں کی سمجھ میں اس وقت تک کوئی چیز نہ آئے گی جب تک آپ اسلامی ادب یا تاریخ کی مثالیں پیش کرتے رہینگے۔ ہاں آپ کسی غیر اسلامی چیز کو اٹھائیں اور یہ آپ کے معتقد اور ہمنوا بن جائینگے' لیکن اس وقت اس کا موقع نہیں ہے کہ قوم کا ماتم کیا جائے۔ کسی نہ کسی طرح سبق پر نظر ڈال لینی ہے۔

سکوت شام سے تا نغمۂ سحر گاہی
ہزار مرحلہ ہائے فغان نیم شبی

خدا کا شکر ہے اس شعر کے سمجھنے میں زیادہ دقت نہ ہوگی۔ اول تو یہ بحث مشکل کشی اور دعا طلبی کے سلسلہ میں آچکی ہوگی لیکن اگر کچھ کسر رہ گئی تو پھر ان کو وہ زمانہ یاد دلاؤنگا جب امتحان قریب ہوتا ہے اور کورس کورا۔ شام کو بیٹھ کر پڑھنا شروع کرتے ہیں' نیند آتی ہے تو اٹھ کر ٹہلنے لگتے ہیں' پھر پڑھتے ہیں' نیند کا غلبہ ہوتا ہے تو چائے کی تیاری میں ہر قسم کی زحمت اٹھاتے ہیں' پھر پڑھائی شروع ہوتی ہے زور کی نیند آتی ہے۔ تھوڑا سا کورس باقی رہ جاتا ہے' اب بغیر دودھ اور شکر کے چائے پی جاتی ہے اور آخری حملہ ہوتا ہے' کورس ختم ہو جاتا ہے اور پاس کے درخت پر پرندوں کا پہلا نغمہ شروع ہوتا ہے۔ افق مشرق سے آفتاب ابھرتا ہے' یا نمایاں بام گردوں سے جبین جبرئیل!

کشاکش زم و گرما' تپ و تراش و خراش ‏ ‏ ‏ زخاک تیرہ درون تا بہ شیشۂ حلبی
مقام بست و شکست و فشار و سوز و کشید ‏ ‏ ‏ میان قطرۂ نیسان و آتش عنبی

یہ دونوں اشعار "گوں" کے ہیں' اس عہد کے نوجوان "ساغر اور شراب" کا مفہوم ہم سے زیادہ سمجھتے ہیں۔ دقت اس وقت پڑتی ہے جب ساغر و شراب کو تصوف یا تصوف کو ان کے قالب میں ڈھالنا پڑتا ہے اس کے علاوہ ایک سہولت یہ بھی ہے کہ آج کل فن تعلیم یا فن معلمی کا سب سے بڑا کمال یہ سمجھا جاتا ہے کہ مفہوم سمجھ میں آئے یا نہ آئے موضوع کو دلچسپ بنا دیا جائے اور ساغر اور شراب وہ چیزیں ہیں جو "دلچسپ" بھی ہیں اور لذیذ بھی! "کشاکش پیہم" پر بحث ہو چکی ہے' ملت عربی کو پیش کرنے کا موقعہ دیکھا جائیگا۔ آخری شعر فارسی کا ہے۔ موجودہ دور میں اردو ہی کون سمجھتا ہے کہ یہ فارسی کا شعر پیش کر دیا گیا' استاد کی سکندر آفتاب کی سی زبان کی بلندی اور بلاغت سے ان لوگوں کو کیسے آشنا کیا جائیگا جن میں سے ایک صاحب مغاں کو فغاں پڑھتے تھے اور سر دھنتے تھے۔ خیر اللہ مالک ہے' اگر سمجھا نہ سکا تو اردو کا ایک شعر پڑھ کر بھاگ کھڑا ہونگا

انگور میں تھی یہ مے پانی کی چند بوندیں ‏ ‏ ‏ جس دن سے کھنچ گئی ہے' تلوار ہو گئی ہے

دوسری کلاس میں غالب پر درس دینا ہے۔ رات زیادہ آئی ہے مگر کوئی مفر نہیں ہے' خدا کرے سبق آسان ہو' غالب کا دیوان کھولا گیا' سبق ہے'

موت کا ایک دن معین ہے ‏ ‏ ‏ نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

لیکن اب الفاظ اور سطروں کے بجائے کچھ اور پیش نظر ہے۔ مفہوم کے بجائے نیند چلی آتی ہے۔ پہلا مصرعہ امر مسلم لیکن دوسرا قطعاً خلاف واقعہ ہے۔ کتاب ہاتھ سے چھوٹ گئی'

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی ‏ ‏ ‏ کچھ ہماری خبر نہیں آتی

دوسرے دن علی الصباح مضمون لکھنے بیٹھا تو معلوم ہوا کہ سیاہی کی شیشی خریدنا بھول گیا' پنسل ڈھونڈ کر نکالی' مضمون کا عنوان کیا ہو' کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر طے کیا کہ عنوان نہ سہی' مضمون کی فکر کرو' لیکن مضمون کا بھی پتہ نہیں' اچھا عنوان پر پھر زور لگاؤ' مثلاً ہندو مسلم اتحاد' برطانیہ کا اخلاص اور ہندوستان کا افلاس' پراونشل ایجوکیشنل کانفرنس' سٹی سکول علی گڑھ' انجمن اقوام عالم اور ہم' اچھوت اور ہم' ہٹلر اور ہم' بم اور ہم' کاروان اور ہم'

ہندو مسلم اتحاد' پر لکھنا آسان ہے' مثلاً محرم' گاؤکشی' تناسب آبادی اور بربادی' ریاست متحدہ اسلامیہ' پورن راج' مخلوط انتخاب' مخلوط ازدواج' اردوئے معلیٰ' ناگرنی پرچارنی سبھا' لاٹھی چارج' شفیع داؤدی' پنڈت مالوی' لیکن اس ماگھ میلا کی طرف متوجہ کون

ہوگا "برطانوی اخلاص اور ہندوستانی افلاس" بھی اچھا مضمون ہے لیکن اسی قسم کی چیزوں سے میرٹھ کا مقدمہ سازش بھی مرتب ہو جایا کرتا ہے اس لئے اس سے بھی اجتناب لازم ہے۔ فائدہ کیا خواہ جیل خانہ گئے گورنمنٹ کو زیر بار ہونا پڑا۔ "پراونشل ایجوکیشنل کانفرنس سٹی سکول علی گڑھ" بھی اچھی چیز ہے لیکن اس کا صدر رہنا اس پر مضمون لکھنے سے زیادہ موزوں ہے اور آسان بھی اس لئے اس کو نمائش اسپان علی گڑھ کے موقعہ پر دیکھا جائیگا۔ "انجمن اقوام عالم اور ہم" خاصا عنوان ہے لیکن اقبال نے ایک شعر میں جو کچھ لکھ دیا ہے وہ ہم سے ایک جلد میں بھی نہ لکھا جائیگا

من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند
بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

"اچھوت اور ہم" البتہ ایک چیز ہے کیا کہنے کس قدر حسب حال ہے، کیسا بولتا ہوا مصرعہ ہے، مصرعہ نہیں فقرہ سہی فقرہ نہیں، واقعہ سہی! "ہٹلر اور ہم" بھی خوب ہے لیکن ہر ہٹلر کو ہم یہی یونیورسٹی کے نقطہ نظر سے کچھ بہت اچھا نہیں سمجھتے اور بزرگوں نے کہا ہے کہ ایسوں کا نام بھی نہیں لینا چاہئے ورنہ اکثر ایسا ہوا ہے کہ ادھر نام لیا ادھر وہ آ دھمکے اس لئے بہتر یہی ہے کہ اس کو بھی نظر انداز کیا جائے

"ہم اور ہم" قافیہ کے اعتبار سے خوب ہے عنقریب ہز ایکسیلنسی گورنر کا ورود ہوگا ایسی حالت میں اس قسم کا تذکرہ مناسب نہیں ہے محفوظ طریقہ کار یہ ہوگا کہ اس عنوان کو خواجہ حسن نظامی صاحب کے پاس بھیج دیا جاتے۔ پچھلی بار کسی ایسے ہی موقعہ پر موصوف نے پیاری ڈکار تصنیف فرمائی تھی جو اردو ظرافت نگاری میں اب تک یادگار ہے۔ ممکن ہے اس دفعہ بھی کچھ ہو جائے۔

اب رہا کارواں اور ہم چنانچہ

چل مرے خامہ بسم اللہ

رشید احمد صدیقی

خدا دراز کرے عمر چرخ نیلی کی
یہ بیکسوں کے مزاروں پہ شامیانہ ہوا
نہ پوچھ حال مرا چوب خشک صحرا ہوں
لگا کے آگ مجھے کارواں روانہ ہوا

آتش

سیّد سلیمان ندوی

نربدا

ہندوستان کی دو ندیاں نربدا اور تاپتی ایسی ہیں جو بحرِ عرب میں جاکر گرتی ہیں، یا یوں کہئے کہ یہ دو شہرگیں ہیں جنکے ذریعہ سے ہندوستان کا آبی خون بحرِ عرب کے جسم میں داخل ہوتا ہے،

قدیم زمانہ میں عرب کے سواحل سے جو جہازات ہندوستان آتے تھے وہ بحرِ ہند و بحرِ عرب سے ہوکر اسی دریائے نربدا میں داخل ہو جاتے تھے، اور اس دریا کے اندر چند میل چل کر اس بندرگاہ میں داخل ہو جاتے تھے جس کا نام انھوں نے "بروص" رکھا تھا، اور جس کو ہم ہندی "بھروچ" کہتے ہیں، ہشام بن عبدالملک کے زمانہ میں عربوں نے اس بندرگاہ پر قبضہ کیا تھا۔

۹ جولائی سنہ ۱۹۳۳ء کو بڑودہ سے مجھے بھروچ جانا پڑا اور اس یادگار زمانہ شہر کی زیارت کی عزت حاصل کی، اور یہاں کی قدیم یادگاریں جو پانچویں صدی ہجری کی بنا ہیں دیکھ کر اپنی عقیدت کی آنکھیں روشن کیں، اسی سلسلہ میں شام کو دریائے نربدا کے ساحل پر حاضر ہوا۔ اس خوش فضا منظر کو دیکھ کر روح نے وجد کیا، اور تاریخ کا گذشتہ بیان ایک جیتی جاگتی زندہ تصویر بن کر سامنے آگیا، اور شاعر نہ ہونے کے باوجود کچھ موزون نغمے میرے خاموش سازِ دل سے ادا ہو گئے۔

سلیمان

نظم

نربدا اے نربدا اے جادۂ بحرِ عرب　　گرچہ تو ہندی ہے لیکن زادۂ بحرِ عرب
ہاں گذشتہ کارواں کا تو نشانِ راہ ہے　　ہند میں اسلام کی تاریخ سے آگاہ ہے
جانتا ہے تو مری تاریخ کا پوشیدہ راز　　تیرے دروازہ پہ ٹھہرا تھا مرا پہلا جہاز
ہند میں اسلام کے انجام کا آغاز تو　　چار صدیوں تک رہا اسلام کا دمساز تو
رشتۂ ہند و عرب تجھ سے ہوا تھا استوار　　تیرے ساحل کا ہر اک ذرّہ ہے اس کی یادگار
آج کس کو یاد ہے وہ داستانِ باستاں　　تیرے ساحل پر جب اترا تھا عرب کا کارواں
تیرا ہر قطرہ حیاتِ نو کا اک تازہ پیام　　اس تنِ آبی میں تیرا خون دوڑانا ہے کام
تو ہے دریائی پری یا شاہدِ عالم ہے تو　　اس سمندر کے گلے میں شہرگِ اعظم ہے تو

اے بھروچ! اے خاتمِ انگشت رودِ نربدا　　عہدِ ماضی کی تری عزت رہے باقی سدا
توتیائے چشمِ زائر آج تیری خاک ہے　　تیرا ساحل یادگارِ امتِ لولاک ہے

آغا حیدر حسن

میرا مرزا

مرزا اچھی صورتوں کا دیوانہ سدا سے تھا۔ اور اب تو یہ دیوانگی حد سے بڑھ گئی تھی۔ اچھی آواز۔ اچھی خوشبو۔ اچھے لباس پر مرزا جان دیتا۔ جن دنوں اس حسن پرستی کا دورہ زوروں پر ہوتا۔ دل بتاشے کی طرح بیٹھتا۔ روح سلب ہوئی جاتی۔ پنڈلیاں کٹی جاتیں۔ پیروں میں اینٹھنیاں ہوتیں۔ جتنا عشق کا زور ہوتا اتنے ہی پاؤں بے سکت ہو جاتے۔ کبھی ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پالا ہو کے رہ جاتے۔ اور کبھی چہرہ بھبک اٹھتا۔ ہتھیلیوں میں سے بھاپ اور تلووں میں سے آگ نکلتی۔ جی کی دھڑکن بڑھ جاتی۔ صندل میں کپڑے تر کر کے دل پر رکھتا۔ گم سم ہوا پڑا رہتا۔ دوست احباب آتے۔ پکڑا جکڑا کر لے جاتے۔ مرزا کی کمزوریوں سے سب واقف تھے۔ مرزا کو صورت مردوں کی اور گانا ناچنا عورتوں کا پسند تھا۔ صورت مردوں کی جب ہی پسند آتی۔ جب اس میں نزاکت اور حسن ہو۔ دو مہینے سے مرزا نے کھانا ترک کر دیا تھا۔ کیونکہ مرزا کو زیادہ کھانا پسند نہ تھا۔ وہ خوش رنگ خوش وضع لطیف میووں پر رہتا۔ اور صرف اتنے ہی کھاتا کہ زندگی رہ سکے۔ پان دن بھر میں بے زردے کے سَو دوسَو کھا جاتا۔ گانا نو بجے سے رات کے تین بجے تک چھ گھنٹے سنتا اور صبح نو بجے تک سویا کرتا۔ مرزا طبعاً مذہبی تھا۔ لیکن اس کو سب پر آشکارا نہ کرنا چاہتا۔ شراب سے اس کو طبعاً نفرت تھی۔ حالانکہ اس کی بیس پشتوں تک کی تاریخ میں اس کے تمام اسلاف و اجداد شراب کے شیدا اور میگساری کے عادی تھے۔ اپنی نسل میں ایک مرزا ہی ایسا تھا۔ جس کو شراب راس نہ تھی۔ اگر کوئی عزیز اپنی جان کی قسمیں دے کر پلاتا تو وہ صرف صحبت کی ہم رنگی کے لئے ایک آدھ گھونٹ سے حلق تر کر لیتا۔ اور اس کا وہ ہنسنا اور چہکنا بالکل جاتا رہتا۔ اور وہ سخت مغموم و متالم ہو کر ایک طرف جا بیٹھتا۔ اس لئے دوست اسے کبھی پینے پر مجبور نہ کرتے۔ اور وہ ان کی راگ رنگ کی محفلوں میں ایسا کھلتا اور چہکتا کہ لوگ سمجھتے کہ یا تو یہ پئے ہے یا صرف پینے والوں کو دیکھ کر شراب کی بو ہی سے مست ہو گیا ہے۔ اور ایک حد تک تھا بھی درست۔ مرزا کسی کو کھانا کھاتے دیکھ کر شکم سیر اور پیتے دیکھ کر مخمور ہو جاتا۔ آنکھوں میں ڈورے آ جاتے اور وہ پھچنے لگتیں۔ مرزا کا شراب کے نشے کے متعلق خیال تھا کہ وہ کوئی چیز نہیں۔ جس کو سرور کہتے ہیں۔ وہ ایک چکر ہے۔ اور وہ چکر کیسا۔ جیسے بچے ہاتھ پھیلا کر "جھائیں مائیں کوّے کی برات آئی" کہتے ہوئے چکر کھاتے ہیں۔ اور سر چکرانے لگتا ہے تو لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے چل چل کر تھوڑی دور پر بیٹھ کر دم لیتے ہیں۔ یہی پینے کی کیفیت ہے۔ مزا بُرا ــ بو بلا کی ــ ایک گھونٹ اندر گیا اور معلوم ہوا کہ حلق سے لیکر پیٹ تک کسی نے ایک گرم سلاخ اتار دی۔ اور شراب خوری کو وہ خدا کے احکام کی صریح نافرمانی سمجھتا۔ اور پینے کے بعد اپنے کو خدا کا مفتوح باغی تصور کرتا۔ نماز کا بچپن سے عادی تھا۔ کبھی کبھی مہینے میں بیس روز کی ناغہ کرتا۔ اور پھر بہت رنجیدہ رہنے لگتا اور کسی آنے والی مصیبت کا انتظا

کرنے لگتا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ اگر نماز نہ پڑھی جائے تو ضرور کوئی نہ کوئی آفت نازل ہوتی ہے۔ اگر نماز پڑھنے کے زمانے میں کوئی مصیبت آپڑتی اور دوست چھیڑتے تو کہتا کہ اگر نماز نہ پڑھتے ہوتے تو یہ اس سے کہیں زیادہ سخت ہوتی۔ صرف نماز ہی کی برکت سے اس کی سختی اتنی ہی رہی۔ ورنہ معلوم نہیں کتنی بڑھ جاتی۔

مرزا تنوع پسند تھا۔ ایک جگہ جم کے نہ رہتا۔ خوبرو ہی اس کے دوست بن سکتے تھے۔ وہ دوستی کا پہلی نظر میں قائل تھا۔ اگر پہلی ملاقات میں دوستی نہ ہوئی اور مرزا نے پسند نہ کیا تو پھر عمر بھر اس کو وہ دوست نہ بنا سکتا تھا۔ مرزا کو نفرت اور دشمنی سے سخت نفرت تھی۔ وہ کہتا تھا کہ انسان چاہنے کے لئے پیدا ہوا ہے۔ نفرت اور دشمنی کے جذبے کو کچل کر نابود کر دینا چاہیئے۔ محبت کرو یا بالکل انجان ہو جاؤ۔ جس شخص سے تم کو محبت نہیں اگر اس کو نہ جانتے ہوتے تو تمہارا کیا نقصان ہوتا۔ اس کو فراموش ہی کر دینا مناسب ہے۔ دشمنی اور نفرت سے انسان خود پہلے جل لیتا ہے تب دوسرے کو جلانے کی غیر اطمینانی کوشش کرتا ہے۔ مرزا کہا کرتا کہ خورشید رویوں کی ہی تپش کیا کم ہے۔ جو بیکار کو ادھر ادھر کا جلا پا مول لیا جائے۔ مرزا کو جب عشق کا دورہ پڑتا تو وہ اپنے آپ کو اٹھارہ بیس برس کا گبرو جوان تصور کرتا اور بڑا مگن رہتا۔

مرزا عورتوں کے عشق کے متعلق بہت سخت رائے رکھتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ عورت کو محبت وعشق صرف اپنے ماں باپ بہن بھائی اور اولاد سے ہونا چاہیئے۔ شوہر سے بھی اگر عشق کیا جائے تو وہ پسند نہ کرتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ عورت اس لئے ہے کہ اس سے عشق کیا جائے اور وہ معشوق بنی رہے۔ اگر وہ خود عاشق ہو جائے تو اس نے عورت پنے کی توہین کی۔ شوہر سے عشق کو مرزا بڑے بُرے الفاظ میں ادا کیا کرتا۔ وہ کہتا کہ عورت کو شوہر کا وفادار۔ خدمت گزار اور تابعدار ہونا چاہیئے۔ شادی کے پچاس برس بعد جب بیوی ستر برس کی اور میاں چھہتر کا ہو اس وقت آپس میں عشق کیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ جوانی کے زمانے میں بیوی کے عشق کو بگڑی ہوئی رگ سے تعبیر کرتا اور اس کا مذاق اڑایا کرتا۔ عشق کا اظہار کرنے والی عورت مرزا کو سروپ نکھا کی بہن نظر آتی مرزا کو خود عشق کرنے میں لطف آتا۔ اگر اس سے کوئی اظہار تعشق کرتا تو کوسوں بھاگتا۔ اور اگر کوئی معشوق اس کے عشق کا جواب عشق سے دیتا تو مرزا پانچ چھ ہفتے میں بیزار ہو جاتا۔ اس کو عشق میں حرمان نصیبی۔ مفارقت۔ درد۔ اور تکلیف پسند تھی۔ مرزا کی اذیت دوستی اس کو ایذا پسند معشوق کا گرویدہ بنائے رکھتی۔ اور جس قدر وہ تعلق کو رکھتے ہوئے بے تعلق بنتا۔ اتنا ہی مرزا اور محبت کے جال میں پھنستا۔ تڑپتا۔ نکلنے کی کوشش کرتا۔ مرا کرتا اور جئے جاتا۔

مرزا کو ساری دنیا نے ہنستے ہی دیکھا ہوگا۔ روتے سوائے معشوق کے اور کسی نے نہ دیکھا ہوگا۔ وہ کہتا تھا کہ آنسو صرف معشوق کے لئے ہیں۔ وہ بڑے پردے کی چیز ہیں۔ ان کا محرم صرف معشوق ہی ہو سکتا ہے۔ ان کو نامحرموں سے مستور ہی رہنا چاہیئے۔ عورت کا آنسو بھوسے۔ بلکہ حیوان مردوں کے ہاں بیش قیمت ہے۔ اعتدال پسند جمالیاتی مرد کے پاس عورت کے آنسو کی قیمت ایک ہلکی سی مردانہ مسکراہٹ ہے۔ کیونکہ عورت میں تو گو تعالٰے نے آنسو کے غدود زیادہ رکھے ہیں۔ وہ آسانی سے اپنا کام کرنے لگتے ہیں مرد کا آنسو انمول ہے۔ اس پر اگر نامحرم کی نظر پڑے تو وہ پھوٹ جائے۔ مرد جب روح کو منجمد کر کے پگھلاتا ہے تب ایک آنسو بنتا ہے مرد کا آنسو اس کے جذبات۔ اس کے حواس۔ اس کی روح۔ اس کے جسم اس کی جان اس کے تاثرات کا نچوڑ ہے۔

مرزا بڑا خیالی۔ مزاجی۔ ذکی الحس۔ اور اعصاب زدہ تھا۔ اس کی اعصاب زدگی ذرا ذرا سی حرکت سے ظاہر ہوتی۔ اور وہ اس

کو طرح طرح کی ترکیبوں سے کبھی کامیاب اور کبھی ناکامیاب چھپانے کی کوشش کیا کرتا۔ معشوق کا نام سن کر جب وہ اعصاب زدہ ہو جاتا تو اس وقت چہرے کے طور مستقل رکھ کر وہ اس خوبی سے اس کو چھپا جاتا کہ کبھی کسی کو اس کے معشوق کا علم کانوں کان نہ ہوا۔ ہاں جب اس کا عشق ختم ہو جاتا اور وہ اپنی کیفیات اور تاثرات دلکش اور رنگین طرز ادا سے سناتا اور جو گل اس نے کھلائے ہیں وہ دکھاتا اور آس پاس کے اتنے پتے دیتا تو اس وقت مرزا کے دوستوں کو کچھ معشوق کی شخصیت کا پتا چلتا۔ وہ ہمیشہ اپنے معشوق کی تصویر اور بالوں کی لٹ اور لباس میں سے وہ کپڑا جو اس کے جسمی تعطر سے معطر ہوتا۔ یہ سب نشانیاں لال کلاوے کے ایک دھاگے سے لپیٹ کر رکھتا۔ اور کہ دیتا کہ اس کچے سوت کو بننا اور مضبوط رکھنا تمہارا اپنا کام ہے۔ اس کی حفاظت تو کی ہی جائیگی۔ اس حفاظت کے باوجود بھی ٹوٹ گیا۔ تو اس کے ذمہ دار آپ ہونگے۔

مرزا کو قلمی تصویریں۔ قلمی کتابیں۔ قدیم چینی کے برتن۔ قدیم بدری کے برتن۔ قدیم کانسی۔ تانبے۔ پیتل۔ چاندی۔ سونے مینے کے برتن۔ قدیم شالیں۔ قدیم جامہ واریں۔ قدیم کشیدے کا کام۔ قدیم لباس۔ قدیم اسلحہ۔ قدیم کپڑے۔ قدیم نوادرات جمع کرنے کا بہت شوق تھا اور اس کا مکان ایک اچھا چھوٹا سا قدیم چیزوں کا عجائب خانہ تھا۔ مرزا کو موتی۔ ہیرے اور زمرّد بہت پسند تھے۔ ریشم کے کپڑے بہت پسند کرتا تھا۔ اس کو قدیم لباس پہننے اور قدیم مردانہ زیور پہننے کا بہت شوق تھا۔ اور جب کبھی ان کی نمائش کا موقعہ مل جاتا۔ کبھی نہ چوکتا۔ مرزا نے علی گڑھ کی دانشگاہ میں چھ برس تعلیم پائی تھی۔ اور وہ استادوں اور ہم مکتبوں میں عزیز تھا۔ اس کا برتاؤ سب سے محبّتانہ تھا۔ اور سب اس کا خیال کرتے تھے۔ مرزا کو مرد بننے کا بڑا شوق تھا۔ اسی لئے وہ ہمیشہ عاشق کا سوانگ بھرتے بھرتے سچ مچ عشق کرنے کا عادی ہو گیا۔ اس کے بے تکلّف دوست اس کو زنانہ خطابوں سے مخاطب کرتے۔ اس نے ان باتوں کو اتنا سنا تھا کہ ایک عادت سی ہو گئی تھی۔ اور وہ ان خطابوں سے نہ چڑتا۔ بلکہ ہنس دیتا۔ کبھی کبھی ان کی برجستگیوں اور ادبی خوبیوں کو سراہا بھی کرتا تھا۔

آغا حیدر حسن

ز۔خ۔ش

تحفہ درویش

بحرِ غم میں ہے سخت طغیانی / سر سے اوپر گذر گیا پانی

کب تک اے نزہت برشتہ جگر / شور یارب سے عرش جنبانی

رونے دھونے سے جان کھونے سے / کہیں بنتے ہیں کام دیوانی!

دردِ دل دردآفریں کو سُنا / کر گزر جی میں ہے جو کچھ ٹھانی

دشتِ وحدت ہے دشتِ وحدت ہے / دیکھ آہستہ کر فرس رانی

بیخبر پہلے نقش کر دل پر / عظمتِ بارگاہِ یزدانی

مایہ اشک یاں بضاعتِ مور / ہیچ واں شوکت سلیمانی

پہلے دے صدقہ ماسوی اللہ کا / پہلے کر جان و دل کی قربانی

صدفِ فکر سے نکال گہر / تربتر کر عرق سے پیشانی

نزہت بینوا ہے ہدیہ بدست / ہو قبول جناب سلطانی

ہدیہ کیا ایک سادہ دفتر پر / لکھ کے لائی ہوں لفظ "لاثانی"

دیں ہے الفتِ وطن فغانستاں

عرف مجنوں ہے پیشہ حسّانی

ز ۔ خ ۔ ش ۔ (مرحومہ)

ذوقی

شاعر سے رات کی سرگوشیاں

زمیں پر رات کی ظلمت کا لہراتا ہے جب پرچم
سکوں دیتا ہے زخمِ فکر کو جب نیند کا مرہم
فرازِ چرخ پر آزاد روحیں سیر کرتی ہیں
دبے پیروں زمیں پر خواب کی پریاں اترتی ہیں
قدم رکھتی ہے سطحِ ارض پر جب نیند کی دیوی
سکوں کی گود میں جب تھک کے گر پڑتی ہے بیداری
مچلتی ہے جنوں انگیز سرمستی ہواؤں میں
فسونِ نغمہ ہوتا ہے خموشی کی فضاؤں میں
ہوا کے دوش پر جب نکہتیں پھرتی ہیں آوارہ
نظر کو خواب میں ہوتا ہے جب روحوں کا نظارہ
اندھیرا حکمراں ہوتا ہے جب سنسان راہوں میں
کنول جب گل پڑے ہوتے ہیں رنگیں خوابگاہوں میں
جب آنکھیں بند ہوتی ہیں تخیل سیر کرتا ہے
تو اک ننھا فرشتہ آسمانوں سے اترتا ہے

وہ کچھ الہام برساتا ہے گردوں کی جبینوں سے
وہ اک پیغام لاتا ہے طلسمی سرزمینوں سے
تجلی سے بھری ہوتی ہیں اس کی خوابناک آنکھیں
وہ کچھ کہتا ہوا آتا ہے پرمعنی اشاروں میں
وہ جادو کی چھڑی سے دل کو چھو دیتا ہے چپکے سے
سمٹ جاتے ہیں دم بھر میں حریمِ روح کے پردے
فرشتہ روح کی گہرائیوں میں مسکراتا ہے
تبسم کی طلسمی ضو میں شاعر جھوم جاتا ہے
مئے عرفاں چھلک اٹھتی ہے دل کے آبگینے میں
چمک اٹھتا ہے وجداں کا شرر تاریک سینے میں

خواجہ مسعود احمد ذوقی

اثر

سیّد امتیاز علی تاج

(۱) اردو ڈرامہ کی مفاہمتیں

(۲) ''۔۔۔کہ عالم دوبارہ نیست'' (مختصر افسانہ)

(۳) ہسپتال

(۴) برفباری کی ایک رات (ایک ایکٹ کا ڈرامہ)

اُردُو ڈراما کی مفاہمتیں

ہر آرٹ کے قیام کے لئے ضروری ہے۔ کہ آرٹسٹ میں اور ان لوگوں میں جو اس کے آرٹ سے لطف اندوز ہوتے ہیں بعض خاص اور ضروری باتوں کے متعلق ایک قسم کی مفاہمت ہو۔ جس کے رُو سے آرٹسٹ حقیقت کے اظہار میں واقعیت سے انحراف کرنے کو آزاد ہو اور لوگوں کو اپنے آرٹ سے لطف اندوز ہونے کا موقع دے۔

مثال کے طور پر یوں سمجھئے۔ مصور آزاد ہے۔ کہ ایک ذرا سے کاغذ پر میلوں لمبے منظر کی تصویر پیش کر دے۔ ہموار سطح پر ایسی چیز دکھا دے جس میں لمبائی چوڑائی کے علاوہ عمق بھی ہو۔ وقت کا ایک لمحہ حرکت کی ایک جھلک سکون میں نقش کر دے۔

اگر کل کو مصوری پر یہ اعتراض ہونے لگے۔ کہ صاحب یہ کیا بات ہوئی۔ کہ انسان ہوتا تو ہے چھ فٹ کے لگ بھگ اور مصور تصویر اس کی بنا دیتے ہیں چند انچوں میں۔ یا یہ کہ ہر منظر میں طول و عرض کے علاوہ ہوتا تو ہے عمق بھی۔ مگر منظر کھینچ دیا جاتا ہے ایک ہموار سطح پر۔ یا مثلاً طوفان میں تو موجیں متحرک ہوتی ہیں۔ اور مصور انہیں دکھلاتے ہیں محض تندی کی ایک ساکن جھلک میں۔ تو ایسے اعتراضات کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہوگا۔ کہ مصوری کا فن قائم ہی نہ رہ سکیگا اور ہم تصاویر کے لطف سے محروم ہو جائینگے۔

اسی طرح سنگتراشی کے فن کو لیجئے۔ مجسموں میں جسامت ہوتی ہے۔ مگر یہ رنگ اور حرکت سے محروم ہوتے ہیں۔ اگر سنگتراش کو اجازت نہ دی جائے۔ کہ وہ حرکت اور رنگ کو نظر انداز کر دے تو ظاہر ہے۔ کہ وہ کام نہیں کر سکتا۔

ان مثالوں سے واضح ہے۔ کہ جب تک آرٹسٹ اور آرٹ سے لطف اندوز ہونے والوں میں باہم ایک مفاہمت یا قرار داد صریحی یا غیر صریحی نہ ہو اور آرٹسٹ کو حقائق پیش کرنے کے زیادہ اعلیٰ مقاصد کے لئے واقعیت کے بعض غیر اہم اور ادنےٰ امور نظر انداز کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ تب تک آرٹ زندہ نہیں رہ سکتے چنانچہ ہر فن میں واقعیت سے انحراف کی کھلی ہوئی مفاہمتیں ہیں۔ جو ہم نے اس فن سے بہرہ اندوز ہونے کی غرض سے آرٹسٹ سے کر لی ہیں۔

اکثر فنون میں ہم ان مفاہمتوں کے ایسے عادی ہو گئے ہیں۔ کہ ہمیں ان کا احساس تک باقی نہیں رہا۔ تصویر کو دیکھ کر کس کو خیال آتا ہے۔ کہ محض بعض مفاہمتوں کی بنا پر یہ شے معقول کہی جا سکتی ہے۔ ہماری طبیعت کچھ اس قسم کی ہے کہ جس چیز سے ہم مانوس ہوں اسے صحیح اور مناسب بلکہ یوں کہئے۔ کہ مطابق عقل قرار دے لیتے ہیں مثال کے طور پر کہتے ہیں۔ کہ امریکہ کے اصلی باشندوں نے جب پہلی مرتبہ ایک ایسی تصویر دیکھی جو پہلو پر سے چہرہ دیکھ کر بنائی گئی تھی۔ تو کسی طرح ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کہ اس کا باقی آدھا چہرہ کہاں گیا۔ چنانچہ وہ ایک ایک سے اس امر کے متعلق سوال کرتے تھے۔ لیکن ہم لوگ اس قسم کی تصویر دیکھنے کے عادی ہیں روزانہ ایسی تصاویر دیکھتے ہیں۔ اور ہمیں خیال تک نہیں آتا۔ کہ آدھا چہرہ یا ایک کان غائب ہونا کیا معنی! اسی طرح ہوش سنبھالنے سے پہلے بچوں کے لئے جنہیں ان مفاہمتوں کا احساس ہی نہیں

ہوتا۔ تصویروں کا سمجھنا بہت مشکل ہوتا ہے ۔

جو مفاہمتیں فن کے اندر مضمر ہوں۔ وہ مستقل ہوتی ہیں کیونکہ ان کے بغیر فن کی تکمیل اور اس کا قیام مشکل ہے۔ وہ گویا آرٹسٹ اور لوگوں کے درمیان دل ہی دل میں اس مفہوم کا ایک اقرارنامہ ہیں۔ کہ اگر لوگوں نے آرٹسٹ کو یہ اختیار دیا۔ کہ وہ بعض واقعی امور کی صحت کا خیال نہ رکھے تو وہ حقائق کو جس نظر سے خود دیکھتا ہے۔ اسی نظر سے لوگوں کو دکھانے کی انتہائی کوشش کریگا۔
یہ مفاہمتیں دو جماعتوں کے درمیان ایک فرضی مگر بے انتہا ضروری قرارداد ہیں۔ اور فریقین میں سے کسی کو بھی اس کی شرائط توڑنے کا حق حاصل نہیں ہے ۔

سینما کے فلم بنانے اور دیکھنے والوں میں باہمی مفاہمت اس امر کی ہے (اب ناطق فلم ایجاد ہونے کے بعد شاید یہی کہنا زیادہ مناسب ہو) کہ اگر لوگوں نے گفتگو اور دوسری آوازوں کا مطالبہ نہ کیا۔ تو ہم تصویروں کے ذریعے ایک اعلےٰ کہانی ان کے سامنے پیش کرینگے ۔

اسی طرح اوپیرا یعنی موسیقی کے ڈراموں میں یہ مفاہمت مضمر ہوتی ہے۔ کہ دنیا میں ایک ایسی قوم فرض کرلی جائے۔ جس کے افراد بات چیت گانے میں ہی کرتے ہیں۔ اگر ہمیں سینما اور اوپیرا سے لطف اندوز ہونا ہے۔ تو ضروری ہے۔ کہ سب سے پہلے ہم ان شرائط کو قبول کریں، اگر ہم ان ضروری اور اہم شرطوں کو قبول نہیں کرتے۔ تو ہمارا ان سے لطف اندوز ہونا ناممکن ہے اور ایسی حالت میں ہمیں چاہئے۔ کہ ہم انہیں نہ دیکھیں ۔

یہ تو تھیں مستقل مفاہمتیں۔ جن پر مندرجہ بالا فنون میں سے ہر ایک کی بنیاد کھڑی ہے۔ لیکن اس کے علاوہ بعض عارضی اور اتفاقی مفاہمتیں بھی ہوتی ہیں۔ مثلاً سنگتراش جب کانسے کا بُت بناتا ہے تو بے تکلفی سے بنا لیتا ہے۔ کانسے کے اندر ایسا مضبوط سہارا ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے مجسمے کی کمزوری کا اندیشہ نہیں ہوتا۔ لیکن سنگ مرمر اس قدر مضبوط نہیں ہے۔ چنانچہ جب سنگ مرمر کا بت بنایا جاتا ہے۔ تو اسے مضبوطی اور پائداری بخشنے کے لئے وہ نیچے کوئی سہارا دے دینا ضروری سمجھتا ہے۔ اگر کچھ نہیں کرتا۔ تو نچلے حصے میں ننھا سا چبوترہ بنا دیتا ہے۔ یا انسانی مجسموں میں پیروں پر کپڑا ڈال دیتا ہے۔ کہ اس سے مجسمہ کو مضبوطی پہنچے۔ گویا سنگ مرمر کے بتوں میں سنگتراش اور لوگوں کے درمیان محض مضبوطی اور پائداری کی ضرورت کے خیال سے یہ مفاہمت ہے کہ نچلے حصے میں اس قسم کی جن تراکیب سے کام لیا جائیگا۔ وہ قابل معافی سمجھی جائینگی۔ اب یہ مفاہمت ایسی نہیں کہ اس پر سنگتراشی کا فن منحصر ہو۔ مضبوط اور پائدار ہو یا نہ ہو۔ بُت تو بہرحال بن سکتا ہے۔ محض ایک ضرورت کی وجہ سے سنگتراش کو ایک رعایت دے دی گئی ہے۔ اور اگر کل کو کوئی ایسا مصالحہ نکل آئے جس کے استعمال سے سنگ مرمر کو تقویت پہنچائی جاسکے۔ تو ظاہر ہے۔ کہ یہ مفاہمت باقی نہ رہیگی ۔

ہنگامی مفاہمت کی ایک بہت دلچسپ مثال اُردو تھیئیٹر میں میری نظر سے گزری تھی۔ ایک مرتبہ البرٹ کمپنی لاہور پہنچی۔ تو اس نے پہلا کھیل سبز پرستان کرنے کا اعلان کیا۔ تماشائی وقت پر تھیئیٹر پہنچ گئے۔ لیکن اتفاق سے کمپنی کا وہ صندوق لاہور نہ پہنچا جس میں پریوں کے پَر آرہے تھے۔ مجبور ہوکر منیجر اسٹیج پر آیا۔ اور اس نے لوگوں سے کہا کہ حضرات ہماری پریوں کے پَر سامان میں لاہور نہیں پہنچ سکے۔ اس لئے اگر آپ اجازت دے دیں۔ تو آج پریاں بغیر پروں کے دکھا دی جائیں۔ لوگوں نے اس کی اجازت دے دی۔ چنانچہ پریاں بغیر پروں کے آئیں۔ یہ مفاہمت اُسی روز کھیل کے ساتھ ختم ہوگئی۔ اگلی دفعہ کھیل ہوا تو پریوں کے پر تھے ۔

دوسرے فنون کی طرح ڈراما کے فن میں بھی چند مفاہمتیں ہیں جن میں سے بعض تو ضروری اور مستقل ہیں۔ اور بعض عارضی

اور اتفاقی + ضروری اور مستقل مفاہمتیں تھیٹر کی نوعیت کی وجہ سے ہیں۔ اور وہ تعداد میں تین ہیں + ان میں سے پہلی مفاہمت تو یہ ہے کہ چونکہ ڈراما نویس کو اپنی کہانی زیادہ سے زیادہ تین چار گھنٹوں میں دکھانی ہوتی ہے۔ لہذا تنگیٔ وقت کی وجہ سے اسے اجازت ہے کہ وہ اپنے موضوع کے متعلق صرف نہایت ضروری امور نہایت سخت گیری سے جمع کرے۔ فروعات کو قریب نہ آنے دے۔ اور تمام گفتگو ایسی منتخب اور محتاط لکھے۔ جس میں روزمرہ کی زندگی کی بے ربطی۔ تکرار اور ابہام نہ ہو + دوسری مفاہمت یہ ہے۔ کہ وہ اپنے ڈراما میں کہانی ایسے انداز سے پیش کرے۔ کہ وہ اسٹیج پر ایکٹروں کی امداد سے پیش کی جا سکے۔ اور اسٹیج پر جو کچھ بھی ہو۔ وہ سب تماشائیوں کو واضح طور پر دکھائی دے سکے + تیسرے یہ کہ اسٹیج پر جو کچھ بھی بولا جائے۔ وہ تماشائیوں کو واضح طور پر سنائی دے سکے +

اگر یہ تین مفاہمتیں نہ ہوں۔ ڈراما نویس واقعیت کے مطابق ڈراما لکھنے پر مجبور ہو۔ یعنی جس طرح ہم زندگی میں بے ربط۔ مبہم۔ اور ڈھیلے ڈھالے فقرے بولتے۔ ایک ایک بات کو کئی کئی مرتبہ بیان کرتے ہیں۔ الفاظ کی کمی کی وجہ سے بعض اوقات فقرے نامکمل چھوڑ دیتے ہیں بعض اوقات ہیر پھیر کر تمام کرتے ہیں۔ اگر اسی طرح یعنی واقعیت اور فطرت کے مطابق ڈراما کے کیرکٹر بھی بات کریں۔ تو شاید تین گھنٹے میں ڈراما کا ایک سین بھی ختم نہ ہو سکے + اگر ڈراما نویس ڈراما لکھتے ہوئے اس امر کی گنجائش نہ رکھے۔ کہ کہانی سمجھنے کے لئے جن واقعات کی ضرورت ہے۔ وہ پس پردہ ہو جائیں اور ڈراما میں ان کا حوالہ نہ ہو۔ لوگوں کو ڈراما کی کہانی کے کڑیوں کے وہ اہم حصے نظر نہ آ سکیں۔ جن پر کہانی کا حسن منحصر ہے۔ تو ظاہر ہے۔ کہ ڈراما ایک بے معنی ڈھیر بن جائے۔ لہذا تھیئیٹر کے آرٹ میں اجازت ہے۔ کہ ہر کمرے کی چوتھی دیوار اور ہر منظر کی چوتھی طرف کی آڑ جو تماشائیوں کی طرف ہو۔ شوق سے دور کر دی جائے۔ چنانچہ آپ دیکھتے ہیں۔ کہ اسٹیج پر جو کمرہ بھی دکھایا جاتا ہے۔ اس کی تین دیواریں ہوتی ہیں۔ چوتھی دیوار جسے لوگوں کی طرف ہونا چاہئے تھا موجود نہیں ہوتی۔ اسی طرح دوسرے مناظر کی چوتھی طرف اڑا دی جاتی ہے۔ تاکہ تماشہ ہونا ممکن ہو + یہ مفاہمت اس لئے ضروری ہے۔ کہ اس کے بغیر یہ آرٹ قائم رہی نہیں رہ سکتا + اسی طرح اگر ڈراما کی عبارت کا وہ حصہ جس سے کہانی کی ترقی اور کیرکٹروں کی سیرت کا نشیب و فراز سمجھ میں آ سکتا ہے۔ تماشائیوں کو سنائی نہ دے۔ اور افراد ایسی گفتگو اسٹیج پر آنے سے پہلے کر آیا کریں۔ یا اسٹیج پر ایسی آوازیں کریں کہ لوگوں تک نہ پہنچے۔ تو ڈراما ہو ہی نہ سکے۔ لیکن چونکہ لوگ ڈراما سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس لئے انھوں نے ڈراما نویس کو اجازت دے رکھی ہے۔ کہ وہ شوق سے خلاف واقعہ گفتگو لکھے۔ دوسری قوموں کے لوگوں کو اپنی کہانی میں لائے۔ تو ان سے بھی اپنی ہی زبان میں گفتگو کرائے۔ زندگی میں جو باتیں دنوں میں طے نہیں ہو سکتیں انہیں ڈراما میں منٹوں میں طے کر ڈالے۔ واقعات آنکھوں کے سامنے واضح طور پر گزارے۔ اور تمام ضروری امور ایکٹروں کی زبانی تماشائیوں کے کانوں تک پہنچا دے +

یہ تین تو تھیں ڈراما کے متعلق مستقل مفاہمتیں یا شرائط۔ ان کے علاوہ مختلف ممالک میں اپنے اپنے حالات اور اپنی اپنی ضروریات کے مطابق کئی مفاہمتیں عارضی اور اتفاقی بھی ہوتی رہی ہیں۔ اور ہیں + مثلاً انگلستان میں سولھویں اور سترھویں صدی میں جب شکسپیئر کے کھیل نکل رہے تھے۔ اسٹیج کے تقریباً تین طرف تماشائی بیٹھتے تھے۔ سینری استعمال نہ کی جاتی تھی۔ بغیر ملبوسات کے ساز و سامان نہ ہونے کے برابر تھا۔ تو ان چیزوں کی کمی شاعری کی امداد سے پوری کر دی جاتی تھی + لمبی لمبی شاعرانہ تقریریں کی جاتی تھیں۔ جو بے قافیہ نظم میں ہوتی تھیں۔ پلیٹ فارم پر کھڑا ہوا ایکٹر

جزو تماشا نہ ہوتا تھا۔ بلکہ خود ہی سب کچھ ہوتا تھا۔ مقررانہ انداز سے بولتا تھا۔ جب چاہتا دوسرے ایکٹر کے قریب سے ہٹ کر اور تماشائیوں کے قریب ہو کر ایسی باتیں کر لیتا تھا۔ جو فرض کر لیا جاتا تھا۔ کہ دوسرے ایکٹر کے کان تک نہیں پہنچیں۔

اس کے بعد جب اٹھارھویں صدی میں انگلستان میں نئے تھیئیٹر بن گئے۔ تو اس ڈراما کی جگہ مکالمے کے ڈراما نے لے لی ذرا باقاعدہ اسٹیج بن گئی۔ پردے لگ گئے۔ روشنی کا بھی تھوڑا بہت انتظام ہوگیا۔ اب لمبی لمبی شاعرانہ تقریریں بے موقع معلوم ہونے لگیں۔ ان کی جگہ بولی ٹھولی کے لطف نے لے لی پرانی مفاہمتیں مٹ گئیں۔ حالات نے نئی مفاہمتیں بنا دیں مثلاً یہ کہ زیادہ لطف کی اور پرمعنی گفتگوئیں اسٹیج کے اگلے حصے میں آکر روشنی کے قریب ہونے لگیں۔ تاکہ لوگ ان گفتگوؤں کے اثر کیرکٹروں کے چہروں پر پورے طور سے دیکھ سکیں۔ یہ طریق بھی خلاف واقعہ تھا۔ کہ ایکٹر بیٹھتے تو اسٹیج کے پچھلے حصے میں تھے۔ اور باتیں کرنے کو آگے آجایا کرتے تھے۔

انیسویں صدی میں جب اسٹیج نے اور ترقی کی۔ روشنی کا بہتر انتظام ہوگیا۔ الفاظ سنانے کی بجائے عمل زیادہ واضح طور پر دکھانا ممکن ہوگیا۔ ایکٹروں کو باتیں کرنے کے لئے اسٹیج کے اگلے حصے میں لانے کی ضرورت نہ رہی۔ بلکہ ایک روشن اسٹیج پر ایکٹروں کا زیادہ آگے بڑھ آنا ناگوار معلوم ہونے لگا۔ تو مکالمے کے ڈراموں کی مفاہمتوں کی بھی ضرورت نہ رہی۔ اور سماں بندھنے کا ڈراما وجود میں آگیا۔

اس موقعے پر چند الفاظ میں مفاہمت اور روایت کا فرق واضح کر دینا بھی نامناسب نہ ہوگا۔ مفاہمت میں واقعیت سے اس غرض سے ہٹتے ہیں کہ ہٹے بغیر تماشائی پورے طور پر لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ روایت کہتے ہیں۔ خاص باتیں سرانجام دینے کے ایک مسلم و مروجہ طریقے کو۔ اس میں خواہ واقعیت کو مدنظر رکھا جائے یا نہ رکھا جائے۔ تمام مفاہمتیں روایتیں ہوتی ہیں لیکن ضروری نہیں کہ روایتیں بھی مفاہمتیں ہوں۔ مثال کے طور پر سنسکرت ڈراما میں ڈراما شروع ہونے سے پہلے نٹ اور نٹی کا آنا روایتی طریق ہے۔ لیکن سنسکرت ڈراما ہی میں ایکٹروں کا میدان میں آکر یوں گفتگو کرنا گویا وہ محل میں موجود ہیں مفاہمت ہے۔

ہم جن مفاہمتوں سے مانوس ہوں۔ ان کو تو بخوشی گوارا کر لیتے ہیں۔ لیکن جن مفاہمتوں سے مانوس نہ ہوں۔ وہ ہمیں بے حد ناگوار گزرتی ہیں۔ نیویارک کے ایک چینی تھیئیٹر کا حال میری نظر سے گزرا۔ لکھا تھا۔ کہ اس تھیئیٹر میں کوئی اسٹیج نہیں محض ایک پلیٹ فارم ہے۔ کسی قسم کے پردے استعمال میں نہیں لائے جاتے۔ بس پچھلی دیوار پر ایک پردہ پڑا رہتا ہے اور اس پردے کے دائیں اور بائیں سے ایکٹر اسٹیج پر داخل ہوتے ہیں۔ سازندے اسٹیج کے اوپر بیٹھتے ہیں۔ ایکٹروں کے لباس پرتکلف ہوتے ہیں۔ بڑی بلند آہنگ اور طویل تقریریں کرتے ہیں۔ ساز و سامان نہایت ادنےٰ اور معمولی استعمال کیا جاتا ہے۔ میز کے اوپر دو شمعیں اور ان کے درمیان ایک مورتی رکھ دی۔ تو مندر بن گیا۔ ظاہر کرنا ہوا۔ کہ کوئی شخص فوجی افسر ہے۔ تو وہ کرسی الٹا کر اس پر بیٹھ گیا۔ دریا عبور کرنے کا عمل دکھانا ہوا۔ تو ایکٹر کے ہاتھ میں ایک چپو دے دیا۔ اور وہ اُسے اپنے پیچھے پیچھے ہلاتا ہوا اسٹیج پر سے گزر جاتا ہے۔ لیجئے دریا عبور ہوگیا۔ چینی لوگ مزے میں بیٹھے یہ تماشہ دیکھتے رہتے ہیں۔ نہیں ان مفاہمتوں کا احساس بھی نہیں ہوتا۔

جاپانی تھیئیٹروں میں دستور ہے کہ پرامپٹر یعنی وہ شخص جس کے ہاتھ میں تماشے کے دوران میں ڈرامے کا مسودہ رہتا ہے کہ اگر ایکٹر بھول جائے۔ تو بوقت ضرورت اسے لقمہ دے دے کر پارٹ یاد دلاتا ہے۔ اسٹیج پر تماشائیوں کی آنکھوں کے

سامنے بیٹھتا ہے۔ بس اتنا کیا جاتا ہے کہ اسے ایک چست سیاہ رنگ کا لباس پہنا دیتے ہیں۔ سر پر ایک ٹوپ اُڑھا دیتے ہیں۔ اور اس کا منہ تماشائیوں کی طرف نہیں ہوتا۔ بس اتنی احتیاط سے مراد یہ ہوتی ہے۔ کہ وہ ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے۔ اس کے علاوہ لباس بدلوانے والا اور اسٹیج کا منتظم تماشے کے دوران میں بھی اسٹیج پر موجود رہتے ہیں۔ ایکٹر کو لباس میں کسی قسم کی تبدیلی کی ضرورت پیش آئے۔ تو لباس بدلوانے والا فوراً حاجت روائی کرتا ہے۔ اسٹیج پر کسی چیز کی ضرورت پڑتی ہے۔ یا نہیں رہتی ہے۔ تو اسٹیج منتظم دستگیری فرماتے ہیں۔ پارٹ کرتے کرتے اگر ایکٹر کی پیٹی ڈھیلی ہو گئی تو لباس تبدیل کرنے والا خاموشی سے اس کے پاس گیا۔ ایکٹر بول رہا ہے۔ اور وہ حضرت پیچھے کھڑے اس کی پیٹی کس رہے ہیں۔ فرض کر لیا جاتا ہے۔ کہ تماشائی یہ باتیں نہیں دیکھ رہے ہیں۔ انہیں ان حاجت روائوں کی موجودگی کا علم ہی نہیں۔

یہ غیر مانوس مفاہمتیں اگر ہمارے ہاں شروع ہو جائیں۔ تو تھیٹروں میں اچھی خاصی قیامت برپا ہو جائے۔ ہم ان کے عادی نہیں۔ اس لئے ان کو گوارا نہیں کر سکتے۔ البتہ ہم شکسپیر کے غیر مقفیٰ نظم کے عادی ہیں۔ اس لئے اس کے پڑھنے میں ہمیں کسی قسم کا تنغص نہیں ہوتا۔ مفاہمت خواہ کیسی ہی خلاف قیاس اور خلاف عادت ہو۔ صرف اسی حالت میں گوارا کی جا سکتی ہے۔ جب اس کے قبول کرنے سے کوئی بہت زیادہ فائدہ حاصل ہو رہا ہو۔ اگر نتیجہ قابل قدر ہے۔ تو مفاہمت جائز قرار دی جا سکتی ہے۔ لیکن اگر مفاہمت کے باوجود نتیجہ بھی قابل قدر نہ ہو۔ تو ایسی مفاہمت ناگوار اور قابل اعتراض ہوتی ہے۔

انگریزی دان طبقے کو جس نے اگر انگریزی کمپنیوں کے بہت زیادہ کھیل دیکھے نہیں۔ تو انگریزی مصنفین کے بہت زیادہ کھیل پڑھے ضرور ہیں۔ اردو ڈراما کی اکثر مفاہمتیں جو انگریزی ڈراما سے خارج ہو چکی ہیں۔ ناگوار گزرتی ہیں۔ اور ان کی بنا پر وہ اردو ڈراما سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ اردو ڈراما نے کن حالات میں جنم لیا۔ کن کیفیات میں سے گزرا اور اب کس منزل پر پہنچ چکا ہے۔ تھیٹروں کے مالکوں کو کس طبقے سے زیادہ یافت ہوتی ہے۔ اور اس طبقے کا ذوق اور ڈراما سے اس کی توقعات کیسی ہیں۔ اور اس طبقے کے مذاق کی رفتار ترقی کیا ہے۔ ایک تاجر ان سب چیزوں سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ ہمارا تھیٹر عوام کی دلچسپی کے لئے ہے۔ لہٰذا جن مفاہمتوں پر عوام کو اعتراض نہیں اور جن کو وہ بسہولت جائز قرار دے کر تماشے سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ مالکوں اور ڈراما نویسوں کو ان کے رفع کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی آپ کو اگر انگریزی ڈراما کے مطالعہ سے معلوم ہو گیا ہے کہ ان مفاہمتوں کے بغیر کیونکر نہایت لطف میں کھیل لکھے اور کئے جا سکتے ہیں۔ تو انہیں اس سے واسطہ نہیں۔ وہ کیوں اشد ضرورت سے پہلے تجربے کے خطرے میں پڑیں۔

اکثر انگریزی دان اصحاب اُردو ڈراما سے متنفر ہوتے ہیں۔ اور اپنی نفرت کی سب سے بڑی وجہ یہ بیان کرتے ہیں۔ کہ اُردو ڈراما میں کئی باتیں خلاف واقعہ ہوتی ہیں۔ مثلاً بعض مناظر میں بادشاہ سلامت دربار میں تخت پر بیٹھے بیٹھے گانے لگ جاتے ہیں۔ ہر چھوٹا موٹا کیرکٹر شعر میں باتیں کرتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ ایسے اصحاب اُردو ڈراما سے متنفر ہو کر ایسے ڈراما کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ جسے وہ REALISTIC کے نام سے پکارتے ہیں۔ ان کو یہ خیال نہیں رہتا۔ کہ REALISTIC سے REALISTIC ڈراما میں بھی کئی باتیں خلاف واقع ہوتی ہیں۔ وہ اردو ڈراما کی شاعرانہ گفتگو سے پریشان ہوتے ہیں۔ لیکن یہ بھول جاتے ہیں۔ کہ برنارڈ شا وغیرہ کے کھیلوں میں بھی جو نثر کیرکٹروں کی زبان سے نکلتی ہے۔ وہ عام گفتگو سے اتنی ہی مختلف ہوتی ہے۔ جتنے شعر۔ حقیقی زندگی میں کوئی شخص ایسی نثر نہیں بولتا۔ اور

نہ اُس تواتر سے بول سکتا ہے۔ تاہم جو لوگ اردو ڈراما کے نشو و ارتقا کا غور سے مطالعہ کر رہے ہیں۔ ان سے پوشیدہ نہیں۔ کہ غیر ضروری مفاہمتیں دن بدن اردو ڈراما سے رفع ہو رہی ہیں۔ اور مفاہمتوں سے قطع نظر سے اردو ڈراما رفتہ رفتہ نئی صورت اختیار کرنے کی طرف مائل ہے۔ جو مفاہمتیں ہمارے ڈرامے کے انداز تحریر اور اسٹیجنگ میں تھیں۔ یا اب بھی ہیں۔ ان کو سمجھنے کے لئے ضرورت اس امر کی ہے۔ کہ اردو ڈراما کی پیدائش اور ترقی کے مختلف مراحل پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے +

موجودہ اردو ڈراما کو قدیم سنسکرت ڈراما سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ قدیم سنسکرت ڈراما جسے برہما نے اِندر کے ایما سے ایجاد کر کے اس کا نام نٹ وید رکھا۔ اور جس کے پہلے ناٹک کی نمائش رشی بھرت کی قیادت میں آکاش منڈل میں ہوئی تھی۔ جس کی غرض و غایت۔ جس کے اصول و قواعد اور دوسری تمام ضروری تفصیلات بھرت شاستر میں مرتب ہوئی تھیں۔ اور جس ڈراما نے کالیداس بھبھوتی بھاس اور ہرش دیو جیسے زندہ جاوید ڈراما نویس پیدا کئے تھے۔ وہ ڈراما بدھ۔ جین اور ہندو مذاہب کے باہمی مناقشے اور خانہ جنگی کا شکار ہو کر رہ گیا تھا +

تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ سکون کے زمانے میں کئی مرتبہ اس ڈرامے نے پھر اُبھرنے کی کوشش کی۔ لیکن پے درپے اس قسم کے واقعات رونما ہوتے رہے۔ کہ یہ فن پھر پنپنے نہ پایا۔ اور رفتہ رفتہ ایسے لوگوں کے ہاتھ میں چلا گیا۔ جو اس کے اہل نہ تھے۔ اور آخر کار فنا ہو گیا +

موجودہ اردو ڈراما نے اودھ کے نواب واجد علی شاہ کے قیصر باغ کی چار دیواری میں جنم لیا تھا۔ نواب واجد علی شاہ کا دربار شمالی ہند میں حکومت کی بجھتی ہوئی شمع کا آخری سنبھالا تھا۔ علم النفس کے ماہر جانیں۔ کہ وہ کیا کیفیت تھی جس میں اودھ کا دربار اس زمانے میں ڈوبا ہوا تھا سلطنت کی باگیں اتنی ڈھیلی ہو چکی تھیں۔ کہ ہاتھوں سے نکل گئی تھیں۔ ایک اجنبی حکومت اتنا فروغ پا چکی تھی۔ کہ سیلاب کی طرح سارے ہندوستان پر چھا گئی تھی۔ لیکن نہ معلوم غم غلط کرنے کی کوشش نے یا نا امیدی کی انتہا میں عشرت کا ایک آخری گھونٹ پینے کی ہوس نے دربار اودھ کے پایۂ تخت لکھنؤ کو تعیش کا گہوارہ بنا رکھا تھا۔ نشاط کا کون سا نشہ تھا۔ جو اس موقع پر بہم نہ پہنچایا گیا۔ حسن کی کون سی دلفریبی تھی۔ جس سے محفلیں نہ سجائی گئیں۔ اور ہوس کی کون سی تسکین تھی۔ جس سے خلوتوں کو رنگین نہ بنایا گیا۔ لیکن تعیش کی اس فضا میں مرجھائے ہوئے اعصاب کے لئے سکون کہاں! نئی نئی دلچسپیوں اور گہما گہموں کی تلاش رہتی تھی۔ مخموروں کو اور زیادہ مخمور بنانے کے لئے تیز تر دارو کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس زمانے میں اتفاق سے ایک فرانسیسی کو دربار اودھ میں باریابی حاصل ہو گئی۔ رنگیلے پیا کے لئے انوکھی تفریحیں بہم پہنچانا درباریوں کے لئے ایک مستقل مسئلہ بنا رہتا تھا فرانسیسی کو اس کا علم ہوا۔ تو اس نے یورپ کی تفریح ڈراما کا ذکر کیا۔ ڈراما میں سے اوپیرا اپنی خصوصیات کی وجہ سے اور دربار اودھ کے حالات کے اعتبار سے نواب کے سامنے پیش کرنے کو مناسب معلوم ہوا۔ چنانچہ پہلے پہل اُردو میں جو ناٹک کھیلا گیا وہ خالص اوپیرا تھا۔ اس کا نام اندر سبھا تھا۔ اور اسے سید آغا حسن امانت لکھنوی نے لکھا تھا +

یہ ایک پری کی کہانی تھی۔ جو ایک انسان شہزادے پر عاشق ہو کر ایک دیو کی معرفت اُسے پرستان میں اٹھوا منگواتی ہے۔ اور اس کے اصرار پر اسے اندر کی سبھا دکھانے کے لئے لے جاتی اور باغ میں ایک پیڑ پر چھپا دیتی ہے۔ وہاں ایک اَور دیو اُسے دیکھ پاتا ہے۔ اور پکڑ کر راجہ کے سامنے لے آتا ہے۔ جب راجہ اِندر کو معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس کے اکھاڑے کی پری نے ایک انسان سے دل لگایا ہے۔ تو وہ غیظ و غضب

کی حالت میں شہزادے کو تو ایک کنوئیں میں قید کرا دیتا ہے اور پری کے پر نچوا کر اسے پرستان سے نکال دیتا ہے۔ پری جوگن بن کر فراق یار میں دلسوز گیت گاتی پھر رہی ہے۔ کہ اتفاق سے ایک دیو اس کا گانا سن پاتا اور جوگن کی خبر جاکر راجہ اندر کو سناتا ہے + راجہ اندر جوگن کو دربار میں بلاکر اس کا گانا سنتا ہے۔ راجہ اور کوئی درباری نہیں پہچاننے پاتا۔ کہ یہ جوگن اصل میں اکھاڑے ہی کی پری ہے۔ راجہ گانے سے بہت محظوظ ہوتا ہے۔ اور خوش ہو کر جوگن کو پان۔ ہار اور رومال پیش کرتا ہے۔ مگر وہ کچھ قبول نہیں کرتی۔ اور منہ مانگی مراد پانے کا قول مانگتی ہے اور جب راجہ قول دے دیتا ہے۔ تو اسے بتاتی ہے۔ کہ میں تیرے دربار کی پری ہوں۔ اور مجھے انعام میں اپنا شہزادہ چاہیئے ہے۔ راجہ اندر کے لئے اب ایفائے وعدہ کے سوا چارہ نہیں رہتا۔ چنانچہ وہ پری اور شہزادہ کو ملا دیتا ہے ٭

یہ کھیل چونکہ اس غرض سے لکھا گیا تھا۔ کہ اس سے نواب اودھ کی دلبستگی ہو۔ اور ایک ایسے شخص کے لئے ایک نئی قسم کی تفریح کا سامان بہم پہنچ جائے۔ جسے عشرتوں کی کثرت نے تھکا دیا تھا۔ اس لئے یہ پہلا ڈرامہ خاص کوشش سے تحیر خیز اور بارونق بنایا گیا۔ اس میں ایک پری اور ایک انسان کی انوکھی محبت کا خلاف واقعہ مگر حیرت انگیز موضوع پیش کیا گیا۔ اندر کے اکھاڑے کی روایتی رونق آنکھوں کے سامنے لائی گئی۔ پریوں کی کثرت سے اسٹیج پر چکا چوند کا عالم پیدا کر دیا گیا۔ مشہور راگ التزام سے کھیل میں کھپائے گئے۔ تقریریں اور مکالمے اشعار میں لکھے اور گائے گئے۔ اس طرح یہ تمام کا تمام ڈراما گو خلاف واقعہ باتوں سے پُر تھا۔ لیکن مفاہمت کی رو سے جو مراعات ڈراما نویس کو دی گئی تھیں۔ ان سے فائدہ اٹھا کر اس نے ایک اس قدر نئی پرلطف اور انوکھی چیز پیش کر دی جو بیحد کامیاب تفریح ثابت ہوئی۔ اور برسوں اردو کمپنیوں میں ضیافت

طبع کا سامان بہم پہنچاتی رہی + اس ڈرامے کے لکھنے میں علاوہ ایک مصنوعی انداز تحریر کے دو پہری جس قسم کی مفاہمتوں سے کام لیا گیا۔ ان کو ظاہر کرنے کے لئے اس کے ایک دو اقتباس دے دینا مناسب ہوگا +

جب پری اندر کے اکھاڑے میں سے نکال دی جاتی ہے تو اس کے بعد تماشائیوں کو کچھ معلوم نہیں ہونے پاتا۔ کہ اس پر کیا بیتی۔ اندر کے اکھاڑے سے نکلنے کے بعد جب وہ دوبارہ اسٹیج پر آتی ہے۔ تو جوگن کے بھیس میں آتی ہے لیکن یہ بھیس تماشائیوں کے سامنے نہیں بدلا گیا۔ اس لئے مصنف یہاں ایک مفاہمت سے کام لیتا ہے۔ جن واقعات کو دکھا نہیں سکا ان کے بیان کرنے کو دیووں کا ایک کورس بھیج دیتا ہے جو اسٹیج پر آکر یہ نظم گاتے ہیں۔ اور بے تکلفی سے لوگوں کو آگاہ کر دیتے ہیں۔ کہ اس دوران میں کیا واقعات ہو چکے اور تماشائیوں کو اب کیا دیکھنے کے لئے تیار رہنا چاہیئے ٭

دیووں کے کورس کے چند اشعار یہ ہیں ؎

جوگن آتی ہے پری بن کے پرستان کے بیچ
سمرنیں ہاتھوں میں مندرے ہیں پڑے کان کے بیچ
سر پہ انڈوا ہے رکھا منہ پہ رمائی ہے بھبھوت
سیلیاں ڈالے ہے گردن میں گریبان کے بیچ
چال متوالی ہے آنکھیں ہیں مئے عشق سے لال
مست شہزادۂ گلفام کے ہے دھیان کے بیچ
کہیں گلفام کا کوسوں نہیں ملتا ہے پتہ
خاک اڑاتی ہوئی پھرتی ہے بیابان کے بیچ

ایک دیو جوگن کی آمد کی خبر راجہ اندر کو پہنچاتا ہے۔ اور راجہ اس کا گانا سننے کے اشتیاق میں اسے دربار میں بلاتا ہے۔ اس موقع پر مصنف ایک اور مفاہمت سے کام لیتا ہے۔ تماشائیوں کو تو صاف نظر آرہا ہے۔ کہ یہ جوگن اصل میں اکھاڑے سے

نکلی ہوئی پری ہے۔ مگر راجہ اور دوسرے دیو پریاں کوئی اسے شناخت نہیں کرسکتا۔ چنانچہ راجہ اس سے پوچھتا ہے ؎

اری جوگن لئے درد کی مبتلا ۔۔۔ فقیروں کا کیوں بھیس تونے کیا
خدا کس پہ ہے کس پہ شیدا ہے تو ۔۔۔ کوئی آدمی ہے پری یا ہے تو؟
کہاں سے یہاں تیرا آنا ہوا ۔۔۔ کہ مشتاق سارا زمانہ ہوا
کسے ڈھونڈتی پھرتی ہے کو بکو ۔۔۔ اڑاتی ہے کیوں خاک جنگل کی تو
سنا اپنا گانا مجھے بھی ذرا ۔۔۔ اڑا بھیرویں چھیڑ یا جوگیا

جوگن جواب دیتی ہے۔ ؎

مہاراج پوچھو نہ جوگن کا حال ۔۔۔ فقیروں کا دل درد سے ہے نڈھال
مرا مجھ سے معشوق ہے چھٹ گیا ۔۔۔ مرا راج اس دیس میں لٹ گیا
یہاں ڈھونڈنے اسکو آئی ہوں میں ۔۔۔ برہ گن ہوں غم کی ستائی ہوں میں
سناتی ہوں گانا جو ہے تجھکو یاد ۔۔۔ عجب کیا جو مل جائے دل کی مراد
اگر راگ سے غیر ہو دل کا حال ۔۔۔ نہ جوگن کا رد کیجئے گا سوال

راجہ گانا بھی سنتا ہے اور پھر بھی نہیں پہچان سکتا۔ کہ یہ اسی کے اکھاڑے کی مردود پری ہے۔

ان مثالوں سے ظاہر ہے کہ اردو کے پہلے ہی ڈرامے میں مستقل مفاہمتوں کے علاوہ وقتی مفاہمتیں بھی کثرت سے تھیں ان میں سے کئی مفاہمتوں نے اردو ڈراما میں روایت کی شکل اختیار کرلی ہے۔ اور اب تک مستعمل ہیں۔ یہ سہیلیاں بھی جو اسٹیج پر آج تک نظر آتی ہیں۔ اندر کے اکھاڑے کی پریوں کی اولاد ہیں۔ ان کے دم سے اسٹیج پر وہ رونق ہوئی تھی۔ کہ اب تک ڈرامہ نویسوں کو انہیں اسٹیج پر سے نکالنے کا حوصلہ پیدا نہیں ہوا۔

جب قیصر باغ اجڑ گیا۔ اور نواب واجد علی شاہ نظربند کر کے کلکتہ کے مٹیا برج میں بھیج دیئے گئے۔ تو اردو ڈراما لکھنؤ سے نکل کر بمبئی جا پہنچا۔ اور وہاں پارسیوں کی اولوالعزمی نے تھیئٹریکل کمپنیوں کی بنیاد رکھ دی۔ جس میں اندر سبھا اور اسی قبیل کے پریوں کے مفاہمتی ڈرامے بہت کثرت سے ہوتے رہے۔

جب پریوں کا موضوع پرانا ہوگیا۔ تو بادشاہوں کا موضوع شروع ہوگیا۔ ان سب میں خلاف عقل اور خلاف قیاس داستانیں ہوتی تھیں۔ اس زمانے میں کہ اخلاقی تنزل اور قومی انحطاط کا زمانہ تھا تعلیم اور روشن خیالی پھیلی نہ تھی۔ حکومت چھن جانے کا احساس بھی ابھی تازہ تھا۔ اور اس سے طبیعتوں پر ایک مردنی سی چھائی ہوئی تھی۔ اس قسم کی داستانیں "اک گونہ بے خودی" کا سامان بہم پہنچاتی تھیں۔ یہی داستانیں چھپتی اور شوق سے پڑھی جاتی تھیں اور اسی قسم کی چیزیں اسٹیج پر لائی جاتی تھیں۔ ان ڈراموں میں بھی محیر العقول باتیں بیان کی جاتیں۔ اور مفاہمتوں سے فائدہ اٹھایا جاتا۔ البتہ ان کی تحریر میں اتنا فرق ہوگیا تھا۔ کہ ان میں اشعار گائے بھی جاتے تھے۔ اور بولے بھی جاتے تھے۔ ایک اس قسم کے ڈرامے کا نمونہ درج کردینا نامناسب نہ ہوگا۔

ہامان جسے شیطان نے اپنا مرید بنا کر بادشاہ بنا دیا ہے۔ اپنے بچوں کو شراب پینے پر مجبور کرتا ہے۔ اور جب وہ نہیں مانتے تو شیطان کے کہنے پر انہیں شہر بدر کردیتا ہے۔ ہامان کی لڑکی مہرنگار اپنے بھائی سے بچھڑ جاتی ہے۔ اور جنگل میں پریشان پھر رہی ہے اور گا رہی ہے ؎

خدایا تنگ آئی ہوں ستم اب اٹھ نہیں سکتا
مرا لاغر ہے تن بار الم اب اٹھ نہیں سکتا
کہاں تک دشت میں بھٹکوں نہیں اب اپنا سر تکوں
ہیں چھالے پاؤں میں آگے قدم اب اٹھ نہیں سکتا
کروں تدبیر گو صدہا پر اس سے فائدہ ہے کیا
ہوا تقدیر میں جو کہ رقم اب اٹھ نہیں سکتا

(اتنے میں ایک سانپ نکلتا ہے اور مہرنگار کو ڈس لیتا ہے۔ جس پر وہ تڑپ تڑپ کر اپنی تکلیف اور درد کا اظہار دوسرے گانے

میں شروع کر دیتی ہے) ؎

بگاڑا تھا کیا میں نے تیرا بتا | ارے موذی تو نے مجھے کیوں ڈسا
مصیبت کی ماری میں بیچاری تھی | تجھے رحم آیا نہ مجھ پر ذرا
ترے زہر نے اب کیا ہے اثر | کوئی دم میں ہوگی مری جاں ہوا

اب شیطان ایک بزرگ کے لباس میں داخل ہوتا ہے۔ اور اپنے آپ کو مخاطب کرکے یہ اشعار پڑھتا ہے۔ ؎

دنیا میں مجھ سے جو بھی کرے عار آدمی | پائے وہ ایسے سینکڑوں آزار آدمی
جو آج ہوگیا نہ گرفتار آدمی | وہ کل بچیگا مجھ سے نہ زنہار آدمی
اسکو وہ اکے چلے سے دکھا ہی تر آب | ایمان اسکا کرتا ہوں فی الفور میں خراب

جس زمانے میں ایسے کھیل لکھے گئے تھے۔ اس زمانے کے لوگ اس قسم کی مفاہمتیں بخوشی گوارا کر لیتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ وقت اور حالات ڈراما نویسی کا انداز تبدیل کرتے رہے۔ کچھ عرصے کے بعد مجیر العقول واقعات کی بجائے صرف انوکھے واقعات ڈراموں میں آنے لگے۔ گانے کی بجائے زیادہ اشعار پڑھے جانے لگے۔ اور ڈراموں میں مقفے عبارتیں استعمال ہونے لگیں۔ اس ڈرامے کے وجود میں آنے کی یہ وجہ تھی۔ کہ ایک تو انگریزی زبان سے کسی قدر شناسائی ہوگئی تھی۔ اور معلوم ہو چکا تھا۔ کہ وہاں کئی اوپیرا اس قسم کے بھی ہیں۔ جن میں صرف گانا ہی گانا نہیں۔ بلکہ غیر مقفے نظم اور نثر بھی ہوتی ہے۔ دوسرے اب ڈرامے کرکے اکثر گویے ایکٹری کا تجربہ حاصل کر چکے تھے۔ اور تماشے کی کامیابی کے لئے گانے ہی کی امداد کے محتاج نہ رہے تھے۔ اس زمانے میں اردو نثر بہت تصنع سے لکھی جاتی تھی۔ تحریر میں قافیوں کا بہت خیال رکھا جاتا تھا عبارت میں چاشنی پیدا کرنے کو دور دور کے قافیے ڈھونڈ ڈھونڈ کر لائے جاتے تھے۔ یہی نثر اسٹیج پر مروج ہوگئی۔ گانوں کے متعلق نئی مفاہمت یہ پیدا ہوئی۔ کہ وہ زیادہ تر جذباتی موقعوں پر استعمال ہونے لگے۔ مثلاً سین کے شروع اور آخر میں دعا۔ فراق۔ وصال۔ لڑائی۔ جوش۔ شکوہ و شکایت۔ چھیڑ چھاڑ اور اظہار تشکر وغیرہ کے موقعوں پر۔ اس مفاہمت کے مطابق جو ڈرامے لکھے گئے۔ ان کا بھی ذرا سا نمونہ درج کر دیا جاتا ہے۔ کھیل تائید خدا میں دو بچے آدم خوروں کے ہاتھ پڑ جاتے ہیں۔ جو انہیں اپنے بادشاہ کے حضور میں لے جاتے ہیں۔ کہ وہ ان کا ناشتہ کرے۔ دربار کا سین ملاحظہ ہو۔ بچے دربار میں یہ گانا گاتے ہوئے داخل ہوتے ہیں ؎

مالک ہمارے سن لے بنتی۔ اب ہم جان سے جاتے ہیں
دولت چھوٹی حشمت چھوٹی۔ ملک ہمارا چھوٹ گیا
کون ہماری داد کو پہنچے اپنا کس کو پاتے ہیں — مالک ہمارے الخ
کن لوگن میں قید ہوئے ہیں جن کو تیرا خوف نہیں
ظلم کا ان کے کون ٹھکانہ۔ یہ انساں کو کھاتے ہیں — مالک ہمارے الخ

محض مفاہمت کی بنا پر بچوں کی اتنی سی فریاد سے آدم خور بادشاہ بیحد متاثر ہو جاتا ہے۔ اور کہتا ہے۔ "اے پیارو۔ تم اپنے دل کو نہ پریشان کرو۔ جو ٹھیک حال ہے بیان کرو۔"

اس پر دونوں بچے اپنی بربادی کا نوحہ گانے میں شروع کر دیتے ہیں ؎

کیا بتائیں حال اپنا بیکس و ناشاد ہیں
ظلم کے مارے ہوئے ہیں مورد بیداد ہیں
اس کی قدرت کا کرشمہ کیا کہیں تم سے حضور
شاد گھر ویراں ہوئے ویران گھر آباد ہیں
ایک دن وہ تھا ہماری سلطنت کرماں میں تھی
ایک دن یہ ہے کہ مٹی خوار ہے برباد ہیں"

بادشاہ سن کر کہتا ہے۔ "معلوم ہوا۔ کہ تم عالی خاندان ہو۔ پر افسوس کہ پریشان ہو۔ لیکن یہ سمجھ میں نہ آیا۔ کہ تم نے مجھ کو ستمگار اور گنہگار کیوں ٹھہرایا؟"

بچوں میں سے ایک کہتا ہے۔ "صاحب۔ آپ کے ظلم کے طور ہیں۔ آپ آدم خور ہیں۔ اس لئے گنہگار ہیں۔ کہ انسان کو اللہ نے بڑا رتبہ عطا فرمایا ہے۔ اسے سب مخلوق سے افضل بنایا ہے۔ انسان ہی تھے حضرت سلیمانؑ۔ اور انسان ہی تھے نبی دوران لیکن آپ انسان کا خون بہاتے ہیں۔ اور اسے کھاتے ہیں +

اب محض اس ذرا سی دلیل پر کسی منطقی وجہ سے نہیں۔ بلکہ محض مفاہمت کے باعث بادشاہ مردم خوری سے توبہ کر لیتا ہے۔ اور کہتا ہے۔ "اے خدا پرست پیارو۔ تمہاری نصیحت سے آج توبہ کرتا ہوں۔ کہ اب کبھی ایسا ظلم نہ ڈھاؤنگا۔ انسان کو کبھی نہ کھاؤنگا"

اس پر بچے پھر اظہار شکریہ میں گانے لگتے ہیں۔ کہ

اے میرے صاحب کرم کیا بھاری جی

یہ نمونہ اس زمانے کی مفاہمتوں کی خصوصیات خوب ظاہر کرتا ہے۔ واقعات انوکھے ہیں۔ گانا اشعار اور مقفٰے عبارت استعمال کی جاتی ہے۔ گانے نسبتاً جذباتی موقعوں پر لائے جاتے ہیں۔ اور مقفٰے عبارت باتوں میں۔ باتوں میں یہ ضروری نہیں۔ کہ کیرکٹر کسی معقول دلیل یا موثر اپیل کی بنا پر متاثر ہوں۔ ڈراما نویس ذرا سا بہانہ بنا کر اور مفاہمت سے فائدہ اٹھا کر انہیں متاثر کر لیتا تھا۔

ڈراما کے مفاہمتوں کی یہ حالت تھی۔ جب ہمارے تین نامور ڈراما نویسوں نے مختلف کمپنیوں میں ڈرامے لکھنے شروع کئے۔ یہ منشی ونائک پرشاد طالب بنارسی۔ منشی مہدی حسن احسن۔ اور پنڈت نرائن پرشاد بیتاب تھے۔ ان لوگوں نے ڈراما نویسی کا آغاز تو پرانی مفاہمتوں میں سے کیا۔ لیکن بہت جلد اپنی روش تبدیل کر لی۔ بعض انگریزی کھیلوں کو ہندوستانی مذاق کے مطابق ڈھال کر نئے سرے سے لکھا۔ اور اس مشق سے قابل قدر تجربہ حاصل کیا۔ قرین عقل و قیاس باتیں کرنی شروع کیں۔ ڈراما میں مختلف نتائج محض اپنی مرضی سے نہیں۔ بلکہ معقول منطقی وجوہ کی بنا پر نکالنے لگے۔ مقفٰے عبارتوں اور اشعار کے ساتھ سادہ نثر بھی ڈراما میں داخل کر دی۔ اور انداز تحریر کا یہ طرز قائم کیا۔ کہ ایکٹر پہلے نثر بولے اور اس کے بعد چند اشعار پڑھ دیا کرے۔ گانوں کی تعداد کم کی۔ اور انہیں ادائے مطلب کی بجائے ادائے جذبات کا ذریعہ بنا دیا یعنی رفتہ رفتہ تمام پرانی مفاہمتوں کو مٹا کر محض انداز تحریر کو اور کہیں کہیں ایسی مفاہمتوں کو رکھ لیا۔ جو اسٹیج کے حالات کے اعتبار سے ترک نہ کی جا سکتی تھیں۔ یہ لوگ بیسویں صدی کے ابتدائی حصے کے ڈراما نویس تھے۔ اس وقت تک تعلیم کا چرچا بھی ہو گیا تھا انگریزی کا معیار بھی ترقی کر گیا تھا۔ اسٹیج بھی بہتر بن گئی تھی۔ کئی شہروں میں پختہ منڈوے تعمیر ہو چکے تھے۔ یہی تین چیزیں ہیں جو ڈراما میں خصوصیات پیدا کرتی ہیں اور یہ تینوں چیزیں اس زمانے میں ترقی کر رہی تھیں۔ میں یہاں ان ڈراما نویسوں کے ابتدائی کھیلوں کے نمونے دے کر اور ان کی ترقی کے مختلف مراحل بیان کر کے مضمون کو طویل نہیں کرنا چاہتا۔ صرف ایک ڈراما نویس منشی ونائک پرشاد طالب کے آخری ڈراما لیل و نہار کے ایک منظر کا ذرا سا حصہ بطور نمونہ پیش کئے دیتا ہوں جس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ ان ڈراموں میں پلاٹ اور اس کے نشوو ارتقا کے متعلق پرانی مفاہمتوں سے کام نہ لیا گیا تھا۔ اور صرف انداز تحریر کی مفاہمت باقی رہ گئی تھی۔

شہناز کا خاوند مر جانے کے بعد اس کے خاوند کا بھائی فلک سیر جائداد پر قابض ہو گیا ہے۔ اور اس نے شہناز اور اس کے بچوں کو گھر سے نکال دیا ہے۔ جو انتہائی غربت میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ بڑا بچہ فیروز ملازم ہے۔ اور چھوٹا بچہ انور یتیم خانے میں ہے شہناز بیمار پڑ جاتی ہے۔ اور ایک روز جب زندہ بچنے کی آس نہیں رہتی۔ تو اپنے بچوں کو بلانے کے لئے آدمی بھیجتی ہے۔ ساتھ ہی اپنے دیور فلک سیر کے بیٹے ہمایوں کو بھی اپنی نازک حالت کی اطلاع کرواتی ہے۔ ہمایوں کو باپ کی مخالفت کے باوجود اپنی چچی اور اس کی اولاد سے محبت ہے۔ چنانچہ شہناز دم توڑ رہی ہے۔ کہ وہ آن پہنچتا ہے۔ اس کی چارپائی کے قریب جا کر کہتا ہے

ہمایوں۔ چچی جان! میں ہمایوں۔ فلک سیر کا پسر۔

شہناز۔ (آنکھیں کھول کر ہمایوں کی طرف حسرت سے دیکھتی ہے)
بیٹا! میں مر رہی ہوں۔ اس گھرانے کے وارث اب تم ہوگے
سچ کہو میرے بچوں کی پرورش کروگے؟

ہمایوں ۔ ؎

مر جاؤں گا ہر طرح کی تکلیف سہونگا
میں ان کی خبرگیری سے غافل نہ رہونگا

شہناز ۔ ہائے اپنے فیروز اور اپنے انور کو میں کہاں ڈھونڈونگی (آہ بھر کر) یہاں نہیں ۔ تو خیر وہاں ہوگی ؛

ہمایوں ۔ انور یتیم خانے سے فیروز نوکری پر سے آتے ہونگے ۔ اشرف بلانے گئے ہیں ۔ بلا کر لاتے ہونگے ؛

(یک بیک دل کی حرکت بند ہونے سے شہناز ہچکی لیتی ہے)

شہناز ۔ ان کو میری دعا ! ہمایوں بچوں کو ـــــ ہا !

(شہناز مرجاتی ہے)

ہمایوں ۔ ہچکی ! ہچکی ! کیا ہے ۔ کچھ بولو ۔ آنکھیں تو کھولو ۔ ہائے ہچکی لی اور چل بسی ۔ افسوس ؎

محتاج ہو غنی ہو امیر و کبیر ہو
سلطان بے نظیر ہو اعلیٰ سریر ہو
سردار ہو غنی ہو جواں ہو کہ پیر ہو
نادان بے وقوف کہ دانا ؛ پیر ہو
جھگڑا اجل کے ہاتھ سے اک روز پاک ہے
جس خاک سے بنا ہے وہی مشت خاک ہے

(ہمایوں کا باپ فلک سیر جس نے شہناز کو تباہ کیا ہے ۔ ایک سائیں کے ساتھ داخل ہوتا ہے)

فلک سیر ۔ یہ کون ناساز ہے ؟

ہمایوں ۔ کم نصیب شہناز ہے ؛

فلک سیر ۔ کیا ہوا ۔ کیا مرگئی ؟

ہمایوں ۔ حسرت بھری دنیا سے گزر گئی ؛

فلک سیر ۔ کس بیماری سے ؟

ہمایوں ۔ کسی کی ستمگاری سے ؛

فلک سیر ۔ (اس طعنے سے چڑ کر) اونہہ ؎

قسمت اس کی جب قضا آجائے تو ہم کیا کریں
اختیار اپنا نہ ہو جس بات میں غم کیا کریں
آپ ہم فانی ہیں پھر اوروں کا ماتم کیا کریں
مرضی اللہ میں ہم مار کر دم کیا کریں

ہمایوں ۔ (غم سے لاش کو دیکھتا ہے) ؎

جس کے آگے سے گیا مفلس کوئی ننگا نہیں
اس کی میت ڈھانپنے کو آج اک کپڑا نہیں

(فلک سیر سائیں کے کندھے سے کمبل کا جوڑا اتار کر ہمایوں کی طرف پھینکتا ہے)

فلک سیر ۔ لو یہ کمبل ۔ ڈھانپو میت ؛

ہمایوں ۔ (تعجب سے) کمبل ؟ جس کی دولت سے آپ شال دوشالے اوڑھیں اُسے کمبل اوڑھائیں !

(آخر ہار کر) اچھا کیا ہوا ! ایک لاش کو اڑھا کر دوسرا کمبل میں دبالیتا ہے) ایک لاش کو اڑھایا ۔ اور ایک اپنے لئے رکھ لیا کہ جس دن میں غریب محتاج ہو جاؤنگا ۔ تو اوڑھوں گا ؛

فلک سیر ۔ (چڑھ کر) ؎

نادان بے وقوف یہ تقریر بے ادب
میرا پسر تو ہے کہ مرا پیر بے ادب؟

ہمایوں ۔ پسر ہوں ۔ گنہگار ہوں ۔ مگر حق پر استوار ہوں ۔ میں نے اس مرحومہ سے قسم کھائی ہے کہ اس کے دونوں بچوں کو مرتے دم تک سنبھالونگا ۔ جیونگا یا مرونگا ۔ مگر ان کو سنبھالوں گا ؛

(شہناز کا بڑا لڑکا فیروز گھبرایا ہوا داخل ہوتا ہے)

فیروز ۔ (یک لخت رک کر) کیا ۔ مرگئی ؟ (ہمایوں سے) کوچ کرگئی ؟

(فلک سیر سے) تمہارے روبرو ۔ تمہارے دوبدو ؟

فلک سیر ۔ میں ان کی بیماری سے بے خبر تھا ۔ ہمایوں کے بلانے

سے آیا۔ مگر آکے دیکھا۔ تو کام تمام پایا ۔

فیروز۔ (ماں کی لاش سے چمٹ کر) سے

اماں مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ   منہ بچوں سے موڑ کر نہ جاؤ
چھاتی سے لگاؤ مجھ کو اٹھو   پہلو میں دباؤ مجھ کو اٹھو

ہمایوں۔ (اسے اٹھا کر) بھائی دل سنبھالو۔ اتنے بے قرار نہ ہو

فیروز۔ سے

حسرت بھری ستم کی ستائی چلی گئی
بچوں کا منہ نہ دیکھنے پائی چلی گئی

فلک سیر۔ تم لوگوں کی اتنی کج ادائی پر بھی میں یہاں ضرور آتا دوا علاج کراتا۔ مگر افسوس تم نے خبر تک نہ دی ۔

فیروز۔ خبر بھیجنے کا حق تمہارا تھا۔ مگر تمہیں تو ہمارا مٹا دینا گوارا تھا (رو کر) جیتے جی تو پوچھنے تک کو نہ آئے۔ اور مرنے کے بعد تماشہ دیکھنے تشریف لے آئے ۔

غرض اسی طرح یہ سین چلتا ہے ۔

تینوں ڈراما نویس انداز تحریر کے علاوہ بہت معمولی پرانی مفاہمتوں سے کام لیتے رہے۔ مثلاً اسٹیج پر عورت مرد کا ہاتھ ملا کر اور شعر پڑھ کر اور آمین کہ کر ان کا نکاح کرا دیتے تھے ۔

اب اس کے بعد میں آغا حشر کاشمیری کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو اگرچہ ان تینوں ڈراما نویسوں کے (جن کا ذکر ابھی کیا گیا ہے) ہمعصر تھے۔ لیکن چونکہ انھوں نے بعض وقتی مفاہمتوں کو دور کرنے میں بہت کوشش کی ہے۔ اس لئے ان کا ذکر جدا کرنا ہی مناسب سمجھتا ہوں ۔

آغا حشر نے انداز تحریر کے متعلق شروع شروع میں وہ مفاہمتیں قبول کیں۔ جو طالب۔ احسن وغیرہ نے روا رکھی تھیں یعنی ڈراما یوں لکھا۔ کہ کیرکٹر پہلے نثر بولتے تھے۔ اور اس کے بعد نظم۔ انھوں نے اس رنگ میں اپنی قادر الکلامی سے اسٹیج پر خوب رنگ جمایا۔ اور بیحد کامیابی حاصل کی۔ لیکن رفتہ رفتہ حالات اور ان کے ذوق نے انہیں اس مفاہمت کے توڑنے پر آمادہ کر دیا۔ اور آخرکار انہوں نے اپنا پہلا ڈراما "بن دیوی" ایسا لکھا جو تمام کا تمام نثر میں تھا۔ اس کے بعد وہ کئی اور ڈرامے بھی نثر میں لکھ چکے ہیں۔ انھوں نے گانوں کو بہت سختی سے ڈراما سے نکالنا شروع کیا۔ اور اس وقت غالباً اکیلے ایسے ڈراما نویس ہیں۔ جن کے کھیل میں گانا بہت کم ہوتا ہے۔ اردو کے ابتدائی کھیل تو شروع سے آخر تک گانے میں ہی ہوتے تھے۔ بعد میں جب تحت اللفظ اشعار اور نثر کا رواج ہوا۔ تو بھی گانوں کی تعداد ستر ستر اسی اسی ہوتی تھی۔ احسن اور طالب کے کھیلوں میں بھی چالیس چالیس پچاس پچاس گانے ہوتے ہیں۔ لیکن حشر کے تازہ ترین کھیلوں میں پندرہ سولہ سے زیادہ گانے نہیں ہوتے۔ اور ان میں سے اکثر ایسے ہوتے ہیں۔ جو مفاہمتاً نہیں۔ بلکہ ضرورت کی وجہ سے جائز طور پر لائے جاتے ہیں۔ مثلاً ایک طوائف کے ہاں اس سے فرمائش کی جاتی ہے۔ کہ وہ گانا سنائے۔ اور وہ گاتی ہے۔ صرف چند گانے مفاہمت کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ جن کو دور کرنا ہندوستان کے عام تماشائیوں کا ذوق دیکھتے ہوئے ایک پیشہ ور ڈراما نویس کے لئے خطرے سے خالی نہیں ۔ حشر کے ہاں اب وہی مفاہمتیں ہیں۔ جو انگلستان کے وکٹورین زمانے کے ڈراما نویسوں میں تھیں۔ مثلاً وہ سوللوکی (SOLILOQUY) استعمال کرتے ہیں۔ جس میں ایکٹر اپنے آپ کو مخاطب کرکے بولتا ہے۔ اور اسائڈ (ASIDE) جس میں فرض کر لیا جاتا ہے کہ ایکٹر کی بات صرف تماشائی سن رہے ہیں۔ اسٹیج پر دوسرے کیرکٹر نہیں سن رہے۔ لیکن ان کی سوللوکی ایسی نہیں ہوتی۔ جیسی اردو اور انگریزی کے پرانے ڈراما نویسوں میں ہوتی تھی جن میں کیرکٹر پلاٹ کے واقعات تماشائیوں سے بیان کیا کرتے تھے۔ کہ اب میں جاؤنگا۔ اور یہ کام کرونگا۔ یا فلاں کام میں اب اس نیت سے کر رہا ہوں۔ بلکہ ان کے ہاں اس ذریعے سے

کیرکٹر صرف اپنے جذبات اور دلی کیفیات بیان کرتے ہیں۔ جیسے تنہائی میں انسان کبھی کبھی "ہائے اللہ" کہ اٹھتا ہے۔ خیر ہائے اللہ جتنا اختصار تو حشر کے ہاں ایسی تقریروں میں نہیں ہوتا لیکن ان کی تہ میں احساس اسی قسم کا ہوتا ہے ۔

ان کے علاوہ حشر بعض بہت معمولی مفاہمتوں سے کام لیتے ہیں۔ مثلاً جن ڈراموں میں وہ مسلمانوں کی زندگی دکھاتے ہیں۔ ان میں بغیر کوئی معقول وجہ بیان کرنے کے مسلمان عورت کو بے پردہ ظاہر کرتے ہیں۔ "سلور کنگ" میں رشیدہ۔ افضل کو گھر لانے کے لئے کھلے منہ جوئے خانے میں جا پہنچتی ہے۔ لیکن اس قسم کی مفاہمتیں جن سے کم تنغص اور زیادہ لطف حاصل ہوتا ہے۔ قابل اعتراض نہیں قرار دی جا سکتیں۔ حشر کے کھیل اتنے زیادہ ہیں۔ اور اتنے لوگوں نے دیکھے ہیں۔ کہ میری رائے میں ایک سین کا بہت تھوڑا سا حصہ یہاں نقل کر دینا کافی ہوگا ۔

کام لتا طوائف کی نائکہ بعض تماشائیوں سے حیلے سے روپیہ وصول کرنا چاہتی ہے۔ مندرجہ ذیل گفتگو میں کام لتا طوائف اس کی نائکہ راج کنور۔ اس کا سازندہ سدا رنگ اور دو تماشائی بینی اور جگل شامل ہیں۔ بینی اور جگل کی موجودگی میں راج کنور محفل سے اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔

راج کنور۔ سدا رنگ جی۔ کندن لال سیٹھ کی گدی آٹھ بجے بند ہو جائیگی۔ میں ذرا ہو تی آؤں۔

بینی۔ راج کنور جی۔ جلسہ سونا کر کے کہاں چلیں ؟

راج کنور۔ (کام لتا کی طرف اشارہ کر کے) کیا کہوں۔ یہ تو بچے کی طرح ہٹ کر بیٹھتی ہے۔ آج ایک گلابی ساٹن پر کار چوبی کام کی پشواز بکنے آئی تھی (کام لتا کو دیکھ کر) وہ دیکھئے۔ آنکھ مار کر منع کر رہی ہے۔ نہ باوا میں نہ کہونگی ۔

کام لتا۔ کہ دو۔ کہ دو۔ یہ سن کر کیا مجھے پھانسی دے دینگے ؟

بینی۔ تمہارے ہی روکنے سے تو چلتی موٹر میں پنکچر ہو گیا۔ بائی جی اب تو تمہیں کہنا ہی پڑیگا۔

راج کنور۔ سرکار۔ آج ان سدا رنگ جی کے بہنوئی ایک نئی پشواز بیچنے لائے تھے۔ مال تو ہزار سے اوپر کا نہ تھا۔ مگر چھوٹی بائی جی نے جھٹ بارہ سو دام لگا دئے۔ کہنے لگیں بسنت پنچمی ہے۔ یہی پشواز پہن کر سرکار لوگوں کے سامنے ناچونگی۔

بینی۔ سوجھی تو اچھی۔ ان کی سمجھ کبھی بے تال نہیں چلتی۔

راج کنور۔ بس آپ ہی لوگوں نے نخرے اٹھا اٹھا کر اس کا مزاج بگاڑ دیا ہے۔ یہ بھی تو سوچنا چاہئے۔ کہ گھر میں بینک کی طرح ہر وقت روپے نہیں رکھے رہتے۔ کندن لال سیٹھ نے چار آنے بیاج پر بھی روپے نہ دئے۔ تب بائی جی نئی پشواز پہن کر سرکار لوگوں کو کیسے خوش کروگی ؟

سدا رنگ۔ بڑی بائی جی۔ یہی دن ان کے اوڑھنے پہننے کے ہیں۔ گھر کے لوگوں سے کیا شرم ہے۔ باہر نہ ملے تو سرکار سے ادھار لے لو۔

کام لتا۔ استاد جی۔ کمبل ڈال کے سرکار کو لوٹ نہ لو۔ ان ہی باتوں سے تو طوائفوں اور مراسیوں کا نام بدنام ہو گیا ہے دیکھو جی۔ تم یا تم ایک پیسہ بھی دوگے تو میں بگڑ جاؤنگی۔

جگل۔ پیسہ دونگا۔ تب بگڑوگی نا۔ میں تو روپے دوں گا۔ راج کنور بائی یہ لو۔

راج کنور۔ جیو۔ دولت بڑھتی ہو۔ روپوں کو بنک میں سمجھنا میں بیاج کے ساتھ مول لوٹا دونگی۔

جگل۔ مول معاف ہے اور بیاج میں ان کی مہربانی چاہئے۔

کام لتا۔ دیکھا۔ مول معاف ہے تو یہ عقل ہی بڑھاپے پر جوانی آ گئی۔ اری نائکاؤ۔ تم بڑی پیسے کی لوبھی ہوتی ہو۔

میں نے اب تک اردو ڈراما کی ایک بہت بڑی اور مشہور مفاہمت کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ لیکن اس پر کچھ لکھے بغیر یہ سرسری تبصرہ

کسی طرح مکمل نہیں ہو سکتا - میری مراد ڈراموں کے کامک یعنی مذاقیہ حصے سے ہے - ہمارا کامک مفاہمتی ہے - اس کا نفس ڈراما سے کچھ تعلق نہیں ہوتا - تمام کا تمام کامک نکال دیا جائے تب بھی اصل ڈراما ویسے کا ویسا ہی رہتا ہے - اس کے متعلق ڈراما نویس اور تماشائیوں میں یہ مفاہمت ہے - کہ آپ تماشے میں ہنسنا بھی چاہتے ہیں - تو ہمیں اجازت دیجئے - کہ ہم آپ کو ساتھ ساتھ ایک اور کہانی بھی سنائیں - میرے خیال میں اس سے زیادہ قابل اعتراض مفاہمت اردو ڈراما میں اور کوئی بھی نہیں - اس اصول پر تو شاید یہ مفاہمت بھی جائز قرار دی جاسکے کہ اگر تماشائی اس دن کی خبریں سننا چاہیں - تو ایک ایکٹر اسٹیج پر آکر اخبار پڑھنے لگے +

ہمارے ہاں ابتدائی کھیلوں میں کامک نہ ہوتا تھا کھیل کے بعد ضرورت ہوتی - تو ایک نقل دکھا دی جاتی تھی - لیکن بعد میں کھیل کے ہیرو کے ساتھ دوست یا نوکر کے مذاقیہ کیرکٹر داخل کئے جانے لگے - ان کے تفنن کو لوگوں نے پسند کیا - تو ڈراما نویسوں نے داد لینے کی حرص میں ان کے بڑے بڑے سین لکھنے اور اصل ڈراما کی ضرورتوں سے ہٹ کر ان کی باقی زندگی کے مضحکہ انگیز واقعات اسٹیج پر لانے شروع کر دئے - حشر کے زمانے تک یہی مفاہمت رہی - کہ ہنسنا ہے - تو ذرا اصل مقصد سے ہٹ کر چند سین دکھانے کی اجازت عنایت فرمایئے - حشر نے بھی شروع شروع میں یوں ہی کیا - کہ کامک کیرکٹر کا اصل ڈراما سے برائے نام تعلق رکھا - اور اس کے تفنن کے غیر متعلق سین بے تکلفی سے لکھتے رہے - اس کی مثالیں "خوبصورت بلا" "کا خیر سلا" "سلور کنگ کا وکیل" اور "خواب ہستی کا فضیحا" ہیں - ان کیرکٹروں کی پرائیویٹ زندگی کے تمام سین کھیل میں سے نکال دیجئے - صرف اتنا ہی حصہ رہنے دیجئے - جہاں وہ اصل کھیل کے ساتھ آتے ہیں - کھیل کی تعمیر گویا تماشے کے تسلسل کو ذرا صدمہ نہ پہنچیگا -

اس کے بعد حشر نے ایک نئی مفاہمت سے کام لیا - کہ کھیل کا کامک سرے سے الگ لکھ کر اس کے متفرق سین جگہ جگہ اصل ڈرامے میں ڈالنے شروع کر دئے - ان کا خیال تھا کہ اس طرح میرے اصل ڈرامے کی تعمیر و تناسب کو نقصان نہ پہنچے گا - اور جب مناسب وقت آئیگا - یہ دونوں چیزیں جدا جدا کر کے اسٹیج کی جاسکینگی - لیکن اب آخری کھیلوں میں حشر نے اپنی خوش مذاقی کا ثبوت دیا ہے - کہ جدا کامک کو کھیل میں سے بالکل نکال دیا ہے - اور کھیل میں ایسی طرح تفنن کو دخل دیتے ہیں جس سے تماشائیوں کی تفریح بھی ہوتی ہے اور جس کا کھیل سے ایسا گہرا تعلق بھی ہوتا ہے - کہ اگر اسے کاٹ دیا جائے - تو کھیل بے معنی ہو کر رہ جائے - امید ہے حسب معمول حشر کی دیکھا دیکھی دوسرے ڈراما نویس بھی اس نہایت قابل اعتراض مفاہمت کو اپنے تماشوں میں سے خارج کرنے کی کوشش کرینگے -

مضمون ختم کرنے سے پہلے چند الفاظ اسٹیج کی مفاہمتوں پر کہ دینے بھی مناسب ہونگے - ہماری اسٹیج پر مناظر (REPRESENTATIVE) یعنی تمثیلی اور (PRESENTATIVE) یعنی مطابق اصل کے ہین بین ہوتے ہیں - مناظر بنائے جاتے ہیں اصل کے مطابق - مگر بنتے نہیں - اندر سبھا سے جو شوخ رنگ پردوں میں آئے ہیں - تو اب تک نکلے نہیں - ہر پردہ مختلف رنگوں کا انبار ہوتا ہے - مناظر میں وہ سادگی - جسامت - ٹھوس پنا اور خوش مذاقی نہیں ہوتی - جو سماں باندھنے کے ڈراما کی جان ہے - اس کی وجہ غالباً یہ ہے - کہ ہماری کمپنیاں سفری ہیں - اور اس قسم کا سامان ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ لے جانا بہت مشکل ہے - اگلے پردوں میں عام طور پر ایک ہی پردے کی سطح پر منظر کی تصویر بنا کر (PERSPECTIVE) دکھایا جاتا ہے - اور وہ

یک تخت اسٹیج کی سطح پر آکر ختم ہو جاتے ہیں۔ اگلے پردے میں کبھی کوئی دریا اسٹیج کے کنارے آکر ختم ہو جاتا ہے۔ کبھی پہاڑ اور کبھی جنگل۔ مفاہمت ہے۔ کہ خواہ اسٹیج پر کوئی خاص انتظام نہ ہو۔ مگر فرض کر لیا جائے۔ کہ اسٹیج کا باقی حصہ بھی اس پردے کے منظر کا ایک حصہ ہے۔ بڑے سین میں دریا پہاڑ تمثیل کے انداز میں ہوتے ہیں۔ اندرونی مناظر میں اب (FORMAL SETTING) یعنی رسمی آرائش سے کام لیا جاتا ہے۔ بقول شخصے فرنیچر بڑے قرینے سے رکھا رہتا ہے۔ اس کی سجاوٹ میں ذوق کو دخل نہیں دیا جاتا۔ ایکٹر ونگ میں سے داخل ہوتے ہیں۔ اور مفاہمت ہے کہ ونگ دروازے ہیں۔ کھانے کی بجائے میوہ مٹھائی لائی جاتی ہے۔ اور فرض کر لیا جاتا ہے۔ کہ یہ کھانا ہے۔ آٹھ دس سپاہی آکر لڑتے ہیں۔ اور مفاہمت ہے کہ ان آٹھ دس سپاہیوں کی لڑائی کو گھمسان کا رن سمجھ لیا جائے۔ کھیل کے دوران میں بعض خاص مناظر میں موسیقی سے کام لیا جاتا ہے۔ لیکن اس کی فہم ابھی کم پیدا ہوئی ہے۔ روشنی کا انتظام بہت ابتدائی منزل پر ہے۔ ایکٹر زیادہ تر کام اسٹیج کے اگلے حصے میں فٹ لائٹس کے سامنے آکر کرتے ہیں۔ حرکات میں ناپ تول کا احساس ابھی زیادہ نہیں ہوا۔ لباس پہلے تو پورے پورے تمثیلی ہوتے تھے لیکن اب ان میں واقعیت کا رنگ جھلکنے لگا ہے۔ چہرے سفید رنگے جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں صرف گنتی کے چند کھیل ایسے نکلے ہیں۔ جو مطابق اصل قرار دئے جا سکیں۔ جن میں مقامی رنگ خوب نمایاں ہو۔ ایسا ایک کھیل خصوصیت کے ساتھ بہت مشہور ہوا تھا۔ جس کا نام علاؤالدین چراغ تھا۔ اور جو چینی زندگی کا کھیل تھا۔ اس کا تمام سامان کھٹاؤ کی کمپنی نے چینی انداز کا تیار کرایا تھا اور اپ ہمارے ہاں اس وقت کرتا ہے۔ جب ایکٹر تصویر بنا کر کھڑے ہوتے ہیں ٭

یہ ہے سرسری بیان اردو ڈراما اور اس کی مفاہمتوں کے پیدا ہونے کا۔ ان میں سے بعض مفاہمتیں وقتی اور اتفاقی تھیں جو رفع ہو گئی اور ہو رہی ہیں۔ بعض آیندہ رفع ہو جائینگی۔ مفاہمت خود بری چیز نہیں۔ دیکھنا صرف یہ ہوتا ہے۔ کہ وہ ضروری بھی ہے یا نہیں اور اس کو جائز قرار دینے سے کوئی خاص فائدہ بھی پہنچتا ہے یا نہیں۔ (DRAMA OF ILLUSION) یعنی سماں باندھنے کا ڈرامہ اچھی چیز ہے یا نہیں۔ اور تخیل کے لئے اتنی غذا بہم پہنچاتا ہے یا نہیں۔ جیسے (REPRESEN-TATIVE DRAMA) یعنی تمثیلی ڈرامہ پہنچاتا تھا۔ یہ بہت طویل موضوع ہے۔ جس پر میں اس صحبت میں بحث نہیں کر سکتا اگر اردو ڈراما کی مفاہمتوں کی اس تاریخ سے انگریزی دان دوست انہیں اس نظر سے دیکھنے لگے۔ کہ وہ خاص حالات میں پیدا ہوئیں اور خاص حالات میں مٹیں اور خاص وجوہ سے بعض بعض موجود ہیں۔ ان کا نقطہ نظر نفرت کی بجائے دلچسپی کا اور ہمدردانہ بن گیا تو میں تصور کرونگا کہ میری محنت اکارت نہیں گئی

"____ کہ عالم دوبارہ نیست"

فراعنۂ مصر کے محل کا دستور تھا۔ کہ ضیافتوں کے بعد جب مہمانوں کی میگساری اور بیباکی اعتدال کی حدود سے تجاوز کرنے لگتی۔ تو معبد قصر کا پروہت ۔ ممی کی وضع پر تراشی ہوئی دیوتا آسیرس کی لکڑی کی مورت ۔ خدام کے کندھوں پر اٹھوا کر ایوان نشاط میں داخل ہوتا۔ اور اس وقت جب کہ خدام مورت کو اٹھائے اٹھائے مخمور فرعون کے بدمست مہمانوں میں تھم تھم کر گھوم رہے ہوتے ۔ تو پکار پکار کر کہتا۔"انجام ہستی کو دیکھو۔ اور ان ترغیبات سے احتراز کرو ۔ جو تمہارے حواس کو فریب میں لا کر تمہیں بھلا دیتی ہیں ۔ کہ موت کا سرد ہاتھ ایک روز حیاتِ ناپائدار کی آنکھیں بند کر دیگا"۔

موت کی چہرہ دستی کا بھیانک نتیجہ آنکھوں کے سامنے آجانے سے منادی کی آواز مقسوم کے گھڑیال کی گونج معلوم ہوتی ۔ جسے سن کر دست درازوں کے بازو ڈھیلے پڑجاتے اور مے آشاموں کے ہاتھ پیالوں کو نہ سنبھال سکتے ۔ اور ایک لمحہ کے اندر اندر محفل پر مدہوشی اور خود فراموشی کی بجائے عبرت کا خیال آفریں سکوت طاری ہو جاتا۔

لیکن یہ صدیوں کا پرانا دستور جسے زمانۂ قدیم کے کسی معلم اخلاق نے وضع کیا تھا ۔ اور جس سے اخلاق عامہ کے محافظ ۔ پروہت اور پجاری' اعتدال و احتیاط کی درس آموزی کیا کرتے تھے ۔ ایک ہی رات کے اندر ایک نوجوان فرعون کے ہاتھوں اپنے معانی کی تعبیر میں اچانک یوں منقلب ہوا ۔ کہ مورخ اور فطرت انسانی کے طالب کے لئے یکساں طور پر استعجاب انگیز ہے۔

وہ رات بلا رسروپ دیوی بسط کے تہوار کی آخری ہنگامہ خیز رات تھی۔

مصر کی وسیع مملکت سے ستر ہزار زائر خشکی کی راہ اور کشتیوں میں سوار ہو کر کھڑتالیں اور مرلیاں بجاتے اور گیت گاتے کئی روز پیشتر بیوبسطس کے شہر میں پہنچ چکے تھے۔ جواں سال فرعون اور اس کے پروہتوں نے پوجا کی تمام خفی و جلی رسمیں ادا کر لی تھیں۔ دیوی کا چولا اور اس کا منڈل جس پر ایک سپنولیا بنا تھا بدلا جا چکا تھا ۔ فرعون نے معطر لیپ دائیں ہاتھ کی چھنگلیا سے دیوی کی کانسے کی مورت پر مل دیا تھا۔ قربانگاہ پر سیاہ و سفید رنگ کے ہزاروں بیلوں کی قربانیاں چڑھ چکی تھیں۔ اور ان کے سر ان دعاؤں کے بعد کہ فرد اور قوم اور شہر اور مملکت کی بلائیں ان پر ٹل جائیں۔ نیل میں غرق کئے جا چکے تھے۔ دیوی کے حضور میں شہد اور شراب اور کشمش اور کھیر کے چڑھاوے چڑھ چکے تھے۔ بیوبسطس کے ایک ایک بازار میں عوام کا بحر مواج جلاجل اور مجیرے بجا بجا کر سارے دن بھجن گاتا اور دیوی کی جے کے نعرے لگاتا رہا تھا۔ اور اب تمام رسوم ادا کر چکنے کے بعد مرد اور عورتیں اور بوڑھے اور بچے ادائے فرض کی فراغت کے احساس کے ساتھ اپنے آپ کو طرب و نشاط کے اس عام میلان کے سپرد کر چکے تھے جس کے تند و پرشور سیلاب کے ریلے سارے اژدحام کو بہائے لئے جا رہے تھے ۔ اور بہار کی اس جذبات انگیز رات میں تاباں و فروزاں مندر کی منقش دیواروں کے باہر جا بجا

مشعلیں گھماتے، دف اور جھانجھیں اور الغوزے بجاتے عریاں گیتوں اور ولولہ انگیز ناچوں میں کھوئے ہوئے تھے۔

بلا رسروپ دیوی بسط کے تہوار کی آخری ہنگامہ خیز رات میں ضیافت کے بعد نوجوان فرعون کا ایوان نشاط مملکت مصر کے تمام قابل ذکر لوگوں سے پٹا پڑا تھا۔ اور اگرچہ ازدحام کے ہنگاموں سے علیحدہ اور جدا تھا۔ لیکن نہ اتنی دور کہ بیرونی وارفتگیاں محسوس ہوئے بغیر رہ سکتیں۔ نوجوان فرعون کا ایوان نشاط عشرت و تجمل کا ایک نادر و یگانہ خواب تھا۔ جسے معمار اور نجار اور مصور اور سنگتراش کی متفقہ مجنونانہ کاوشوں نے زندگی بخش دی تھی۔ عظمت و رفعت میں اہرام کھڑے کرنے والوں کی اولاد کے شایان شان۔ طول و عرض میں اس قدر وافر کہ ایک ازدحام کی معصیت اس میں ناچیز نظر آتی تھی۔ اس کی وسعت ایک شور قیامت کو اپنے اندر گم کر سکتی تھی۔ مجلّٰے و مصفّٰے فرش پر منقش اور رنگین دیواروں کے ساتھ ساتھ استر کاری کے ستونوں کی ایک دنیا آباد۔ جن کے پائے اور سر قدیم صناعی اور رنگ آمیزی کا ایک فردوس تھے۔ اور ان کے درمیاں جابجا دیوی بسط کے عظیم الجثہ مجسمے وقار اور تمکنت میں ترشے ہوئے کھڑے تھے۔ ایوان کی وسعت کے برابر نیچی نیچی اور چوڑی چکلی بے شمار سیڑھیاں دو ایسے ہی دوسرے وسیع تختوں کو رہنمائی کرتی تھیں۔ گرانڈیل صد شاخوں کی مختلف اللون روشنیوں میں انسانی صناعی کا یہ حیرتناک منظر جس میں رنگ و آہنگ کی موجوں پر خوشبوئیں ہلکورے لے رہی تھیں۔ اپنی تابانی و درخشانی سے ہوش ربائی کر رہا تھا۔

رنگدار پایوں کے ہزاروں گدیلے دار تخت اور کرسیاں بچھی تھیں۔ جن پر نوجوان فرعون کے مہمان ضیافت کے بعد رنگ رلیوں سے لطف اندوز ہونے کے لئے بیٹھے تھے۔ نیل کی مچھلیوں اور بطوں اور جنوبی جنگلوں کے غزالوں اور گایوں کے کبابوں کے ساتھ مہمانوں کو کرنب بھی کھلایا گیا تھا۔ کہ ان کی پیاس بھڑک اٹھے اور وہ اسے وادیٔ نیل کے انگوروں کی لال اور سفید شراب سے بجھا سکیں۔

تنومند ہاتھوں نے قدح بڑھا رکھے تھے اور گوری ساقنیں زمرد کار مینا لئے فراخ حوصلگی سے انہیں لبالب بھر رہی اور خالی مینا ساتھ کی سیہ فام کنیزوں کے سپرد کرتی جا رہی تھیں۔ جام ہونٹوں پر سرنگوں تھے اور منہ پونچھنے والے خادموں کے رومال ہٹا ہٹا کر ہل من مزید کی صدائیں بلند کی جا رہی تھیں۔

ایوان کے مختلف حصوں میں مختلف تفریحیں جاری تھیں۔ نچلے تختے میں مزامیر کے غل کے ساتھ نٹ اور بازی گر اور شعبدہ باز اور مسخرے اپنے اپنے کمال فن کو نظارہ افروز کر رہے تھے۔ کئی کئی چرمی گیندیں آگے پیچھے اچھال کر واپسی میں باری باری لپکی اور پھر اچھالی جا رہی تھیں۔ رنگین دائروں والی لکڑی کے اندرونی دائرے پر خنجروں سے نشانہ لگایا جا رہا تھا۔ دو دو مرد اور عورتیں زمین پر ٹانگیں پھیلا کر برابر برابر بیٹھتے اور ایک دوسرے کی باہوں میں باہیں ڈال کر بغیر زمین کا سہارا لئے کھڑے ہو رہے تھے۔ مسخرے اور بونے اپنی چست پھبتیوں اور مضحکہ خیز حرکتوں پر قہقہے وصول کر رہے تھے۔

دوسرا تختہ خوش آواز سازوں اور نامور مغنیوں کے راگوں سے سماعت کے لئے ایک خوش آیند وارفتگی کا سامان مہیا کر رہا تھا۔ طنبور اور سرود اور نے بجانے والی جماعتیں فضا کو کیف و مستی کی جنت بنا رہی تھیں۔ اور مغنیوں کی گلے بازیاں متاع ہوش کی غارتگری میں مصروف تھیں۔ نازنینیں اپنے سبک بربط سینے سے لگائے اور کندھوں پر اٹھائے اپنی نازک انگلیوں سے ان کے تاروں کو ملاتی اور اپنے گیتوں اور تبسموں سے بجلیاں گراتی مہمانوں کے درمیان سے گزر رہی تھیں۔ جن کے ذہن عشرت کی ایک انوکھی مدہوشی میں جیسے سُن تھے۔

تیسرے تختے کے پرلے کنارے ایک جڑاؤ تخت پر جس کے پایوں کو شیروں کے بڑے بڑے سر بنا کر مزین کیا گیا تھا۔ نوجوان

فرعون وقار آمیز تجمل میں بیٹھا تھا + شباب کے اولین مراحل میں اور نا کتخدا - اس کی مسیں بھیگ چکی تھیں - اور خط بننا شروع ہو گیا تھا + اس نے نفیس ترین کتان کی ایک لمبی اور دودھ سی سفید عبا پہن رکھی تھی - جس کی آستینیں چست تھیں - اور جس کے دامن پر سنپولیوں کی زرنار قطار نے مصر کا شاہی نشان بنا رکھا تھا + زری کے ایک کمر بندے جس نے عبا کو خوش مذاقی سے چنٹیں دے رکھی تھیں - سامنے کی طرف باریک چمڑے کی ایک مثلث آویزاں تھی - جس پر شوخ رنگوں میں لہریئے کے نقش بنے ہوئے تھے + سر پر مصنوعی بال تھے - جن پر کنول کے شگفتہ پھولوں کا بک سا تاج رکھا تھا - گردن میں ہیروں کا ایک ہار دمک رہا تھا - اور بازوؤں - کلائیوں اور انگلیوں میں سونے کے موٹے موٹے بازو بند - پہنچیاں اور انگشتریاں جن پر نایاب پتھروں سے گرمچھ اور بچھو اور تصویری خط کے حروف بنے ہوئے تھے +

قد آدم بربط جن کے سروں پر ارواح خبیثہ کے انوکھے چہرے ترشے ہوئے تھے - ایک مناسب فاصلے پر کھڑے تھے اور مزاج شناس سازندوں کی مشاق انگلیاں انہیں ایسے سلیقہ سے ہولے ہولے بجا رہی تھیں - کہ رقاصہ لڑکیوں کے لطیف رقص کے ساتھ مل کر وہ تھکے ہوئے دماغ پر خوش آیند غنودگی طاری کر سکیں + خوشبوؤں اور روشنیوں میں کھوئے ہوئے نشاط پر اس تیسرے تختے میں ہیبت سے رنگا ہوا ایک سکون مسلط تھا - جس نے ہر قسم کے تجاوز و توافر کو عنان گیر اور تمام حرکات اور آوازوں کو منضبط کر رکھا تھا + پروہت کے نزدیک عشرت کا یہی تصور تھا - جو تہوار کی رات میں ایک نیک فرعون کے شایان شان قرار دیا جا سکتا تھا - چنانچہ وہ اپنی ضعیف پیشانی پر اطمینان و تشفی لئے اس امتناع آمیز طرب میں دلجمعی سے بیٹھا تھا +

لیکن نوجوان فرعون بے قرار نظر آ رہا تھا +

اس کی آنکھوں میں ایک تکان تھی - ایک بے کلی - جسے تکلف کی یہ محتاط فضا گھٹانے کی بجائے بڑھاتی چلی جا رہی تھی - حرکات میں ایک اکتاہٹ - ایک دل برداشتگی - ماحول کی نوعیت سے سیری - اس سارے ماحول میں جو تال مضمر تھی اس سے بے آہنگی - وہ بیٹھا ہوا تھا جیسے ایک تلخی کے امتلا میں - صرف ادائے فرض کی تسکین کے سہارے - اس لئے کہ پروہت وہاں موجود تھا - جس نے اس کی طبع آزاد کو ہمیشہ آئین پرستی کے سلیچے میں ڈھالنے کی کوشش کی تھی جس کے نزدیک تربیت کا لب لباب ناجائز جذبات کا انسداد تھا - اور جس کی خشک دامانی کے لئے وہ تمام جذبات ناجائز تھے - جو فرعون کے مقررہ مذہبی و معاشرتی فرائض سے تعلق نہ رکھتے تھے - یا جن سے اس کے فرعونہ جلال و جبروت میں کوئی عام انسانی خصوصیت جھلک اٹھنے کا احتمال کیا جا سکتا تھا +

وہ بیٹھا ہوا تھا - احتجاج کی چبھن سینے میں دبائے - اس منضبط عشرت کا صدر بنے اور اپنے کشیدہ دل میں پروہت اور رواج کی طرف سے ایک دُود آفرین شکوہ لئے + دیوی بسط کے تہوار کی یہ آخری ہنگامہ پرور رات جس کی ریل پیل کا شور باہر اور ایوان نشاط کے نچلے تختوں سے ایک مدھم گونج بن کر اس تک پہنچ رہا تھا اسے عجیب طرح متاثر کر رہی تھی - ایک انوکھی تشنگی تھی جس نے دل سے زبان تک اس کے سینے اور حلق کو خشک کر رکھا تھا - شراب میں اس پیاس کے لئے تسکین نہ تھی - وہ اتنی گاڑھی معلوم ہوتی تھی - کہ حلق جبر سے اس کے لئے کھلتا تھا + اس کے بے قرار خون کی بڑھی ہوئی حرارت کسی اور تسکین کی تشنہ تھی - اس تسکین سے بہت مختلف جو بربط کے ہلکے ہلکے ہلتے ہوئے تاروں اور رقاصوں کے لطافت سے اٹھتے ہوئے قدموں میں تھی - اور جو اس شبستان کے ضبط و ترتیب اور تہذیب و شائستگی کی جلا میں نظر آ رہی تھی - کچھ زیادہ تند - وحشیانہ - خلاف معمول - اپنی نوع میں اس سب سے مختلف جس نے ہر طرف سے گھیر رکھا تھا - کچھ اس سے ہمنوا جو ازدحام کے شور و غل کی مدھم گونج میں تھا - لیکن زیادہ بلند - زیادہ شدید - زیادہ بے تکلف - حواس کی لطف اندوزی کے لئے زیادہ

واضح - جو وہاں نہ تھا - جو گلیوں میں تھا - از دحام کے ان وارفتہ مخلوط ناچوں میں جہاں لباس جذبہ کی فراوانی میں حائل ہونے سے معذور تھا جہاں کی فضا میں صرف بدن سے نکلے ہوئے پسینے کی بو تھی - جہاں جسموں کا باہمی مس تھا - جہاں شانے پھڑ سکتے تھے - جہاں سینہ ہر طرف سے گوشت پوست کے گرم دباؤ میں دب سکتا تھا +

دیوی بسط کے تہوار کی اس آخری ہنگامہ خیز رات کا رنگ رس جو اپنی فراوانی اور بے عنانی میں بیخودی و مستی کا ایک ابلتا ہوا سمندر تھا - اس کے نوجوان خون پر اپنا افسوں پھونک کر اس کو پکار رہا تھا - لیکن اس کے لئے اس کے سوا چارہ نہ تھا - کہ اپنی روح میں سے اٹھتی ہوئی لبیک کو دبائے چپ چاپ بیٹھا رہے + شفقت پدری سے بچپن ہی میں محروم ہو جانے کے بعد پروہت نے اسے یوں ہی تربیت دی تھی - خیال سے اپنے آپ کو بچانے کی تربیت - نفس کی ہر پیداوار کو دیکھے یا پرکھے بغیر خود کچل ڈالنے کی تربیت + اور اس نے ہمیشہ پروہت کے کہے پر عمل کرنے اور اپنے نفس کو اپنا سب سے عیار دشمن سمجھنے کی مخلصانہ کوشش کی تھی - لیکن آج کی رات میں - تہوار کی اس ولولہ انگیز رات میں جب ہر طرف نفس ہی کی برات چڑھی ہوئی نظر آ رہی تھی - وہ پروہت سے شکوہ آلود برگشتگی اور اپنے نفس سے ایک حجاب آمیز موانست محسوس کر رہا تھا - ایک موانست جو اس رات میں حیرتناک رفتار سے ترقی کر رہی تھی - جو اس کی تمام ہستی سے ساز باز کرتی ہوئی اس پر چھائی چلی جا رہی تھی اور جس کے دزدیدہ تموج کی سرکشی سے اور اپنے ایک دوسرے آپ کی مغلوبیت سے اس کی فطرت کا زیادہ گہرا عمق ایک پوشیدہ مسرت حاصل کر رہا تھا +

اور جذبات کی اس درہمی برہمی میں ایک نیا اور قوی ارمان اس کے اندر جنم لے رہا تھا - جو شاید اپنی نوزائیدگی کی وجہ سے - شاید اپنی اجنبیت کے باعث اسے بے حد محبوب معلوم ہو رہا تھا - جس کی قوت کا اصرار - جس کی سرکشی کا دعویٰ باوجود درد آمیز ہونے کے ایک عجیب طرح سرور انگیز تھا - جس کی سنسناہٹ وہ چاہتا تھا اس کے خون میں فزوں تر ہوتی چلی جائے اور جس کی پھریریاں اسے کسی زیادہ موافق ماحول میں چھوڑ آئیں +

وہ آنکھیں بند کئے اپنے آپ سے خود مغلوب ہونے کی کوشش کر رہا تھا - کہ بربطوں کے یکلخت تھم جانے سے وہ چونک پڑا - اس نے اپنی گرم گرم آنکھوں پر سے پلکیں ذرا سی اٹھائیں + پچھلا رقص ختم ہو چکا تھا - اور ایک نئی رقاصہ اکیلی رقص کرنے کو محفل میں آ چکی تھی - خاموشی کی علت نے آہستہ سے اس کے شعور سے مس کیا - اور اس نے آنکھیں پھر بند کر لیں + لیکن اس مس میں ایک دامنگیری - اس کے ارمان کی حرکت کی تال - ایک دعوت تھی + اس کی پلکیں رفتہ رفتہ زیادہ اٹھتی چلی گئیں +

روشنی سے دہکتے ہوئے فرش پر ایک نئی رقاصہ جو لبنان کے تپتے ہوئے صحراؤں میں سے لائی گئی تھی - ایک باریک سفید نقاب میں سر سے پاؤں تک ڈھکی ہوئی ساکت کھڑی تھی - یوں جیسے کسی سنگتراش کی گرمی جنوں ایک سفید جسامت میں حسن تناسب کا خواب جمیل دیکھ رہی ہو - تفصیل کھوئی ہوئی - لیکن خاکہ کی سہانی اور محتاط اور احتیاط میں کامل گولائیاں عشرت نظر - اپنے جمود میں بھی سجیلی حرکات کا تصور بھڑکاتی ہوئی - پیر کا انگوٹھا زمین پر - گھٹنے میں خم - ایک بازو بدن سے چمٹا ہوا - دوسرا جدا جس کے فاصلے اور انگلیوں کے خم میں ایک حرکت تھی ہوئی - گردن میں ایک آگاہی - بدن کے تناؤ میں ایک تامل - جیسے اپنی بے تکلفی میں شباب کی للکار سن کر تھم گئی ہو +

ایک خادم نے جھک کر لمبے نقاب کا دامن زمین پر سے اٹھانا شروع کیا - سازوں کے لمبے لمبے تار دھڑکنے لگے - ان کی

دھڑکن میں خیال کی مخلوق نے حواس کی دنیا میں جنم لینا شروع کر دیا۔ صحرا کے آفتاب میں پلا ہوا گداز سانولا جسم۔ تکمیل کے سانچے میں ڈھلے ہوئے اعصاب جن میں سے زندگی کی گرمی پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی تھی۔ سرخ اور سبز منکوں کی ایک مختصر جھالر کمر کے مس سے لرزشیں کھاتی ہوئی۔ گدرایا ہوا بدن۔ خط و خال میں ایک بے تکلفی۔ ایک ناتراشیدگی۔ غیر واضح ٹھوڑی۔ ہونٹ موٹے۔ نچلا ہونٹ درمیان سے کسی قدر دبا ہوا۔ اور اوپر کا ہونٹ اُبھرا ہوا۔ سرخ خون سے پر اور نمناک۔ ناک چھوٹی اور کسی قدر پھیلی ہوئی۔ نتھنے نازک جو کچھ سونگھنے اور کھینچتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ آنکھیں لمبی اور سیاہ جن میں ایک سحر رقیق ہو کر کبھی پلکوں کی چلمن میں چھپتا اور کبھی باہر جھانکتا تھا۔ تنگ پیشانی۔ اور اس پر پھولے ہوئے گھنگریالے بال۔

فرعون اسے تک رہا تھا۔ اور اپنی پلکیں پھر گرانا نہ چاہتا تھا۔ وہ اسے عجیب طرح ایک نئی اور تازہ شے معلوم ہو رہی تھی۔ اپنے نوزائیدہ ارمان کی طرح نئی اور تازہ اور اصرار سے بھری ہوئی۔ اس ماحول میں جہاں سب کچھ جچا تلا اور جانچا پرکھا ہوا تھا ایک مختلف شے۔ اس کے ارمان کی طرح مختلف۔ جو باوجود تخالف کے بے محل نہ تھی۔ جس کا تضاد منظر کو ایک انوکھی طرح نیا بنا رہا تھا۔ جس میں اس وسیع اور رنگین چھتی ہوئی چاردیواری سے باہر کا پیغام تھا۔ وہاں کا پیغام جہاں سے نعروں اور چیخوں اور قہقہوں اور گیتوں کی گونج آ رہی تھی۔ جہاں اُجڈ پگڈنڈیاں اور زندگی سے بھری ہوئی راہیں تھرک رہی تھیں۔

فرعون کانوں میں ایک سنسناہٹ لئے اس کا ناچ دیکھنے لگا۔ ناچ جو اس کے بھرے بھرے اور لچکتے ہوئے بازوؤں کی بیباک حرکات سے شروع ہوا تھا۔ اور جس کا زہر اندر ہی اندر اس کے دھڑ میں لہریں مارتا ہوا دڑانہ نیچے کو بڑھ رہا اور اس کے تندرست و توانا اعضا میں تند اور البیلی حرکات پیدا کرتا جا رہا تھا۔ حرکات جن میں نہ فرعون کا پاس ادب تھا اور نہ پروہت کا حجاب۔ حرکات جن کا منبع شباب کا جوش مارتا اور کف اُڑاتا ہوا چشمہ تھا۔

فرعون کا انہماک بڑھ رہا تھا۔ رقص جیسے اس پر کوئی افسوں پھونکتا جاتا اور اس پر ایک سنسناتی ہوئی معطر غفلت طاری کر رہا تھا۔ ایک غفلت جو اندر سے بیدار اور حیات افروز تھی۔ جس میں وہ سب خیالات کروٹیں لے لے کر آنکھیں کھول رہے تھے۔ جنہیں اچانک پیدا ہونے پر پروہت کی ہدایت کے مطابق اس نے ہمیشہ کچل ڈالا اور مردہ سمجھ کر چھوڑ دیا تھا۔ وہ سینے کی گہرائیوں سے زندہ ہو ہو کر اٹھ رہے اور اس کے نوزائیدہ ارمان کے اندر سما سما کر اس ناچ پر جھوم جھوم کر وجد کر رہے تھے۔ اور ان کے وجد میں رقاصہ مانوس سی معلوم ہوتی جا رہی تھی۔ ایک گریزاں لطافت جو ہمیشہ ٹکڑوں میں اس کے پاس آئی تھی۔ جب وہ دیوی کا چولا بدل رہا تھا۔ تو اسی کی پنڈلی کی ایک جھلک نے اسے سراسیمہ کر دیا تھا۔ جب وہ دیوی کی برہنہ مورت پر معطر لیپ مل رہا تھا۔ تو اُس کی چھنگلی اسی کے مس سے لرز کر تھم گئی تھی۔ جب اُس کا رتھ ازدحام میں سے گزر رہا تھا۔ تو یہی تھی جس نے بالوں میں سے کہیں اپنا شانہ اور کہیں اپنی پیٹھ کا اُتار ننگا کر رکھا تھا۔ جس کی آنکھیں نگاہیں چار ہونے کے بعد منڈیر کے پیچھے چھپ گئی تھیں۔ جس کی آواز نے اس ہجوم کے شور میں سے اس تک پہنچنے کا راستہ بنا لیا تھا۔ جو کہیں اس کے آگے آگے بھاگ کر نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ اور کہیں اس کے گزر چکنے کے بعد پیچھے اسے پکارتی رہ گئی تھی۔

اب وہ اکٹھی ہو کر کھڑی ناچ رہی تھی۔ ایک ناچ جس کا خروش لمحہ بہ لمحہ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ جو جسم میں رچ چکنے کے بعد اسے چال میں متحرک کرنے لگا تھا۔ لمبے لمبے قدموں کی البیلی چال میں جس کا تعلق گھٹنوں سے زیادہ کولھوں سے تھا۔ جس میں خلوت کی بیباکی تھی اور جلوت کا احتراز۔ جس میں رزم کی یورش تھی اور بزم کا پس و پیش۔ جس میں سرور آشام قوت کے اچانک دھاوے تھے اور رعنا ضعف کی

پسپائیاں۔ نفس کے دروازوں پہ بیباک دستک بھی تھی اور دبی ہوئی آہیں بھی +

فرعون جلتی ہوئی آنکھوں سے اس گدرائے ہوئے جسم کی حرکات کو دیکھ رہا تھا۔ جس کے مانوس اعضا اس وقت یکجا ہو کر ایک اجنبی اور ناقابل فہم ہستی بن گئے تھے۔ اور اپنی تکمیل سے ایک عظیم تسکین پیدا کرنے کی بجائے ایک نئے اور پر اسرار طریق پر اسے نبرد آزما ہونے کو للکار رہے تھے + اس نے رتھ پر کھڑے ہو کر کسی حریف کے سامنے اپنی قوت کی بساط کو ایسا متامل محسوس نہ کیا تھا کیسی متقابل کے اسلحہ اور فن نبرد آزمائی کو سمجھنے میں اتنا عاجز نہ رہا تھا۔ لیکن عجز اور تامل کا یہ احساس اسے زیادہ اکسا رہا تھا۔ اس میں سنسنیوں کے نئے ریلے پیدا کر رہا تھا۔ غلبہ کا منہ زور ارمان اس کی ساری ہستی میں ایک زلزلہ سا لا رہا تھا اور پکار پکار کر اسے کہہ رہا تھا۔ کہ اس حصول میں وہ سب کچھ ہے جس سے محرومی مرد کی زندگی کو ماتمی بنا سکتی ہے + زندگی کا وہ کامل سرور جو ہمیشہ اس کے ہاتھوں میں سے پھسلتا رہا ہے۔ جو اس کے بے پناہ ارمان میں دھڑک رہا ہے۔ اس سرکش جسم کو مغلوب کرنے میں ہے۔ اس میں اپنی سخت انگلیوں کے فشار سے نیل ڈال دینے میں۔ اسے اپنے آغوش کی حدت سے بے سدھ کر دینے میں۔ اور اس کے بھرے بھرے سانولے بازوؤں میں اپنے سفید دانت گاڑ دینے میں +

پروہت چیں جبیں سے اس کی بے کلی کو دیکھ رہا تھا۔ لیکن اپنے میں جرأت نہ پاتا تھا۔ کہ اس رقص کے طغیان کو روک کر فرعون کی سرخ جلتی ہوئی آنکھوں سے آنکھیں چار کر سکے + وہ اٹھا اور اپنے سلگتے ہوئے غصے کے شعلوں کو دبائے پروہتوں سمیت خاموشی سے رخصت ہو گیا +

اور رقاصہ کا رقص اپنی تندی اور تفصیل اور وحشیانہ خود فراموشی میں ترقی کرتا چلا گیا + صحرا کی وہ ارواح خبیثہ جن کی ترغیبات کی آواز بھدے مجسموں میں محفوظ تھیں۔ اس کے رقص میں انگڑائیاں لے لے کر جاگ رہی تھیں۔ اور اس کے اندازوں میں اپنا شیطانی افسوں پوری پوری وضاحت سے پھونک رہی تھیں + اس کی آنکھوں میں ان کی خناسی نظریں دہک رہی تھیں۔ اور اس کے نتھنوں سے ان کے سانس کی گرم بھاپ نکل رہی تھی +

فرعون کے اندر خواہشوں کی موجیں عظمت اور بلندی اور غضبناکی میں بے پناہ بن گئی تھیں۔ اس کی کمر اور اس کی رانوں میں سوئیوں کی طرح چبھتی ہوئی گرم لہریں دوڑ رہی تھیں۔ اس کی تمام ہستی غلبہ کے ایک پھونک ڈالنے والے ارمان سے بھڑک رہی تھی + اس کا فرعونانہ جلال نرم گوشت اور لچکتی ہڈیوں کی اس کمزور ہستی کو جو اپنی نویلی حرکات اور البیلے اندازوں میں اجیت بن بن کر تھرک رہی تھی اس سے زیادہ سرکش نہ دیکھ سکتا تھا۔ اس کے اعضا نے چیتے کی گھات کا انداز اختیار کر لیا تھا۔ یکلخت وہ ایک ببر کی سرعت سے لپکا۔ اس کے بازوؤں نے اژدہے کا بل ڈال لیا۔ اور ایک زہریلا ناگ بن کر انتقام کی پوری خونخواری میں رقاصہ کو ہونٹوں پر ڈسنے لگا۔ قد آدم ستاروں کے تار شدید دھڑاکوں کے ساتھ ٹوٹ کر رہ گئے۔ اور ذرا دیر کو ایک کانپتا ہوا سکوت طاری ہو گیا +

اور پھر ایوان نشاط کا تبسر انخنہ ہاؤ وہو کے ایک فلک شگاف غل سے گونج اٹھا۔ جس میں خموں کے منہ کھل گئے۔ قدحوں میں سے شراب ابل ابل کر گرنے لگی۔ مینا فرش پر لڑھکتے ہوئے دکھائی دینے لگے۔ رقاصہ لڑکیوں کی کلائیوں پہ پنجے گڑ گئے۔ اور ساتنوں کے دامن تار تار ہو گئے +

لیکن یہ رنگ رس ابھی پورے طور پر بے قابو نہ ہونے پایا تھا۔ کہ یکلخت کانسے کا ایک گھڑیال بجنا شروع ہوا۔ اور فرعون کے تخت

کے پیچھے ایک منقش دروازہ رسم کے تکلف واہتمام سے کھول دیا گیا۔ چونکی ہوئی نگاہیں اس سمت کو اٹھیں۔ تو دیکھا۔ کہ غضب آلود پروہت ممی کی وضع پر تراشی ہوئی دیوتا آسیرس کی لکڑی کی مورتی خدام کے کندھوں پر اٹھوا کر ایوان نشاط میں داخل ہو رہا ہے۔

غل گھٹنے لگا اور گھٹتے گھٹتے نابود ہو کر رہ گیا۔ تامل آمیز سکوت میں جب خدام ممی کو اٹھائے اٹھائے نوجوان فرعون کے مہمانوں کے سامنے چپ چاپ تھم تھم کر گھومنے لگے۔ تو پروہت پکار پکار کر کہنے لگا۔ "انجام ہستی کو دیکھو اور ان ترغیبات سے احتراز کرو۔ جو تمہارے حواس کو فریب میں لا کر تمہیں بھلا دیتی ہیں۔ کہ موت کا سرد ہاتھ ایک روز حیات ناپائدار کی آنکھیں بند کر دیگا"۔

پروہت کی آواز جیسے اہرام کے اندر سے گونج گونج کر نکل رہی اور ہڈیوں میں نفوذ کرتی چلی جا رہی تھی۔ مورتی کے سامنے آتے ہی لرزہ براندام مہمانوں کے رنگ پیلے پڑ گئے۔ اور حلق سوکھ کر رہ گئے۔ ہیبت نے دلوں کو دہلا دیا۔ اور عبرت آفریں خاموشی میں مخمور نظروں کے اندر سے استغفار کی پو پھٹنے لگی۔

فرعون اپنی ہلچل اور عطر پاش خود فراموشی سے چونک اٹھا تھا۔ رقاصہ اس کے بازو پر بے سدھ پڑی تھی۔ وہ اپنے تمام جسم میں ایک پیاسا اور مُصر درد لیئے ساکت تھا۔ پروہت کے الفاظ کی گونج اس کے کانوں میں شائیں شائیں کر رہی تھی۔ اور اس گونج میں ایک ہیبت کا سایہ اس کے دل پر اترتا آ رہا اور گہرا ہوتا جا رہا تھا۔

اس کی نظر مورتی پر پڑی۔ جسے خدام کے کندھے احترام کی آہستگی اور خاموشی میں اٹھائے لئے آ رہے تھے۔ اس نے خوف آلود پس و پیش سے نظریں اٹھائیں اور آسیرس کی مورتی کو دیکھنے لگا۔ اسے ایسا محسوس ہوا۔ کہ آسیرس کے ساکت و جامد چہرے میں اس کے اپنے خط و خال ابھرتے چلے آ رہے ہیں۔ زندگی کی روانی سے منقطع۔ موت کی چیرہ دستی سے مغلوب۔ انجام ہستی کے شدید احساس نے یکلخت اس کے دل کو مٹھی میں لے کر بھینچ ڈالا۔ ایسے چہرے اور اس بے بسی کے ساتھ زندگی کی رنگینیوں اور دلاویزیوں کو الوداع! مقبرے کے دروازے کا خاموش اور مہیب اور درد انگیز راستہ! وہ راستہ جو صرف جاتا ہے۔ اور واپس نہیں آتا۔

اچانک اس کے بازوؤں میں پڑی ہوئی رقاصہ اپنی مدہوش غفلت میں کراہی۔ اور فرعون کی متامل نگاہیں اس کے چہرے پر چلی گئیں۔

اس کے نمناک ہونٹ ایک شیریں آرزو میں کھلے ہوئے تھے۔ اس کے نازک نتھنوں سے ارمانوں کے لمبے لمبے اور رکتے ہوئے سانس نکل رہے تھے۔ اس کی پھیلی ہوئی پتلیوں میں تشنہ تمنائیں گم تھیں۔ وہ سب کچھ تھا۔ جو یہ مختصر اور عارضی اور اپنی جگمگاہٹوں میں بھاگتی ہوئی دنیا اپنے اندر رکھتی ہے۔ اس کا خون بجلیوں کی طرح اس کے دماغ میں تڑپ تڑپ کر پوچھنے لگا۔ اس کو تیاگنا۔ اس سے منہ موڑ لینا۔ اس سربستہ مسرت کے دروازے پر سے ترستی ہوئی روح لے کر لوٹ جانا! کیوں؟ آخر کیوں؟ اس لئے کہ اس زندگی کے آگے آخرت کا سفر درپیش ہے۔ کسی روز۔ شاید کل۔ شاید اسی وقت۔ اس لئے کہ جب روح اس سفر میں ہو گی۔ تو یہ جسم اس ممی سے مشابہ ہو جائیگا۔ خشک اور سرد اور بے رنگ اور بے حس۔ ان تمام شیریں ارمانوں سے محروم جو رگوں کے تاروں سے نغمے نکالتے اور اس کے ساتھ لہک لہک کر گاتے ہیں۔ صرف ایک تودہ۔ ایک لوتھ۔ ایک ڈھیر۔ جس کی رعنائیاں اور زلفیں۔ جس کی گرمیاں اور بجلیاں۔ جس کے میلان اور ارمان اس نورانی عالم کا تمام حاصل۔ اس حسین دنیا کی ساری متاع عزیز یہیں فنا ہو کر رہ جائیگی۔

اس نے بے قرار ہو کر پروہت پر نظر ڈالی۔ جس کی ملامت سے ابلتی ہوئی نظریں اپنے اقتدار کی جراحت اور اپنی بے بسی کے ضعف میں گلا پھاڑ پھاڑ کر اسے فریبی اور دغاباز اور ملعون و مردود قرار دے رہی تھیں۔ مایوسی اور برافروختگی کے شدید اعلان میں وہ نوجوان فرعون کو

اپنے تمام وقار اور جلال سے عجیب طرح خالی نظر آرہا تھا۔ اپنے زہد و اتقا میں خشک اور کم ظرف۔ اپنی ناتجربہ کاری میں ادنٰے و جاہل + جذبات کی بلند آہنگ نمائش نے تکلف و تقدس کی عبا اس کے شانوں پر سے گرا دی تھی۔ اور وہ اپنی عریانی میں ایک بازاری انسان بن کر نظر آرہا تھا جس کی گردن کی رگیں پھول سکتی اور جس کا منہ غیظ و غضب سے کف آلود ہو سکتا تھا۔ جس میں نہ زندگی کی پیچیدگیوں کی سمجھ تھی اور نہ موت کے اسرار کی فہم۔ جو محض ایک پیشہ ور تھا۔ اور اپنے پیشہ کے فروغ کے لئے دلوں میں اوہام و وساوس بیدار کرتا رہا تھا +

نوجوان فرعون پروہت کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ اور اپنے سرکش اور باغی نفس کو اس کی گرفت سے آزاد محسوس کر رہا تھا۔ اس باغی نفس کو جو رقاصہ کے نرم جسم سے حرارت اور اس کے کانپتے ہوئے نفس سے نشہ پا رہا۔ اور اپنے طغیان میں مقسوم سے بھی نبرد آزما ہونے کا بل حاصل کرتا جا رہا تھا۔ ایک نئی سنسنی نے اسے بیخود کر دیا۔ اس نے یکلخت اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا اور نفس کی سرور انگیز فیروزمندی میں پکار کر بولا "دیوتا آسیرس کی مورتی کو دیکھو اور اس کے پیغام کو سمجھو۔ کہ ہستیٔ انسان کا انجام کیا ہے۔ موت بھاگی آرہی ہے۔ کہ تمہیں مغلوب کر لے۔ اس مورتی کی طرح تمہیں بےحس بنا دے۔ تمہارے حواس اور بیرونی رعنائیوں کے رشتے کاٹ ڈالے۔ اس سنجوگ سے تمہاری روح میں جو سہانی لرزش پیدا ہوتی ہیں انہیں ہمیشہ کو تھما دے۔ عالم دوبارہ نہیں۔ زندگی مختصر ہے۔ اور اگلا پل غیر یقینی۔ اس لئے ان تمام لذتوں سے اپنے سینے بھر لو۔ جو اس حیات ناپائدار کا حاصل ہیں۔ اور جو حواس کے دروازے بند ہو جانے پر پھر تمہیں نصیب نہ ہو سکیں گی" +

ایوان نشاط کے ضبط و تامل میں سے نفس کی تائید کا ایک پُر خروش غل اٹھا۔ جس میں پروہت کا احتجاج ڈوب کر رہ گیا +

اور اس کے بعد فراعنہ مصر کے محل کا دستور بن گیا۔ کہ ضیافتوں کے بعد جب مہمان میگساری کی رنگ رلیوں سے لطف اندوز ہونے لگتے۔ تو ایوان نشاط کا مہتمم انہیں عشرت کے انوکھے اور نت نئے احساسات سے لطف اندوزی کی دعوت دینے کو ممی کی وضع پر ترشی ہوئی دیوتا آسیرس کی لکڑی کی مورت خدام کے کندھوں پر اٹھوا کر ایوان نشاط میں داخل ہوتا۔ اور اس وقت جبکہ خدام ممی کو اٹھائے اٹھائے مخمور فرعون اور اس کے بدمست مہمانوں میں تھم تھم کر گھوم رہے ہوتے۔ تو پکار پکار کر کہتا۔ "انجام ہستی کو سمجھو۔ اور ان تمام لذتوں سے اپنے سینے بھر لو جو اس حیات ناپائدار کا حاصل ہیں۔ اور جو حواس کے دروازے بند ہو جانے کے بعد پھر نصیب نہ ہو سکینگی" +

ہسپتال

انسانی دکھ سے بھری ہوئی خاموشی . . .
دواؤں کی تیز بو سے برگشتہ فضا . . .
اونچی اجلی دیواریں ——
اپنی طہارت میں سرد اور جابر . . . .
چکنا سنگین فرش ——
اور اس پر سفید پوش ڈاکٹروں اور نرسوں کے بے آواز تیز قدم +
پہیوں دار سٹریچر ——
ملول محرابوں کے سکوت میں ——
بے خبر جسموں کا کرب اٹھائے ——
احتیاط کی آہستگی میں مڑتے ہوئے +
کھلی کھڑکیوں کی اداس ——
جسم کی دردناک جد و جہد کا مدھم منظر لئے .
کالے پڑے ہوئے پیلے چہرے . . .
سوکھی ہوئی بے بس گردنیں . . .
کراہتے ہوئے گلے - وقفوں میں اٹھتی ہوئی چیخیں - درد کی چارہ طلب لیکن بے سود فریاد . . .
پھٹی ہوئی آنکھیں غیر معلوم انجام سے مہیب - ناتمام تمناؤں سے اشک آلود . . .
ناچیز ارمانوں کی دہلا دینے والی تصویریں +
اور دروازے پہ دو دہقان . . .
ایک ماں - ایک باپ .
زندگی کے ہاتھوں لٹے ہوئے
کس مپرسی میں
اپنے اعتماد کے ہاتھوں خود مجبور و محروم
آنکھوں میں استفہامی بے چارگی لے
ڈر ڈر کر اندر تکتے ہوئے
موت سے بند ہوتی ہوئی پلکوں میں نیند سمجھتے ہوئے ——
اس نیند میں خوف آلود سہاؤنے خواب دیکھتے ہوئے

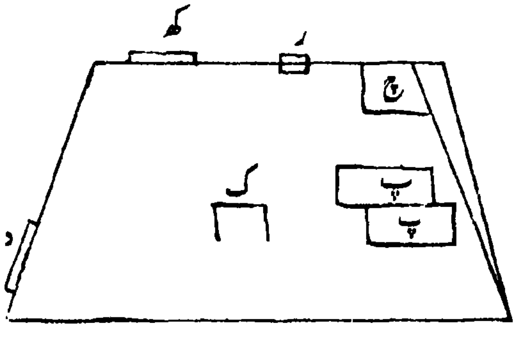
باہر سڑک پر موٹر کا ہارن بجانے والے . تجھے کیا معلوم !

برفباری کی ایک رات

افراد

مرد　　　　عورت

منظر۔ دامن کوہ میں ایک خستہ حال جھونپڑا۔ جو لکڑی کے تختوں کو جوڑ کر موسم کی چیرہ دستیوں سے پناہ لینے کے لئے کھڑا کر لیا گیا ہوگا۔ نہ صرف آرائش کی ہر کوشش سے اجنبی۔ بلکہ تعمیر کی اتنی خصوصیات سے بھی محروم جنہیں نجار کا پیشہ عادتاً پیدا کر لیتا ہے۔



د = دروازہ	کھ = کھڑکی
ر = روشن دان	چ = چولھا
پ = پلنگ	ک = کرسی

اسٹیج کے اترتے رخ دائیں دیوار میں باہر جانے کا دروازہ۔ سامنے کی دیوار میں دائیں ہاتھ کو ایک کھڑکی۔ دونوں کے کواڑ تختوں کے اندر لکڑیاں جڑی ہونے سے مضبوط۔ کہ ہوا کا مقابلہ کر سکیں۔ بائیں ہاتھ اوپر ایک چھوٹا سا روشندان جس میں سلاخوں کی بجائے لکڑیاں لگی ہوئی۔ دیواروں کا رنگ وقت اور دھوئیں کی بدولت سیاہی مائل سرخ۔ روشن دان کے نیچے کونے کی دیوار میں وہاں چولھا جلائے جانے کے باعث زیادہ سیاہ۔

جھونپڑا راحت و آسائش کے سامان سے یکسر محروم۔ بس بائیں دیوار کے ساتھ برابر برابر دو بان کے بُنے ہوئے پلنگ۔ پائنتیاں دائیں دیوار کی جانب۔ اور درمیان میں ایک کرسی۔ جس کا بایاں بازو غائب۔ چولھے کے اوپر چراغ۔ سامنے مٹی کے چند برتن۔ پچھلی چارپائی کے نیچے ایک دو چھوٹی چھوٹی گٹھڑیاں۔

سامنے کی چارپائی پر بچہ دُہرے کئے ہوئے ایک لحاف میں سو رہا ہے پچھلی چارپائی پر مرد لحاف اوڑھے پڑا کروٹیں لے رہا ہے۔ کرسی پر عورت ٹانگوں کے اوپر کمّل ڈالے بیٹھی ہے۔ گود میں سلائی کا کام ہے مگر وہ سی نہیں رہی۔ چپ چاپ جمی ہوئی نظروں سے سامنے تک رہی ہے روشن دان میں سے باہر برف گرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

تھوڑی دیر بعد مرد کو کھانسی اٹھتی ہے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ جاتا اور ایک بآواز آہ بھرتا ہے۔

مرد - (عورت کی طرف دیکھے بغیر) برف گرے جا رہی ہے!

عورت - (اسی طرح سامنے تکتے ہوئے) تم کیوں جاگے؟

مرد - رات آدھی سے زیادہ گزر چکی ہو گی۔

عورت - برف کا وقت سے کیا تعلق؟

مرد - ہمیشہ نہیں گر سکتی۔

عورت - (پرمعنی انداز میں) ... تم برف سے واقف نہیں

مرد - (طنز سے) تم واقف ہو تو بہتر تھا۔

عورت - ... تم نے برف کو صرف دیکھا ہے۔ میں اسے سمجھتی بھی ہوں۔

مرد - (سر آہستہ سے موڑ کر ذرا دیر عورت کو دیکھتا ہے) ... روشندان میں سے نظر آ سکتی ہو گی۔

عورت - ... میں سن جو سکتی ہوں۔

مرد - کیونکر؟

عورت - مجھے معلوم نہیں۔ مگر مجھے اس کا آنا۔ فضا میں تیرنا یا تلملانا۔ کھلکھلانا یا بڑبڑاتے ہوئے زمین پر چلا جانا صاف سنائی دیتا ہے۔

مرد - ... تم لیٹ جاؤ۔

عورت - ... کہ برف اور زیادہ آنے لگے۔

مرد - ... کیوں؟

عورت ... برف کیوں آ رہی ہے؟

مرد - ... کون جانتا ہے!

عورت ... میں اور برف دونوں ... ہمیں ایک دوسرے کو سمجھنے دو (دونوں چپ ہو جاتے ہیں)

مرد - ... نیند نہیں آتی۔

عورت (آہستہ سے سر پھیر کر بچے کو دیکھتی ہے) کم از کم ننھا سو رہا ہے۔

مرد - ... ساری عمر ایسی برف پڑتا یاد نہیں۔

عورت - ... تمہیں بھوک کی وجہ سے نیند نہیں آتی۔

مرد - ... شاید کھانا کھانے سے ٹھنڈ نہ لگتی تھی۔

عورت - ... میں نے تمہیں کہا تھا۔ ایک روٹی اور کچھ دال باقی ہے۔

مرد - (جواب نہیں دیتا۔ اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ ذرا دیر منتقل سا رہتا ہے۔ پھر کھڑکی کے پاس چلا جاتا ہے۔ کواڑ تھوڑا سا کھول کر باہر دیکھنے لگتا ہے) نہ معلوم کب تھمے گی!

عورت (اسی طرح سامنے تکتے ہوئے) ... اس کا تھمنا صرف نہیں مختصر ہے۔

مرد (کھڑکی بند کر دیتا ہے) ... تم ٹھٹھر رہی ہو گی!

(عورت خاموش رہتی ہے۔ مرد پیچھے اس کے قریب آ کھڑا ہوتا ہے)

عورت - میری ہمتی نہ کرو۔

مرد - (عورت کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیتا ہے۔ پھر دونوں رخساروں کو چھوتا ہے) تم ٹھنڈی ہو! (اس کا کمل اسے زیادہ اچھی طرح اڑھاتا ہے۔ عورت بے پرواہ بیٹھی رہتی ہے۔ مرد کھویا کھویا کھڑا ہو جاتا ہے۔ آخر کرسی کے دائیں بازو پر دائیں دیوار کی طرف منہ کر کے بیٹھ جاتا ہے) ... کاش تم مجھے طعنے اور گالیاں دے سکتیں۔

عورت - ... غلط فہمیوں سے بچنے کا موقع ہے۔

مرد - ... مجھے تسکین کی ضرورت ہے ... اپنی تسکین کی ضرورت ... میں ہمیشہ کی طرح اب بھی خود غرض ہوں۔

عورت ... مجھے میری نظروں میں شہید بنانے کی کوشش مت کرو۔

مرد - ... تم سمجھتی ہو۔ مجنوں تم تھیں؟

عورت - ... (تفوق کے رحم آلود تبسم سے) تمہیں اس لئے شبہ ہے۔ کہ میں برفباری میں خاموش اور بے پرواہ ہوں۔

مرد (چپ ہو جاتا ہے۔ آخر سر اٹھا کر سامنے کی دیوار کو گھورنے

لگتا ہے) نہیں۔ تمہیں میں نے ورغلایا تھا۔ میں نے۔ میں نے رات کے مہتابی دریچوں میں۔ شفق کے شہابی درختوں کے نیچے۔ آہوں سے۔ آنسوؤں سے۔ تصور سے۔

عورت ۔ (چمکتی آنکھوں سے) وہ تصور اس وقت حقیقت ہے۔

مرد ۔ (آنکھیں بند کرکے) کیسی جگر گداز حقیقت!

عورت ۔ میرے جنون کی توہین نہ کرو۔

مرد ۔ (چپ چاپ کھڑا ہو جاتا ہے۔ سر پھیر کر روش دان کو دیکھنے لگتا ہے) برف اندھا دھند گر رہی ہے... اس برفباری میں اپنی خاطر اسے ٹھنڈا ہوتے ہوئے دیکھنا۔ جس کے ماں باپ اور بہن بھائی بھڑکتے ہوئے آتش دان کے سامنے تمتمائے ہوئے رخسار لئے بیٹھے ہونگے۔ یارب! یارب! (سر موڑ لیتا ہے)

عورت ... یہ باتیں اس موقع کے لئے غیر موزوں ہیں۔

مرد ... ہم تنہا ہیں۔

عورت ... ہم تنہا نہیں ہیں۔

مرد ... ہمارے علاوہ جو کچھ ہے۔ وہ ان کا خیال دلاتا ہے۔

عورت ... اونہہ۔ دنیا میں ایسے بہتیرے خوش حال ہیں۔

مرد ۔ میں ایک ہی خوشحال گھرانے کا قصوروار ہوں۔

(کھڑکی کے قریب چلا جاتا ہے۔ اور منہ ادھر ہی کئے سر جھکائے کھڑا رہتا ہے)

عورت ... برف ان کے مقابلہ میں کچھ نہیں۔

مرد (سر پیچھے ڈال کر) کاش وہ اب تک میری یاد پر لعنت بھیج رہے ہوں!

عورت ۔ ان کی باتیں کیوں کر رہے ہو۔

مرد ۔ میں ان کی یاد میں رہنا چاہتا ہوں۔

عورت ۔ کیوں؟

مرد ۔ تمہاری اور ننھے کی خاطر۔

عورت ۔ (خفیف سی چین جبیں سے) میری غیرت اتنی بے حقیقت نہیں۔

مرد ۔ (بھاری آواز میں) مجھے اپنی غیرت کی حقیقت معلوم ہو رہی ہے

عورت ... چپ ہو جاؤ۔

مرد (کھڑکی کے کواڑ پر ہاتھ رکھ دیتا ہے۔ ایک آہ بھرتا ہے۔ کھڑکی کھولتا اور باہر تکنے لگتا ہے۔ جیسے اپنے آپ سے) ساری برف ایک ہی بار کیوں نہیں آپڑتی!

عورت ۔ یک لخت ہمیں ختم نہیں کرنا چاہتی۔

مرد ۔ یہ آہستگی۔ یہ تامل۔ یہ بے فکری روئیں روئیں کو کھائے دیتی ہے۔

عورت ... برف کا یہی منشا ہے۔

مرد (کھڑکی بند کر دیتا ہے)... اور اندر تمہیں بیٹھے ہوئے دیکھنا سیدھا۔ ساکت۔ ٹھنڈا... تم سو نہیں سکتیں... لیٹ بھی نہیں سکتیں؟

عورت ... نہیں۔

مرد (کچھ کہتا کہتا رک جاتا ہے پھر بے بسی کے تبسم سے) ہاں بے سود ہے! جب اعضا کو پھیلا کر مناسب طریق پر ڈھا نکنے کی توفیق نہ ہو۔

عورت ... بیٹھنے میں بے پرواہی اور بےفکری ہے۔

مرد ۔ لیٹنے کا طنز میں محسوس کر چکا ہوں۔

عورت ۔ عجز کا اظہار اندیشہ ناک ہے۔

مرد ۔ کاش اپنے آپ کو کوئی دھوکا ہی دینا ممکن ہوتا۔

عورت ۔ چپ ہو جاؤ۔ برف بے قابو ہو جائیگی۔

مرد ۔ (جاکر چپ چاپ چارپائی پر بیٹھ جاتا ہے)... کبھی تمہیں بھی خیال آتا ہے۔ آسمان کے اُس پار کیا ہے! کوئی آنکھ؟ کوئی دل؟ یا ایک بے اختیاری اور بے بسی۔ جو صرف اس لئے قوی ہے۔ کہ بلندی پر ہے۔

عورت (فکرمند جبیں سے) تمہارے لئے سو رہنا نا ممکن ہے۔
مرد۔ (بیتابی سے سر ہلا کر خیالات کو منتشر کر دیتا ہے)۔۔ نیند بھوک سے بہت مختلف ہے۔
عورت۔۔ کہا جو۔ ایک روٹی اور تھوڑی سی دال رکھی ہے
مرد۔ (کسی قدر سختی سے) مجھے معلوم ہے۔
عورت۔ آدھی لے لو۔
مرد (سامنے گھورتے ہوئے) ابھی میں زندگی سے نیچے نہیں پہنچا
عورت۔ تمہے کے لئے صبح کو آدھی کافی ہو جائیگی۔
مرد (بیقراری سے کھڑے ہو کر) عورت چپ ہو جا! ابھی قدرت مجھے پاگل نہیں دیکھنا چاہتی۔
عورت۔ (جیسے اپنے آپ سے) میں ہار رہی ہوں۔
مرد۔ (کھڑکی کے پاس جاتا اور پیشانی دیوار کے ساتھ لگا کر کھڑا رہتا ہے مڑ کر عورت کو دیکھتا ہے۔ پھر بیقراری سے سر موڑتا اور یک لخت کھڑکی کھول لیتا ہے)۔۔۔ برف آئے جا رہی ہے۔۔۔ کیوں ۔۔۔ کوئی کر سکتا ہے کیوں؟
عورت۔ ہٹ آؤ۔ دیکھتے رہنا کمزوری کا اعتراف ہے۔
مرد۔ یہ تواتر۔۔۔ یہ تواتر۔ (کنپٹیوں پر ہاتھ رکھ لیتا ہے)
عورت۔ اس کا بند ہونا ایک طرح ممکن ہے۔ صرف ایک طرح۔
مرد۔ کس طرح؟
عورت۔۔۔ ہم میں حس نہ رہے۔
مرد۔ (سوچتا ہوا سر عورت کی طرف موڑتا ہے) پھر ہیبت اکارت جانے لگیگی۔ اس لئے؟
عورت۔ تم اب تک اس معرکے کو نہیں سمجھے؟
مرد۔ (سوچتے ہوئے) ورنہ رات کو بھی گریگی۔ دن میں بھی نہ تھمے گی؟
عورت۔۔۔ دن میں کہیں باہر جانا ہے؟
مرد۔ کسی بھروسہ پر نہیں۔
عورت۔۔۔ پھر تھم جائیگی۔

مرد۔ کیوں؟
عورت۔۔۔ جانا امید جو پیدا کرتا ہے۔
مرد۔ ایک موہوم امید۔
عورت۔ (آہستہ سے) مایوس بیٹھے رہنے سے بہرحال زیادہ اذیت بخش۔
مرد۔ (سر جھکا کر)۔۔۔ یوں ہے۔۔۔ تو یوں ہے۔۔۔ میں سمجھا۔۔۔ میں سمجھا۔
عورت۔ میں کبھی کی سب کچھ سمجھ چکی ہوں۔
مرد۔ (نظریں اٹھا کر)۔۔۔ ہم سے زندگی کا مذاق کھیلا جا رہا ہے۔۔۔
عورت۔۔۔ بنایا جانا کبھی کا ختم ہو چکا۔
مرد۔۔۔ یہ مذاق کے انکشاف کا مرحلہ ہے۔
عورت۔۔۔ مذاق کامیاب ہو چکا ہے۔
(دونوں چپ ہو جاتے ہیں۔ مرد بے معنی نظروں سے باہر دیکھتا رہتا ہے)
مرد۔۔۔ گالے اوپر سے آتے ہیں۔ آنکھوں کے آگے سے تیرتے ہوئے نیچے چلے جاتے ہیں۔ جیسے ہمیں چھپا رہے ہیں۔
عورت۔۔۔ میں یہ محسوس کر چکی ہوں۔
مرد۔ اس مظاہرہ کے بغیر مذاق کی تکمیل نہ ہوتی تھی نا؟
عورت۔ عملی مذاق بعد کی ایسی چھیڑ ہی کی خاطر کیا جاتا ہے۔
مرد۔۔۔ اور یہ یوں ہی ہوتا رہیگا؟
عورت۔۔۔ تناسب کی فہم انسان میں ہے۔
مرد۔۔۔ انسان کا صبر غیر محدود نہیں۔
عورت (آہستہ سے) مگر بے بسی بھی کھلی ہوئی ہے۔
مرد۔ بے بسی! بے بسی! زندگی اور انانیت کے ساتھ۔ تمام علم اور تمام تجربہ کے ساتھ!

(کواڑ پر ہاتھ رکھے کچھ دیرچبھی ہوئی نظروں سے سامنے تکتا رہتا ہے
پھر یکلخت کھڑکی بند کر دیتا ہے۔ اور اس کا سانس تیز تیز چلنے لگتا
ہے)

... لیکن ... لیکن ...

عورت - کیا ؟

مرد - ایک اختیار ! ... ایک اختیار ! ...

عورت - (سر پھیر کر ذرا دیر اسے دیکھتی رہتی ہے) ... خودکشی ! ...

مرد - (عورت کو گھورتا رہتا ہے) ... اس سارے مذاق کا جواب ہو سکتی ہے ۔ (جلدی سے عورت کے قریب آکر) نہیں ؟

عورت - (پھر سامنے دیکھنے لگتی ہے ۔ آنکھیں زیادہ کھل جاتی ہیں) میں نے خودکشی کو یوں نہیں سوچا -

مرد - (جوش میں دو زانو ہو کر اور عورت کے سامنے جھک کر) جواب میں بے جان ہو جانا ! سچ مچ بے جان ہو جانا !

عورت - (مرد کو تکتے ہوئے) جیسے مذاق پر آنکھیں اور کان بند کر لئے جائیں ؟

مرد ... تم سمجھیں ؟

عورت - تم بولو - تم بولو - (پھر سامنے دیکھنے لگتی ہے)

مرد - ہم تم دونوں یہاں - اسی جھونپڑے میں - فرش پر - اکٹھے بے جان ! ذرا سوچو ! ذرا سوچو !

عورت - ہاں ہاں -

مرد ... پھر برف اس چھت کو ڈھا دے -

عورت ... اور پڑی ہمارے جسموں کو دبائے -

مرد ... جو ان دیواروں کو اڑا لیجائے -

عورت ... سورج یہاں سے ندیاں نکال لے -

مرد ... زلزلے اس مقام کو تہس نہس کر ڈالیں -

عورت ... بارشیں اسے بہالے جائیں -

مرد ... لاشیں رہیں یا غرق ہو جائیں - -

عورت ... ہم پھر بھی مسکرا رہے ہونگے -

مرد - (کھڑے ہو کر) زندگی کے مذاق کا کیسا منہ توڑ جواب !

عورت - (چمکتی آنکھوں سے) ہاں ہاں ... برف کے لئے کیسی مایوسی !

مرد - (جلدی سے اس کے دوسری طرف آکر) اور دیکھنا —— پھر آتشدانوں کی آگ پڑی بھڑکا کرے -

عورت - کھانوں کی ہنڈیاں چولھوں پر کھد بد کھد بد کرتی رہیں -

مرد - لوگوں کو بدہضمی ہو -

عورت - دسترخوانوں پر قہقہے اڑیں -

مرد - ہماری لحافوں میں چہرے مسکرایا کریں -

عورت - ہمارا ذہن سُن ہو گا - ہمارا ذہن سُن ہو گا -

مرد - سب کے لئے کس قدر مایوسی -

عورت - اپنے آپ سے تھک جائینگے -

مرد - (پھر دو زانو ہو کر) ذرا سوچو - عرضیوں کے جواب میں ملازمت پیش کی جاتی ہے -

عورت - اور ہمیں اس کی پرواہ نہیں -

مرد - منظوری دینے والے کا منہ (زور سے ہنستا ہے)

عورت - اس کا کھسیانہ پن (ہنس پڑتی ہے)

مرد - (بیتابی سے کھڑے ہو کر) ارے ہاں ! ارے ہاں !

عورت - کیا ؟

مرد - (چارپائی گھسیٹ کر عورت کے قریب کرتا - اور اس پر بیٹھتا ہے) کوئی دکھ - کوئی بیماری تمہارے والد کو تمہاری یاد دلاتی ہے -

عورت - ان کا م[illegible] یہاں آکر رکتا ہے -

مرد - ہم کہیں نہیں ہیں -

عورت - یا ہماری لاشیں مسکرا رہی ہیں -

مرد ۔ تمہارے لئے ان کی آرزو۔

عورت ۔ تمہارے لئے ان کا پچھتاوا۔

مرد ۔ لوگوں سے پوچھ گچھ۔

عورت ۔ کیسے ہوا؟ کب ہوا؟ کیوں ہوا؟

مرد ۔ لوگوں کی آنکھوں میں الزام۔

عورت ۔ اُن کی آنکھوں میں آنسو۔

مرد ۔ پشیمانی کے فقرے۔

عورت ۔ کہ ہائے یہ کیا ہوگیا!

مرد ۔ کہ ہائے میں اب کیا کروں!

عورت ۔ کہ ہائے مجھے کیا معلوم تھا!

مرد ۔ کہ ہائے مجھے یہ دن بھی دیکھنا تھا!

عورت ۔ اور پھر بھائی جان پر جھنجھلاہٹ۔

مرد ۔ کہ یہ سب کیا دھرا تمہارا ہے۔

عورت ۔ ان کا بغلیں جھانکنا۔

مرد ۔ لاجواب ہو کر ہمیں بزدل کہنا۔

عورت ۔ اور دل ہی دل میں ہمارے خاموش جواب پر ششدر رہ جانا

مرد ۔ زبانوں پر ہمارا تذکرہ۔

عورت ۔ آنکھوں میں ہمارے لئے آنسو۔

مرد ۔ (مٹھیاں بند کرکے کھڑا ہو جاتا ہے) اُف وہ میں چھلکا پڑ رہا ہوں

عورت ۔ (تیز تیز سانس لے کر) میں جیسے کسی گرم کمرے میں بیٹھی ہوں۔

مرد ۔ (کرسی کے بازو پر بیٹھ کر) لیکن کیونکر۔ اب کیونکر؟

عورت ۔ (سر پھیر کر مرد سے نظریں ملاتی ہے)... زہر؟

مرد ۔ پر زہر کا حاصل کرنا؟ (یوں ادھر ادھر دیکھتا ہے جیسے دماغ بڑی چستی سے کام کر رہا ہے)

عورت ۔ (یکلخت) گلا گھونٹ کر؟

مرد ۔ اتنا اتنا ؟

عورت ۔ (بچے کو دیکھ کر) مگر بچہ؟ بچہ؟

مرد ۔ ہمارا گلا گھونٹ لینا اس کے لئے بھی کافی ہے۔

عورت ۔ تجھے چھوڑنا زیادہ مشکل ہے۔

مرد ۔ (کھڑا ہو جاتا ہے) ضروری ہے کہ اسے بھی ——

عورت ۔ اِس کے بغیر اُس پار؟ (مرد کا منہ تکنے لگتی ہے)

مرد ۔ مذاق ہم سے ہے۔ یہ نا سمجھ ہے۔

عورت ۔ (پرمعنی انداز سے) تم برف کو نہیں جانتے۔ اور پھر اس کا کھسیانہ پن۔

مرد ۔ ہم دونوں کی طرف سے جواب ناکافی ہے؟

عورت ۔ اس کو چھوڑنا کمزوری ہے۔ جواب کی کمزوری —— تمہیں معلوم نہیں ہوتی ——؟

مرد ۔ سمجھتا ہوں، سمجھتا ہوں۔ (کھڑکی کی طرف سر موڑ لیتا ہے)

عورت ۔ اسی لئے تو۔

مرد ۔ (یکلخت مڑ کر) میں بتاؤں؟

عورت ۔ کیا؟

مرد ۔ مجھے ایک زہریلی بوٹی معلوم ہے۔

عورت ۔ کہاں؟

مرد ۔ سامنے کے جنگل میں۔

عورت ۔ (تردد سے) باہر اندھیرا ہے۔

مرد ۔ میں آنکھیں بند کرکے وہاں پہنچ سکتا ہوں۔

عورت ۔ باہر برف ہے۔

مرد ۔ فاصلہ کم ہے۔

عورت ۔ بوٹی برف میں دب گئی ہوگی۔

مرد ۔ برف سے لڑ کر اسے چھیننے میں سرور ہے۔

عورت ۔ (پھٹی پھٹی آنکھوں سے سامنے تکتے ہوئے) تو ابھی! تو ابھی!

مرد ۔ (عورت کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر اشتیاق سے سر اس کے سامنے کرتا ہے) اُٹھو... اُٹھو...

برف کے سامنے۔

عورت ۔ (مسکرا کر گردن اونچی کرتی ہے) جیت ہماری ہے۔ ہماری ہے۔

مرد ۔ (کھڑے ہو کر جوش سے) اور میں سمجھ بیٹھا تھا۔ خدا کوئی شے نہیں۔

عورت ۔ ہمیں اس نے بے حد و حساب اختیار بخشا ہے۔

مرد ۔ بے پایاں نعمت ہمارے پاس ہے۔

عورت ۔ کہ ہم مر سکتے ہیں!

مرد ۔ (سر آسمان کی طرف اٹھاتا ہے) میرے پیارے خدا۔ میرے پیارے خدا۔ مجھے تیرے اس سب سے بڑے عطیے کا خیال نہ رہا تھا۔

عورت ۔ (نظریں اونچی کرکے) یہ قدرت جو تو نے انسان ہی کو دے ڈالی ہے۔

مرد ۔ جو تو نے اپنے لئے بھی نہیں رکھی۔

عورت ۔ زندگی کے مذاق کا۔ عناصر کے مذاق کا جواب!

مرد ۔ مجھے اس کا خیال پہلے کیوں نہ آیا۔ (یکلخت دروازہ کھول کر باہر نکل جاتا ہے)

عورت ۔ (آنکھیں بند کرکے؛ حسانمند چہرہ آسمان کی طرف اٹھاتی ہے) او میرے خدا! او میرے خدا!

مرد ۔ (الٹے پاؤں اندر آ کر وفورِ فتحمندی سے) برف تھم گئی!

عورت ۔ (چمکتی آنکھوں سے سامنے تکتے ہوئے) اس کے لئے کوئی چارہ نہ تھا۔

مرد ۔ فضا صاف ہے۔

عورت ۔ (مسکرا کر) آہ!

مرد ۔ (مٹھیاں اوپر اٹھا کر) ہم نے جواب ڈھونڈ لیا! ہم نے جواب ڈھونڈ لیا!

عورت ۔ زندگی کے مذاق کا جواب!

مرد ۔ (تیزی سے کھڑکی کی طرف جاتا اور کواڑ پورا کھول کر یوں سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔ گویا دعوتِ مقابلہ دے رہا ہے) تو اب آ سکتی ہے۔ اور بھی آہستہ۔ اور بھی تامل سے۔ اور بھی بیفکری سے ہمیشہ۔ ہمیشہ۔ ہمیشہ ہم بے خوف ہیں۔

عورت ۔ (مکمل دلجمعی سے) ہم فتحیاب ہیں!

مرد ۔ ہم بھوکے۔ ٹھٹھرتے ہوئے انسان!

فوری پردہ

سید امتیاز علی تاج

مجید ملک

سوال

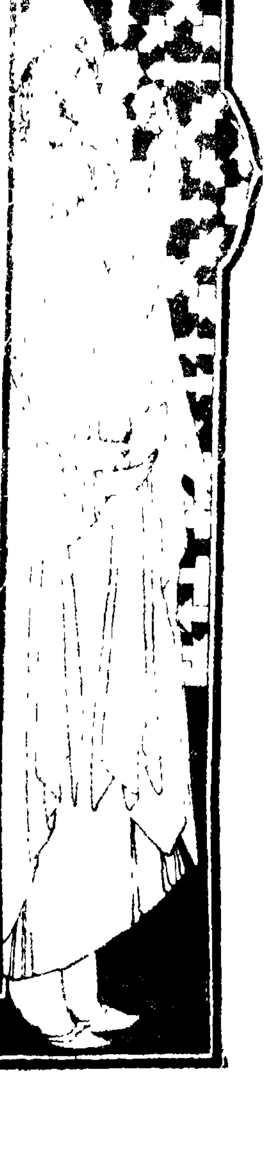
میں تجھ سے محبت کرتا ہوں
او مجھ سے خفا رہنے والے
او مجھ کو برا کہنے والے
میں تجھ سے محبت کرتا ہوں
میں تیرے نام پہ مرتا ہوں

میں تیرا ادنیٰ بندہ ہوں
راضی برضا رہنے والا
میں تیرا ادنیٰ بندہ ہوں
سرگرم وفا رہنے والا
میں تیرا ادنیٰ بندہ ہوں
قدموں میں گرا رہنے والا

ہر چند میں عشرت زادہ ہوں
ہر چند میں عیش افتادہ ہوں
پر تیرے ایک اشارے پر
مٹ جانے پر آمادہ ہوں

تو مجھ سے خفا کیوں رہتا ہے
او مجھ سے خفا رہنے والے
تو مجھ کو بُرا کیوں کہتا ہے
او مجھ کو بُرا کہنے والے
میں تجھ سے محبت کرتا ہوں
میں تیرے نام پہ مرتا ہوں





مجید ملک

مجید ملک

آپ بیتیاں

دریائے سندھ کی لہروں میں سورج غروب ہو رہا تھا اور میں ایک کشتی میں سوار تھا جسے تین آدمی لمبے لمبے بانسوں سے کھے رہے تھے۔ اسی کشتی میں ایک بلوچ سوار تھا جس کے سفید بال شانوں تک گر رہے تھے۔ ایک ادھیڑ عمر کی عورت تھی۔ ایک سپیرا تھا جس کے ہاتھ میں بین تھی اور ماتھے پر کسی پرانے زخم کا نشان۔ ایک نوعمر لڑکا تھا۔ اور ایک ماہی گیر جس کے بوسیدہ جال میں کوئی مچھلی نہ تھی۔

ایک کشتی بان نے دوسرے سے کہا۔ "میں تھک گیا ہوں۔ لنگر ڈال دو۔ حقہ بھر لو۔ تازہ دم ہو کے چلینگے"۔

میں نے پوچھا۔ "ابھی ہم کنارے سے کتنی دور ہیں"؟

بوڑھے بلوچ نے کہا۔ "کوئی ایک گھنٹے میں پہنچینگے"۔

سپیرے نے کہا۔ "نہیں ڈیڑھ گھنٹے ہیں"۔

نوعمر لڑکے نے کہا۔ "اس اندھیری رات میں وقت گزارنا بہت مشکل ہے"۔

ادھیڑ عمر کی عورت نے کہا۔ "میرے ساتھ کوئی پچیس سال کے بعد یہ اتفاق ہوا ہے کہ دریا میں رات ہو گئی ہے۔ وہ رات بھی اسی طرح تاریک تھی"۔

میں نے پوچھا۔ "اس رات آپ لوگوں نے وقت کیسے گذارا تھا"؟

جواب ملا۔ "اس رات میرے ساتھ میرا شوہر تھا۔ جو اب اس دنیا میں نہیں۔ اُسے یہ دریا کھا گیا"۔

نوعمر لڑکے نے پوچھا۔ "کیسے"؟

ادھیڑ عمر کی عورت نے آواز کو قدرے بلند کر کے کہا۔ "کیسے؟ جیسے دریا کھایا کرتے ہیں۔ وہ میری آنکھوں کے سامنے پانی کی لہروں کے اندر سما گیا۔ اس جگہ دریا کا کنارہ بہت اونچا تھا۔ میں کنارے پہ ان لہروں کے ساتھ دوڑتی رہی جو اُسے بہائے لئے جا رہی تھیں۔ وہ پانی پر دیوانہ وار ہاتھ مار رہا تھا اور میں اپنے سینہ پر۔ میں اُسے بلاتی رہی لیکن موت اُسے بلا چکی تھی"

لڑکے نے کہا۔ "ایسی باتوں سے میرے دل میں ڈر پیدا ہوتا ہے۔ کوئی اور بات کیجئے"۔

عورت نے کہا۔ "ہاں لوگ کہتے ہیں موت ڈراؤنی چیز ہے لیکن مجھے موت کی باتوں میں مزا آتا ہے۔ تمہیں تو بادشاہوں

اور پریوں کی کہانیوں میں مزا آئیگا۔"
لڑکے نے کہا۔" ہاں مجھے بادشاہوں اور پریوں کی کہانیوں میں مزا آتا ہے۔"
سپیرے نے کہا۔" اسے تاج الملوک کی کہانی سناؤ"۔

(۲)

میں نے سگرٹ سلگانے کے لئے دیا سلائی جلائی۔ اور اس کی روشنی میں سب کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر کہا۔" بادشاہوں کی کہانیوں میں کیا رکھا ہے۔ مزا تو اپنی زندگی کی کہانیوں میں ہے۔ بڑی بی تو اپنی داستان غم سنا چکیں۔ اب جوان کے دائیں ہاتھ بیٹھا ہے۔ وہ کوئی آپ بیتی سنائے۔ جب تک چکر پورا ہوگا کنارہ آجائیگا۔"
اس تجویز کو سب نے پسند کیا اور سفید ریش بلوچ نے کہا:۔
"دائیں ہاتھ میں بیٹھا ہوں۔ اس لئے باری میری ہے لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اپنی زندگی کا کون سا واقعہ سناؤں۔ ایک ہی واقعہ ہے جو سنانے کے قابل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہی واقعہ میری تمام زندگی ہے۔ لیکن اسے بیان کرتے ہوئے میں گھبراتا ہوں۔ خیر۔ غالباً۔ آپ لوگوں میں سے کسی سے بھی اب عمر بھر ملاقات نہ ہوگی۔ اس وقت تاریکی بھی ہے۔ میں آپ کی اور آپ میری صورت نہیں دیکھ سکتے۔ اس لئے میرا کام نسبتاً آسان ہوگیا ہے۔
میری عمر بیس سال سے کچھ زیادہ تھی کہ میں نے ایک عورت کو قتل کر دیا۔ کیوں قتل کر دیا؟ یہ ایک لمبی داستان ہے۔ مختصر یہ کہ اس نے بیوفائی کی اور میں رشک سے دیوانہ ہوگیا۔ ایک دن جب وہ میرے گاؤں سے کئی میل کے فاصلے پر میرے رقیب کے ساتھ محوِ عیش رہنے کے بعد نیند میں بیہوش تھی میں نے اُسے قتل کر دیا۔"
ادھیڑ عمر کی عورت نے کہا۔" تم نے بہت خوب کیا۔"
سپیرے نے کہا۔" تم بڑے مرد نکلے"۔
نوعمر لڑکے نے پوچھا۔" پھر کیا ہوا"؟
بلوچ نے ایک لمبا سانس لیا۔" میں رات ہی رات اپنے گاؤں میں واپس آگیا۔"
نوعمر لڑکے نے پوچھا۔" اور کسی کو پتہ نہ چلا"؟
بلوچ نے اپنی داستان کا تسلسل نہ توڑا۔" پولیس آئی۔ تفتیش ہوئی۔ لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ یہانتک کہ پانچ سال گذر گئے۔
"لیکن پانچ سال کے بعد میں نے اپنے گناہ کا کفارہ ادا کیا۔ مجھے ایک ایسے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا جس کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہ تھا۔"
"میری عادت تھی کہ میں ایک بڑا سا چاقو ہمیشہ اپنے پاس رکھا کرتا تھا۔ ایک دن میں ایک گھنے جنگل میں سے گزر رہا تھا کہ مجھے جھاڑیوں میں سے کسی کے کراہنے کی آواز آئی۔ میں نے بڑھ کے دیکھا تو ایک آدمی خون میں لتھڑا ہوا جان توڑ رہا تھا۔ میں نے اس کا سر اپنی گود میں رکھا۔ اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر گرم کیا۔ لیکن وہ میرے دیکھتے ہی دیکھتے ٹھنڈا ہوگیا

میں نے پھر اُسے زمین پر لٹا دیا اور لٹا کے اٹھا ہی تھا کہ دو آدمی آ گئے۔

"اس کے بعد کیا ہوا؟ آپ آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ مجھ پر قتل کا الزام لگا۔ اور کیسے نہ لگتا؟ میں لاش کے پاس کھڑا تھا۔ میرے کپڑے خون آلود تھے۔ اور میری جیب میں ایک بڑا سا چاقو تھا۔

"مجھے بیس سال قید کی سزا ہوئی۔ تعجب ہے کہ مجھے پھانسی کا حکم نہ ملا۔ میں نے اپنے آپ کو بے قصور ثابت کرنے کی کچھ ایسی زیادہ کوشش بھی نہ کی۔ کیونکہ میرا دل کہتا تھا کہ قدرت کا منشا یہی ہے کہ مجھے اپنے اصلی جرم کی سزا ملے"۔

(۳)

بوڑھے بلوچ کی کہانی کے اختتام کے بعد کچھ دیر تک خاموشی رہی۔ دریا کی لہروں یا تھکے ہوئے کشتی بانوں کے بھولے بھٹکے سانسوں کے سوا اور کوئی آواز نہ آتی تھی۔ آخر ماہی گیر لڑکے نے مہرِ سکوت توڑی۔ "اب کس کی باری ہے"؟

ادھیڑ عمر کی عورت نے ماہی گیر کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ "اب ان کی باری ہے"۔

ماہی گیر نے انگڑائی لی اور اپنے جال کی رسی کو انگلیوں کے گرد لپیٹتے ہوئے کہا۔ "میری آپ بیتی کیا ہوگی؟ صبح سے لے کر شام تک مچھلیاں پکڑتا ہوں۔ اگر جال میں مچھلیاں آ گئیں تو روٹی کھا لی۔ ورنہ یوں ہی سو رہے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ اس دریا نے مجھے بھوکا کبھی نہیں رکھا۔ مجھے اس سے محبت ہے۔ اس قدر محبت ہے کہ اگر مجھے روزی کمانے کا کوئی اور ذریعہ بھی مل جائے۔ اور دو ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہو چکا ہے جب بھی میں اسے چھوڑ کر نہ جاؤں"۔

"میں آپ کو اسی دریا کی ایک بات سناتا ہوں۔ جو صحیح معنوں میں "آپ بیتی" تو نہیں۔ لیکن چونکہ آنکھوں دیکھی بات ہے اس لئے اسے "آپ بیتی" ہی سمجھنا چاہیئے۔ آپ کو یاد ہے جب دریا میں طغیانی آئی تھی؟ کوئی سولہ سال کی بات ہے۔ رَو ہنگارو کے پیر کے ہاتھی کو بہا کر لے گئی تھی۔ اور سینکڑوں گاؤں تباہ و برباد ہو گئے تھے"۔

بوڑھے بلوچ نے بات کاٹ کے کہا۔ "ہاں میرے پاس چھ مہینے کے بعد اطلاع پہنچی تھی۔ میرا ایک چچیرا بھائی بھی اسی رَو میں بہ گیا تھا"۔

ماہی گیر نے کہا۔ "ہاں سینکڑوں آدمی۔ سینکڑوں عورتیں۔ سینکڑوں بچے ڈوب کے مر گئے تھے"۔

ادھیڑ عمر کی عورت کی آواز میں شکایت آمیز تعجب تھا۔ "پھر بھی تمہیں دریا سے محبت ہے"؟

ماہی گیر بولا۔ "ہاں پھر بھی مجھے دریا سے محبت ہے۔ یہ دریا رزّاق بھی ہے اور قہار بھی۔ جب مہربان ہوتا ہے تو ہزاروں کو روزی دیتا ہے۔ اور جب قہر میں آتا ہے تو ہزاروں کو فنا کر دیتا ہے۔

"ہاں۔ تو اُن ایام میں میری حالت نسبتاً اچھی تھی۔ اور میرے پاس ایک چھوٹی سی کشتی تھی۔ جس میں بیٹھ کے میں مچھلیاں پکڑنے کے لئے دوسرے کنارے پر جایا کرتا تھا۔ کوئی چار دن تو طغیانی کی یہ حالت رہی کہ بڑے سے بڑے اگن بوٹ بھی کنارے سے ہلنے کی جرأت نہ کرتے تھے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے کئی آدمیوں کو دیکھا کہ درختوں کے تنوں سے چمٹے ہوئے بہتے چلے جا رہے ہیں۔ چیختے ہیں۔ منتیں کرتے ہیں۔ لیکن کوئی انہیں بچا نہیں سکتا۔ ایک بہت بڑا چھپر تھا۔ جس پر ایک عورت اور دو بچے

بہے چلے جا رہے تھے۔ یہ چھپر کسی لہر کے آگے بہتا ہوا کنارے سے چار گز کے فاصلے تک پہنچ گیا۔ اس وقت کس قدر امیدیں ان تین انسانوں کے دلوں میں پیدا نہ ہوئی ہونگی۔ ہم لوگ کنارے پہ کھڑے ہوئے اس انتظار میں تھے کہ چھپر ذرا اور نزدیک آئے تو انہیں پکڑلیں۔ لیکن نہیں۔ جس طرح ایک لہر انہیں نجات اور زندگی سے اس قدر قریب لے آئی تھی۔ اسی طرح دوسری لہر انہیں دھکیل کر موت کے منہ میں لے گئی۔ اس چھپر کا رُخ یکدم بدلا۔ اور ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے یہ تین انسان پھر منجدھار کی طرف روانہ ہوگئے اور چند منٹ میں ہماری نظروں سے غائب ہوگئے"۔

نوعمر لڑکے نے کہا۔ "آپ لوگ ذرا آگے کیوں نہ بڑھ گئے' یا رسے ہی پھینک دیتے"۔

لیکن ماہی گیر نے نوعمر لڑکے کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ اور سلسلۂ کلام جاری رکھا:۔

"پانچویں دن پانی کم ہوا تو سرکاری حکم ملا کہ تمام کشتیوں والے اپنی اپنی کشتیاں لے کے دریا میں چکر لگائیں۔ کوئی مرد یا عورت یا جانور نظر آئے تو اسے بچائیں۔ کوئی لاش ملے تو اس کو بھی پکڑلیں۔ اور ہسپتال میں پہنچا دیں۔ تاکہ اگر زندگی کا کوئی امکان ہو تو ڈاکٹر کوشش کریں۔ ورنہ لواحقین لاش کو پہچان کر لے جائیں۔

"میری کشتی میں میرے ساتھ تین سپاہی تھے۔ ہم نے کئی لاشیں پکڑیں۔ لکڑی کے کئی صندوق پکڑے۔ تین چار بھینسوں کو بچایا لیکن آدمیوں کو بچانے کا وقت اب گذر چکا تھا"۔

"عصر کے قریب میں نے دیکھا کہ دور کوئی آدمی بہتا چلا آرہا ہے۔ ایک سپاہی نے کہا۔" یہ بھی کوئی لاش معلوم ہوتی ہے"۔ میں نے کہا۔" نہیں۔ لاش کا سر عام طور پر پیچھے ہوتا ہے اور پانی میں ڈوب جاتا ہے۔ زندہ آدمی کا سر پانی سے باہر ہوتا ہے اور پاؤں پیچھے ہوتے ہیں۔ بہرحال ہم نے اس کی جانب رُخ کیا اور تھوڑی دیر کے بعد اُسے پانی میں سے نکال لیا لیکن اُسے دیکھ کے مجھے سخت تعجب ہوا۔ اس کے ہاتھ پاؤں اور تمام جسم لکڑی کے تختے کی طرح سخت تھا۔ اور پیٹ میں معلوم ہوتا تھا کہ پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں۔

"خیر ہم نے اس لاش کو ہسپتال میں بھیج دیا۔ ہسپتال کنارے سے کچھ دور خیموں میں تھا۔ ڈاکٹروں نے فیصلہ کیا کہ یہ لاش بہت پرانی ہے۔ غالباً سو سال پرانی ہے۔ اور دریا اسے کسی قبرستان میں سے بہا کے لے آیا ہے۔ ہمیں حکم ملا کہ کوئی وزن باندھ کے اس کو دریا کے درمیان غرق کر دیں۔ چنانچہ ہم اس لاش کو منجدھار میں لے گئے اور اس کے ساتھ ایک وزنی پتھر باندھ کے اُسے دریا میں ڈبو دیا"۔

"لیکن ابھی ہم اس جگہ سے پچاس گز ہی دور گئے ہونگے کہ خدا جانے کیوں میں نے پھر مڑ کر اُدھر دیکھا۔ میں نے تعجب اور گھبراہٹ سے ہاتھ اٹھا کر اپنے ساتھیوں سے کہا۔" وہ دیکھو" —— لاش بدستور پانی پہ تیر رہی تھی!

"ہم کشتی واپس لے گئے۔ لاش کو اٹھایا۔ اس کے ساتھ کوئی وزن نہ تھا۔ اور تعجب پر تعجب اس بات پر ہوا کہ یہ لاش بغیر کسی ظاہرا روک کے دریا کے درمیان ایک ہی جگہ پر تیر رہی تھی۔ حالانکہ اُسے قاعدے کے مطابق دریا کی رَو کے ساتھ بہ جانا چاہیئے تھا۔ خیر۔ ہم نے پھر اس کے ساتھ وزن باندھا اور دریا میں غرق کر دیا"۔

"لیکن چند لمحوں کے بعد وہ لاش پھر پانی کی سطح پر آگئی !! سچ یہ ہے کہ اس کے بعد ہم ڈر گئے۔ میں چاہتا تھا کہ

ہم پھر جائیں۔ لیکن میرے ساتھیوں نے ہمت نہ کی اور ہم کوئی پچاس گز کے فاصلے سے اس لاش کو پانی کے اوپر دیکھتے رہے۔

"آہستہ آہستہ سورج غروب ہو رہا تھا۔ افق اور دریا کا پانی سرخ ہو چکا تھا۔

"سورج بالکل غروب ہو گیا۔

"اب ہم نے دیکھا کہ ایک اور لاش بہتی چلی آ رہی ہے۔ اس لاش کا بھی سر آگے تھا اور لمبے لمبے بالوں سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ لاش کسی عورت کی ہے۔ یہ دوسری لاش اسی رو پہ آ رہی تھی جس پہ پہلی لاش تھی۔ جب ان دونوں میں کوئی بیس گز کا فاصلہ رہ گیا تو ہم نے دیکھا کہ پہلی لاش رو کے خلاف کچھ آگے کی طرف بڑھی جیسے کوئی استقبال کے لئے بڑھتا ہے۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے دونوں لاشیں پہلو بہ پہلو ہو گئیں۔ اس طرح پر کہ شانے سے شانہ مل گیا۔ یوں ملنے کے بعد دونوں لاشوں نے ایک چھوٹے سے محیط میں چکر لگایا اور پھر دونوں غوطہ لگا کے نگاہ سے غائب ہو گئیں"۔

ادھیڑ عمر کی عورت نے کہا۔ "محبت موت پر بھی فتح پا لیتی ہے"۔

سپیرے نے کہا۔ "جن کی تقدیر میں وصال ہو وہ جدا نہیں ہو سکتے"۔

سفید ریش بلوچ نے کہا۔ "کاش ———" کچھ اور کہنا چاہتا تھا لیکن کہتے کہتے رک گیا۔

نوعمر لڑکے نے پوچھا۔ "پھر کیا ہوا"؟

ماہی گیر نے جواب دیا۔ "کچھ بھی نہیں"۔

اس کے بعد دیر تک خاموشی رہی۔ آخر نوعمر لڑکے نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ "اب آپ کی باری ہے"۔

میں نے چونک کے۔ جیسے کوئی خواب سے بیدار ہوتا ہے۔ کہا۔ "اچھا"؟

لیکن ابھی میں آپ بیتی سنانے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ کشتی نے کسی چیز سے ٹھوکر کھائی۔

کنارہ آ چکا تھا۔

مجید ملک

ہر چند گدا ہوں میں ترے عشق میں لیکن — ان بوالہوسوں میں کوئی مجھ سا بھی غنی ہے

ہر اشک مرا ہے درِ شہوار سے بہتر — ہر لخت جگر رشکِ عقیقِ یمنی ہے

میر

راشد

فطرت اور اِنسان

فطرت :-

"شام ہونے کو ہے اور تاریکیاں چھانے کو ہیں،
آ مرے ننھے، مری جاں، اے مرے شہکار، آ!
تجھ پہ صدقے خلد کے نغمات اور انوار، آ!
آ مرے ننھے، کہ پریاں رات کی آنے کو ہیں،
ساری دنیا پر فسوں اپنا وہ پھیلانے کو ہیں!
تیری خاطر لا رہی ہیں لوریوں کے ہار، آ!
تو نہ ہوگا کب تلک اس "کھیل" سے بیزار، آ!
اب "کھلونے" بھی ترے نیندوں میں کھو جانے کو ہیں!

"کھیل" میں کانٹوں سے ہے دامان صد پارا ترا
کاش، تو جانے کہ سامانِ طرب ارزاں نہیں؛
کون سی شے ہے جو وجہ کاہشِ انساں نہیں؟
آہ! کیوں رہتا ہے دل شیدائے نظارہ ترا!

آ کہ ہے راحت بھری آغوش وا تیرے لئے
آ کہ میری روح ہے غم آشنا تیرے لئے!"

اِنسان:

"جانتا ہوں، مادرِ فطرت، بہت آوارہ ہوں،
طفل آوارہ ہوں لیکن سرکش و ناداں نہیں،
میری اس "آوارگی" میں "وحشتِ عصیاں" نہیں،
شوخ ہوں لیکن بہت معصوم اور بیچارہ ہوں۔
تجھ کو کیا غم ہے اگر وارفتۂ نظارہ ہوں؟
شکر ہے 'زندانیِ' اہرمن و یزداں نہیں،
ان سے بڑھ کر کچھ بھی وجہ کاہشِ انساں نہیں،
میں مگر ان کے افق سے دور اک "سیارہ" ہوں!

شام ہونے کو ہے اور تاریکیاں چھانے کو ہیں،
تو بلاتی ہے مجھے راحت بھری آغوش میں،
کھیل لوں تھوڑا سا، آتا ہوں، ابھی آتا ہوں میں!
اب تو دن کی آخری کرنیں بھی سو جانے کو ہیں
اور کھو جانے کو ہیں وہ بھی کنارِ دوش میں!
بہ چلی ہے روح نیندوں میں مری آتا ہوں میں!

ن۔م۔ راشد



"ماترلنک"

آخری وصیّت

" اگر وہ لوٹ آئیں - تو میں ان سے کیا کہوں ؟"

"——— یہی - کہ میں ان کا عمر بھر انتظار کرتی رہی"+

اور جو انھوں نے کچھ اور پوچھا - مجھے نہ پہچانا ؟

——— بہنوں کی طرح نرمی سے بولنا - شاید دکھیا ہوں +

اور جو انہوں نے تمہارا نام لیکر پوچھا کہ وہ کہاں ہے ؟

——— تو انہیں یہ میرا چھلا دے دینا - خاموشی سے +

اور جو انھوں نے پوچھا کہ یہ ایوان سنسان کیوں ہے ؟

——— تو انہیں یہ جل جل کر بجھی ہوئی شمع دکھا دینا اور یہ کھلا دروازہ +

اور جو انھوں نے پوچھا کہ تمہاری سہیلی کو نیند کیسے آئی ؟

——— کہنا کہ مسکرا کر جان دے دی - دیکھنا - وہ دردمند نہ ہوں

آنسو نہ بہائیں ! ———

محمد عبداللہ چغتائی

معمارِ تاج

روضہ ممتاز محل آگرہ کی تعمیر کے متعلق انیسویں صدی عیسوی کا ایک مخطوطہ "خلاصہ احوال بانو بیگم ... " کے عنوان سے ملتا ہے جو آج قریب قریب ہر کتبخانے میں موجود ہے اس میں ایک طویل فہرست ان کاریگروں کی دی گئی ہے جنہوں نے تاج محل پر کام کیا تھا اور اس سامان کا بھی تفصیلی ذکر ہے جو روضۂ تاج پر استعمال ہوا معماروں کی فہرست میں سب سے مقدم نام استاد عیسیٰ کا ہے جس کو ایک ہزار روپیہ مشاہرہ ملتا تھا مغربی مصنفین کا دعویٰ ہے کہ وہ ایک یورپین تھا۔ اور اس کا اصل نام (AUGUSTIN DE BOURDEAUX.) تھا چونکہ وہ مذہباً عیسائی تھا اس لئے مشرقیوں نے اس کا نام عیسیٰ رکھ دیا۔ بات یہ ہے کہ ہمعصر کتب تاریخ اصل معمارِ تاج کے نام کے متعلق خاموش ہیں اس لئے ہر شخص کو قیاس آرائیوں کی جرأت ہوتی ہے۔ افسوس ہے کہ تاج گنج کی کوئی قدیم معاصر تاریخ نہیں ملتی۔ اس زمانے کی تاریخوں میں تاج کا ذکر ضمنی طور پر ملتا ہے جس سے اس کے معماروں کے اسماء و حالات پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ اس سلسلے میں نہایت تلاش و جستجو کے بعد جو چیز ملتی ہے وہ پیرس کے کتبخانہ ملی کا نسخہ ع۲۹۵ ہے۔ لیکن یہ تالیف بھی ہمارے مقصد تلاش پر زیادہ روشنی نہیں ڈالتی کیونکہ اس نسخے میں صرف روضۂ تاج کی پیمائش کا ذکر درج ہے۔ اس کے ابتدائی حصے کے روٹو گراف بھی میں حاصل کر چکا ہوں۔ یہ نسخہ ماہ ربیع الاول ۱۱۸۸ھ کا لکھا ہوا ہے۔ کتاب کے ابتدائی الفاظ ہیں :-

"حقیقت چہرۂ عمارت روضہ مقدسہ مطہرہ حضرت ممتاز الزمانی نواب تاج محل مہد علیا ارجمند بانو بیگم شروع تیاری عمارت در سنہ ۱۰۴۲ھ و در سنہ ۱۰۵۳ھ تمام یافت[1]"

میرے نزدیک یہ نسخہ تاج کے متعلق تمام نسخوں میں قدیم ترین اور اصح بھی ہے باقی تالیفات بالکل بعد کی چیزیں ہیں اور موضوعات میں شمار ہونے کے قابل ہیں وہ کسی معاصرانہ مستند ماخذ پر مبنی نہیں ۔

احمدؒ

سنہ ۱۰۴۸ھ میں شاہجہان آباد کی عمارات کی داغ بیل ڈالی گئی ہمعصر مورخین اس کی عمارات کے ذکر میں احمدؒ و حامد دو معماروں[2] کے نام کا اپنی مصنفات میں ذکر کرتے ہیں جن کی زیرِ نگرانی عمارات دہلی تعمیر ہوئیں جیسا کہ عبارتِ ذیل سے عیاں ہے :-

---

[1] - آغاز تعمیر ۱۰۴۲ھ تو ہمعصر کتب تاریخ میں درج ہے مگر تاریخ اختتام ۱۰۵۳ھ اور کتب میں نہیں ہے تاریخ اختتام روضہ کے اندرونی دروازہ بڑی محراب کے کتبات آیاتِ قرآنی کے اخیر میں درج ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولف نسخہ ہذا نے سنی سنائی باتیں نہیں کہیں بلکہ جو کچھ لکھا ہے خود دیکھ کے اور پیمائش کر کے لکھا ہے ۔

[2] - یہ بات قابل ذکر ہے کہ نسخہ عمل صالح مطبوعہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی میں تاریخ ۱۰۷۰ھ لکھی ہے جو سراسر غلط ہے۔ ایک اور غلطی یہ ہے کہ اس نسخہ میں محض "احمد معمار" بجائے "احمد و حامد" چھپا ہے۔ میں نے اس ضمن میں ولایت سے ایک خط سکریٹری بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کو تحریر کیا تھا کہ طباعت آیندہ میں یا ایک غلط نامہ کی صورت میں یہ تصحیح کر لی جائے۔ اسی طرح ایک غلطی مآثر رحیمی میں بھی ہے کہ استاد مری کی بجائے بڑی

۱۔ عمل صالح[۱]۔ بعد از پنج ساعت از شب جمعہ بست پنجم ذی حجہ مطابق نہم اردی بہشت سال دوازدہم از جلوس اقدس موافق ۱۰۴۸ھ در زمان محمود دوران مسعود استاد احمد و حامد سر معماران نادرہ کار سرکاری عزت خاں صوبہ دار آنجا و سعادت اہتمام این کار مطابق طرحی تازہ و نقشہ بدیع کہ ہیچ چشم ناظر آں در بہشتی جنت دیبا نظر نظارگیان در نیامدہ بود الخ

۲۔ بادشاہ نامہ محمد وارث:۔ حکم اشرف بعد از پنج ساعت از شب جمعہ بست و پنجم ذی حجہ مطابق نہم اردی بہشت سال دوازدہم از جلوس اقدس موافق سنہ ہزار و چہل و ہشت ہجری کہ مختار دانشوران انجم و افلاک بود استاد احمد و استاد حامد کہ معماران ماہر بودند کار عمارت بہ آمد سرکاری عزت خان[۳] برادر زادہ عبد اللہ خاں بہادر فیروز جنگ کہ ناظم صوبہ دہلی و اہتمام تاسیس عمارات مذکور باو مفوض فرمود مطابق طرحی کہ در پیشگاہ خلافت مقرر گشتہ بود رنگ ریختند الخ

اسی طرح ان دونوں معماروں کے متعلق میں نے کتبہ ذیل شادی آباد مانڈو مالوہ میں بڑی مسجد کے قریب ہوشنگ شاہ کے مقبرہ میں دروازہ کے پہلو پر بخط خفی تانبے کی لوح پر دیکھا :

"بتاریخ نہم ربیع الثانی سنہ ہزار و ہفتاد ہجری فقیر حقیر لطف اللہ مہندس ابن استاد احمد معمار شاہجہانی و خواجہ جاد و رائے و استاد شیو رام و استاد حامد بجہت زیارت آمدہ بود و دو کلمہ یادگار نوشت"

مولانا سید سلیمان ندوی صاحب نے اپنے مقالہ میں جو انہوں نے دائرہ معارف اسلامیہ لاہور کے جلسہ میں بعنوان "لاہور کا ایک مہندس خاندان" پڑھا تھا۔ بحوالہ سید مرتضیٰ صاحب ہیڈ کلرک کمانڈر انچیف دہلی بیان فرمایا تھا کہ استاد احمدؒ و حامد دونوں بھائی تھے اور یہ کہ دہلی میں اب تک ایک کوچہ "کوچہ استاد حامد" کے نام سے دریبہ اور جامع مسجد کے درمیان موجود ہے ان کی اولاد وہیں سکونت پذیر ہے۔ لاہور والے کہلاتے ہیں اور آج کل سادہ کاری کا کام کرتے ہیں"۔ ممکن ہے یہ درست ہو۔ لیکن نہ ان کتب تاریخ سے جن میں ان دونوں کا ذکر ہے نہ کتبہ متذکرہ بالا سے جس میں دونوں کا نام ہے اور نہ لطف اللہ کی مثنوی سے جس میں اس نے اپنے خاندان کے افراد کا ذکر کیا ہے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ احمدؒ و حامد بھائی تھے اس لئے اس بات کو تسلیم کرنے میں کچھ تامل ہوتا ہے ٭

اگر فنی اعتبار سے دیکھیں تو اسی کتبہ مانڈو سے بہت سے امور پر روشنی پڑتی ہے۔ اوّل یہ کہ استادان فن دیگر ملکی عمارات و آثار کو دیکھنے کی غرض سے سفر کیا کرتے تھے۔ دوم کتبہ کے الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کاتب لطف اللہ مہندس خود ہے سوم یہ کہ احمدؒ معمار کے ساتھ لفظ شاہجہانی ایزاد کیا جاتا تھا۔ جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس کو شرف ملازمت شاہی حاصل تھا۔ مانڈو میں یہ امر فن تعمیر کے اعتبار سے ضرور قابل ذکر ہے کہ مانڈو میں مغل عمارات کوئی نہیں ہیں صرف ایک دروازہ عالمگیر کے نام پر ہے جو مغل طرز پر ہے۔ اورنگ زیب اپنی دور اندیشی سے قدیم یادگاروں کو شکست و ریخت سے بچانے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ مانڈو میں اس نے فصیل کو پھر قائم کیا اور دروازہ عالمگیر پر کتبہ ذیل ملتا ہے :۔

در زمان شاہ عالمگیر خاقان جہاں — از سر نو گشت برپا این در گردون نشان

در ہزار و ہفتاد و نہ آغاز و ہم انجام یافت — ز اہتمام خان عالیشان محمد بیگ خان

در جلوس این شہنشاہ جہاں اورنگ زیب — بود سال یازدہ از روی تحریر بیان

میرا خیال ہے کہ متذکرہ معماران جن کے اسمائے گرامی کتبہ میں ثبت ہیں۔ اورنگ زیب کے عہد میں شکست و ریخت مانڈو کو ٹھیک کرنے کے لئے آئے تھے اور انھوں نے دروازۂ عالمگیر کو بھی تعمیر کیا جو کسی طرح بھی فتح پور سیکری کے دروازے سے بلندی یا خوبصورتی میں کم نہیں ٭

سید سلیمان ندوی کے پیش کردہ دیوان لطف اللہ مہندس کی مختصر کیفیت ذیل کے اشعار سے واضح ہے۔ دیوان کی ابتدا نعتیہ

---

[۱]۔ از نسخہ برٹش میوزیم ADD ۲۶۲۲۲ [۲] از نسخہ بوڈلین CAPS ORD3

[۳]: دونوں نسخوں میں غیرت خاں پڑھا جاتا ہے۔

قصیدہ سے ہوتی ہے جس کے آخر میں صاحب دیوان اپنا اور اپنے باپ کا نام اور اپنے مشاغل درس تدریس کا ذکر کرتا ہے ؎

باش لطف اللہ احمد چہ کنی فخر بعلم   جہل ازیں علم تو بہ تر کہ نباید بعمل

دارا شکوہ کی مدح کرتا ہے جس میں اپنا ذکر کرتا ہے اور ایک جگہ لفظ مہندس سے لطیف استدلال کرتا ہے ؎

در حق من گمان خطامی بری خطاست   ہرگز شنیدۂ کہ مہندس خطا کنند

اس دیوان میں دارا شکوہ کے ایک محل کا ذکر ہے جسے لطف اللہ نے بنوایا اور اس کی تاریخ نکالی ہے ؎

چوں بنا کردہ قصر جاہ و جلال   ظل حق بادشاہ عالی ملک
بلندہ ایں عمارت والا   تافت چوں سپہر بر والی ملک
گفت معمار قصر تاریخش   قصر دارا شکوہ والی ملک
سنہ ۱۰۶۰ھ

بلکہ دارا شکوہ کے بیٹے سلیمان شکوہ کی کتخدائی کی تاریخ بھی لکھی ہے ؎

گفت جبریل امین تاریخش   بسلیمان شدہ بلقیس قرین
۱۰۶۴ھ

ذیل کی مثنوی میں لطف اللہ مہندس اپنے خاندان کا ذکر بھی کرتا ہے اور اپنے باپ احمد کو باضافہ لفظ شاہجہانی یوں یاد کرتا ہے :-

"نادر العصر استاد احمد معمار لاہوری شاہجہانی"

اس کے بعد اپنے والد کے متعلق کہتا ہے کہ وہ ریاضیات فلکی کی سب سے بڑی کتاب مجسطی کا ماہر تھا - اور خواجہ نصیر الدین طوسی کی مشہور کتاب "تحریر اقلیدس" کا عالم تھا - اس کے تین بیٹے عطا، اللہ، لطف اللہ مہندس اور نور اللہ تھے - تینوں صاحب فن تھے +

شاہجہاں داور گیتی ستاں   روشنی دودہ صاحب قراں
عرش بریں قبۂ خرگاہ اوست   رشک فلک سدۂ درگاہ اوست
احمد معمار کہ در فن خویش   صد قدم از اہل ہنر بود بیش
واقف تحریر و مقالات آن   آگہ اشکال و حوالات آن
حال کواکب شدہ معلوم او   سر مجسطی شدہ مفہوم او

از طرف داور گیتی جناب
بود عمارت گر آن بادشاہ
آگرہ چو شد مضرب رایات شاہ
کرد بحکم شہ کشور کشا
باز بحکم شہ انجم سپاہ
قلعہ دہلی کہ ندارد نظیر
ایں دو عمارت کہ بیان کردہ ایم
یک ہنر از گنج ہنرہائے اوست
چوں بنود عالم فانی مقر
پس سہ پسر ماند زمرد سترگ
نادر عصر خود و مشہور شہر
مرد ہنر پرور و استاد فن
مخزن علم آمدہ تالیف او
نثر وی از آب روان پاک تر
منکہ سخن پرور و دانش ورم
منکہ ربودم ز جہاں گوی علم
منکہ شدہ آگہ سر بنان
ثانی آن ہر سہ برادر منم
گرچہ مہندس لقبم از شہ است
ثالث آن ہر سہ برادر بسال
ما ہمہ و معمار عمارت گریم
لیک بود قیصر کلامش عجب
گرچہ کم است سال وی از سال من
نثر وی از نظم گہربار تر
دیدہ ز نور سخنش پر ضیا
گنج ہنر آمدہ در مشت او
گرچہ منم بے سخن استاد فن

نادر عصر آمدہ او را خطاب
داشت دران حضرت فرخندہ را
بسکہ بر و بود عنایات شاہ
روضۂ ممتاز محل را بنا
شاہ جہاں داور گیتی پناہ
کرد بنا احمد روشن ضمیر
در صفتش خامہ روان کردہ ایم
یک گہر از کان گہرہائے اوست
کرد سوی عالم باقی سفر
زاں سہ عطاء اللہ رشیدی بزرگ
عالم و علامہ و دانائے دہر
فاضل و دانشور و حبر زمن
گنج ہنرہاست تصانیف او
نظم خوشش غیرت سلک گوہر
بندۂ آن حبر سخن پرورم
از چمنش یافتہ ام بوی علم
از دم او یافتہ ام قوت جان
ہندسہ یک فن بود از صد فنم
نام من دل شدہ لطف اللہ است
آمدہ نور اللہ صاحب کمال
ما ہمہ استاد و سخن پروریم
زاں شدہ معمار مرا در لقب
بیش بود حال وی از حال من
نظم بنثر آمدہ ہموار تر
طبع ز لطف سخنش پر صفا
ہفت قلم راندہ سر انگشت او
آن یک و این یک بود استاد من

گرچہ مراہست مہندس لقب — ہندسہ زاں ہرسہ برادر طلب[1]

اسی دیوان میں احمدؒ کی وفات کے متعلق دو قطعات دئے ہیں جن کے تاریخی اشعار یہ ہیں ؎

نادرالعصر رفت و گفت خرد — شد بفردوس احمدؒ معمار

تاریخ وفات او خرد گفت — محمود العاقبت شد احمدؒ

ان دونوں سے سید صاحب کے نزدیک تاریخ وفات ۱۰۵۹ھ نکلتی ہے ۔

لطف اللہ مہندس تو واضح طور پر "تاج" کو "یک گہر از گہرہای احمدؒ" کہتا ہے ۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آخر دیگر مورخین کیوں خاموش ہیں ۔ قلعہ شاہجہان آباد کی تعمیر کے ذکر میں معماران احمدؒ و حامد کے اسما ملتے ہیں ۔ مورخین بڑی آسانی سے انہیں دونوں (احمدؒ و حامد) یا محض احمدؒ کے متعلق بیان کر سکتے تھے کہ یہ وہی احمدؒ ہے جس کے زیر ہدایت تاج تعمیر ہوا بلکہ احمدؒ کے متعلق دیگر تاریخی اطلاعات سے جو ذیل میں آتی ہیں معلوم ہوتا ہے کہ اس نے لاہور، حسن ابدال وغیرہ میں عمارات تعمیر کیں لیکن تاج کے ضمن میں کہیں ذکر نہیں ملتا فقط لطف اللہ مہندس نے اپنی مثنوی میں ذکر کیا ہے اور تاج کو اس کی طرف منسوب کیا ہے یہ ایک معمہ ہے جو سمجھ میں نہیں آتا ۔

محمدؐ شفیع نگینوی نے اپنی کتاب "مرأتِ واردات" میں شاہجہان کے عہد کی عمارات دولتخانہ شاہجہان آباد، مسجد دہلی، مقبرہ ممتاز محل آگرہ، باغ شالامار لاہور، خانۂ نواب آصف خان لاہور کا ذکر کیا ہے مؤخر الذکر عمارت کے متعلق ایک طویل بیان دیا گیا ہے جس میں وہ اس تعمیر کو احمدؒ معمار کی طرف باوضاحت منسوب کرتا ہے ۔

قضا و قدر لفظ تفرقہ را بر جبین خلائق نوشتہ و عمارات عالی بنائے که در زمان آن پادشاہ دین پناہ صورت پذیر تمام گشتہ در ہیچ عصری و دوری معماران دارالثبت اخبار از نقش بندی تصویرش نشان ندادہ اند خصوصاً این پنج عمارات کہ در بلاد متفرقہ بحسن تدبیر صاحبقران ثانی تا حال آئینہ دار خلد برین است یکی عمارات دولتخانۂ شہریاری کہ موسوم بقلعہ دارالخلافہ شاہجہان آباد است و دوم مسجد جامع کہ مقابل قلعہ مذکور و ہمسایہ بیت المعمور است سیم مقبرہ ممتاز محل دختر نواب آصفخان کہ سرخیل زوجات آن خسرو شیرین کردار بود برکنار دریا در سواد اکبرآباد واقع است و چہارم باغ شالامار لاہور کہ از بناہائے دولت و اقبال است و در معنی صورت ہندوستان را گلستان ساخت پنجم خانۂ آصف صفات کہ در شہر لاہور آئینہ دار یکتائیست ۔ چنانچہ بہم چشمی این عمارت فردوس اشارت سیاحان جہان گرد بر روئی زمین نشان نمیدہند لیک سلاطین حال دارالملک ہندوستان سر شہریاران ہفت اقلیم ازین پنج بنائے عالی نہاد افتخار تمام دارند و در حقیقت خانہ نواب مذکور عمارتیست کہ معمار باصرہ از تشخیص ادراک آن آئینہ دار حیرانست حکایت کنند کہ قریب مبلغ دو کرور روپیہ کہ خراجہائے قرنہا مقرر است بران عمارت خرج شدہ و وسعت عمارت و تعداد مکان بحدیست دو سلطان والا حشم را با کارخانجات کافی است گویند کہ چون آصف خان از چار دیوار زندان جہانی بوسعت آباد بیدر و دیوار عالم باقی شتافت سلطان دارا شکوہ کہ بخطاب شاہ بلند اقبال سربلند روزگار بود آنخانہ جہت اقامت خویش از صاحبقران ثانی درخواست و برای اظہار طراحی طبع دو نشیمن مختصر مقابل آن عمارت وسیع متعددہ بنیاد نہاد ہنوز کار از نصف تعمیر نگذشتہ بود کہ جرأت اتمام ننمودہ بعجز تہیدستی معروف گشت باوجود ولیعہدی سلطنت ہندوستان و منصب پنج ہزاری و آن دولت بقیاس ہمتش مقصور و مفقود گشت و آن امیر عالیجاہ ازین قبیل عمارات بسیار ساختہ گویند چون

---

[1] مقتبس از مضمون سید صاحب ۔

این خانہ کہ در وسعت عالمست و در خوبی مانندِ گلستان ارم
از آغاز انجام پذیرفت خان دریا دل عالی ہمت تماشای آن
تشریف آوردہ بعد از سیر مکانات و مقامات باستاد احمدؒ
معماری آن تعمیر از روئی ناخوشی و عتاب فرمودہ۔ کہ ای پست
فطرت گرگی خزائن در سرکارِ من بخیالت رسید کہ از کوتاہی ہمت
و قصور فطرت قصری ساختی کہ پا دراں دراز نتواں نمود استاد
احمدؒ کہ دراں روز توقع تحسین فراوان و حصولِ انعامات کلی چشم
داشت یکبارہ مایوس گشتہ معروض داشت کہ ہرگاہ دریں خانہ
کہ در زیر فلک مینائی از زمان آدم تا ایامِ حال چشم کہن پیر روزگا
تماشا نکردہ پای عالی دراز نگردد یقین کاملست کہ بغیر از کنج
تاریک تنگ گور دراز نخواہد گردید۔ لمصنفہ ؎

در زیر خاک ای زجہاں واکشیدہ دست　　　مارا بہر علائے دل خود دراز کن

دراین معنی دردل دیدہ اہل بصیرت آئینہ صورت حال اہل
روزگارست۔ استاد گفت ؎

چشمِ تنگ مرد دنیا دار را　　　یا قناعت پر کند یا خاکِ گور

خان نکتہ سنج صاحب انصاف متبسم گشتہ درجلد وی این جواب
با صواب مبلغ یک لک روپیہ کہ بفارسی صد ہزار گویند با خلعت
خاصہ کامیاب عزتش گردانیدند ہر چند خانہ دوم آن مرصع
کاری شاہ نشین متعدد دارد ولیکن خانہ لاہور کہ بہشت
شداو از تماشائی آن عمارت مرجع کار خجالت اند وزگشتہ
خود را از چشم تماشائیان پنہان ساختہ حسن دیگر و کیفیت
جدای دارد و از انتقال آصف خان آن خانہ جہت بودن
سلاطین مقرر است لیکن بعد خان آصف نشان ہیچ
سلاطین ہمت تعمیر شکست و ریخت آن عمارت نداشتہ
و ندارند ؎

چشم عبرت بین چرا در قصر شاہان ننگرد　　　کو چساں از حادثاتِ دورِ گردون شد خراب[1]

[1] مرآتِ واردات برٹش موزیم Add 6579 ورق ۷۵

اس کے علاوہ ایک نامکمل نسخہ مخطوطہ میرے پاس ہے اس نسخہ میں ایک خط مدار المہام نواب جعفر خان کے نام ہے جس میں تعمیر مسجد و قلعہ حسن ابدال کا ذکر ہے۔ نواب جعفر خان ۱۰۵۵ھ میں پنجاب کا گورنر تھا ۱۰۷۳ھ میں عالمگیر کا وزیر ہوا اور ۱۰۸۱ھ میں فوت ہوا:۔

"بمدار المہامی نواب جعفر خاں ـــــ بیگر داند کہ حقیقت فہمیدگی
و کاردانی و معاملہ شناسی و سربراہی و سلوک محمد مومن دارو غہ منازل
قدسی مشاکل و باغ و سرائی واقعہ حسن ابدال بمقتضائی دستگیر فتگی
نواب فیاض زمان درسای خدمت گذارش نمودن تحصیل حاصل
دارد چوں درباب ساختن قلعہ شمشیر گڈھ حکم مقدس معلی شرف
نفاذ یافت و وارد و معمار کہ پیش از آمدن کاظم بیگ از حضور
لامع النور رسید بقدر امکان واقتدار حسب سرانجام مصالح بایگا
عمارت ہر چند دست و پا میزد بطریق دل خواہ صورت نمی بست
و کار در تعویق می افتاد و کیفیت بیوتوفی معمار کابلی کہ ہمراہش
خدمت میکرد بعرض رسیدہ باشد و ہمیشہ احکام قدسی انتیام
دربارہ تاکید تاسیس قلعہ شرف صدور و اعزا ایراد می یافت
درو قتی کہ حکم مبرم قضا توام بعمدۃ الملک مہابتخان سعادت
وصول و عطائی حلول بخشید از انجا کہ جمیع مصالح عمارت قلعہ
از حسن ابدال و مضافات انجا سرانجام و سربراہ میشد بوسیلہ
رفعت پناہ حاجی اللہ قلی کار فرمائی عمارت قلعہ مذکور در کار
دانی و معاملہ فہمی و حسن تردد و نیکو خدمتی و سربراہی و سعی تلاش
و حفظ ضوابط عملی می توان گفت کہ سہیم و عدیل ندارد و صورت
سرگرمیش را بیشتر بدرگاہ سلاطین سپہر معروض داشتہ حقیقت
حسن سلوک و کاردانی محمد مومن مذکور و استاد احمدؒ معمار کہ در
طراحی و وقوف کار عمارت و معاملہ شناسی استعداد تام و دستے
بکمال دارد بعمدۃ الملک رسید برطبق تقدیم احکام مقدس معلی
صورت سرانجام تعمیر قلعہ از انہا دیدہ و ہر دو را از حسن ابدال
طلبداشتہ و بچند وجہ مستمال ساختہ و بجہت سرانجام و سربراہی

مالح وپیشرفت کار باوجود تقیید خدمات سابقہ بے تکلف تمام
بست داروغگی ومعماری اینجا مقرر نموده تجویز نامه داد ندسے
اقع بعنوانی که شنید ه شده بود که از کار دانی سرمایه وافر دارند
زاز ان بمحک آزمودن رسیده به تجربه پیوستند؛ بمعاونت د
اسدت ومظاہرت رفعت پناه مذکور در فرصت اندک قلعه
م دور شہر سر انجام نمودند وکارش تا ساختن کنگره رسانیدند
انچه در اکثر جاکنگره ساخته شده ومیشود وقلعه پخته تخمیناً بسی
رار گز و کسری صورت تعمیر گرفته وکار عمارت روز بروز جاری
ست وتا نکه تمامی عمله وفعله رضامند است کفایت تمام در سر
نجام کار بظهور آورده اند بهمین طریق در تقدیم خدمات متعلقه
سن ابدال از پرداخت باغ ومنازل معلی وبند آب دروازه
شمیری وسرایی گلابخانه وتعمیر سرای عهده خود را بطرز گزیده بوجه
سندیده ساعی وسرگرم اند بوضع سنجیده سربراه ساخته دمیباز
از فیض بخشای نواب امیدگاه امیدوار بحرای هستند درینولا
کارپردازان خدمت سامی ظاهراً خدمات حسن ابدال بدیگری
بخواهند تجویز فرمایند چون مصالح دارائی که در اینجا خدمت
بیکنند بطریقی که گذارش رفته از توابع حسن ابدال اند و
رجوع بداروغه انجا خواهند کرد واو برای مجری خود نخواهد گذاشت
له مصالح از قرار واقع در اینجا برسد یقین که کار اینجا در تعویق
خواهد افتاد نیاز مند بحسب این معنی که از وقوع تغیر خدمات
انجا از محمد مومن واستاد احمد سررشته نظم ونسقے که در اینجا قرار
داده بودند شاید از هم افتند لازم دید که حقیقت را در گرامی خدمت
اظهار سازد مترصد که خدمات مذکوره نظر بر پیشرفت خدمت
اینجا بدستور سابق بمحمد مومن واستاد احمد بحال ومسلم باشند
که بجمعیت خاطر در ایجاد آن اشتغال نمایند که خدمت
دولتخانه فیض آستانه مبارک منزل قلعه شمشیر گڈه باهمه گر لازم
ملزوم داشت باقی الامر بیدکم والاختیار الیکم ایام عمر و
ازمون (دراصل نسخه)

دولت واقبال دائماً مخلد ومستدام باد"
برٹش موزیم کے نسخہ زیج شاہجہانی از ملا فرید ابراہیم منجم متوفی ۱۰۳۹ھ
کے مقدمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ملا فرید نے بھی کسی استاد احمد قدوۃ
المہندسین سے استفادہ کیا تھا قیاس غالب ہے کہ اسی احمد معمار کی
طرف اشارہ ہے جس کے لڑکے لطف اللہ مہندس نے خاندانی روایات
کو مدنظر رکھ کر اور اپنے فن مہندسی کی وجہ سے اپنا تخلص بھی مہندس
کیا +

عطاراللہ رشیدی

متذکرہ بالا اشعار مثنوی کے مطابق استاد احمد کا سب سے بڑا
لڑکا عطاراللہ رشیدی ہے۔ اس کی دو تصانیف الجبر اور خلاصۃ الحساب
ملتی ہیں جو برٹش موزیم میں ہیں[1] :-

"الجبر مصنفہ عطاراللہ رشیدی ابن احمد نادر کہ بتوفیق الٰہی در سنہ
ارب
ع واربعین والف ہجری مطابق ہشتم سال جلوس حضرت صاحبقرا
برا ورنگ لطف وجہانبانی کتاب جبر ومقابلہ ہندوسی موسوم بہ
بیج گنت تصنیف بھاسکراچارج مصنف لیلاوتی را کہ در علم
حساب کتابی ست بحقائق را ..... از زبان ہندوی بفارسی
آوردم و دیباچہ کتاب را .... ابوالمظفر شہاب الدین محمد
قران ثانی شاہجہان بادشاہ غازی ... حلیہ آرائش دادم
.... الخ"

اس دیباچہ میں مصنف کا نام عطاراللہ رشیدی لکھا ہے برٹش موزیم
کے ایک مجموعۂ کتب حساب[2] میں "منتخب" از لطف اللہ ہندی اور متذکرہ
بالا عطاراللہ ابن احمد کی کتاب "خلاصۃ الحساب" وغیرہ ہیں لیکن نسخہ
"خلاصۃ الحساب" میں عطاراللہ کے ساتھ لفظ رشیدی (اس کا تخلص)

---

[1] برٹش موزیم Add :16,869

[2] برٹش موزیم Add 16,744

ایزاد نہیں ہے۔ یہ کتاب حساب نظم میں ہے جسے مصنف نے دارا شکوہ کے نام پر منسوب کیا ہے۔ چند اشعار اپنے متعلق بھی کہے ہیں۔ لطف اللہ مہندس کے اشعار اور عطاء اللہ کے اشعار کو پیش نظر رکھ کر اندازہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس خاندان کا خصوصیت کے ساتھ دارا شکوہ سے تعلق تھا۔ شفیع لکھنوی کے الفاظ کے مطابق احمدؒ معمار نے خود دارا شکوہ کے لئے ایک محل تیار کیا تھا۔ خلاصۃ الحساب کا دیباچہ یہ ہے۔

حمد

شکر بیحد بواحد ازلی   حمد بیحد بعز دلم یزلی
آں خدائے کہ قسمت ہر فرد   رقم اندر سطور نامیہ کرد
پادشاہِ ممالک جبروت   خالق خلق و مالک ملکوت

نعت

بر محمدؐ صلوٰۃ نامحصور   باد تا حذر باشند محذور
ذاتِ او در مدارج ایجاد   چوں یکی در مراتب اعداد
فصل کل از جمال او پیدا   عقل کل در کمال او شیدا
از خدا بر وی و صحابہ وی   صلوٰۃ سلام پی در پی

در مدح بادشاہ شہاب الدین شاہجہان

بعد نعت رسول و حمد اللہ   نہ سزد جز دعائے دولت شاہ
سایہ رحمتِ الٰہِ جہان   شاہ آفاق گیر شاہجہان
باسط مسند ظفر بزمیں   بوالمظفر شہاب دولت دیں
نائب مصطفیٰ باستحقاق   بادشاہجہان علی الاطلاق
رستمان جہان فگندہ او   صد چو افراسیاب بندہ او
خامۂ اوست رایت منصور   کہ نویسد بشش جہت منشور

صفت شاہزادہ دارا شکوہ

للہ الحمد این سپہکہ ماہ   شد مجلی بنام دارا شاہ
نیر اعظم سپہر کمال   بادشاہزادہ بلند اقبال
قطب آفاق سرور عادل   شاہ دارا شکوہ دریا دل
فخر دنیا و دین پناہ جہان   شرف دودمان شاہجہان
تا بود بر فلک مہ و خورشید   آن چمن دین سپہر بود جاوید
بانی قصر دولت و اقبال   در دریائے دل رفعت و اجلال
قرۃ العین دیدہ ہستی   علم عالم زبہر دستی
پر شکوہش قبائی دریا تنگ   کوہ در وزن حلم او یا سنگ

اظہار عجز حال مصنف این کتاب

میکند نظم این خلاصہ راز   بندہ مقدم بکمال نیاز
خانزادہ غلام حضرت شاہ   ذرۂ بینوا عطاء اللہ
پور استاد احمدؒ معمار   کہ ہنر بود مرکز او پرکار
آن وحید جہاں کہ در ہر فن   بود برہان قدرت ذوالمن
آن ہنر پیشہ کز سر تیشہ   زنگ بردی ز روی اندیشہ
بود ہر چند دانا ہنر این راہ   گشت معمار کل درین درگاہ
ورنہ ہر خستہ چو من عامی   اندرین باغ کہ شود نامی
سنگ این آستان گوہر بار   جوہر بخت را بود معمار
من کہ از بندگان درگاہم   خانہ زادہ کمینہ شاہم
گرچہ نادان و گول و بے فہم   منقبت خوان شاہ بحر و برم
نشناسم سیاہ را ز سپید   خاصہ بر لطف بادشاہت امید
کاندرین درگہ غریب نواز   در رحمت ہمیشہ باشد باز

صفت عدد و شروع کتاب

نظم روشن چو سلک گوہر ناب   بشنو اندر بیان علم حساب

ان اشعار سے دیگر امور پر بھی روشنی پڑتی ہے یعنی یہ رسالہ اس وقت لکھا گیا جب بادشاہ شاہجہان زندہ تھا اور دارا شکوہ اس وقت اسم بامسمیٰ بلند اقبال تھا۔ عطاء اللہ اپنے باپ احمدؒ معمار کے متعلق لکھتا ہے کہ وہ شاہجہان کا "معمار کل" تھا غالباً یہی وجہ ہے کہ کتبہ

مانڈو میں اس کے نام کے ساتھ لفظ شاہجہانی ایزاد کیا گیا ہے یعنی تمام عمارتی کام اس کے سپرد تھا اور تاج محل بھی بیشک اس میں شامل ہے۔ لطف اللہ نے صاف اس کی تعمیر کو اپنے باپ کی طرف منسوب کیا ہے۔ عطاء اللہ نے اپنے متعلق صراحت سے کہا ہے کہ میرا بھی اسی درگاہ شاہجہانی سے تعلق ہے۔ اگرچہ معلوم ہوتا ہے کہ عطاء اللہ رشیدی عالمگیر کے زمانہ میں بھی ملازم سرکار رہا۔ جب دلرس بانو بیگم رابعہ دورانی زوجہ اورنگ زیب کا انتقال ہوا تو ضرورت محسوس ہوئی کہ تاج محل کی طرح کا روضہ تعمیر کیا جائے لہذا یہ کام عطاء اللہ معمار کے سپرد کیا گیا۔ فن کے اعتبار سے یہ عمارت بھی انہی روایات کی تتبع ہے۔ چنانچہ میں نے مقبرہ دلرس بانو کو کئی بار دیکھا ہے اور مولانا عبدالحق کے مہمان کی حیثیت سے اس روضہ کے ملحقہ مکان میں چند روز رہنے کا فخر بھی حاصل کیا ہے۔ یہ روضہ بالکل تاج محل آگرہ کی نقل ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ ویسا ہی تعمیر ہو اگرچہ وہ بات حاصل نہیں ہوئی تاہم ظاہری صورت میں تاج کا تصور ضرور آتا ہے اس پر خوش قسمتی سے کتبات موجود ہیں جن سے واضح ہے کہ اس کا معمار عطاء اللہ تھا۔ جو مقبرے کے دروازہ پر پیتل کے ٹکڑہ پر ہیں:-

۱- این دروازہ باہتمام رفعت پناہ ابوالقاسم بیگ داروغہ طیار شد

۲- این روضہ منورہ در معماری عطاء اللہ بعمل ہیبت راے طیار شد

۱۰۷۲ھ

لطف اللہ مہندس

لطف اللہ مہندس بیشمار کتب کا مصنف ہے۔ شرح خلاصۃ الحساب منتخب الحساب، رسالہ خواص اعداد، تذکرہ آسمان سخن۔ دیوان مہندس اس کے رسالہ "منتخب الحساب" کا میرا اپنا ذاتی نسخہ[۱۵۰] میرے سامنے ہے۔ اس کی ابتدا ہے:-

الحمد للہ رب العالمین . . . اما بعد می گوید فقیر لطف اللہ مہندس ابن استاد احمد معمار لاہوری غفر اللہ لہ و لوالدیہ و احسن الیہما و الیہ کہ کتاب حساب را تصنیف است او محقق و تحریر مدقق شیخ بہاء الدین محمد بن حسن عاملی است رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ مشتملست بر قواعد شریفہ و فوائد لطیفہ باشارت خلاصۂ دودمان سیادت منتخب خاندان وزارت میر محمد سعید ابن میر محمد یحییٰ ادام اللہ اقبالہ و ضاعف اجلالہ ترجمہ کردم چوں آن نسخہ خلاصہ نام داشت این نسخہ را منتخب سنہ ۱۰۹۲ نام نہادم نام تاریخ تالیف این رسالہ است . . . . . .'

لطف اللہ مہندس کی دوسری تصنیف "رسالہ خواص اعداد"[۱۵۱] چار مقالوں میں ہے اور یہ اس نے ابن سینا کے تتبع میں حساب پر لکھا ہے:-

الحمد للہ . . . اما بعد میگوید فقیر لطف اللہ مہندس متخلص بمہندس ابن استاد احمد معمار لاہوری کہ این رسالہ ایست کہ علم ارثماطیقی (ARITHMETIC) خواص اعداد بدان اسعدک اللہ تصنیف بیش از یک باز کند زوج الزوج شیخ الرئیس . . . . "

لطف اللہ مہندس جس کا شاعر ہونا تخلص مہندس اس کے اپنے دیوان سے ثابت ہو چکا ہے اس نے تذکرہ دولت شاہ کا اختصار "آسمان سخن" کے عنوان سے نظم کیا جسے سپرنگر نے فہرست مخطوطات اودھ میں ص ۱۲۲ پر بیان کیا ہے[۱۵۲] وہ کہتا ہے کہ لطف اللہ مہندس ابن احمد نے اس کا نظم میں اختصار کیا اس کے مقدمہ سے جو بارہ اشعار پر مشتمل ہے نائفی کرمانی نے تذکرہ دولت شاہ کو فارسی نظم میں اکبر کے زمانہ میں لکھا تھا اور سات طبقات کے بجائے دس میں کیا تھا مگر لطف اللہ مہندس نے جو اورنگ زیب کا ہمعصر

---

۱۵۰ - انقلاب روزنامہ ۲۰ اپریل سنہ ۱۹۳۲ء رپورٹ ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور ۱۵۱ برٹش میوزیم Add 16,744

۱۵۲ - برلن لائبریری مخطوطات مشرقیہ عدد ۶۸۲ Pertsch میں ایک مخطوطہ تذکرہ کے متعلق ہے جو موسومہ لطف اللہ ابن احمد ابن یوسف ابن حسین ابن عبداللطیف ۱۰ رمضان سنہ ۱۰۹۹ھ بیان کیا گیا ہے۔

تھا۔ اس نظم کو شکل ثانی دی اس نے دو برج زائد کئے تاکہ تعداد دائرۃ البروج کے نشانات کے ساتھ مناسبت پیدا کر لے اور اس وجہ سے اس کا نام آسمانِ سخن رکھا۔ قریباً دو سو پچاس اشعار میں ہے اور ہر ایک میں شاعر کا نام ہے ؎

شکر خدائی کہ آسمانِ سخن　　بیا فرید محیط نہ آسمان کہن

اس طرح لطف اللہ مہندس کا متذکرہ بالا دیوان بھی اس کی تصانیف ہی سے ہے۔ لیکن اس کا سب سے بڑا کام ترجمہ ہے "صُوَرِ صوفی" مصنفہ عبدالرحمٰن الصوفی المتوفی سنہ ۳۷۶ھ کی کتاب کا جو ستاروں کے اشکال و صور پر ہے اس کتاب کے بہت سے قدیم مصوّر نسخے کتبخانہ ملی پیرس میں موجود ہیں۔ اور ان سے قدیم مصوری پر بہت روشنی پڑتی ہے۔ لطف اللہ مہندس نے سنہ ۱۰۵۰ھ میں اپنے باپ احمدؒ کے کہنے پر اس کا ترجمہ فارسی میں کیا اس کا ایک نسخہ مسلم یونیورسٹی میں لطف اللہ مہندس کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا موجود ہے[1]

نور اللہ

مثنوی مہندس سے احمدؒ کے تیسرے لڑکے نور اللہ کا پتہ چلتا ہے۔ عام طور پر اس کا کوئی کام یا کارنامہ بیان نہیں کیا جاتا۔ افسوس ہے کہ ہم اپنی یادگاروں کو کبھی غور سے نہیں دیکھتے جن لوگوں نے دہلی کی جامع مسجد کو بغور دیکھا ہے اور اس کے گیارہ دروں کے کتبات کو پڑھا ہے۔ ان کو معلوم ہے کہ ان کا کاتب یہی نور اللہ ابن احمدؒ تھا جس نے اپنے نام کو لطف اللہ احمدؒ کے اتباع میں "نور اللہ احمدؒ" لکھا ہے اس سے صاف واضح ہے کہ یہ شخص بر موقع تعمیر مسجد ہذا اپنے بزرگوں کے ہمراہ تھا اور کتبات لکھنے میں ماہر تھا ؞

امام الدین الرّیاضی

اس خاندان کے دیگر افراد بھی مہندس و شاعر تھے۔ تذکرہ "ہمیشہ بہار" مصنفہ کشن چند میں مولینا امام الدین کا ذکر ملتا ہے جس کے متعلق سپرنگر نے اپنی فہرست مخطوطات اودھ صہ ۱۲۲ میں لکھا ہے کہ اسے امام الرّیاضی کہا جاتا تھا اور یہ باشندہ لاہور تھا لیکن سکونت دہلی میں تھی۔ اس کا والد لطف اللہ مہندس بہت بڑا ریاضی دان تھا اور اس کی کتابیں مدارس میں رائج تھیں سنہ ۱۱۳۶ھ میں زندہ تھا۔ اس کے ایک شاگرد نے المجسطی کی شرح کی ہے۔ تذکرہ "صبح گلشن" میں ریاضی کا ذکر ذیل کے الفاظ میں مع چند اشعار کے ملتا ہے:-

"ریاضی۔ امام الدین فرزند مولانا لطف اللہ مہندس لاہوری کہ قلعہ ارک شاہجہان اباد بصوابدید رای زرینش بنیاد گرفتہ در ریاضی متوطن شاہجہان اباد گردید ازاں شہرت مدت العمر بیرون نرفتہ ماہر علوم درسیہ بودہ و در سبق علم ریاضی از معاصرین قصب السبق ربودہ در عبادت و ریاضت ورع در حد عدیل خود نداشت و در سنہ خمس واربعین و مأتہ والف قدم بطریق سیر ریاضی رضوان گذاشت ؎

رگ گل کرد آں گلچہرہ ہر تار نہالی را　　ازیں اندیشہ گلہا داغ شد بر سینۂ قالی را
رفتی و رفت لشکرِ دل در رکاب تو　　شہرم برنگ مجلس تصویر جان ہذا اشت
روشن دلیم و خاک نشینی غبار ماست　　سیماب وار گشتہ شدن اعتبار ماست
زعشق یار چگویم کہ حال من چون ست　　غمم بہ مدخطش از احاطہ بیرون است
ندانم از چہ شدی سنگدل کہ بیمارست　　بجاں رسید و نہ پرسی کہ حال او چون ست

مصنف "ہمیشہ بہار" کے الفاظ سے واضح ہوتا ہے کہ مولینا امام الدین اس کا ہمعصر تھا۔ اور یہ کہ اس کا انتقال سنہ ۱۱۴۵ھ میں ہوا ؞

میرزا خیر اللہ

خیر اللہ بن لطف اللہ نے جس کا پورا نام ابوالخیر المخاطب بہ

نوٹ۔ دیوان لطف اللہ کا خاتمہ: ۶ر شہر ذی الحجہ سنہ ۱۰۴۷ھ بوقت شب تحریر یافت۔ تاریخ خریداری۔ بتاریخ بستم رمضان المبارک سنہ ۱۱۵۷ھ دیوان مہندس خرید شد بسرکار نواب ابراہیم خان بہادر" کتاب میں آخری قطعہ تاریخی سنہ ۱۰۶۲ھ کا ہے۔

[1] کتب فہرست مسلم یونیورسٹی و مضمون سید صاحب۔

خیر اللہ خاں مہندس ہے۔ محمد شاہ اول کے زمانہ میں اپنا نام روشن کیا۔ یہ بہت بڑا ریاضی دان اور منجم تھا۔ اس کا ذکر تذکرہ "سفینہ خوش گو" مولفہ بندرابن خوشگو متوفی سنہ ۱۱۷۰ھ نسخہ بانکی پور میں امام الدین الریاضی کے حال میں ملتا ہے:۔

"و امروز ملا ابوالخیر معروف بخیر اللہ برادر اعیانی وی در ہیئت و ہندسہ و اکثر علوم یگانہ روزگار است چنانچہ راجہ دھیراج جے سنگھ سوائی زمیندار انبیر کہ درین ایام خیال رصد بستن در پیش داشتہ قریب بیست لک روپیہ در بست سال صرف این کار نمودہ باستصواب ابوالخیر مذکور است۔ و حق آنست کہ ذات او برزمانہ ثبت است ......"

بعض تذکرہ نویسوں نے اس کا نام میرزا خیر اللہ بھی لکھا ہے۔ اس سے صاف واضح ہے کہ جے سنگھ والی جے پور کا "جنتر منتر" اسی خیر اللہ کی اختراع کا نتیجہ ہے۔

محمد علی[1]

محمد علی ریاضی بن خیر اللہ مہندس جس نے اپنے باپ کی کتاب "تقریب التحریر" کو صاف کرکے اس پر دیباچہ لکھا چنانچہ سلسلہ خاندان احمد معمار ابھی دور تک پہنچتا ہے۔

---

[1] مضمون سید سلیمان صاحب۔

محمد عبد اللہ چغتائی

نگار خانہ چین

آئینے والی حسینہ

چاندنی میں وہ آئینے کے سامنے بے حرکت کھڑی ہے۔ عریاں ہے۔ مگر اس کے سر کے لمبے لمبے اور گھنے بالوں نے اس کے تمام جسم کو چھپا رکھا ہے۔

لو اس نے انگڑائی لی۔ اور ایک پھولوں سے لدے پھندے پیڑ کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ اور اس پیڑ سے پھول جھڑنے لگے .....

مجید ملک

آغاز

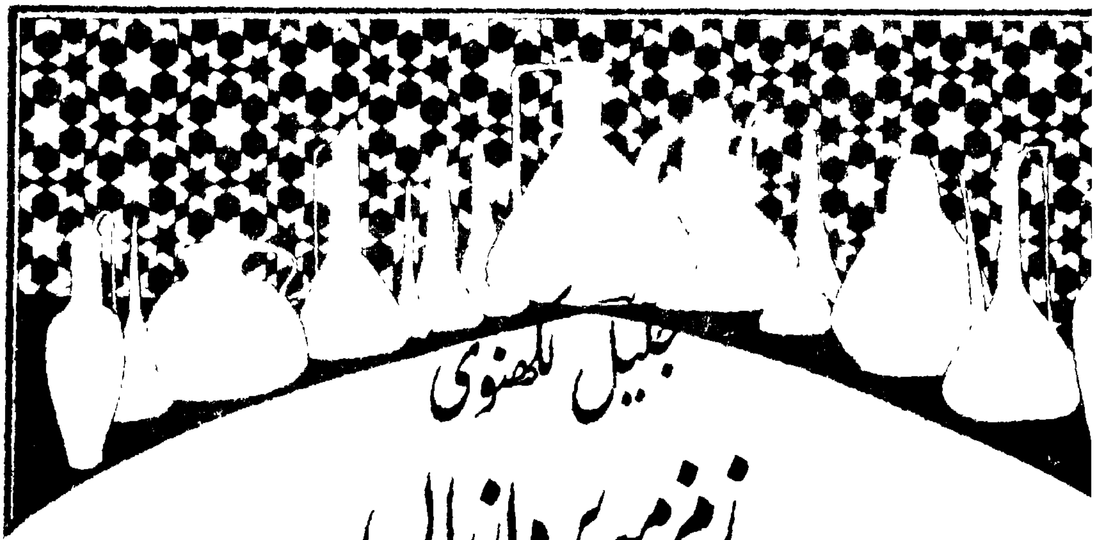
مجھے تجھ سے عشق نہیں نہیں   مگر اے حسینۂ نازنیں
تو ہو مجھ سے دور اگر کبھی
تجھے ڈھونڈتی ہو نظر کبھی
تو جگر میں اٹھتا ہے درد سا
مرا رنگ رہتا ہے زرد سا
مگر اے حسینۂ نازنیں   مجھے تجھ سے عشق نہیں نہیں

۲

مجھے تجھ سے عشق نہیں نہیں   مگر اے حسینۂ نازنیں
تو اگر ہو مجمع عام میں
کسی کھیل میں کسی کام میں
تو میں چھپ کے دور ہی دور سے
تجھے دیکھتا ہوں غرور سے
مگر اے حسینۂ نازنیں   مجھے تجھ سے عشق نہیں نہیں

۳

مجھے تجھ سے عشق نہیں نہیں   مگر اے حسینہ نازنیں
تو کہے یہ مجھ سے اگر کبھی
ہمیں لا دو لعل و گہر کبھی
تو میں دور دور کی سوچ لوں
میں فلک کے تارے بھی نوچ لوں
یہ ثبوت شوق کمال دوں
ترے پاؤں پر انہیں ڈال دوں
مگر اے حسینۂ نازنیں   مجھے تجھ سے عشق نہیں نہیں



زمزمہ پرداز یاں

اب بھی اک عمر پہ جینے کا نہ انداز آیا	زندگی چھوڑ دے پیچھا مرا میں باز آیا
مغبچے ہیں متحیر، متبسم ساقی	پینے والے تجھے پینے کا نہ انداز آیا
دل ہو یا روح و جگر کان کھڑے سب کے ہوئے	عشق آیا کہ کوئی مفسدہ پرداز آیا
دل جو گھبرائے قفس میں تو ذرا پر کھولوں	زور اتنا بھی نہ اے حسرتِ پرواز آیا
رند پھیلائے ہیں چلو تو تکلف کیسا	ساقیا ڈھال بھی دے جام خدا ساز آیا
نہ گیا پر نہ گیا شمع کا رونا کسی حال	گو کہ پروانۂ مرحوم سا دمساز آیا
اک خموشی میں گلو تم نے نکالے سب کام	غمزہ آیا نہ کرشمہ نہ تمہیں ناز آیا

بے امیر اب چمن نظم ہے ویران جلیل
اب تک ایسا نہ کوئی زمزمہ پرداز آیا

فصاحت یار جنگ جلیل لکھنوی

مجید ملک

پرانے دوست

سین ــــ ایک میونسپل پارک ۔ اس پارک میں بالم از کم پارک کے اس حصّے میں آمد و رفت بہت کم ہے ۔ ایک روش کے پاس ایک بنچ رکھا ہے ۔ لیکن پودوں اور درختوں میں اس طرح گھرا ہُوا ہے کہ نصف نظر آتا ہے اور نصف نظر نہیں آتا ۔

بنچ خالی ہے ۔ لیکن نہیں ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بنچ کے اس حصّہ نصف پر جو آنکھوں کے سامنے نہیں کوئی بیٹھا ہے ۔ ہاں ضرور بیٹھا ہے ۔ کیونکہ بیٹھنے والے نے جمائی لے کر اپنا دایاں بازو بنچ کی پشت پر پھیلا دیا ہے ۔ اور اب اس کا بازو ۔ فقط بازو ۔ سب کو نظر آ رہا ہے ۔

غالباً یہ آدمی ایک جگہ بیٹھا بیٹھا تھک گیا ہے ۔ ورنہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ۔ دو چار قدم چل کر ۔ جمائی لے کر بنچ کے اس حصّہ نصف پر کیوں آ بیٹھتا جو ہمیں نظر آ رہا ہے ۔

اب چونکہ وہ ہمارے سامنے آ بیٹھا ہے ۔ ہم اطمینان اور دلجمعی سے اس کے متعلق رائے قائم کر سکتے ہیں ۔ بے چارا ۔ فلک زدہ ۔" صورت بہیں ۔ حالش مپرس"۔ پھٹے ہوئے بھدّے سے بوٹ ۔ دیلٹھے کا پاجامہ جو آج سے چند روز پہلے ضرور سفید ہوگا ۔ ایک بہت بڑا اور خوب موٹا کوٹ ــــ کیا تعجب ہے رات کو لحاف کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہو ــــ اور سر پر ترکی ٹوپی جس پر کشش انابیب شعری سے کوئی ڈیڑھ ڈیڑھ انچ تک تیل اور میل ۔ سرایت کر چکا ہے ۔ کبھی کسی دفتر میں کلرک ہوگا ۔ لیکن اب غالباً بلکہ یقیناً برسر روزگار نہیں ۔ شاید اسی غم سے بے چارا راتوں کو سو نہیں سکتا کیونکہ اس وقت اس کی آنکھیں نیند سے بھاری ہیں اور اس پر غنودگی سی طاری ہے ۔

بنچ پر بیٹھا اونگھ رہا ہے ۔ اور شاید سو جاتا لیکن روش پر دو آدمی آ رہے ہیں ۔ دونو فیشنیبل ۔ مغربی لباس میں ۔ ایک کے سر پر ہیٹ ہے ۔ دوسرا سر سے ننگا ہے ۔ جو سر سے ننگا ہے ۔ اسکے گلے میں سرخ رنگ کی نکٹائی ہے ۔

سرخ نکٹائی والا بنچ کے پاس آ کر یکدم رک جاتا ہے ۔ ہیٹ والا آٹھ دس قدم آگے جا کر ٹھہر جاتا ہے ۔ یعنی اس انتظار میں ہے کہ اس کا ساتھی گفتگو کر چکے تو دونو اپنی راہ لیں ۔

سرخ نکٹائی والا اونگھنے والے کو غور سے دیکھتا ہے گویا پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے :۔

" اہا ! شاکر "

اونگھنے والا جسے شاکر کے نام سے مخاطب کیا گیا ہے ہوشیار ہو کے بیٹھ گیا ہے ۔ اس کے چہرے سے صاف ظاہر ہے کہ اس نے نووارد کو نہیں پہچانا ۔

" شاکر ! میرے دوست شاکر "!

لیکن مخاطب نے اب بھی نووارد کو نہیں پہچانا ۔ اس کے چہرے پر استعجاب واضح اور جلی طور پر منقوش ہے ۔

اور سرخ نکٹائی والے کے چہرے پر تیقن ہے :۔

"شاکر۔ تمہارا کیا حال ہے"؟

"معاف کیجئے آپ نے مجھے پہچانا نہیں"

"شاکر! کیا کہ رہے ہو"؟

"معاف کیجئے میں نے آپ کو پہچانا نہیں"

"شاکر۔ تم اپنے پرانے دوست کو اتنی جلدی بھول گئے"۔

"آپ بھول رہے ہیں"

"شاکر! شاکر!!"

"لیکن میرا نام شاکر نہیں"۔

"کیا کہ رہے ہو شاکر! تمہارا نام شاکر نہیں"

"نہ ہے۔ نہ تھا"

"شاکر۔ تم بن رہے ہو۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ تمہاری صورت بدل گئی ہے۔ لیکن شاکر۔۔۔۔"

"میرے کسی بھائی کا نام بھی شاکر نہیں ورنہ میں سمجھتا۔۔۔۔"

"شاکر۔ خدا کے لئے تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ — قدرے توقف کے بعد — اچھا اب میں سمجھا۔ شاکر۔ تم مجھے بیگانہ سمجھتے ہو۔ غیر سمجھتے ہو۔ تم اپنے ایک پرانے دوست سے جس نے تم کو — اس کے کپڑوں کی طرف دیکھ کر — تمہارے اچھے وقتوں میں دیکھا تھا۔ اپنی موجودہ پریشان حالی کی وجہ سے گھبرا رہے ہو۔ شاکر۔ غیرت عالی ظرفی کی دلیل ہے۔ لیکن اگر پرانے دوستوں کے مل بیٹھنے میں حائل ہو تو غیرت نہیں۔ غیریت ہے"۔

معلوم ہوتا ہے کہ خلوص کے اس اظہار سے اونگھنے والا بہت متاثر ہوا ہے۔ اس کے چہرے پر اب الجھن نہیں۔ الجھن کے بجائے ایک لحظے کے لئے مسکراہٹ آتی ہے۔ لیکن صرف ایک لحظے کے لئے :۔

"آپ سچ کہتے ہیں۔ اگر غیرت دو دوستوں کے مل بیٹھنے میں حائل ہو تو غیرت نہیں غیریت ہے"۔

"بے شک۔ قطعی اور لازمی طور پر"

"میں مانتا ہوں کہ میرا نام شاکر ہے"

"خدا کا شکر ہے تم نے اعتراف کیا"

"میں اپنی خستہ حالی کی وجہ سے انکار کر رہا تھا۔ آپ جانتے ہیں غربت اور افلاس کی وجہ سے انسان اپنی نظروں میں خود ذلیل ہو جاتا ہے"

"لیکن ان باتوں کو بھول جاؤ۔ خدا نے مجھے بہت کچھ دیا ہے۔ تمہاری مصیبتیں تو چند ہزار روپے میں ٹل سکتی ہیں"۔

"چند ہزار! یعنی آپ کے پاس۔۔۔۔"

"بے شک"

"لیکن میں بہت بدقسمت ہوں۔ میں نے ابھی تک آپ کو نہیں پہچانا"

"شاکر۔ مصائب نے تمہارے دماغ کو مکدر کر دیا ہے۔ اپنے حافظے پر زور ڈالو۔ اچھا۔ لو یہ سگریٹ پیو۔ اس سے حافظے کو مدد ملے گی — ہیٹ والے کی طرف اشارہ کر کے — ان سے ملو۔ یہ میرے چھوٹے بھائی رشید ہیں"

"رشید؟ میرا بھی ایک بھائی — لیکن بات ختم نہیں کرتا — بہر حال میرا حافظہ۔۔۔۔"

"شاکر۔ یاد کرو۔ تمہارا کوئی دوست۔۔ آج سے دس سال پہلے۔۔۔ رشید کا ہموزن نام —"

"ہموزن نام؟"

"ہموزن۔ اور کیا۔ اور یاد کرو ایک بہت بڑا مکان جس کی ایک جانب مینار بھی تھا — حافظے پر زور ڈالو — مذاقاً — سگریٹ کے دو ایک کش اور لو"۔

شاکر کے ماتھے پر بل ہیں۔ ابرو درمیان سے جڑ گئے ہیں۔ گویا گہری سوچ میں ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی آ رہی ہے۔ ماتھے کے بل مٹ رہے ہیں۔ بھویں کھل رہی ہیں۔ اب وہ مسکرا رہا ہے :-

"سعید!"

"خدا کا شکر ہے آخر تم نے مجھ کو پہچان لیا۔"

دوران گفتگو میں رشید اور شاکر یعنی ہیٹ والا اور راوسنگھنے والا بنچ پر بیٹھ گئے تھے۔ لیکن سعید یعنی سرخ نکٹائی والا بدستور کھڑا ہے۔

شاکر نے ابھی اپنا سگریٹ ختم نہیں کیا۔ لیکن وہ مضمحل سا ہو رہا ہے۔ سگریٹ پینے کے بعد اس نے تین چار جمائیاں بھی لی تھیں۔ اب اس پر غنودگی چھا رہی ہے۔ سگریٹ اس کے ہاتھ سے گر گیا ہے۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے بنچ کی پشت پر اپنا سر رکھ دیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ سو گیا ہے۔

سرخ نکٹائی والا مسکرا رہا ہے۔ اس کی مسکراہٹ میں استہزا ہے۔ وہ شاکر کو شانے سے پکڑ کر کھینچتا ہے۔ شاکر گہری نیند سو رہا ہے۔

سرخ نکٹائی والا کھلکھلا کے ہنستا ہے۔ اور اپنے ساتھی کو مخاطب کرتا ہے :-

"جا تو دو"

"یہ لو۔ اس سے کیا ہوگا"

"دیکھتے رہو"

وہ اپنے خوابیدہ اور بے ہوش "دوست" کے کوٹ میں سامنے کے بٹنوں کے پاس ایک سوراخ کرتا ہے۔ پھر جیب میں سے ایک ہیرا نکال کے اس سوراخ میں ڈال دیتا ہے اور اسے سرکاتا ہوا جیب کے نیچے استر تک پہنچا کر اظہارِ اطمینان کے لئے ایک لمبا سانس لیتا ہے :-

"اب مزے ہیں۔ اب میں دنیا کے غم و فکر سے آزاد ہوں۔"

"تم عجیب آدمی ہو۔ تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔"

"تمہاری سمجھ ہی کتنی ہے۔"

"اب یہ ہیرا اس آدمی کے پاس رہیگا"

"نہیں اس کوٹ کے پاس رہیگا۔"

"اور کوئی جگہ نہ تھی۔"

"تم بے وقوف آدمی ہو۔ شہر کے مشہور ترین جوہری کے ہاں سے ایک بیش قیمت ہیرا دن دہاڑے غائب ہو جاتا ہے۔ پولیس کس پر شبہ کریگی۔ اس شہر میں ہیروں کے مشہور ترین قدردانوں پر۔ یعنی —— اپنی طرف اور اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کرتا ہے —— آخر پولیس والے آپ سے ناواقف تو ہیں نہیں۔"

"پھر"

"پھر کیا۔ میں سمجھتا ہوں اور ایک آدھ گھنٹے کے اندر ہمارے مکان کی تلاشی ہوگی۔ اس وقت بھی ہمارے لئے ڈھنڈیا پڑ رہی ہوگی۔ ہم اس ہیرے کو کہاں چھپا سکتے تھے۔ آخر ہیرا ہے۔ کوئی موٹر کار تو نہیں کہ فوراً غائب کر دوں۔"

"گویا موٹر بہت آسانی سے غائب ہو سکتا ہے۔"

"بیشک۔ موٹر۔ ہاتھی۔ آدمی اور اسی قسم کی اور چیزیں تو چند منٹ میں غائب کی جا سکتی ہیں۔ لیکن ہیرا۔ ہیرے کی

اور بات ہے۔ بہر حال اب تم نے میدان مار لیا ہے۔ مجھے فکر تھی تو اتنی کہ کہیں اس بھلے آدمی سے باتیں کرتے کرتے تمہارا نیا دوست نہ آدھمکے۔"

"نیا دوست کون ؟"

"انسپکٹر سعید"

"میں نے تو کبھی اس کی صورت بھی نہیں دیکھی۔"

"نہ میں نے۔ لیکن اس ظرافت کی داد دو کہ میں نے تمہارا نام 'رشید' بتایا اور اپنا نام 'سعید' کہلوا لیا۔ تمہیں معلوم ہے انسپکٹر سعید کے بھائی کا نام رشید ہے"

"ہاں۔ لیکن اب سوال یہ ہے کہ اس کوٹ میں سے ہیرا نکالا کیسے جائیگا۔"

"نکالنے کی ضرورت نہیں"

"پھر کیا ہوگا ؟"

"جب پولیس سے ہمیں کوئی خدشہ نہ رہے تم کوٹ لے آنا۔"

"وہ کیسے"

"یہ تم جانو"

"اگر اس عرصہ میں یہ قلاش کوٹ بیچ دے۔"

"تمہارے پاس کیوں نہ بیچے ؟"

"اگر اس کے مکان کو آگ لگ جائے"

"اگر مکان کو آگ لگ جائے تو آدمی کی جان بچانا خدا کا کام ہے۔ لیکن کوٹ کو شعلوں سے تم بھی بچا سکتے ہو۔"

"اور اگر یہ مرجائے تو ۔ ۔ ۔ ۔"

"تو بھائی۔ تم مُلّا بن جانا۔ اور اسے غسل دینا۔ اترے کپڑے تمہیں مل جائینگے۔"

"اور اگر ــــ"

"کیا اگر مگر لگا رکھی ہے تم نے۔ بندۂ خدا ہر حالت میں اس کوٹ کے مالک کو۔ نہیں۔ اس کوٹ کو نگاہ میں رکھنا تمہارا کام ہے۔ دنیا میں اور کسی کو اس کوٹ کی ضرورت نہیں۔ صرف تمہیں ہے۔ تمہارے مقابلے پر کوئی حریف نہیں۔ پھر کیا مشکل ہے۔ اور یاد رکھو۔ تمہیں تو ــــ ناٹک کے انداز میں سینہ تان کر اور ہاتھ ہلا ہلا کر ــــ

پہاڑ ٹوٹ پڑے آسمان پھٹ جائے
شبِ سیاہ میں ڈائن کوئی لپٹ جائے
مقابلے میں کوئی فوج آکے ڈٹ جائے
تمہارے جسم کا ایک ایک عضو کٹ جائے
مگر کوٹ ہاتھ سے جانے نہ پائے"

"تم سنجیدگی سے کبھی بات نہیں کرتے۔ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ جب یہ آدمی سو کے اٹھیگا تو کیا سمجھے گا۔"

"سیدھی سی بات ہے۔ ایک آدمی نیم غنودگی کی حالت میں ایک بنچ پر بیٹھا ہے۔ دو آدمی آتے ہیں۔ اس سے کہتے ہیں تو ہمارا پرانا دوست ہے۔ ہزاروں روپے دینے کا وعدہ کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ پھر سو جاتا ہے۔ بہت ہی گہری نیند سو جاتا ہے۔ جب نیند کھلتی ہے۔ تو نہ کوئی پرانا دوست ہے نہ نیا۔ وہی باغ کا کونہ ہے۔ وہی بنچ۔ اب تم ہی بتاؤ جاگے گا تو کس نتیجہ پر پہنچیگا۔ ؟"

"سمجھے گا سب کچھ خواب تھا۔"

"یقیناً۔ اُسے تعجّب ضرور ہوگا۔ دل میں شبہات ضرور پیدا ہونگے لیکن آخری فیصلہ یہی ہوگا کہ سب کچھ خواب تھا۔"

"تم بہت دانا آدمی ہو۔"

"اور کیا تمہاری طرح۔ اچھا اب یہاں سے چلو۔ میں گھر جاتا ہوں۔ تم کچھ فاصلے سے اس پر نگاہ رکھو اور بس ایک مرتبہ اس کا مکان دیکھ لو۔ کوئی آدھ گھنٹے میں اسے ہوش آجائیگا۔"

دونو آہستہ آہستہ چلتے ہیں۔ لیکن چند قدم ہی جاتے ہیں کہ

وہ شخص جو ابھی بنچ پر بیہوش پڑا تھا۔ ہوش میں آجاتا ہے۔ آنکھیں کھول دیتا ہے۔ تیزی سے سر اٹھاتا ہے۔ اس پر غنودگی کے کوئی آثار نہیں۔ غنودگی کے بجائے غیر معمولی قسم کی چستی ہے۔ بلکہ جہاں پہلے وہ فلک زدہ۔ مریض دائم معلوم ہوتا تھا۔ اب وہ ایک تیز۔ طرار۔ جوانمرد قسم کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ معاً آواز آتی ہے :—

"میرے دوستو ٹھہرو۔ تم مجھے چھوڑ کے جانا چاہتے ہو لیکن میں برسوں کے پرانے دوستوں کو نہیں چھوڑونگا"

دونو کا رنگ فق ہوجاتا ہے .... آخر ہیٹ والا سکوت توڑتا ہے۔

"تم کون ہو"

"تم مجھے پہچانتے نہیں۔ اپنے حافظے پر زور ڈالو۔ میں تمہارا پرانا دوست ہوں"

ہیٹ والا بے انتہا خوف زدہ ہے۔ لیکن سرخ نکٹائی والے کی گھبراہٹ اب کم ہو رہی ہے۔

اور اونگھنے والا ہنس رہا ہے :—

"آپ نے ابھی تک مجھے نہیں پہچانا۔ میرے دوستو معلوم ہوتا ہے کہ آپ لوگ انقلاباتِ زمانہ کی وجہ سے ایک پرانے دوست کو پہچاننے سے گریز کرتے ہیں"

ہیٹ والے کی حالت قابلِ رحم ہے :-

"لیکن تم ہو کون ؟"

"میں شاکر۔ سعید اور رشید کا پرانا دوست۔ میرے دوستو۔ جھوٹی غیرت دوستوں میں غیریت پیدا کرتی ہے۔ میں کیسے مان لوں کہ آپ لوگوں نے ابھی تک مجھے نہیں پہچانا۔ اچھا یہ سگریٹ لیجئے —— یہ وہی سگریٹ ہے جو سرخ نکٹائی والے نے اونگھنے والے کو دیا تھا —— سعید۔ لو یہ سگریٹ پیو اور اپنے حافظے پر خوب زور ڈالو۔ یاد کرو آج سے دس سال پہلے۔ ایک بہت بڑا مکان۔ اور ایک مینار۔ اب بھی چند سال کے لئے۔ غالباً دس سال کے لئے۔ آپ ایک بہت بڑے مکان میں رہینگے۔ مینار بھی ہوگا"

"لیکن تم ہو کون"

سرخ نکٹائی والے کی آواز میں غصہ ہے :—

"احمق یہ انسپکٹر سعید ہے"

"خدا کا شکر ہے آخر آپ نے مجھے پہچان لیا۔ میرے دوستو میرے پاس ہزاروں روپے تو نہیں لیکن میری طرف سے یہ تحفہ قبول کیجئے۔

جیب میں سے ہتھکڑیاں نکالتا ہے ——

مجید ملک

نواب سجاد علی خاں (نواب آف کرنال)

"اے۔ اے۔ اے"

شمالی ہندوستان میں ایک پروفیسر ہیں۔ ان کا نام؟ "اے۔ اے۔ اے" سمجھ لیجئے۔ سمجھ لیجئے نہیں۔ یہی ہے۔ شوخ۔ چنچل خوش وضع۔ اور ــــ مضمون نگار۔ شاید یہ تعارف کافی نہیں۔ نہ سہی۔ دیکھنا یہی ہے کہ "اے۔ اے۔ اے" کو کون کون پہچانتا ہے۔

"اے۔ ون"۔ انگریزی زبان کا محاورہ ہے۔ جس چیز کی انتہائی تعریف مقصود ہوتی ہے۔ اس کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ مگر ہمارے پروفیسر صاحب اے تھری ہیں۔ بظاہر دھوکہ ہوتا ہے کہ یہ اے کا طویل سلسلہ کہیں مشہور مسٹر اے سے تو نہیں جا ملتا۔ مگر نہیں۔ ہم یقین کے ساتھ کہ سکتے ہیں۔ کہ اس سے اس کا کوئی مادی تعلق نہیں۔ اگر دور کی کچھ روحانی نسبت ہو تو خبر نہیں۔ خدا بھلا کرے اس آواگون کا۔ آپ ملک سندھ کے مایہ ناز فرزند ہیں۔ اور دورِ حاضرہ کی دو اعلیٰ یونیورسٹیوں کے ڈبل گریجوایٹ یعنی بمبئی اور لندن کے۔ خشک جھلسے ہوئے ریگستان کو کسی شاداب اور سرد وادئ کوہ سے کیا واسطہ۔ علم و جہالت میں اسی قدر فرق ہے۔ جتنا روشنی اور تاریکی میں۔

علوم جدید کی آغوش میں پرورش یافتہ۔ اور یورپ کی آزاد فضا میں نشو و نما پائے ہوئے خیالات کسی دقیانوسی نظام تمدن کے کب متحمل ہو سکتے ہیں۔ شان و شوکت کی نمائش قابل نفرت۔ جواہرات کی تابش۔ اطلس و کمخواب کی چمک دمک لائق نفرین۔ بجا و درست۔ ہاں اگر صنف نازک کے حسن کو دوبالا کرنے۔ ناز و ادا کو کافر ماجرا بنانے میں معاون ہو سکتے ہیں۔ تو سبحان اللہ کیا کہنا۔ ہندوستانی اسباب زینت مردوں کے لئے مذموم اور بہت ہی مذموم۔ ان سے نسوانیت جھلکتی ہے۔ زنانہ پن ٹپکتا ہے مگر صنف لطیف کے لئے مردانہ آرائش اور حیا نمائی عریانی واجب و درست۔ پسندیدہ اور لائق تعریف۔ کیوں اور کس لئے۔ حسن کا فرمان ہے۔ تہذیب جدید کا فتویٰ۔ جائے احترام ہے۔ مجبوری ہے۔ تہذیب کیا۔ معیار تہذیب کیا۔ جبر و استبداد کی خوشامد اور قوت و طاقت کی پرستش۔ ایک غلامانہ ذہنیت اور ایک طفلانہ تقلید۔

چیتے کی سی پتلی کمر۔ نازک نازک ہاتھ پاؤں۔ بوٹا سا قد۔ عورت کے لئے زیور حسن اور عطیۂ قدرت مگر مرد کے لئے معیوب اور فطرت کی ستم ظریفی۔ خوش قسمتی کہئے یا بدقسمتی یہ سب خوبیاں ہمارے پروفیسر صاحب میں موجود ہیں۔ اور ستم یہ ہے۔ کہ ان کا انہیں احساس بھی ہے۔ کافی احساس ہے۔ بلکہ نہایت ہی کافی۔ بونڈ سٹریٹ کے خوش وضع اور شوخ رنگ سوٹ۔ جاذب نظر ریشمی نکٹائی اور رومال۔ خوبصورت جراب اور شوز کا شوق ہے۔ چہرے کو ریش و بروت سے پاک و صاف رکھنا ضروریات زندگی میں داخل ہے۔ اعضا کے نازک تناسب کو زیادہ دل آویز بنانے کی خواہش ان کی خوبصورتی کو انتہائی حد تک نمایاں کرنے کی تمنا۔ کیا جذبہ نسوانیت

کی کرشمہ سازی نہیں ؟ کراچی کے ماہرِ فنِ خیاط آپ کی نازک اندامی اور دلفریب اعضا کی جس قدر چاہیں تعریف کریں۔ اور آپ حلقۂ احباب میں اپنی تعریف پر جتنا چاہیں فخر و ناز کریں۔ ہم تو ان خوبیوں کو صنفِ نازک اور صرف صنفِ نازک ہی کے لئے موزوں اور مناسب سمجھتے ہیں۔

سر کے بالوں کی ژولیدگی اور رجعتِ قہقری۔ جو شمالی ہند کی ایک مشہور دشمنِ عقل و خرد قوم کا طرۂ امتیاز ہے۔ اور تنگی پیشانی۔ دماغی لہروں کے تناسب اور خیالات کے توازن کے متعلق شکوک پیدا کرتی ہے۔ شکوک غلط بھی ہوتے ہیں اور صحیح بھی۔ آپ علم ادب کے پروفیسر ہیں۔ کیوں ہیں۔ اور کس لئے۔ اس کا غالباً خود ان کے پاس بھی جواب نہیں۔ کالج باقاعدہ جاتے ہیں۔ لیکچر دیتے ہیں سب کچھ کرتے ہیں۔ دل نہیں چاہتا ہے مگر کرتے ہیں۔ کرنا پڑتا ہے۔ غالباً اسی کا نام مقدر ہے۔

پلنگ کے ساتھ آپ کو خاص محبت ہے۔ ایسی محبت جیسی شیر خوار بچے کو ماں کی گود سے۔ یا اتا کے گہوارے سے۔ کاہلی پر محمول کرنا تو ظلم ہوگا۔ کیونکہ آپ کبھی کبھی ٹینس بھی کھیلتے ہیں۔ خاص خاص ڈنر پارٹیوں میں بھی شرکت فرماتے ہیں۔ گاہ گاہ کی شب بیداری تک کو جائز سمجھتے ہیں۔ اگر اس کا نتیجہ بزمِ نغمہ و سرود کی پرلطف شرکت ہو۔ کیونکہ علم موسیقی سے لگاؤ ہے اور کافی لگاؤ ہے۔ دعویٰ نہیں ہے۔ دعویٰ ہو بھی نہیں سکتا۔ مگر پھر بھی دعویٰ ہے۔ اس لئے کہ دعویٰ ہے۔ زبان سے نہ سہی دل سے تو ہے۔

سیر و سیاحت کا بھی شوق ہے۔ ایک دوست کو ممنون فرمانے کے لئے جنوبی ہند اور جزیرہ سنگلدیپ کا سفر بھی اختیار کر چکے ہیں۔ آثارِ صنادید کے ملاحظے نے تاریخ ہند اور بالخصوص سلطنت مغلیہ کے حالات کے مطالعہ کا ولولہ پیدا کر دیا ہے۔ جس کی بدولت منوچی جیسے گمنام اور ناقابل اعتبار مؤرخ کو لائبریری کی تاریکیوں سے نکل کر کچھ روز کے لئے دنیا کی روشن فضا میں ہوا کھانے کا موقع نصیب ہو گیا۔ اور کیڑے مکوڑوں کے زندان و شکم سے جس کا وہ صحیح معنوں میں مستحق ہے۔ چندے نجات مل گئی۔ مگر پلنگ پھر بھی پلنگ ہے۔ اور پلنگ نوازی آپ کی طبیعت ثانیہ۔ گھر پر زیادہ تر وقت اسی کی صحبت میں بسر ہوتا ہے۔ اور ملاقات کا کمرہ۔ جو مختصر مگر مذاق سلیم کا نمونہ ہے۔ دوستوں کی طرح آپ کی بے اعتنائی کا شاکی۔ اس کا سبب وجہ۔ جو کچھ بھی ہے۔ ایک معمہ ہے۔ ایک کیفیت۔

پروفیسر صاحب ایک بامذاق اور خوش طبع رفیق صحبت ہیں۔ بشرطیکہ دماغ حاضر ہو۔ طبیعت کو سکون ہو۔ اور دل کو قرار ہو۔ مگر یہ کیفیت اپنے بس کی بات نہیں۔ امکان کم اور عدم امکان زیادہ۔ نہ وابستہ بہار نہ پابندِ خزاں معمولی سے معمولی واقعہ درہم برہم کر دینے کے لئے کافی ہے۔ برسات میں قدرے اضافہ یا گرمی کی تھوڑی سی زیادتی ایسے غیر معمولی ناگوار اثرات پیدا کر دیتے ہیں۔ کہ عقل بیچاری انگشت بدنداں رہ جاتی ہے۔ بہرحال جس وقت اور جب کبھی عناصر میں اعتدال ہوتا ہے۔ عارضی یا قدرے پائدار۔ مستقل طور پر تو غیر ممکن ہے۔ تو بذلہ سنجی اور سلیس ضلع جگت کی طرف طبیعت مائل ہوتی ہے۔ سخن شناسی اور نکتہ سنجی کی اہلیت ہے۔ دوسروں کو خوب داد دینا جانتے ہیں اور خود خراج تحسین حاصل کرنے کی تمنا رکھتے ہیں۔ اسکیچ لکھنا لمحاتِ فرصت کا محبوب مشغلہ ہے۔ بعض اوقات یہ شوق جنون کی حد سے تجاوز کر جاتا ہے۔ جس کی تصدیق پلنگ کی آہ و زاری اور ٹائپ رائٹر کی فریاد سے بخوبی ہو سکتی ہے۔

آپ انگریزی زبان میں لکھتے ہیں۔ اچھا لکھتے ہیں اور بہت اچھا لکھتے ہیں۔ اعلیٰ زبان۔ ندرت بیان۔ دلکش محاورات۔ پرمذاق طرزِ تحریر۔ ان سب خوبیوں کا اجتماع معمولی بات نہیں۔ یہ سب پروفیسر صاحب کے ہر مضمون میں کم و بیش پائی جاتی ہیں اور بعض میں تو بدرجہ کمال موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ معمولی سے معمولی مضمون میں بھی ایک عجیب دلکشی اور روزمرہ کے سادہ واقعات میں جدت اور

خاص قسم کی جاذبیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یقیناً یہ اسکیچ ہندوستانی ادب میں ایک دلچسپ اور قابل قدر نئے باب کا اضافہ کرتے ہیں مضمون جب تیار ہو جاتا ہے۔ تو پھر خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ کسی بچہ کو نیا کھلونا پا کر اتنی مسرت نہ ہوتی ہوگی۔ بحر حیات میں تلاطم سا برپا ہو جاتا ہے۔ اور سکون اضطراب میں منتقل ہو کر بھولے ہوئے احباب کی یاد تازہ بلکہ ناقابل برداشت ہو جاتی ہے۔ سچ ہے۔ دل بھر کے داد اور مل بھی سکتی ہے کہاں۔ بس پھر تو کسی بے تکلف دوست کا کمرہ اور بیئر کی بوتل۔ خود پڑھنا اور دوسروں سے پڑھوانا ہر عمدہ فقرہ پر داد طلب تقاضوں کی بوچھاڑ۔ قابلیت کا رنگ اور علمیت کا ترانہ۔ اسکیچ کیا ہے۔ ایک آئینہ ہے۔ جس میں برائی اور بھلائی پہلو بہ پہلو واضح اور صحیح طور پر نمایاں نظر آتی ہے۔ ایک طرف صاحب مضمون کی صفات کی مدح سرائی دوسری طرف اس کی کمزوریوں کو طشت از بام کرنا۔ مگر دونوں ایک لطیف اور دلچسپ مذاق کے پیرایہ میں۔ دل آزاری کی نیت سے نہیں۔ یا اہانت کے خیال سے نہیں۔ ہرگز نہیں۔ اور قطعاً نہیں۔ مقصد اصلاح کرنا ہوتا ہے نہ کہ رسوا کرنا۔ آئینہ اور شانہ والا قطعہ اس قول کا ثبوت ہے۔

پروفیسر صاحب کو دوسروں کے احساسات کی قدر ہے۔ حفظ مراتب کا لحاظ ہے۔ انس و محبت کے جذبات بھی معقول تعداد میں رکھتے ہیں جو صرف وقت کے منتظر اور تحریک کے محتاج ہیں۔ آپ کے دوست بھی ہیں۔ اور اچھے دوست ہیں۔ مگر کم اور بہت کم۔ سب اعلیٰ تعلیم یافتہ۔ لائق و فائق۔ سب تو نہیں مگر بعض کی نسبت یہ گمان ہے۔ گمان نہیں بلکہ یقین ہے۔ ہونا نہ چاہئے مگر ہے۔ کہ آپ کے بعد بھی ان کے دل آپ کی یاد سے کبھی خالی نہ ہونگے۔ اور زبان قصیدہ خوانی سے سیر نہ ہوگی۔ اس کی دلیل یہی کہ بے دلیل ہے۔ اچھا وقت آنے دو۔ زمانہ خود بتا دیگا۔

غرض فلسفیانہ طبیعت عالمانہ ذہنیت۔ طفلانہ مزاج اور نسوانی خود پسندی۔ ایک معجون مرکب ہے۔ ایک مجموعہ اضداد ہے جس کا نام پروفیسر "اے۔ اے۔ اے" ہے۔

رکن الدولہ شمشیر جنگ نواب سجاد علی خاں

جی ڈھہا جائے ہے سحر سے آج — رات گزریگی کس خرابی سے

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے — اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

برقع اٹھتے ہی چاند سا نکلا — داغ ہوں اسکی بیحجابی سے

میر تقی میر

نغماتِ حفیظ

ابو الاثر حفیظ جالندھری

(۱)

جھوٹا سب سنسار
پیارے
جھوٹا سب سنسار
موہ کا دریا لوبھ کی نیا کامی کھیون ہار
موج کے بل پر چل نکلے تھے آن پھنسے منجدھار
پیارے
جھوٹا سب سنسار

جھوٹا سب سنسار
پیارے
جھوٹا سب سنسار
تن کے اجلے من کے میلے دھن کی دُھن اسوار
اوپر اوپر راہ بتائیں اندر سے بٹ مار
جھوٹا سب سنسار
پیارے
جھوٹا سب سنسار

سرِ حشر کام آئی نہ مری سخن طرازی
کہ میں نامۂ عمل پر نہ شہید تھا نہ غازی

سرِ سر بلند میرا ہے نیاز مند تیرا
مرے ناز کو بھی دیکھے تری شان بے نیازی

فقط ایک بات کہ کر کوئی بات ہے کہ چپ ہوں
مجھے بے زباں سمجھ کر نہ کرو زباں درازی

نہ متاعِ نور حاصل نہ میں حور ہی سے واصل
نہ میں خود فریب واعظ نہ میں سادہ دل نمازی

میری زندگی ریا ہے۔ مگر اس کا غم ہی کیا ہے
کہ ابھی بچھا ہُوا ہے مرا دامِ پاکبازی

(۳)

جرم کو جوشِ ندامت میں سمونا چاہا
داغِ مے کوثر و تسنیم سے دھونا چاہا

عشق نے حسن کے افعال پہ رونا چاہا
تخمِ احساس مگر سنگ میں بونا چاہا

ہائے کس درد سے کی ضبط کی تلقین مجھے
ہنس پڑے دوست جو میں نے کبھی رونا چاہا

آنے والے کسی طوفان کا رونا رو کر
ناخدا نے مجھے ساحل پہ ڈبونا چاہا

سنگدل کیوں نہ کہیں بتکدے والے مجھ کو
میں نے پتھر کا پرستار نہ ہونا چاہا

دیدۂ تر سے بھی سرزد ہوا اک جرمِ عظیم
حشر میں نامۂ اعمال کو دھونا چاہا

حضرتِ شیخ نہ سمجھے مرے دل کی قیمت
لے کے تسبیح کے رشتے میں پرونا چاہا

پھر دمِ نزع توقع ہوئی دلداری کی
رکھ کے سر زانوئے دلدار پہ سونا چاہا

کوئی مذکور نہ تھا غیر کا لیکن تم نے
باتوں باتوں میں یہ نشتر بھی چبھونا چاہا

جنسِ شہرت بہت ارزاں تھی مگر میں نے حفیظ
دولتِ وقت کو بیکار نہ کھونا چاہا



(۴)

بتوں کو کبھی آپ سچا نہ جانیں — نہ ان کے دہن ہیں نہ ان کی زبانیں

زمانے میں چرچے ہیں دیر و حرم کے — بڑی رونقوں پر ہیں دونوں دکانیں

بتوں کی نگاہیں مجھے ڈھونڈتی ہیں — فضاؤں میں جب گونجتی ہیں اذانیں

ہمیں پیار ہے ان سے ہم جانتے ہیں — وہ سمجھیں نہ سمجھیں وہ جانیں نہ جانیں

جوانی گئی پھر بھی ہم اور ناصح

جہاں مل گئے چھڑ گئیں داستانیں

(۵)

مجھے شاد رکھنا کہ ناشاد رکھنا
مرے دیدہ و دل کو آباد رکھنا

ملیں گے تمہیں راہ میں بتکدے بھی
ذرا اپنے اللہ کو یاد رکھنا

بھلائی نہیں جا سکیں گی یہ راتیں
تمہیں یاد آئیں گے ہم یاد رکھنا

تمہیں بھی قسم ہے کہ جو سر جھکا دے
اسی کو نہ تیغِ بیداد رکھنا

الٰہی وہ برباد کرتا ہے مجھ کو
الٰہی اُسے شاد و آباد رکھنا

(۶)

ہم ہی میں تھی نہ کوئی بات۔ یاد نہ تم کو آسکے
تم نے ہمیں بھلا دیا۔ ہم نہ تمہیں بھلا سکے

تم ہی نہ سُن سکے اگر۔ قصّۂ غم سنیگا کون
کس کی زباں کھلیگی پھر۔ ہم نہ اگر سنا سکے

ہوش میں آچکے تھے ہم جوش میں آچکے تھے ہم
بزم کا رنگ دیکھ کر سر نہ مگر اٹھا سکے

رونق بزم بن گئے لب پہ حکایتیں رہیں
دل میں شکایتیں رہیں لب نہ مگر ہلا سکے

عجز سے اَور بڑھ گئی۔ برہمی مزاجِ دوست
اب وہ کرے علاجِ دوست جسکی سمجھ میں آسکے

ابوالاثر حفیظ





ا عبدالحمید

کامیاب ناکام

رچرڈ نارمن اپنی سنگار میز کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ ابھی ابھی نہا کر نکلا تھا۔ اور ڈریسنگ گون پہنے ہوئے تھا۔ اس کے ایک ہاتھ سگرٹ تھا۔ جس کو وہ آہستہ آہستہ سگرٹ کیس پر مار رہا تھا کہ کش لگاتے وقت تمباکو کے ٹکڑے منہ میں نہ آنے پائیں +
دروازہ کھلا اور اس کا خدمتگار چاندی کی طشتری میں ایک ملاقاتی کارڈ رکھے ہوئے داخل ہوا۔ کارڈ پر لکھا ہوا تھا
ہنا ٹالمیج "۔

نارمن میز کے آئینہ میں اپنا عکس دیکھ رہا تھا۔ اس کو ایک تیس پینتیس برس کے خوشرو نوجوان کا چہرہ نظر آ رہا تھا جس کے رے بال ماتھے پر بکھرے ہوئے تھے اور جس کی آنکھوں کے گرد ہلکے ہلکے سیاہ دائرے نظر آتے تھے۔ گو اس کے ہونٹوں پر ایک ہٹ سا تبسم تھا لیکن گالوں اور آنکھوں کے گرد چند ایک شکنیں نمودار ہو چکی تھیں جن سے اس کا چہرہ یاس انگیز اور پر حسرت لیا تھا +

نارمن آج خوش تھا۔ رات اس کے کھیل کو امید سے بڑھ کر کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ ہر ڈرامہ نویس کھیل کی پہلی رات کا انتظار بہت صبری اور امید و بیم کی حالت میں کرتا ہے۔ لیکن نارمن کے کانوں میں اب تک لوگوں کی تالیوں کی آواز اور دوستوں کی مبارکبادیں نج رہی تھیں۔ اب تک اس کا دل اس خوشی کی یاد سے دھڑکنے لگتا تھا جو اس کو کھیل کے اختتام پر تقریر کرنے سے ہوتی تھی۔ ں پر مستزاد یہ کہ صبح کے تمام اخباروں نے کھیل کا ذکر شاندار الفاظ میں کیا تھا۔ کئی نامی گرامی مصنفین سے اس کا مقابلہ کیا گیا ۔ بعض کشادہ دل نقادوں نے تو اس کے کھیل کے متعلق یہاں تک لکھ دیا تھا کہ وہ ڈرامہ کی تاریخ میں یادگار رہیگا +
جو ناول اس نے ایک ماہ پہلے شائع کیا تھا وہ اب تک دھڑا دھڑ بک رہا تھا۔ وہ اپنی زندگی سے پورا مطمئن ہوتا اگر ایک چیز...
خدمتگار نے کسی قدر توقف کے بعد کہا۔ "حضور ایک خاتون باہر کھڑی ہیں"۔

نارمن نے سگرٹ انگلیوں میں دبا کر بے پرواہی سے کارڈ اٹھایا۔ ہلینا ٹالمیج! نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اس نے آنکھیں ڑ کر کارڈ کو دیکھا۔ شک وشبہ کی گنجائش نہ تھی۔ اس پر صرف یہ دو لفظ تھے ہلینا ٹالمیج! اس کا سانس تیزی سے آنے لگا۔ ، ایک دم گھٹنے والا تھا۔ ہاں ہاں اس خاتون کو لے آؤ۔ جلد جاؤ۔ لیکن اچانک رک گیا +
دس سال پہلے کے واقعات بجلی کی تیزی سے یاد آ گئے اور اس کی آنکھوں کے سامنے وہی مناظر پھرنے لگے +
دس سال پہلے وہ ایک رقص گاہ میں گیا تھا۔ اس وقت وہ ایک معمولی اور غیر معروف طالبعلم تھا۔ وہ رقص گاہوں میں جانے

کا عادی نہ تھا ۔ اس کو ایسے مشاغل کے لئے وقت کم ملتا تھا ۔ لیکن اس رات موسم غیر معمولی طور پر خوشگوار تھا ۔ چنانچہ اس کے دل میں اس بات کی امنگ پیدا ہوئی کہ وہ رقص گاہ میں جائے ۔

پہلے ہی ناچ کے دوران میں ایک لڑکی ناچتی ہوئی اس کے قریب سے گزری ۔ نارمن کی نظر اس پر جم کر رہ گئی ۔ کوئی بیس برس کی عمر ۔ سیاہ بال ۔ نکلتا ہوا قد ۔ ہلکا پھلکا جسم ۔ گویا ناچ ہی کے لئے بنا ہے ۔ بہت بے تکلفی سے ناچتی جا رہی تھی ۔ ایک دلگداز مسکراہٹ سے جس میں کسی قدر بے پرواہی ملی ہوئی تھی اپنے شریک رقص اور دوسرے ناچنے والوں کو دیکھتی جاتی تھی ۔ باقی وقت نارمن اپنی آنکھیں اس کی طرف سے نہ ہٹا سکا ۔ اسے محسوس ہوا کہ کئی اور نوجوان بھی اس کو متواتر تک رہے ہیں ۔ وہ اتنا محو تھا کہ کسی غلطی پر اسے اپنے ساتھی سے معافی بھی مانگنی پڑی ۔ ناچ ختم ہونے پر اس نے اپنے ایک دوست سے لڑکی کا نام پوچھا ۔

اسے معلوم ہوا کہ لڑکی کا نام ہلینا ٹالبیج ہے ۔ اس کا باپ پروفیسر ٹالبیج جس کو مرے ہوئے دو تین سال ہو گئے ہیں ایک معمولی آدمی تھا ۔ اب ہلینا بالکل آزاد ہے ۔ کیونکہ اس کی والدہ بچپن ہی میں مر چکی ہے ۔ ادبی شوق کے علاوہ اسے موسیقی میں بھی کچھ دسترس ہے ۔ "اور سب سے بڑی بات یہ ہے" اس کے دوست نے ہلینا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ۔ "کہ وہ خوبصورت ہے ۔ بہت ہی خوبصورت ۔ لیکن ان بچوں کی طرح جو بن ماں کے پلتے ہیں لاڈلی اور مزاج کی تیز ہے" ۔ پھر اس نے نارمن کے چہرے پر ایک نظر ڈال کر ہنستے ہوئے کہا ۔ "تم کوشش کرو تمہارے ایسے حسین نوجوانوں پر تو ایسی لڑکیاں پھڑک جاتی ہیں" اس نے اپنے دوست پر ایک حقارت آمیز نظر ڈالی ۔

نارمن نے بہت کوشش کر کے اس سے تعارف حاصل کیا اور اس کے ساتھ ناچنے کی درخواست کی ۔ ہلینا نے بے پرواہی سے تکتے ہوئے اپنی خفیف سی مسکراہٹ سے اس کی درخواست منظور کر لی ۔ نارمن کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا ۔ تھا کہ ہلینا دل ہی دل میں اس کی اس گھبراہٹ پر ہنسیگی ۔ ناچ میں ہلینا کے مس سے نارمن کے جسم میں بجلی سی دوڑ گئی ۔ معلوم ہو رہا تھا کہ وہ ہوا میں اڑا جا رہا ہے ۔ آج تک اس کو کسی عورت نے اتنا مسحور اور از خود رفتہ نہ بنایا تھا ۔ ناچ کا وقت ایک خواب کی سی کیفیت میں گذر گیا ۔

نارمن گھر کی طرف روانہ ہوا تو راستہ بھر وہی خیالات اس کے ذہن میں گھومتے رہے ۔ بستر پر لیٹا تو بھی وہی منظر اس کے سامنے تھا ۔ اور اس کا جسم انہیں محسوسات سے لطف اندوز ہو رہا تھا ۔ ابھی تک ہلینا کے آتشیں اور رسیلے ہونٹ سے کچھ کھلے ہوئے تھے ۔ اور ان میں سے اس کے سفید دانت چمک رہے تھے ۔ ابھی تک اس کی نیم وا آنکھیں اس کو دوسرے والوں کو بے پرواہی سے دیکھ رہی تھیں ۔ وہ بار بار سر کو ایسے جھٹکتی تھی جیسے ماتھے پر سے بال ہٹا رہی ہو ۔ ابھی تک اس کا سانس نارمن کے منہ اور گردن پر محسوس ہو رہا تھا ۔ اس کے جسم میں بار بار بجلی سی دوڑ جاتی تھی اور دل کی حرکت تیز ہو جاتی ۔ اب بازو ایک لطیف اور سڈول جسم کو تھامے ہوئے تھے ۔ رات بھر اسے اچھی طرح نیند نہ آئی ۔ پریشان خوابوں میں کٹ گئی ۔

دن بھر نارمن کوئی کام نہ کر سکا ۔ شام کو وہ پھر رقص گاہ میں گیا ۔ لیکن ہلینا وہاں موجود نہ تھی ۔ بہت کوشش کے بعد دن ہلینا سے ملا ۔ لیکن اپنی فطری شرم اور عصبیت سے وہ کوئی بات نہ کر سکا ۔ اب رات دن نارمن کو یہی دھن رہتی تھی ۔ اس نے بڑی ہمت کر کے ہلینا سے اپنے عشق کا اظہار کیا تو اس نے مسکرا کر نیم وا آنکھوں سے اس کی طرف بے پرواہی

اور اس کی باتوں کو مذاق میں اڑا دیا۔ ان دنوں ایک بانکے چھبیلے ایکٹر سے ہلینا کا دوستانہ تھا جس کا پیشہ ایکٹنگ کے علاوہ عشق بازی بھی تھا ÷

اس معمولی سی مایوسی نے نارمن کو بہت متاثر کیا تھا۔ اس کی طبیعت میں قنوطیت پہلے سے موجود تھی اب وہ گہرا رنگ اختیار کر رہی تھی۔ اس کا چہرہ مغموم اور ملول نظر آتا تھا۔ چھ ماہ اسی پریشانی میں گذر گئے۔ آخر ایک روز ہلینا نے چند ایک دوستوں کے سامنے نارمن کو بری طرح جھڑک دیا ÷

نارمن نے اپنے دل کو سمجھایا کہ اب ہلینا سے ملنا بیکار ہے۔ لیکن عہد کیا کہ وہ اپنی باقی زندگی اس کی یاد میں گذار دیگا۔ عالم یاس میں نارمن نے اپنی نظموں کا ایک چھوٹا سا مجموعہ شائع کیا۔ جس میں قنوطیت کا جذبہ بہت غالب تھا۔ ان تمام نظموں میں اس نے اپنی نامرادی کا حال بڑے دردناک الفاظ میں بیان کیا تھا۔ اس کی وہ نظم جس میں اس نے ہلینا کو مخاطب کر رکھا تھا خصوصیت سے بہت مقبول ہوئی۔ نارمن اس کتاب کی کامیابی پر بہت حیران ہوا تھا۔ اسے اس کی بالکل امید نہ تھی۔ جب وہ اخبارات میں اپنی تعریفیں پڑھتا تو تعجب کرتا۔ آہستہ آہستہ اس کے عشق کا قصہ بھی مشہور ہوتا جا رہا تھا ÷

کچھ عرصہ بعد نارمن نے ایک ناول لکھا جس کو اس کی نظموں سے زیادہ قبولیت حاصل ہوئی۔ اس میں ایک ایسے نوجوان کا قصہ تھا۔ جس کو عشق میں ناکامی سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور اس کی زندگی بہت تلخ ہو جاتی ہے۔ اس میں عورتوں کی سنگدلی اور خودپسندی کے خلاف بہت زہر اگلا گیا تھا۔ کتاب کا آخری باب جس میں وہ نوجوان بالکل مایوس ہو کر اپنی پردرد زندگی کا خاتمہ کر لیتا ہے بڑا شاندار تھا۔ جس وقت زہر اس کے رگ و پے میں سرائت کر رہا ہوتا ہے تو وہ اپنی محبوبہ کو یاد کرتا ہے اور بہت پیارے الفاظ میں اس کو آنے کی دعوت دیتا ہے۔ اس ناول میں نارمن نے بہت کچھ اپنا ہی واقعہ لکھا تھا۔ اس کی اشاعت پر اس کا شمار مشہور مصنفوں میں ہونے لگا تھا ÷

نارمن کے تمام ناولوں افسانوں اور ناٹکوں کی بنیاد مایوسی، نامرادی اور اسی قسم کی دوسری قنوطیت آمیز باتوں پر ہوتی تھی۔ وہ مایوسی اور خاص طور پر عشق میں ناکامی کے جذبات کو بیان کرنے میں بے مثل تھا اور یہ سب کچھ ہلینا کی بدولت تھا جس کی یاد نارمن سے کبھی جدا نہ ہوتی تھی۔ رقص گاہ کی وہ رات اس کے لئے ایک حسین خواب بن گئی تھی۔ گو وہ اب ہلینا سے ملتا نہ تھا لیکن اس کے متعلق اڑتی اڑتی خبریں سنتا رہتا تھا +

اسے معلوم ہوا تھا کہ ایکٹر کے ساتھ ہلینا کی دوستی ایک سال سے زیادہ نہ نبھ سکی کیونکہ اس عرصہ میں وہ اپنی کافی دولت اور عزت لٹا چکی تھی۔ پھر اس نے ایک وارفتہ مزاج شخص مورگن سے شادی کر لی جس کی اوباشی اور شراب خوری نے اسے شادی کے بعد صرف تین سال زندہ رکھا۔ خاوند کی موت کے بعد اس نے اپنا نام ہلینا مارگن سے بدل کر پھر ہلینا ٹالمیج رکھ لیا تھا۔ اب اس کی زندگی بہت بے ترتیب ہو گئی تھی۔ اس نے کئی مردوں سے عشق کیا تھا اور اس کے آخری عاشق نے اسے سخت دھوکا دیا تھا +

نارمن نے یہ سب کچھ باتوں ہی باتوں میں سنا تھا۔ اس کی محبت میں ذرہ برابر فرق نہ آیا تھا۔ وہ اسے اسی طرح چاہتا تھا اور اپنی مایوسی کے گیت اسی زور شور سے گاتا تھا۔ اب . . . . . اس وقت وہ اس کے دروازے پر کھڑی تھی !

نارمن نے رات اس کو تھیٹر میں دیکھا تھا۔ وہ سوچنے لگا اس کو کھیل دیکھ کر میرا خیال آیا ہوگا۔ اور اپنی غلطی کا احساس

ہوا ہوگا - اس نے سوچا ہوگا کہ میں دس سال تک ایک ایسے شخص سے کھنچی رہی ہوں جو مجھے چاہتا ہے - مجھ پر جان تک قربان کرنے کو تیار رہے - اس احساس پر اس نے یہاں آنے کا ارادہ کیا ہوگا اور اب وہ میرے دروازے پر کھڑی ہے +

نارمن ملاقاتی کارڈ ہاتھ میں لئے ان باتوں پر گویا نظر ڈالتا جا رہا تھا - جس بات کو وہ ایک موہوم خواب یا بعض اوقات ایک دوراز عقل وقیاس بات خیال کرتا تھا وہ پوری ہو چکی تھی - ہلینا ٹالبیچ اس کے دروازے پر کھڑی تھی ! وہ ہمیشہ سے یہی چاہتا تھا اور تمام عمر اس کو اس بات کی زبردست خواہش رہی تھی - لیکن اس کے پورا ہو جانے کی امید نہ تھی - ہلینا کی آمد نے اس کی زندگی کے نظام کو تہ و بالا کر دیا تھا +

اس نے سوچا میں نے اپنی زندگی کی بنیاد مایوسی اور ناکامی پر رکھی ہے - اسی جذبہ سے متاثر ہو کر میں نے اپنی نظمیں اور افسانے لکھے ہیں - اب میں ایک مشہور مصنف ہوں - میرے عشق کی ناکامی کی داستانیں زبان زد خلائق ہیں - کیا اب ہلینا سے مل کر اپنی زندگی کا بنیادی پتھر اکھاڑ دوں ؟ اور اس شاندار عمارت کو جس کی تعمیر آرزوؤں کے خون سے کی ہے منہدم کر دوں ؟ اپنی مایوسی کو ختم کر دوں ؟ اس کامرانی میں بربادی ہے +

خدمتگار طشتری ہاتھ میں لئے خاموش کھڑا تھا - نارمن کی گہری سوچ نے اسے کسی قدر حیران کر دیا تھا - وہ ایک دو بار آہستہ سے کھانسا بھی تھا لیکن نارمن متوجہ نہ ہوا تھا - آخر اس نے دبی آواز میں کہا - " حضور ایک خاتون باہر کھڑی ہیں " +

نارمن کی سوچ میں کسی قدر نفرت اور تلخی تھی - جس چیز کے لئے مدتوں سرگرداں رہا تھا جب وہ مل رہی ہے تو اسے لینے کی جرأت نہیں ! اب اسے معلوم ہوا کہ اس کی زندگی کتنا بڑا فریب ہے ! وہ اب تک اپنے آپ کو دھوکا دیتا رہا ہے - اس کو اپنی مایوسی کے لئے صرف ایک بہانہ کی ضرورت تھی - اب اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ ہلینا کو قبول کر کے اپنی زندگی کو بدل ڈالے +

خدمتگار نے پھر کہا - " حضور باہر ایک خاتون کھڑی ہیں " !

نارمن نے ملاقاتی کارڈ طشتری میں واپس رکھ دیا اور آئینہ میں اپنا عکس دیکھنے لگا - پھر سگرٹ کو سگرٹ کیس پر مارتے ہوئے کہا :-

" جو خاتون باہر کھڑی ہیں ان سے کہہ دو کہ میری ان سے ملاقات نہیں ہو سکتی " +

آغا عبدالحمید

فلک پیما

اِنسان کہ شیطان ؟

فرانسیسی شاعر یامز کی ایک مختصر نظم کا لفظی ترجمہ یہ ہے :۔

دعا کہ شاعر
بہشت میں
گدھوں کے ساتھ جائے :۔

"اے خدا جب تو مجھے بلائے تو کاش یوں کرے
کہ کسی میلے کے دن بلائے جب سڑکیں گرد آلود ہوتی ہیں ۔
زمین پر ہمیشہ سے میری عادت ہے کہ ایسے رستے پر چلتا ہوں جو مجھے پسند ہو ۔
میں چاہتا ہوں کہ تیری بہشت کی طرف بھی (جہاں ستارے
تمام دن چمکتے ہیں) اپنی پسند کی سڑک پر چلوں ۔
اُس بڑی شاہراہ پر ہاتھ کی لکڑی لے کر چل کھڑا ہوں
جس پر بوجھ تلے جھکے ہوئے گدھے جا رہے ہوں اور میں
اپنے پیارے دوستوں۔گدھوں۔ سے کہوں
"میں فرانسے یامز ہوں، بہشت کو جا رہا ہوں
کیونکہ جہاں خدا کے برگزیدہ ہے وہاں کوئی دوزخ نہیں ۔
میرے ساتھ آؤ۔ اے میرے زنگاری آسمان تلے کے دوستو !
غریبو، 'وپیارے'، بوجھ اٹھانے والو ! جو اپنے لمبے لمبے

کان ہلا ہلا کر مچھروں کو '
غصے سے بھرے چوٹ لگانے والے ڈنڈوں کو '
اور بھنبھناتی مکھیوں کو '
ہٹاتے رہتے ہو ۔'

اے خدا ! مجھے اپنے سامنے ان حیوانوں کے ہمراہ پیش ہونے دے ۔
ان سے مجھے بےحد پیار ہے کیونکہ وہ اپنے سر میٹھی اداؤں کے ساتھ
جھکاتے ہیں اور جب چلتے چلتے رک جاتے ہیں تو اپنے چھوٹے چھوٹے
پاؤں اس قدر نرمی سے پاس پاس جما دیتے ہیں کہ جو دیکھے
وہی رحم کرے ۔
اے خدا ! مجھ کو آنے دے اور میرے ساتھ ان کے دس لاکھ کانوں کو '
اور ان سب کو جو اپنے پہلوؤں پر بھاری بھاری بکس اٹھاتے ہیں ۔
اور ان سب کو جو پہلوانوں کی گاڑیاں کھینچتے ہیں ۔
اور ان سب کو جو اپنی پیٹھ پر ٹوٹے پھوٹے کنستر ڈھوتے ہیں ۔
اور ان سب گدھیوں کو جو لنگڑا کر چلتی ہیں کیونکہ
ان کے پیٹ چمڑے کی بوتلوں کی طرح پُر ہیں ۔
اور ان سب کو جن کو چیتھڑوں سے ڈھانکا جاتا ہے
کیونکہ ان کے بہنے والے زخموں کے گرد
ضدی مکھیوں کے جھنڈ کے جھنڈ جمع ہوتے ہیں ۔

اے خدا ! مجھے اپنے پاس بہشت میں آنے دے مع سب گدھوں کے '
اور فرشتوں کو حکم دے کہ وہ ہمیں وہاں لے جائیں جہاں تیرے دریا
اپنے ساحلوں کے ساتھ لطف سے پیش آتے ہیں ۔
جہاں درختوں سے "چیری" کے گچھے لٹکتے ہیں ۔
ایسی "چیری" کے جو رحمدل کنواریوں کے ہنسنے والے رخساروں کی طرح نرم ہے ۔
اور اے خدا ! جہاں تیرا مکمل امن ہے وہاں مجھے بھی اپنے گدھوں کی طرح بنا
کہ میں آسمانی دریاؤں کے اوپر جھکا رہوں تیرے گدھوں

کی طرح جو اپنی میٹھی اور عاجزانہ غربت کے ساتھ ۔تیری دائمی محبت کے شفاف پانیوں میں منعکس ہوتے ہیں ——————"

انسانی دعاؤں کے خارزار میں یامز کی یہ بھولی سی دعا گویا کنول کا پھول ہے۔ جس دنیا میں اکثر لوگ حکومت، دولت، فتح اور انتقام کی دعاؤں کے تیروں سے آسمان کا کلیجہ چھلنی کرتے رہتے ہیں یامز کی دعا کا وجود غنیمت ہے مگر مگر . . . . .

۲

اس سے بحث نہیں کہ فرانس میں یا یورپ میں اس نظم کا اثر کیا ہوا ۔ ممکن ہے کہ گدھوں کے ساتھ انسانی سلوک پہلے سے بہتر ہو گیا ہو ۔قیاس ہے کہ ایسا ہوا ۔ بیمار گدھوں کے لئے ہسپتال بنائے گئے اور گدھوں کے ساتھ بدسلوکی کرنے والے مستوجب سزا قرار دئے گئے ۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اب باقی کرۂ زمین پر بھی گدھوں کے ساتھ بمقابلۂ سابق بدسلوکی کم ہو جائے اور آخر کار مفقود ہو جائے ۔ محض اپنی نظروں میں اپنا وقار زیادہ کرنے کے لئے انسان مختلف اقسام کی غیر ضروری بدسلوکیوں میں (گدھوں کے ساتھ "بیویوں کے ساتھ") بغیر اس قسم کی نظموں کے بھی کمی کر رہا ہے ۔

اس سے بھی بحث نہیں کہ بیزبان حیوانوں کے ساتھ ہزارہا سال کے مسلسل ظلم کی روسیاہی کسی بعد کی خود غرضانہ توبہ سے دُھل نہیں سکتی ۔ بے زبان حیوانوں پر جو قدرت انسان کو حاصل ہے اور جس طرح انسان نے اپنے اختیار کو استعمال کیا ہے اس سے نطرت کا اور فطرت کے ساتھ انسان کا منہ ایسی بری طرح کالا ہے کہ اگر اور کسی غرض کے لئے نہیں تو اس ظلم کی پاداش کے لئے ایک یوم الحساب کی اشد ضرورت ہے ۔ انسان کی مکروہ عادتوں میں سے مکروہ ترین یہ ہے کہ ظلم کم کرے تو اپنی روحانی ترقی پر فخر کرتا ہے ۔شرم کو انسان سے شرم ہے ؛

دنیا میں صرف ایک ہی بے رحم ظالم حیوان ہے اور وہ انسان ہے مگر بے رحمی سے بڑھ کر یہ بیحیائی ہے کہ انسان آرزو کرے کہ خدا کے حضور میں مسکین اور نیک گدھوں کے ہمراہ پیش ہو ۔ یہ گویا خدا کو بھی ظلم میں شریک ہونے کی دعوت ہے کہ وہ آنکھیں بند کر کے جفا پیشہ انسان کو بھی وہی رتبہ دے دے جو گدھے کا حق ہے اور یہ محض اس لئے کہ شاعر گدھوں سے محبت کر کے ایک انوکھے کفارے کا طلبگار ہے ۔ گدھوں کے رتبے میں ہرگز محض ایک شاعر کی محبت کی وجہ سے یہ ناروا کمی نہیں ہو سکتی کہ انسان گدھوں کے برابر میں بیٹھے ۔ یامز کی یہ آرزو جس غلط خیال پر مبنی ہے اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں ۔مختصراً وہ خیال یہ ہے کہ ظالم مظلوم کے ساتھ ہمدردی کر کے اپنے مظالم کو مٹا سکتا ہے ۔ یہ قطعی غلط ہے ۔

۳

یامز گو زمانۂ حال کا شاعر ہے ۔ مگر ایک متروک تخیل کا شکار ہے ۔ اسے اتنا بھی پتہ نہیں کہ یہ ہماری دنیا جسے جہلا ایک آنیوالے دوزخ اور ایک آنے والی بہشت کا پیش خیمہ بنائے بیٹھے ہیں دراصل ایک مٹی ہوئی دنیا کا دوزخ ہے ۔ اس مٹی ہوئی دنیا میں جو بُری ہستیاں تھیں وہ یہاں گدھے ہیں ۔ جو ان سے بھی زیادہ بُری تھیں وہ یہاں انسان یعنی اس دوزخ کے شیطان ہیں ۔ یہ ان شیاطین کی سزا ہے کہ وہ صرف گدھوں پر ظلم نہیں کرتے بلکہ خود اپنے ہمجنسوں پر بھی ہاتھ صاف کرتے ہیں ۔ خدائی کارخانے میں انصاف شاعرانہ قسم کا ہے ۔ شیطان سمجھتا ہے کہ شیطان کوئی اور ہے ۔ اگر یوں نہ ہوتا اور یہ دوزخ واقعی ایک دارالامتحان ہوتا تو آج سے مدتوں پہلے مٹ جاتا ۔ کیونکہ انسانوں کے امتحان کی ضرورت نہیں +

فلک پیما

نگارخانۂ چین

دو بانسریاں

ایک دن شام کو میں دریا کے کنارے بیٹھا تھا ۔ اس پار سے ایک بانسری کی صدا میرے کان میں آئی ۔ وہ کچھ کہہ رہی تھی ۔ میں نے اسی وقت بانس کے پیڑ سے ایک نَے کاٹی ۔ اور اس بانسری کا جواب دینے کی کوشش کی +

بس اس شام سے ہر روز رات کو جب بستی والے سو جاتے ہیں ۔ تو دریا کے دونو کناروں سے دو خوش گلو پرند ایک دوسرے کو پکارتے ہیں ۔ اور دیر تک پکارتے رہتے ہیں ۔ وہ ایک دوسرے سے آشنا تو نہیں ۔ مگر وہ ایک دوسرے کی بات سمجھ لیتے ہیں +

عزیز لکھنوی

"شعبدۂ صنعت"

ہلچل ہے زمانے میں عالم تہ و بالا ہے
کس مست نے اس جانب پلکوں کو اٹھایا ہے

ویراں کدۂ دل میں اب میرے دھرا کیا ہے
کچھ داغ ہیں حسرت کے کچھ خون تمنا ہے

ہو عزم طلب صادق تو یاس نہیں ہوتی
جس نے تجھے ڈھونڈا ہے اس نے تجھے پایا ہے

ہر نقش فنا تیرا ہے شعبدۂ صنعت
میں نے تجھے اے دنیا ہر رنگ میں دیکھا ہے

دل چاہے اگر تیرا تو پوچھ مرے دل سے
دردِ غم الفت کی ٹیسوں میں مزا کیا ہے

ہنستے ہوئے اٹھے ہیں وہ عیش کی نیندوں سے
شاید کسی بیکس کو روتا ہوا دیکھا ہے

آنے کا عزیز اپنے مطلب ہے کہ جانا ہے
جینے کا یہ مطلب ہے اک دن ہمیں مرنا ہے

عزیز لکھنوی

اصغر

روحِ نشاط

رقصِ مستی دیکھتے، جوشِ تمنا دیکھتے
سامنے لا کر تجھے، اپنا تماشا دیکھتے

کم سے کم حسنِ تخیل کا تماشا دیکھتے
جلوۂ یوسف تو کیا؟ خوابِ زلیخا دیکھتے

روزِ روشن یا شبِ مہتاب یا صبحِ چمن
ہم جہاں سے چاہتے وہ روئے زیبا دیکھتے

اس طرح کچھ رنگ بھر جاتا نگاہِ شوق میں
جلوہ خود بیتاب ہو جاتا وہ پردا دیکھتے

صد زمان و صد مکان و این جہان و آن جہاں
تم نہ آجاتے تو ہم وحشت میں کیا کیا دیکھتے

جن کو اپنی شوخیوں پر آج اتنا ناز ہے
وہ کسی دن میری جانِ ناشکیبا دیکھتے

جان دے کر ہم نے رکھا ہے حجابِ دہر کو
توڑ کر شیشے کو پھر کیا رنگِ صہبا دیکھتے

میکدے میں زندگی ہے شورِ نوشانوش سے
مٹ گئے ہوتے اگر ہم جام و مینا دیکھتے

سید اصغر حسین گونڈوی

نثر

پطرس (سید احمد شاہ بخاری)

(۱) لاہور کا جغرافیہ (مزاحیہ مضمون)

(۲) سیب کا درخت (افسانہ)

(۳) فرمودۂ پطرس (فارسی اشعار)

لاہور کا جغرافیہ

تمہید۔ تمہید کے طور پر صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں۔ کہ لاہور کو دریافت ہوئے اب بہت عرصہ گزر چکا ہے۔ اس لئے دلائل و براہین سے اس کے وجود کو ثابت کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ کہنے کی اب ضرورت نہیں کہ کرّے کو دائیں سے بائیں گھمائیے حتیٰ کہ ہندوستان کا ملک آپ کے سامنے آ کر ٹھہر جائے۔ پھر فلاں طول البلد اور فلاں عرض البلد کے مقام انقطاع پر لاہور کا نام تلاش کیجئے۔ جہاں یہ نام کرّے پر مرقوم ہو۔ وہی لاہور کا محل وقوع ہے۔ اس ساری تحقیقات کو مختصر مگر جامع الفاظ میں بزرگ یوں بیان کرتے ہیں۔ کہ لاہور لاہور ہی ہے اگر اس پتے سے آپ کو لاہور نہیں مل سکتا۔ تو آپ کی تعلیم ناقص اور آپ کی ذہانت فاتر ہے۔

محل وقوع۔ ایک دو غلط فہمیاں البتہ ضرور رفع کرنا چاہتا ہوں۔ لاہور پنجاب میں واقع ہے۔ لیکن پنجاب اب پنجاب نہیں رہا۔ اس پانچ دریاؤں کی سرزمین میں اب صرف ساڑھے چار دریا بہتے ہیں۔ اور جو نصف دریا ہے۔ وہ تو اب بہنے کے قابل بھی نہیں رہا۔ اسی کو اصطلاح میں راوی ضعیف کہتے ہیں۔ ملنے کا پتہ یہ ہے۔ کہ شہر کے قریب دو پل بنے ہیں۔ ان کے نیچے ریت میں یہ دریا لیٹا رہتا ہے۔ بہنے کا شغل عرصے سے بند ہے۔ اس لئے اب یہ بتانا بھی مشکل ہے۔ کہ شہر دریا کے دائیں کنارے پر واقع ہے یا بائیں کنارے پر۔

لاہور تک پہنچنے کے کئی رستے ہیں۔ لیکن دو اُنہیں سے بہت مشہور ہیں۔ ایک پشاور سے آتا ہے اور دوسرا دہلی سے + وسط ایشیا کے حملہ آور پشاور کے رستے اور یو۔پی کے حملہ آور دہلی کے رستے وارد ہوتے ہیں۔ اوّل الذکر اہل سیف کہلاتے ہیں اور غزنوی یا غوری تخلص کرتے ہیں۔ موخرالذکر اہل زبان کہلاتے ہیں۔ یہ بھی تخلص کرتے ہیں اور اس میں ید طولیٰ رکھتے ہیں +

حدود اربعہ۔ کہتے ہیں کسی زمانے میں لاہور کا حدود اربعہ بھی ہُوا کرتا تھا۔ لیکن طلبا کی سہولت کے لئے میونسپلٹی نے اسے منسوخ کر دیا ہے اب لاہور کے چاروں طرف بھی لاہور ہی واقع ہے۔ اور روز بروز واقع تر ہو رہا ہے۔ ماہرین کا اندازہ ہے۔ کہ دس بیس سال کے اندر لاہور ایک صوبے کا نام ہوگا جس کا دارالخلافہ پنجاب ہوگا۔ یوں سمجھئے کہ لاہور ایک جسم ہے۔ جس کے ہر حصے پر ورم نمودار ہو رہا ہے لیکن ہر ورم موادِ فاسد سے بھرا ہے۔ گویا یہ توسیع ایک عارضہ ہے جو اس جسم کو لاحق ہے +

آب و ہوا۔ لاہور کی آب و ہوا کے متعلق طرح طرح کی روایات مشہور ہیں۔ جو قریباً سب کی سب غلط ہیں۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ لاہور کے باشندوں نے حال ہی میں یہ خواہش ظاہر کی ہے۔ کہ اور شہروں کی طرح ہمیں بھی آب و ہوا دی جائے۔ میونسپلٹی بڑی بحث و تمحیص کے بعد اس نتیجے پر پہنچی۔ کہ اس ترقی کے دور میں جبکہ دنیا میں کئی ممالک کو ہوم رول مل رہا ہے اور لوگوں میں بیداری کے آثار پیدا ہو رہے ہیں۔ اہل لاہور کی یہ خواہش ناجائز نہیں۔ بلکہ ہمدردانہ غور و خوض کی مستحق ہے +

لیکن بدقسمتی سے کمیٹی کے پاس ہوا کی قلت تھی۔ اس لئے لوگوں کو ہدایت کی گئی۔ کہ مفاد عامہ کے پیش نظر اہل شہر ہوا کا بیجا استعمال نہ کریں۔ بلکہ جہاں تک ہوسکے کفایت شعاری سے کام لیں۔ چنانچہ اب لاہور میں عام ضروریات کے لئے ہوا کی بجائے گرد اور خاص خاص حالات میں دھوّاں استعمال کیا جاتا ہے۔ کیٹی نے جابجا دھوئیں اور گرد کے مہیا کرنے کے لئے مرکز کھول دئے ہیں جہاں یہ مرکبات مفت تقسیم کئے جاتے ہیں۔ امید کی جاتی ہے۔ کہ اس سے نہایت تسلی بخش نتائج برآمد ہونگے۔

بہم رسانی آب کے لئے ایک سکیم عرصے سے کمیٹی کے زیرغور ہے۔ یہ سکیم نظام سقے کے وقت سے چلی آتی ہے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ نظام سقے کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے اہم مسودات بعض تو تلف ہو چکے ہیں۔ اور جو باقی ہیں ان کے پڑھنے میں بہت دقت پیش آرہی ہے۔ اس لئے ممکن ہے تحقیق و تدقیق میں چند سال اور لگ جائیں۔ عارضی طور پر پانی کا یہ انتظام کیا گیا ہے۔ کہ فی الحال بارش کے پانی کو حتی الوسع شہر سے باہر نکلنے نہیں دیتے۔ اس میں کمیٹی کو بہت کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ امید کی جاتی ہے۔ کہ تھوڑے ہی عرصے میں ہر محلے کا اپنا ایک دریا ہوگا۔ جس میں رفتہ رفتہ مچھلیاں پیدا ہونگی۔ اور ہر مچھلی کے پیٹ میں کمیٹی کی ایک انگوٹھی ہوگی۔ جو رائے دہندگی کے موقع پر ہر رائے دہندہ پہن کر آئیگا۔

نظام سقے کے مسودات سے اس قدر ضرور ثابت ہوا ہے۔ کہ پانی بچانے کے لئے نل ضروری ہیں۔ چنانچہ کمیٹی نے کروڑوں روپے خرچ کرکے جابجا نل لگوا دئے ہیں۔ فی الحال ان میں ہائیڈروجن اور آکسیجن بھری ہے۔ لیکن ماہرین کی رائے ہے۔ کہ ایک نہ ایک دن یہ گیسیں ضرور مل کر پانی بن جائینگی۔ چنانچہ بعض بعض نلوں میں اب بھی چند قطرے روزانہ ٹپکتے ہیں۔ اہل شہر کو ہدایت کی گئی ہے۔ کہ اپنے اپنے گھڑے نلوں کے نیچے رکھ چھوڑیں۔ تاکہ عین وقت پر تاخیر کی وجہ سے کسی کی دلشکنی نہ ہو۔ شہر کے لوگ اس پر بہت خوشیاں منا رہے ہیں۔

ذرائع آمد و رفت۔ جو سیاح لاہور تشریف لانے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ ان کو یہاں کے ذرائع آمد و رفت کے متعلق چند ضروری باتیں ذہن نشین کر لینی چاہئیں۔ تاکہ وہ یہاں کی سیاحت سے کما حقہٗ اثر پذیر ہو سکیں۔ جو سڑک بل کھاتی ہوئی لاہور کے بازاروں میں سے گزرتی ہے۔ تاریخی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ یہ وہی سڑک ہے جسے شیر شاہ سوری نے بنایا تھا۔ یہ آثار قدیمہ میں شمار ہوتی ہے۔ اور بیحد احترام کی نظروں سے دیکھی جاتی ہے۔ چنانچہ اس میں کسی قسم کا رد و بدل گوارا نہیں کیا جاتا۔ وہ قدیم تاریخی گڑھے اور خندقیں جوں کی توں موجود ہیں۔ جنہوں نے کئی سلطنتوں کے تختے الٹ دئے تھے۔ آجکل بھی کئی لوگوں کے تختے یہاں اُلٹتے ہیں اور عظمت رفتہ کی یاد دلا کر انسان کو عبرت سکھاتے ہیں۔

بعض لوگ زیادہ عبرت پکڑنے کے لئے ان تختوں کے نیچے کہیں کہیں دو ایک پہیے لگا لیتے ہیں۔ اور سامنے دو بک لگا کر ان میں ایک گھوڑا ٹانک دیتے ہیں۔ اصطلاح میں اس کو تانگہ کہتے ہیں۔ شوقین لوگ اس تختہ پر موجامہ منڈھ لیتے ہیں۔ تاکہ پھسلنے میں سہولت ہو اور بہت زیادہ عبرت پکڑی جائے۔

اصلی اور خالص گھوڑے لاہور میں خوراک کے کام آتے ہیں۔ قصابوں کی دکانوں پر انہی کا گوشت بکتا ہے اور زین کس کر کھایا جاتا ہے۔ تانگوں میں ان کی بجائے بناسپتی گھوڑے استعمال کئے جاتے ہیں۔ بناسپتی گھوڑا شکل و صورت میں دمدار تارے سے ملتا ہے۔ کیونکہ اس گھوڑے کی ساخت میں دم زیادہ اور گھوڑا کم پایا جاتا ہے۔ حرکت کرتے وقت اپنی دم کو دبا لیتا ہے۔ اور اس

ضبط نفس سے اپنی رفتار میں ایک سنجیدہ اعتدال پیدا کرتا ہے ۔ تاکہ سڑک کا ہر تاریخی گڑھا اور تانگے کا ہر ہچکولا اپنا نقش آپ پر ثبت کر جائے اور آپ کا ہر ایک مسام لطف اندوز ہو سکے ۔

قابل دید مقامات ۔ لاہور میں قابل دید مقامات مشکل سے ملتے ہیں ۔ اس کی وجہ یہ ہے ۔ کہ لاہور میں ہر عمارت کی بیرونی دیواریں دوہری بنائی جاتی ہیں ۔ پہلے اینٹوں اور چونے سے دیوار کھڑی کرتے ہیں ۔ اور پھر اس پر اشتہاروں کا پلستر کر دیا جاتا ہے ۔ جو دبازت میں رفتہ رفتہ بڑھتا جاتا ہے ۔ شروع شروع میں چھوٹے سائز کے مبہم اور غیر معروف اشتہارات چپکائے جاتے ہیں ۔ مثلاً "اہل لاہور کو مژدہ" یا "اچھا اور سستا مال" اس کے بعد ان اشتہاروں کی باری آتی ہے ۔ جن کے مخاطب اہل علم اور سخن فہم لوگ ہوتے ہیں ۔ مثلاً "گریجویٹ درزی ہاؤس" یا "سٹوڈنٹوں کے لئے نادر موقعہ" یا "کہنی ہے ہم کو خلق خدا غائبانہ کیا" ۔ رفتہ رفتہ گھر کی چار دیواری ایک مکمل ڈائرکٹری کی صورت اختیار کر لیتی ہے ۔ دروازے کے اوپر بوٹ پالش کا اشتہار ہے ۔ دائیں طرف تازہ مکھن ملنے کا پتہ مندرج ہے ۔ بائیں طرف حافظے کی گولیوں کا بیان ہے ۔ اس کھڑکی کے اوپر انجمن خدام ملت کے جلسے کا پروگرام چسپاں ہے ۔ اس کھڑکی پر کسی مشہور لیڈر کے خانگی حالات بالوضاحت بیان کر دئے گئے ہیں ۔ عقبی دیوار پر سرکس کے تمام جانوروں کی فہرست ہے اور اصطبل کے دروازے پر مس نغمہ جان کی تصویر اور ان کے فلم کے محاسن گنوا رکھے ہیں ۔ یہ اشتہارات بڑی سرعت سے بدلتے رہتے ہیں اور ہر نیا مژدہ ۔ ہر نئی دریافت یا ایجاد یا انقلاب عظیم کی اطلاع چشم زدن میں ہر ساکن چیز پر لیپ دی جاتی ہے ۔ اس لئے عمارتوں کی ظاہری صورت ہر لحظہ بدلتی رہتی ہے ۔ اور ان کے پہچاننے میں خود شہر کے لوگوں کو بیحد دقت پیش آتی ہے ۔

لیکن جب سے لاہور میں دستور رائج ہوا ہے ۔ کہ بعض بعض اشتہاری کلمات پختہ سیاہی سے خود دیوار پر نقش کر دئے جاتے ہیں ۔ یہ دقت بہت حد تک رفع ہو گئی ہے ۔ ان دائمی اشتہاروں کی بدولت اب یہ خدشہ نہیں رہا ۔ کہ کوئی شخص اپنا یا اپنے کسی دوست کا مکان صرف اس لئے بھول جائے ۔ کہ پچھلی مرتبہ وہاں چارپائیوں کا اشتہار لگا تھا اور لوٹتے تک وہاں اہالیان لاہور کو تازہ اور سستے جوتوں کا مژدہ سنایا جا رہا ہے ۔ چنانچہ اب وثوق سے کہا جا سکتا ہے ۔ کہ جہاں بحروف جلی "محمد علی دندان ساز" لکھا ہے ۔ وہ اخبار انقلاب کا دفتر ہے ۔ جہاں "بجلی پانی بھاپ کا بڑا ہسپتال" لکھا ہے ۔ وہاں ڈاکٹر اقبال رہتے ہیں ۔ "خالص گھی کی مٹھائی" امتیاز علی تاج کا مکان ہے ۔ "کرشنا بیوٹی کریم" شالا مار باغ کو اور "کھانسی کا مجرب نسخہ" جہانگیر کے مقبرے کو جاتا ہے ۔

صنعت و حرفت ۔ اشتہاروں کے علاوہ لاہور کی سب سے بڑی صنعت رسالہ بازی اور سب سے بڑی حرفت انجمن سازی ہے ۔ ہر رسالے کا ہر نمبر عموماً خاص نمبر ہوتا ہے ۔ اور عام نمبر صرف خاص خاص موقعوں پر شائع کئے جاتے ہیں ۔ عام نمبر میں صرف ایڈیٹر کی تصویر اور خاص نمبروں میں مس سلوچنا اور مس کجن کی تصاویر بھی دی جاتی ہیں ۔ اس سے ادب کو بہت فروغ نصیب ہوتا ہے ۔ اور فن تنقید ترقی کرتا ہے ۔

لاہور کے ہر مربع انچ میں ایک انجمن موجود ہے ۔ پریزیڈنٹ البتہ تھوڑے ہیں ۔ اس لئے فی الحال صرف دو تین اصحاب ہی یہ اہم فرض ادا کر رہے ہیں ۔ چونکہ ان انجمنوں کے اغراض و مقاصد مختلف ہیں ۔ اس لئے بسا اوقات ایک ہی صدر صبح کسی مذہبی کانفرنس کا افتتاح کرتا ہے ۔ سہ پہر کو کسی سینما کی انجمن میں مس نغمہ جان کا تعارف کراتا ہے ۔ اور شام کو کسی کرکٹ ٹیم کے ڈنر میں شامل ہوتا ہے ۔ اس سے ان کا مطمح نظر وسیع رہتا ہے ۔ تقریر عام طور پر ایسی ہوتی ہے ۔ جو تینوں موقعوں پر کام آ سکتی ہے ۔ چنانچہ سامعین کو بہت سہولت رہتی ہے ۔

پیداوار۔ لاہور کی سب سے مشہور پیداوار یہاں کے طلبا ہیں۔ جو بہت کثرت سے پائے جاتے ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں دساور کو بھیجے جاتے ہیں۔ فصل شروع سرما میں بوئی جاتی ہے اور عموماً اواخر بہار میں پک کر تیار ہوتی ہے ۔

طلبا کی کئی قسمیں ہیں جن میں سے چند مشہور ہیں۔ قسم اول جمالی کہلاتی ہے۔ یہ طلبا عام طور پر پہلے درزیوں کے ہاں تیار ہوتے ہیں۔ بعد ازاں دھوبی اور پھر نائی کے پاس بھیجے جاتے ہیں۔ اور اس عمل کے بعد کسی رستورنٹ میں ان کی نمائش کی جاتی ہے۔ غروب آفتاب کے بعد کسی سینما یا سینما کے گردونواح میں رخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں ادھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے۔ شمعیں کئی ہوتی ہیں لیکن سب کی تصاویر ایک البم میں جمع کر کے اپنے پاس رکھ چھوڑتے ہیں۔ اور تعطیلات میں ایک ایک کو خط لکھتے رہتے ہیں۔ دوسری قسم جلالی طلبا کی ہے۔ ان کا شجرہ جلال الدین اکبر سے ملتا ہے۔ اس لئے ہندوستان کا تخت و تاج ان کی ملکیت سمجھا جاتا ہے۔ شام کے وقت چند مصاحبوں کو ساتھ لئے نکلتے ہیں اور جود وسخا کے خم لنڈھاتے پھرتے ہیں۔ کالج کی خوراک انہیں راس نہیں آتی۔ اس لئے ہاسٹل میں فروکش نہیں ہوتے۔ تیسری قسم خیالی طلبا کی ہے۔ یہ اکثر روح اور اخلاق اور آواگون اور جمہوریت پر باآواز بلند خیالات کرتے پائے جاتے ہیں۔ اور آفرینش اور نفسیات جنسی کے متعلق نئے نئے نظریے پیش کرتے رہتے ہیں۔ صحت جسمانی کو ارتقائے انسانی کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ اس لئے علی الصباح پانچ چھ ڈنڑ پیلتے ہیں اور شام کو ہاسٹل کی چھت پر گہرے سانس لیتے ہیں۔ گاتے ضرور ہیں لیکن اکثر بے سرے ہوتے ہیں۔ چوتھی قسم خالی طلبا کی ہے۔ یہ طلبا کی خالص ترین قسم ہے۔ ان کا دامن کسی قسم کی آلائش سے تر ہونے نہیں پاتا۔ کتابیں، امتحانات، مطالعہ اور اس قسم کے خرخشے کبھی ان کی زندگی میں خلل انداز نہیں ہوتے۔ جس معصومیت کو ساتھ لے کر کالج میں پہنچے تھے اسے آخر تک ملوث ہونے نہیں دیتے اور تعلیم اور نصاب اور درس کے ہنگاموں میں اس طرح زندگی بسر کرتے ہیں جس طرح بتیس دانتوں میں زبان رہتی ہے ۔

پچھلے چند سالوں سے طلبا کی ایک اور قسم بھی دکھائی دینے لگی ہے لیکن ان کو اچھی طرح سے دیکھنے کے لئے محدب شیشے کا استعمال ضروری ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ریل کا ٹکٹ نصف قیمت پر ملتا ہے۔ اور اگر چاہیں۔ تو اپنی اناکے ساتھ زنانہ ڈبے میں بھی سفر کر سکتے ہیں۔ ان کی وجہ سے اب یونیورسٹی نے کالجوں پر شرط عائد کر دی ہے۔ کہ آیندہ صرف وہی لوگ پروفیسر مقرر کئے جائیں۔ جو دودھ پلانے والے جانوروں میں سے ہوں ۔

طبعی حالات۔ لاہور کے لوگ بہت خوش طبع ہیں ۔

سوالات

(۱) لاہور تمہیں کیوں پسند ہے؟ مفصل لکھو۔

(۲) لاہور کس نے دریافت کیا اور کیوں؟ اس کے لئے سزا بھی تجویز کرو۔

(۳) میونسپل کمیٹی کی شان میں ایک قصیدہ مدحیہ لکھو۔

جان گالزوردی

سیب کا درخت

"سیب کا درخت - موسیقی اور سنہری پھول"

(ہپالیٹس)

اپنی شادی کی پچیسویں سالگرہ کے دن ایشرسٹ اور اس کی بیوی جنگل کے کنارے موٹر میں سیر کر رہے تھے۔ ان کا ارادہ تھا۔ کہ دن بھر سیر کرنے کے بعد رات اس تقریب کی خوشی میں ٹورکی کے مقام پر گزاریں۔ جہاں ان دونو کی سب سے پہلے ملاقات ہوئی تھی۔ یہ تجویز سٹیلا ایشرسٹ کی تھی۔ جس کی فطرت میں جذبہ پرستی کی ایک جھلک بھی پائی جاتی تھی۔ سٹیلا میں اب وہ پہلے کا سا حسن تو نہ تھا۔ نہ وہ نیلی آنکھیں۔ نہ وہ پھول کی سی لطافت۔ نہ وہ چہرے اور اعضا کی نازک پاکیزگی جسے دیکھ کر آنکھوں کو تسکین ہوتی تھی۔ نہ وہ سیب کے شگوفے کی سی رنگت جس نے آج سے چھبیس سال پہلے ایشرسٹ کے دل کو ایک ہی جھلک میں موہ لیا تھا۔ لیکن تینتالیس برس کی عمر ہونے پر بھی اپنے شوہر کی وفادار رفیق تھی۔ چہرہ اب بھی حسین تھا۔ گالوں پر ہلکے ہلکے داغ پڑ گئے تھے۔ اور آنکھوں میں ایک لبریزی سی آگئی تھی۔

سٹیلا ہی نے موٹر کو ایسے مقام پر ٹھہرایا۔ جہاں بائیں ہاتھ کو مرغزار کی اونچی چڑھائی تھی۔ اور جنگل کا ایک تنگ ساخطہ جس میں زیادہ تر بیچ اور لارچ اور کہیں کہیں چیڑ کے درخت اُگے ہوئے تھے۔ اس وادی کی طرف بڑھا ہوا تھا۔ جو سڑک سے لے کر بھرے جنگل کی پہلی اونچی پہاڑی تک پھیلی ہوئی تھی۔ اسے ایسی جگہ کی تلاش تھی۔ جہاں دونو بیٹھ کر لنچ کھائیں (ایشرسٹ کو تو کبھی کسی چیز کی تلاش نہ تھی)۔ اور ادھر ادھر چاروں طرف فرز کے سنہری پھول اُگ رہے تھے۔ لارچ کے ہرے بھرے ہلکے پھلکے پیڑوں پر اواخر اپریل کی دھوپ پڑ رہی تھی۔ اور ان میں سے لیموؤں کی خوشبو آ رہی تھی۔ سامنے گہری وادی کا منظر جنگل کے لمبے لمبے ٹیلوں تک پھیلا ہوا تھا۔ سٹیلا کو آبی رنگوں سے تصویریں کھینچنے کا شوق تھا۔ ہر ارمان انگیز منظر اس کے دل کو اپنی طرف کھینچ لیتا۔ اس پر طبیعت ایسی کہ جھٹ ہر بات کا فیصلہ کر لیتی۔ چنانچہ یہی مقام اسے موزوں معلوم ہوا۔ رنگوں کا ڈبہ ہاتھ میں لیا۔ اور موٹر سے نیچے اتری۔

"کیوں فرینک؟ یہ جگہ ٹھیک ہے"؟

ایشرسٹ کی شکل کچھ کچھ شلر سے ملتی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس کے ڈاڑھی تھی شلر کے ڈاڑھی نہ تھی۔ گالوں پر کے بال سفید تھے۔ لمبا قد۔ لمبی لمبی ٹانگیں۔ بڑی بڑی بھورے رنگ کی کھوئی کھوئی سی آنکھیں۔ جو پر معنی ہوتیں تو چہرے پر ایک حسن آجاتا۔ ناک ذرا ایک طرف کو۔ ڈاڑھی اور مونچھوں کے بیچ میں

ہونٹ ذرا کھلے ہوئے ۔ اڑتالیس برس کی عمر ۔ چپ چاپ کھانے کی ٹوکری اٹھائے موٹر سے نیچے اتر پڑا ۔

"دیکھو فرینک ! قبر"!

مرغزار کی اونچان سے ایک پگ ڈنڈی نیچے کو اترتی تھی ۔ جو جنگل کے تنگ خطے کے ساتھ ہو کر ایک پھاٹک میں سے نکل جاتی تھی ۔ جہاں یہ پگ ڈنڈی سڑک کو عموداً کاٹتی تھی ۔ وہاں سڑک کے کنارے مٹی کی ایک ڈھیری تھی ۔ چھ فٹ لمبی ۔ فٹ بھر چوڑی ۔ اوپر گھانس اگی ہوئی تھی ۔ مغرب کو ایک پتھر کھڑا تھا ۔ جس پر کوئی اللہ کا بندہ بلیک تھارن کی ایک ٹہنی اور کچھ نیلے پھول ڈال گیا تھا ۔ ایشرسٹ نے قبر کو دیکھا ۔ تو شاعرانہ دل امنڈ آیا ۔ سوچا چوراہے پر تو اسی شخص کی قبر بناتے ہیں جس نے خودکشی کی ہو! اللہ اللہ فانی انسان بھی کیسے کیسے توہمات پر تکیہ کرتا ہے! لیکن جو کوئی بھی یہاں دفن ہے ۔ سکھ کی نیند سو رہا ہے ۔ قبر کے سرہانے ایک ناہموار سا پتھر ہے ۔ سر پر کھلے آسمان کا سائبان ہے اور راہ چلتے لوگ فاتحہ پڑھ جاتے ہیں ۔ طبعی موت مرتا ۔ تو کسی قبرستان میں سجا ہوا مقبرہ ہوتا ۔ اور چاروں طرف بدوضع قبریں ۔ جن پر طرح طرح کے لاحاصل کلمات کندہ ہوتے ۔ منہ سے کچھ نہ بولا ۔ جانتا تھا گھر کے لوگوں میں فلسفہ بگھارنا بیہودہ ہے ۔ چپ چاپ مرغزار کی جانب چل دیا ۔ ایک دیوار کے نیچے کھانے کی ٹوکری رکھی ۔ بیوی کے بیٹھنے کو کمبل بچھایا ۔ (کیونکہ جب اسے بھوک لگیگی ۔ تو تصویر کشی چھوڑ کر یہیں آئیگی) اور جیب سے مرے کا ہپالٹس کا ترجمہ نکالا تھوڑی دیر میں سپرئین اور اس کے انتقام کی داستان پڑھ چکا ۔ تو آسمان کی طرف دیکھنے لگا ۔ نیلگوں آسمان پر بگلا سے بادلوں کو دیکھ کر ایشرسٹ کا دل آج اپنی شادی کی چھبیسویں سالگرہ کے دن نہ معلوم کس چیز کے لئے تڑپنے لگا ۔ سچ ہے ۔ زندگی اور فطرت انسانی کا آپس میں جوڑ نہیں ! انسان کی زندگی کتنی ہی پاک اور ارفع ہو ۔ پھر بھی اندر ہی اندر ایک ہوس ایک جستجو لگی رہتی ہے ۔ اور زندگی خالی خالی معلوم ہوتی ہے ۔ کیا عورتوں کے دل کا بھی یہی حال ہے ؟ یہ کون جانے ! انسان میں ایک جدت پسندی ہے جس کی وجہ سے وہ نت نئے عیش کی تلاش میں رہتا ہے ۔ اور مستانہ وار نت نئے خطروں میں پڑنا چاہتا ہے ۔ لیکن اگر اس کی تسکین ہو جائے ۔ تو جہاں پہلے طبیعت میں ایک تشنگی تھی ۔ وہاں اب ایک سیری آجاتی ہے ۔ طبیعت اکتا جاتی ہے ۔ اطمینان مفقود ہو جاتا ہے ۔ غرضیکہ یہ مرض لاعلاج ہے ۔ زندگی اور تہذیب یافتہ انسان کا آپس میں جوڑ نہیں ! انسان کو یہ قدرت تو حاصل ہے ۔ کہ حسن کو فن کے کسی نمونے کے اندر مقید کر کے ہمیشہ کے لئے ایک جگہ جکڑ رکھے ۔ اور جب اسے دیکھے یا پڑھے ۔ ہمیشہ اسی قابل قدر حلوا سی تسکین بخش نشے کا احساس ہو ۔ لیکن اُسے یہ قدرت نہیں ۔ کہ اسی طرح اپنی زندگی کے اندر بھی اپنی مرضی کا ایک گلزار بنائے ۔ جس میں بقول اس خوش گفتار یونانی کورس کے "سیب کا درخت ہو ۔ موسیقی ہو اور سنہری پھول ہوں" جس انسان کے اندر احساس حسن موجود ہے اُسے زندگی میں جنت نہیں مل سکتی ۔ دائمی مسرت اس کے قبضے سے باہر ہے ۔ بعض بعض لمحے البتہ اس قسم کی دلفریبی سے ضرور معمور ہوتے ہیں ۔ جن میں ایک سریع بیخودی آپ ہی آپ انسان پر طاری ہو جاتی ہے ۔ لیکن جتنی دیر میں ایک بادل سورج کے سامنے سے گزر جاتا ہے ۔ اتنی دیر میں یہ لمحے بھی گزر جاتے ہیں ۔ جس طرح فن حسن کو قید کر لیتا ہے ۔ اسی طرح ان لمحوں کو قید کر رکھنا ممکن نہیں ۔ یہ اُن لمحوں کی طرح گریز پا ہیں ۔ جن میں انسان کو اُس روح فطرت کے درخشاں یا جھلملاتے ہوئے جلوے کی ایک جھلک دکھائی دے جاتی ہے ۔ جو انسانوں سے دور اپنی سوچ میں مستغرق بیٹھی ہے ۔ اس مقام پر اور اس لمحے کے اندر جبکہ دھوپ اس کے چہرے پر پڑ رہی ہے ۔ تھارن کے درخت پر ککو بول رہا ہے ۔ گورس کی خوشبو سے ہوا میں شہد کی سی چاشنی ہے ۔ چاروں طرف بلیک تھارن اور نوخاستہ فرن کے چھوٹے چھوٹے پتوں کی ہریاول ہے اور سفید براق بادل پہاڑیوں اور پرکیف وادیوں کے اوپر آسمان پر

ہلکے ہلکے اُڑ رہے ہیں۔ ایشرسٹ کی آنکھوں کے سامنے قدرت کا جلوۂ پنہاں بے نقاب ہے۔ لیکن چشم زدن میں یہ جلوہ غائب ہو جائیگا۔ جیسے پین کا چہرہ جو ایک چٹان کے کونے پر سے دکھائی دے رہا ہو۔ انسان کی نگہ سے خوفزدہ ہو کر غائب ہو جاتا ہے۔ ایشرسٹ یکلخت اٹھ بیٹھا۔ اسے یکلخت اس بات کا احساس ہوا۔ کہ گھاس کا یہ تختہ۔ یہ تنگ سی سڑک۔ پیچھے یہ پرانی دیوار۔ یہ سب منظر کچھ مانوس سا معلوم ہوتا ہے۔ جب وہ موٹر میں سوار تھے۔ تو اس نے حسب عادت اس طرف توجہ ہی نہ کی تھی۔ لیکن اب تو وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ اس مقام سے کوئی آدھ میل کے فاصلے پر ایک فارم ہاؤس واقع تھا۔ جہاں سے وہ چھبیس سال ہوئے ایک دن اسی موسم میں ٹورکی کو روانہ ہوا تھا۔ اور یوں سمجھئے کہ پھر کبھی واپس نہ آیا تھا۔ دل میں ایک ٹیس اٹھی۔ گذشتہ زندگی کا ایک ایسا لمحہ یاد آگیا جس کی دلفریبی اور بیخودی ہاتھ میں آ کر نکل گئی تھی۔ ایک ایسا لمحہ جو پھڑپھڑاتا ہوا کسی نامعلوم دنیا کو اڑ گیا تھا۔ دفعتہً ایک ایسے زمانے کی یاد پھر تازہ ہو گئی جو شیرینی اور شباب سے لبریز تھا۔ لیکن جو یکلخت منقطع ہو گیا تھا۔ ہاتھوں کو ٹھوڑی کے نیچے رکھے اوندھے منہ زمین پر لیٹ گیا اور نوخاستہ سبزے کو جس کے بیچ میں ہاک ورٹ کے ننھے ننھے پھول اُگ رہے تھے۔ کھوئی ہوئی نظروں سے تکتا رہا۔ . . . . . .

اور جو کچھ اُسے یاد آیا۔ وہ یہ تھا۔

(۱)

فرینک ایشرسٹ اور اس کا دوست رابرٹ گارٹن ایک ہی کالج میں پڑھتے تھے۔ زمانۂ تعلیم کا آخری سال گزار چکنے کے بعد یکم مئی کو دونو سیاحت کی غرض سے پا پیادہ سفر کر رہے تھے۔ برینٹ سے پیدل چلے تھے اور ارادہ تھا۔ کہ چیگ فورڈ پہنچ کر دم لینگے۔ لیکن ایشرسٹ کے گھٹنے میں ایک دفعہ فٹ بال کھیلنے میں چوٹ لگی تھی۔ چلتے چلتے گھٹنے میں درد ہونے لگا۔ یہاں تک کہ قدم اٹھانا مشکل ہو گیا۔ نقشے کو دیکھا۔ تو ابھی سات میل باقی تھے۔ ایک چوراہے کے پاس جہاں ایک پگ ڈنڈی جنگل کے ساتھ ساتھ ہوتی ہوئی سڑک کو کاٹ کر نکل جاتی تھی۔ دونوں دوست سڑک کے کنارے گھاس پر بیٹھے سستا رہے تھے اور جیسا کہ نوجوانوں کا قاعدہ ہے۔ کائنات کے متعلق گفتگو کر رہے تھے۔ دونوں کا قد چھ فٹ سے اونچا تھا۔ اور جسم چھریرا ایشرسٹ کا رنگ ذرا پیلا تھا تخیل پسند طبیعت۔ ہمیشہ کھویا کھویا سا رہتا تھا۔ گارٹن نے نرالی طبیعت پائی تھی۔ جس کا اندازہ پوری طرح لگانا مشکل تھا۔ کچھ کرخت تھا۔ کچھ ٹیڑھا بینکا جیسے زمانہ قدیم کا کوئی حیوان ہو۔ دونو کو ادب سے بہت دلچسپی تھی۔ دونو سر سے ننگے تھے۔ ایشرسٹ کے بال ہلکے رنگ کے۔ ملائم اور لہروں والے تھے۔ اور کنپٹیوں پر سے یوں اوپر کو اٹھتے تھے جیسے کوئی ہمیشہ انہیں پیچھے کو جھٹک رہا ہو۔ گارٹن کے بال سیاہ رنگ کے تھے۔ اور از حد بے ترتیب۔ دونو دوست چلتے چلتے میلوں نکل گئے تھے۔ لیکن رستے میں اپنے سوا اور کوئی رہرو نظر نہ آیا تھا۔

گارٹن کہ رہا تھا۔ تم میری بات مان لو۔ رحم صرف شعور نفس کا نتیجہ ہے۔ یہ ایک ایسا مرض ہے جو آج سے پانچ ہزار سال پہلے مفقود تھا۔ جب رحم نہ تھا تو دنیا کے لوگ زیادہ مزے میں تھے

ایشرسٹ نے جو بادلوں کی حرکت کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ جواب دیا۔ بہرحال میرا یہ عقیدہ ہے۔ کہ دنیا میں رحم کا وہی رتبہ ہے۔ جو صدف کے اندر موتی کا ہے۔

گارٹن بولا۔ برخوردار موجودہ زمانے کی تمام بے اطمینانی رحم ہی کا نتیجہ ہے۔ جانوروں کو دیکھو۔ امریکہ کے اصلی باشندوں کو دیکھو انہیں صرف اپنے اپنے دکھ کا احساس ہے۔ اور اس کا موقع بھی کبھی کبھی پیش آتا ہے۔ لیکن ہمیں دیکھو۔ کسی دوسرے کی داڑھ میں بھی درد ہو۔ تو ہم بیقرار ہو جاتے ہیں۔ آخر اوروں پر ترس کھانے سے کیا حاصل؟ میں تو کہتا ہوں۔ وحشیوں کی طرح دوسروں کے غم سے نجات حاصل کرو اور اطمینان سے رہو۔

ایشرسٹ نے کہا۔ میں شرط لگاتا ہوں۔ کہ تم اس پر عمل کبھی

نہ کرو گے۔

گارتھن غور و فکر کے انداز میں اپنے بے ترتیب بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

"رکھ رکھاؤ کی زندگی میں انسان پوری طرح نشوونما نہیں پا سکتا۔ جذبات کو اپنے اوپر حرام کر لینا غلطی ہے۔ ہر جذبہ مفید ہوتا ہے۔ کیونکہ اس سے زندگی کو سیرابی حاصل ہوتی ہے۔"

"اور اگر کوئی جذبہ توقیر نسواں کے اصول کے منافی ہو۔ تو پھر؟"

"تم نے بالکل انگریزوں کی سی بات کی ہے۔ انگریزوں کے سامنے جذبے کا ذکر کرو۔ تو وہ سمجھتے ہیں۔ اس سے مراد جسمانی لذت ہے وہ جذبے کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں۔ لیکن شہوت سے نہیں گھبراتے۔ بشرطیکہ کسی اور کو معلوم نہ ہو جائے۔"

ایشرسٹ نے کچھ جواب نہ دیا۔ وہ ایک تنکے سے نیلے رنگ کے پھول کو آسمان کے سامنے رکھ کر گھما رہا تھا۔ تھارن کے ایک درخت پر ککو نے بولنا شروع کیا۔ خوش رنگ آسمان کے نیچے۔ جہاں پھول اُگ رہے ہوں اور پرندے چہچہا رہے ہوں۔ رابرٹ کی باتیں کتنی بے معنی معلوم ہوتی تھیں۔ ایشرسٹ بولا۔

"چلو اب چلیں۔ کسی فارم میں جگہ مل جائے۔ تو رات وہیں گزاریں"

جب یہ الفاظ کہے تو وہ دیکھ رہا تھا۔ کہ سامنے ایک لڑکی ٹوکری اٹھائے مرغزار کی اونچان سے نیچے اتر رہی ہے۔ آسمان کے بالمقابل (جو ایشرسٹ کو لڑکی کے خمیدہ بازو میں سے دکھائی دے رہا تھا) اس کے جسم کا خاکہ واضح نظر آ رہا تھا۔ ایشرسٹ نے جو حسن کا نظارہ کیا کرتا تھا۔ بغیر یہ سوچنے کے کہ اس سے فائدہ کیا پہنچتا ہے۔ دل میں کہا۔ "بہت خوب"! لڑکی نے گہرے رنگ کے موٹے اونی کپڑے کا سایہ پہن رکھا تھا۔ ہوا کے زور سے سایہ اس کی ٹانگوں کے ساتھ چمٹ رہا تھا۔ اور اس کی چھوٹی پرانی طاؤسی رنگ کی ٹوپی اوپر اٹھ گئی تھی۔ بھورے رنگ کا بلاوزر پرانا اور گھسا ہوا تھا جوتے پھٹے ہوئے تھے۔ اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ سرخ اور کھردرے تھے۔ گردن کا رنگ سانولا پڑ گیا تھا۔ اس کے پریشان بال اس کے فراخ ماتھے پر لہرا رہے تھے۔ چہرہ لمبا نہ تھا۔ اوپر کا ہونٹ چھوٹا سا تھا۔ اور دانت چمک رہے تھے۔ بھویں کالی اور سیدھی تھیں۔ پلکیں سیاہ اور لمبی لمبی۔ ناک سُتواں اور اس کی بھوری آنکھیں تو غضب ہی ڈھا رہی تھیں۔ ان میں شبنم کی سی تازگی اور حرارت تھی۔ گویا ابھی ابھی وا ہوئی ہیں۔ اس نے ایشرسٹ کی طرف دیکھا۔ شاید اُسے ایک لنگڑاتا ہوا آدمی (سر سے ننگا بال پیچھے کو جھٹکے ہوئے) جو اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے اسے تک رہا تھا۔ عجیب معلوم ہوا۔ ایشرسٹ کے سر پر ٹوپی تو تھی نہیں۔ ہاتھ کے اشارے سے سلام کیا اور بولا:۔

"یہاں پاس ہی کوئی فارم ایسا نہیں جہاں ہم رات گزار سکیں؟ میں چل نہیں سکتا۔ میری ٹانگ دکھتی ہے"۔

لڑکی بغیر شرمانے کے نرم نازک اور پیاری آواز میں بولی۔

"جناب یہاں قریب تو ہمارا ہی فارم ہے"۔

"کہاں"؟

"اس طرف۔ نیچے کو"۔

"ہم وہاں رات گزار سکتے ہیں"؟

"میرا خیال تو ہے"۔

"تو ہمیں رستہ بتا دو"۔

"آئیے"۔

ایشرسٹ لنگڑاتا لنگڑاتا ساتھ چل پڑا۔ جب وہ چپ ہوا تو گارتھن نے جرح شروع کر دی:۔

"تم ڈیون شائر کی رہنے والی ہو"؟

"نہیں جناب"!

"تو پھر"؟

"میرا وطن ویلز میں ہے"۔

"ٹھیک۔ میں بھی کہتا تھا کہ شکل سے تو تم کیلٹ معلوم ہوتی

ہو ـــــ تو یہ فارم تمہارا نہیں"؟
"نہیں۔ میری خالہ کا ہے"۔
"اور تمہارا خالو"؟
"وہ زندہ نہیں"۔
"تو فارم کا کام کون چلاتا ہے"؟
"میری خالہ اور خالہ کے تین لڑکے"۔
"تمہارا خالو تو ڈیون شائر کا رہنے والا تھا"؟
"جی ہاں"۔
"تمہیں یہاں آئے ہوئے بہت عرصہ گزر چکا ہے"؟
"سات سال"۔
"ویلز کے بعد یہ جگہ تمہیں کچھ پسند بھی آئی"؟
"معلوم نہیں جناب"۔
"شاید تمہیں ویلز اب یاد بھی نہ رہا ہو"۔
"اچھی طرح یاد ہے۔ وہ جگہ تو کچھ اور ہی تھی"۔
"مجھے بھی تم سے اتفاق ہے"۔
ایشرسٹ یکلخت بولا :۔
"تمہاری عمر کیا ہے"؟
"جناب۔ سترہ سال"۔
"اور تمہارا نام کیا ہے"؟
"میگن ڈیوڈ"۔
"ان کا نام رابرٹ گارٹن ہے۔ میرا نام فرینک ایشرسٹ ہے۔ ہمارا ارادہ تو تھا۔ کہ چیگ فورڈ پہنچنے سے پہلے دم نہ لیں۔ لیکن ـــ"
"مجھے افسوس ہے کہ آپ کی ٹانگ دکھ رہی ہے"۔
ایشرسٹ مسکرا دیا۔ اور جب وہ مسکراتا تھا تو اس کے چہرے پر ایک حسن سا آجاتا تھا۔
اونچان سے نیچے اتر کر جنگل کے برابر سے نکلے تو سامنے فارم دکھائی دیا۔ پتھر کی ایک عمارت تھی۔ لمبی اور نیچی نیچی۔ کھڑکیوں میں پٹ لگے تھے۔ اردگرد ایک احاطہ تھا۔ جس میں سؤر اور مرغیاں اور ایک بوڑھی گھوڑی ادھر ادھر پھر رہی تھی۔ پرے کو گھاس سے ڈھکی ہوئی ایک پہاڑی تھی۔ جس پر سکاچ فر کے چند درخت اگ رہے تھے۔ سامنے سیب کے درختوں کا ایک پرانا باغ تھا۔ جن کے شگوفے پھوٹ رہے تھے۔ باغ کے کنارے کنارے ایک ندی بہ رہی تھی۔ اور ندی کے پار ایک لمبا مرغزار پھیلا ہوا تھا۔ سیاہ اور ترچھی آنکھوں والا ایک چھوٹا سا لڑکا ایک سؤر کی رکھوالی کر رہا تھا۔ گھر کے دروازے کے پاس ایک عورت کھڑی تھی جو انہیں دیکھ کر آگے بڑھی۔ لڑکی نے کہا :۔
"یہ میری خالہ مسز نیروکومب ہیں"
خالہ مسز نیروکومب کی آنکھ بچوں والی جنگلی بطخ کی مانند سیاہ اور تیز تھی۔ گردن میں بھی وہی سانپ کی سی اٹھان تھی۔
ایشرسٹ نے کہا۔" ہمیں آپ کی بھانجی رستے میں مل گئی۔ یہ کہتی ہے۔ یہاں رات بسر کرنے کا انتظام ہو جائیگا"۔
"ہو تو جائیگا۔ لیکن آپ دونو کو ایک ہی کمرے میں سونا پڑیگا۔ میگن بیٹی جاؤ۔ وہ خالی کمرہ ان کے لئے صاف کر دو۔ کریم کا ایک پیالہ بھی لیتی آنا۔ چائے تو آپ پئینگے"؟
یو کے دو درختوں اور چند پھولدار جھاڑیوں سے ایک محراب سی بنی ہوئی تھی۔ لڑکی اس میں سے گزر کر گھر کے اندر غائب ہو گئی گلابی رنگ کے پھولوں اور یو کے سبز پتوں کے سامنے اس کی ٹوپی کا طاؤسی رنگ بھلا معلوم ہوتا تھا۔
"آپ کی ٹانگ میں تکلیف ہو رہی ہوگی۔ چل کر پارلر کے اندر آرام کیجئے ـــ آپ کالج میں پڑھتے ہیں"؟
"پڑھتے تھے اب تو فارغ ہو چکے"۔
مسز نیروکومب نے دانشمندانہ انداز میں سر ہلایا۔
پارلر کا فرش اینٹوں کا تھا اور اس پر چمکتی ہوئی صاف کرسیاں

اور ایک سوفا پڑا تھا جس کے گدیلوں میں گھوڑے کے بال بھرے ہوئے تھے۔ ایک میز بھی۔ مگر اس پر میز پوش نہ تھا۔ کمرہ اس قدر صاف تھا۔ کہ معلوم ہوتا تھا کبھی استعمال نہیں ہوا۔ ایشرسٹ فوراً سوفے پر جا بیٹھا اور دکھتے ہوئے گھٹنے کو ہاتھوں میں تھام لیا۔ مسز نیرو کومب اسے بغور دیکھتی رہی۔ ایشرسٹ اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کا باپ کیمیا کا ایک سابق پروفیسر تھا۔ تاہم لوگوں کو اس لڑکے میں امیرانہ تکبر نظر آتا تھا۔ گو ایشرسٹ کو اپنی عالی نگاہی کی وجہ سے اکثر ان کی موجودگی تک کا احساس نہ ہوتا۔

"یہاں کوئی ندی ہے۔ جہاں ہم نہا سکیں"؟

"باغیچے کے ساتھ ایک ندی ہے۔ لیکن اس میں تو بیٹھ کر بھی سر تک پانی نہیں پہنچتا"۔

"کتنی گہری ہے"؟

"یہی کوئی ڈیڑھ فٹ"۔

"اوہ تو بہت ٹھیک ہے۔ ہے کس طرف کو"؟

"پگ ڈنڈی کے ساتھ ساتھ چلے جائیے۔ دائیں ہاتھ کو جو دوسرا پھاٹک آئیگا۔ اس میں سے گزر کر سامنے ایک بڑا سا سیب کا درخت ہے۔ سب سے الگ۔ اس کے پاس ہی تالاب ہے۔ مچھلیاں پکڑنے کا شوق ہو تو تالاب میں مچھلیاں بھی ہیں"۔

"مچھلیاں ہمیں ہی نہ پکڑ لیں"۔

مسز نیرو کومب مسکرا دی اور بولی۔ "جب آپ واپس آئینگے تو چائے تیار ہوگی"۔

ندی میں ایک جگہ ایک چٹان کا بند لگا تھا۔ جس سے پانی رک گیا تھا اور ایک تالاب سا بن گیا تھا جس کی تہ ریتلی تھی۔ وہ بڑا سا سیب کا درخت سب درختوں سے نیچا تھا۔ اتنا نیچا۔ کہ اس کی شاخیں ندی کے پانی پر جھکی پڑتی تھیں۔ کونپلیں پھوٹ آئی تھیں۔ شگوفے کھلنے کو تھے اور قرمزی کلیاں چٹک رہی تھیں۔ اس چھوٹے سے تالاب میں ایک ہی آدمی نہا سکتا تھا۔ چنانچہ ایشرسٹ کنارے پر منتظر کھڑا اپنے گھٹنے کو ملتا رہا۔ اور اس مرغزار کا نظارہ کرتا رہا۔ جس میں چٹانوں کے درمیان تھارن کے درخت اور جنگلی پھول اُگ رہے تھے۔ پرے ایک اونچے مگر ہموار ٹیلے پر بیچ کے درختوں کا جھنڈ تھا۔ ہر شاخ ہوا میں جھوم رہی تھی۔ بہار کا ہر پرندہ چہچہا رہا تھا۔ اور سورج کی ترچھی شعاعوں سے گھاس پر دھوپ چھاؤں کی شطرنجی سی بچھی تھی۔ اسے کئی چیزیں یاد آئیں۔ تھیوکرٹس اور دریائے چرول۔ چاندنی اور وہ دوشیزہ جس کی آنکھوں میں شبنم کی سی تازگی اور طراوت تھی اتنی باتیں یاد آئیں۔ کہ معلوم ہوتا تھا کسی بات کا خیال نہیں اور وہ بغیر کسی وجہ کے خوش تھا۔

۲

چائے دیر سے پی گئی۔ لیکن تھی پر تکلف۔ کھانے کو ساتھ انڈے کریم۔ مربّہ اور پتلے پتلے تازہ کیک تھے جن پر زعفران کے چھینٹے دئے ہوئے تھے۔ چائے کے دوران میں گارتھ کیلٹ قوم کے متعلق ایک طویل تقریر کرتا رہا۔ ان دنوں ہر جگہ کیلٹوں کا چرچا تھا۔ گارتھ خود بھی کیلٹ تھا۔ اور جب اسے یہ معلوم ہوا۔ کہ اس کنبے میں بھی اسی قوم کا خون موجود ہے۔ تو اس قدر دلچسپی پیدا ہوئی۔ کہ آپے سے باہر ہو گیا۔ وہ ایک کرسی پر دراز تھا۔ جس کے گدیلوں میں گھوڑے کے بال بھرے تھے۔ ہاتھ کا بنایا ہوا سگرٹ اس کے خمدار ہونٹوں کے کنج میں جیسے لٹک رہا تھا۔ اپنی چھوٹی چھوٹی سرد مہر آنکھوں کو ایشرسٹ کی آنکھوں میں ڈالے اہل ویلز کی شائستگی کو سراہتا رہا۔ ویلز کو چھوڑ کر انگلستان میں آجانا ایسے ہی ہے جیسے انسان چینی کے برتنوں کو چھوڑ کر مٹی کے برتن استعمال کرنے لگے! فرینک آخر پھر انگریز ہے۔ اسے کیا معلوم اس ویلز کی رہنے والی لڑکی میں کس درجہ شائستگی اور اس کی فطرت میں جذبات کی کس قدر گنجائش ہے! اپنے گیلے سیاہ بالوں کو ہلکے ہلکے اپنی انگلیوں سے پریشان کرتا رہا اور بالوضاحت یہ ثابت کیا۔ کہ یہ لڑکی عین بعین ان نظموں کے مطابق ہے۔ جو ویلز کے کسی داستان گو شاعر نے بارھویں صدی میں لکھی تھیں۔

ایشرسٹ سوفے پر چت لیٹا گہرے رنگ کا ایک پائپ پی رہا تھا۔ تھا قد آور اس لئے ٹانگیں سوفے سے بہت باہر نکلی ہوئی تھیں اس نے گارتھ کی باتوں کو توجہ سے نہ سنا۔ جب لڑکی دوبارہ کیک

لے کر اندر آئی تھی ۔ اس وقت سے اس کی شکل (جسے دیکھ لینا پھول یا قدرت کے کسی اور حسین منظر کی دید سے کم نہ تھا) آنکھوں میں سمائی ہوئی تھی ۔ لڑکی نے عجیب انداز کے ساتھ ایک جھرجھری لے کر اپنی آنکھیں نیچی ڈال لی تھیں اور چپ چاپ کمرے سے باہر نکل گئی تھی ۔

گارٹن نے کہا ۔ چلو باورچی خانے میں چل کر اسے ایک نظر اور دیکھ لیں ۔

باورچی خانے کی دیواروں پر سفیدی پھری ہوئی تھی ۔ چھت میں بڑے بڑے شہتیر لگے تھے ۔ جن میں بھنی ہوئی سوٴر کی رانیں لٹک رہی تھیں کھڑکی میں پھولوں کے گملے پڑے تھے ۔ دیوار پر بندوقیں چینی اور جست کے عجیب و غریب آبخورے اور ملکہ وکٹوریا کی تصویریں کیلوں سے آویزاں تھیں ۔ بیچ میں معمولی لکڑی کی ایک لمبی تنگ سی میز بچھی تھی ۔ جس پر پیالے اور چمچے رکھے ہوئے تھے ۔ اوپر چھت سے پیاز کی گٹھیوں کی ایک لڑی لٹک رہی تھی ۔ آتشدان خاصا گہرا تھا جس کے ایک طرف دو چھوٹے لڑکے بڑی تمیز کے ساتھ نچلے بیٹھے تھے ۔ اور دوسری طرف ایک بھوری آنکھوں اور سرخ چہرے والا موٹا سا جوان آدمی بیٹھا سن کے پھوسڑوں سے بندوق کی نالی صاف کر رہا تھا ۔ اس کی پلکوں اور سر کے بالوں کی رنگت بالکل ان پھوسڑوں کی سی تھی ۔ دونوں کے درمیان ایک بڑے دیگچے میں اسٹو پک رہا تھا ۔ جو خوشبو سے بہت خوش ذائقہ معلوم ہوتا تھا ۔ اور سامنے مسز نیرڈکومب کسی سوچ میں میٹھی چمچہ ہلا رہی تھی ۔ دو اور نوجوان جن کی آنکھیں ترچھی اور بال سیاہ تھے اور جو چہروں سے ان دو چھوٹے لڑکوں کی طرح عیار معلوم ہوتے تھے ۔ دیوار کے ساتھ سہارا لگائے آپس میں باتیں کر رہے تھے ۔ ایک پست قد ادھیڑ عمر کا آدمی ۔ داڑھی مونچھ منڈی ہوئی کارڈورائی کی برجس پہنے کھڑکی میں بیٹھا ایک پرانا سا اخبار پڑھ رہا تھا ۔ صرف میگن ہی کام کاج میں لگی ہوئی تھی اور پیپے میں سے سیب کی شراب کے جگ بھر بھر کر میز پر رکھتی جا رہی تھی ۔

ظاہر تھا ۔ کہ یہ لوگ کھانے پر بیٹھنے والے ہیں ۔ چنانچہ گارٹن بولا :۔

" اگر آپ لوگوں کو کوئی اعتراض نہ ہو تو ہم کھانے کے بعد آجائیں "

اور جواب کا انتظار کئے بغیر دونو پھر پارلر میں آ بیٹھے ۔ لیکن باورچی خانے کی اس رونق ۔ اس گرماہٹ ان خوشبوؤں اور ان چہروں کے بعد یہ چمک دار کمرہ پہلے سے بھی کچھ اجاڑ معلوم ہونے لگا ۔ دونو دوست پژمردہ ہو کر پھر اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے ۔

" لڑکے شکل سے بالکل جپسی معلوم ہوتے ہیں ۔ ان میں صرف ایک لڑکا سیکسن تھا ۔ وہ جو بیٹھا بندوق صاف کر رہا تھا ۔ اور وہ لڑکی تو نفسیاتی نقطہ نظر سے دقیق مطالعے کی چیز ہے "

ایشرسٹ کے ہونٹ پھڑک اٹھے ۔ گارٹن اسے اس وقت بالکل گدھا معلوم ہوتا تھا ۔ دقیق مطالعے کی چیز ! کیا بکواس ہے ! وہ لڑکی تو جنگل کا ایک پھول ہے ۔ جسے دیکھنے سے دل کو ٹھنڈک سی ہوتی ہے ۔ مطالعہ !

گارٹن بولا :۔

" جذباتی لحاظ سے وہ لڑکی ایک حیرت انگیز چیز ہے ۔ صرف اس کے بیدار ہونے کی کسر ہے "۔

" تو کیا جناب اسے بیدار کیجئے گا " ؟

گارٹن اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا ۔ اس کا خم دار تبسم کہہ رہا تھا " کیا بد مذاقی کی بات ہے ! بالکل انگریزوں کی سی " !

ایشرسٹ پائپ کے کش لگاتا رہا ۔ بیدار ہونے کی کسر ہے ! اس بیوقوف گارٹن کو تو دیکھو ۔ اپنے آپ کو کیا کچھ سمجھے بیٹھا ہے ! ایشرسٹ نے کھڑکی کھول دی اور جسم باہر کو جھکا کر کھڑا ہو گیا ۔ باہر اندھیرا ہو چکا تھا ۔ گاڑی خانے اور فارم کی عمارتیں دھندلی اور نیلی نیلی ۔ اور سیب کے درختوں کا باغیچہ غیر واضح نظر آ رہا تھا ۔ ہوا میں ان لکڑیوں کے دھوئیں کی بو تھی جو باورچی خانے میں جل رہی تھیں ۔ ایک پرندہ جو ابھی جاگ رہا تھا ۔ بیدلی سے چہچہایا

گویا اسے اندھیرے پر تعجب ہو رہا ہے۔ اصطبل سے ایک گھوڑے کی جو کھڑا دانہ کھا رہا تھا شیردمی اور جھولنے کی آواز آئی۔ سامنے جنگل تھا جو تاریکی میں دور دور تک پھیلا ہوا معلوم ہوتا تھا اور اس سے پرے محجوب ستارے تھے جو ابھی پوری طرح عریاں نہ ہوئے تھے اور جن کی سفید شعاعوں نے گہرے نیلے آسمان کو چھلنی کر دیا تھا۔

ایک الو کی لرزتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ایشرسٹ نے ایک لمبا سانس لیا۔ ایسی رات میں باہر آزاد پھرنا کتنا پرلطف ہوگا! تھوڑی دیر کے بعد سڑک پر کھلے سموں کے ٹاپوں کی آواز آئی اور تین ٹٹو اس اندھیرے میں دھندلے سیاہ سلسلے سے گزرتے دکھائی دئیے جن کی کالی ایال دار گردنیں پھاٹک کے اوپر سے نظر آ رہی تھیں۔ جب اس نے پائپ کو ٹھونک کر خالی کیا۔ اور اس میں سے شرارو کی ایک پھلجھڑی سی نکلی۔ تو جانور بدک کر بھاگ نکلے۔ ایک چمگادڑ پھڑپھڑاتی ہوئی نکل گئی۔ اس کی ہلکی ہلکی چیپ چیپ کی آواز شکل سے سنائی دیتی تھی۔ ایشرسٹ نے اپنا بازو پھیلا دیا ہتھیلی پر اوس پڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ یکلخت اسے اوپر کی منزل میں بچوں کی آوازیں سنائی دیں۔ ان کے چھوٹے چھوٹے جوتے تھپ تھپ فرش پر گرے اور پھر ایک نرم اور نازک آواز سنائی دی۔ لڑکی کی آواز — جو بچوں کو بستر میں سلا رہی تھی۔ تو الفاظ صاف اور واضح طور پر کان میں پڑے: "نہیں رِک میں بلی کو ساتھ نہ سلانے دوں گی"۔ پھر ننھے بچوں کے قہقہوں کی آواز آئی۔ کسی نے ہلکے سے ان کے ایک تھپڑ مارا اور پھر کوئی ہلکی آواز میں ایسی پیاری ہنسی ہنسا۔ کہ ایشرسٹ کانپ سا گیا۔ پھر ایسی آواز آئی جیسے کسی نے پھونک ماری ہو۔ موم بتی جس کی روشنی تاریکی پر انگلیاں پھیر رہی تھی بجھ گئی اور خاموشی چھا گئی۔ ایشرسٹ کھڑکی سے ہٹ آیا اور کمرے میں آ کر بیٹھ گیا۔ اس کا گھٹنا دکھ رہا تھا اور اس کی روح ملول تھی۔

گارٹن سے کہا "تمہیں باورچیخانے میں جانا ہو تو جاؤ میں تو سونے چلا ہوں"۔

(۳)

ایشرسٹ ہمیشہ غفلت کی نیند سوتا تھا۔ لیکن جب گارٹن سونے کے کمرے میں آیا۔ تو گو ایشرسٹ بظاہر گہری نیند میں تھا۔ لیکن درحقیقت بالکل جاگ رہا تھا۔ کمرے کی چھت نیچی تھی۔ گارٹن بستر میں لٹ لٹا کر چت لیٹا تاریکی کے طلسم پر ناک بھوں چڑھا کر دنیا و ما فیہا سے بیخبر پڑا تھا۔ لیکن ایشرسٹ کو الوؤں کے بولنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس کا گھٹنا دکھ رہا تھا۔ لیکن اس کے علاوہ اسے اور کوئی تکلیف نہ تھی۔ دنیا کے تفکرات رات کے وقت ایشرسٹ کے آرام میں کبھی خلل انداز نہ ہوتے تھے اور سچ پوچھو تو اسے زندگی میں کوئی فکر ہی نہ تھا۔ بیرسٹروں کی فہرست میں نام درج ہو چکا تھا۔ تصنیف و تالیف کا شوق تھا۔ دنیا اس کے سامنے کھلی پڑی تھی۔ والدین کی وفات کے بعد گھر کے علائق سے بھی پاک ہو چکا تھا۔ ذاتی آمدنی چار سو پاؤنڈ سالانہ تھی۔ اب اس کی آزادی میں بھلا کیا حائل تھا؟ جہاں چاہے جائے۔ جو چاہے کرے۔ جب چاہے کرے۔ اس کا بستر سخت تھا۔ اس لئے اسے بخار نہ ہونے پایا۔ سرہانے کے پاس ایک کھڑکی کھلی تھی۔ جس میں سے رات کی خوشبو کمرے کے اندر پھیل رہی تھی اور ایشرسٹ بستر میں لیٹا اس خوشبو کو سونگھ رہا تھا۔ گارٹن سے کھچا ہوا تھا اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ تین دن تک پیدل سفر میں جس شخص کا ساتھ رہا ہو اس سے کھچ جانا قدرتی امر ہے۔ لیکن اس کے علاوہ اس رات اس کے باقی تمام خیالات شفقت آمیز تھے۔ بعض تصورات سے تو دل میں ہوکیں اٹھ رہی تھیں بعض سے طبیعت میں ایک ہیجان سا پیدا ہوتا تھا۔ اسے اس نوجوان کا چہرہ یاد آیا جو باورچیخانے میں بیٹھا بندوق صاف کر رہا تھا۔ جب دونوں دوست باورچیخانے میں داخل ہوئے تھے۔ تو اس نے یکلخت آنکھیں اٹھا کر پہلے ان دونوں کو اور پھر فوراً ہی اس لڑکی کو جو اس وقت سیب کی شراب کا

مگ اٹھائے جا رہی تھی ایک نظر دیکھا تھا۔ اس کی نظر میں نہ ذہانت پائی جاتی تھی نہ بیدلی۔ تاہم وہ ایسے آدمی کی نظر ضرور تھی جو دفعتاً چونک اٹھا ہو۔ اُس وقت ایشرسٹ نے اس بات کا دھیان بھی نہ کیا تھا لیکن حیرت ہے۔ کہ اس کا تصور نہایت واضح طور پر اس کے ذہن میں محفوظ تھا۔ جس طرح اس لڑکی کا تر و تازہ چہرہ اسے نہ بھولتا تھا۔ ویسے ہی اس نوجوان کا سرخ چہرہ۔ نیلی آنکھیں ہلکے رنگ کی پلکیں اور سن کے سے بال بھی اس کی یاد سے محو نہ ہوتے تھے۔ کھڑکی کے سامنے پردہ نہ تھا۔ اس کی بجائے تاریکی کی ایک مستطیل سی دکھائی دے رہی تھی۔ رفتہ رفتہ اس تاریکی میں سحر کی روشنی نمودار ہوئی۔ ایک نیم خوابیدہ کوّے کی بیٹھی ہوئی آواز سنائی دی۔ اس کے بعد پھر گہری خاموشی چھا گئی۔ اور پھر تھوڑی دیر کے بعد ایک بلیک برڈ نے جس کی آنکھ ابھی پوری طرح نہ کھلی تھی۔ اپنی خوش الحانی سے خاموشی کے طلسم کو برہم کر دیا۔ کھڑکی کے چوکھٹے میں بڑھتی ہوئی روشنی کی مستطیل کو دیکھتے دیکھتے ایشرسٹ کی آنکھ لگ گئی۔

دوسرے دن اس کا گھٹنا بہت سوجا ہوا تھا۔ اس لئے پیدل سفر کا ارادہ ترک کرنا پڑا۔ گارٹن کو اگلے دن لندن پہنچنا تھا۔ وہ دوپہر کے وقت وہاں سے رخصت ہو گیا۔ چلتے وقت اس کے ہونٹوں پر ایک طنز آمیز تبسم دیکھ کر ایشرسٹ بہت چڑا۔ لیکن جب وہ دوڑتا دوڑتا ڈھلوان سڑک کے موڑ تک پہنچ کر نظر سے اوجھل ہو گیا۔ تو ایشرسٹ کا غصہ فوراً اتر گیا۔ یُو کے درختوں کی محراب کے پاس گھاس کا ایک قطعہ تھا۔ ایشرسٹ دن بھر وہیں ایک سبز رنگ کی چوکی پر آرام سے بیٹھا رہا۔ سورج کی شعاعیں خوشبودار پھولوں کا عطر کھینچ رہی تھیں اور پھولدار جھاڑیوں سے بھینی بھینی خوشبو آرہی تھی۔ ایشرسٹ ایک سرور کے عالم میں بیٹھا کبھی پائپ سلگا لیتا۔ کبھی منظر کا لطف اٹھاتا۔ اور کبھی کسی سوچ میں مصروف ہو جاتا۔

ایک فارم کے اندر بہار کے موسم میں بیشمار ہستیاں عالمِ وجود میں آتی ہیں۔ ننھی ننھی جانیں انڈوں اور کلیوں سے جنم لیتی ہیں۔ فارم کے لوگ اس عمل کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور نوزائیدہ ہستیوں کی دیکھ بھال اور پرورش میں لگ جاتے ہیں۔ ایشرسٹ اس قدر چپ چاپ بیٹھا تھا۔ کہ ایک مادہ ہنس اپنے چھ بچوں کو جن کی گردنیں زرد اور میٹھے بھورے رنگ کی تھی۔ ساتھ لئے مٹکتی مٹکاتی قریب آ پہنچی اور بچے ایشرسٹ کے پیروں کے پاس گھاس کے پتوں پر اپنی ننھی ننھی چونچیں تیز کرنے لگے۔ کبھی کبھی مسز نیرو کومب یا میگن آن کر پوچھ جاتی کہ کیوں صاحب آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔ ایشرسٹ مسکرا کر جواب دیتا۔ نہیں تھینک یُو! مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں یہاں بڑے مزے میں ہوں۔ چائے کے وقت وہ دونو سیاہ رنگ کی ایک لمبی سی پلپٹس ایک پیالے میں ڈال کر اپنے ساتھ لائیں۔ سوجے ہوئے گھٹنے کو دیر تک غور سے دیکھتی رہیں اور پلپٹس اس پر باندھ گئیں۔ جب وہ چلی گئیں۔ تو ایشرسٹ کو لڑکی کا وہ نیچی آواز میں "اوئی" کہنا۔ وہ ہمدردی کی نظروں سے دیکھنا وہ ماتھے پر ہلکی سی تیوری ڈالنا یاد آیا۔ اور جب اسے خیال آیا۔ کہ گارٹن اس لڑکی کے متعلق کتنی فضول باتیں کرتا تھا۔ تو ایک بار پھر گارٹن سے چڑ ہو گئی۔ اس نے یہ ذرا نہ سوچا کہ آخر اس میں چڑنے کی کیا بات ہے۔ جب لڑکی چائے لائی۔ تو ایشرسٹ نے پوچھا :-

"میگن۔ یہ تو کہو۔ میرا دوست بھی تمہیں پسند آیا"؟

میگن نے منہ سکوڑ لیا۔ گویا ڈرتی تھی۔ کہ کہیں مسکرا دوں تو بدتمیزی نہ سمجھی جائے۔ پھر بولی

"بڑے ہنسوڑ تھے وہ۔ ہم سب کو ہنساتے رہے ——
وہ بہت لائق معلوم ہوتے تھے"۔

"کیا ایسی بات کہی انہوں نے' جو تم سب کو ہنسا دیا"؟

"وہ مجھ سے کہتے تھے۔ تم بارڈوں کی بیٹی ہو۔ بارڈ کیا ہوتے ہیں"؟

"بارڈ ان شاعروں کو کہتے ہیں۔ جو آج سے کئی سو سال پہلے ویلز میں رہتے تھے"۔

"تو بھلا میں ان کی بیٹی کیونکر ہوئی"؟

"میرے دوست کا مطلب یہ تھا۔ کہ وہ تم ہی جیسی لڑکیوں کے متعلق گیت گایا کرتے تھے۔"

میگن نے اپنی بھویں سکیڑ کر کہا۔" انہیں مذاق سوجھا ہوگا کیا میں ویسی لڑکی ہوں"؟

"میری بات پر یقین کر لوگی"؟

"کیوں نہیں"!

"میرے خیال میں وہ سچ کہتا تھا۔"

لڑکی مسکرا دی۔

ایشرسٹ نے دل میں کہا۔" تم واقعی خوبصورت ہو۔"

"وہ یہ بھی کہتے تھے۔ کہ جو شکل وصورت سے سیکسن معلوم ہوتا ہے۔ اس کا کیا مطلب تھا"؟

"جو کونسا ہے؟ وہ جس کی نیلی نیلی آنکھیں اور لال لال چہرہ ہے"؟

"ہاں وہ میرے خالو کا بھتیجا ہے۔"

"اچھا؟ تمہاری خالہ کا لڑکا نہیں"؟

"نہ۔"

"ان کا مطلب یہ تھا۔ کہ جو کی شکل ان لوگوں سے ملتی ہے جو تقریباً چودہ سو سال پہلے انگلستان پر آ کر قابض ہو گئے تھے۔"

"اچھا؟ ان کا حال تو میں جانتی ہوں۔ تو کیا جو واقعی سیکسن ہے"؟

"گارٹن کو ایسی باتوں کا جنون ہے۔ لیکن جو کا چہرہ قدیم زمانے کے سیکسنوں سے کچھ کچھ ملتا ضرور ہے۔"

"ٹھیک ہے۔"

میگن کے اس آخری جملے سے ایشرسٹ کے دل میں گدگدی ہوئی۔ مختصر سا جملہ تھا۔ لیکن اس میں کتنی سادگی اور خوش اسلوبی پائی جاتی تھی۔ ظاہر ہے۔ کہ یہ بات اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ پھر بھی اس نے کس سلیقہ اور شائستگی کے ساتھ ہاں میں ہاں ملا دی تھی۔

"وہ کہتے تھے۔ کہ باقی لڑکے تو سب کے سب نرے جپسی ہیں یہ بھلا کیوں کہا؟ خالہ ہنس تو دیں لیکن یہ بات ناگوار انہیں ضرور گذری اور میری خالہ کے بیٹوں کو تو بہت غصہ آیا۔ خالو تو کسان تھے۔ کہیں کسان بھی جپسی ہوتے ہیں؟ — یوں لوگوں کا دل دکھانا بہت بری بات ہے۔"

ایشرسٹ کے دل میں آیا! اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کے بھینچے۔ لیکن منہ سے صرف اتنا کہا۔" میگن تم سچ کہتی ہو — اور ہاں کل رات تم ہی بچوں کو بستر میں سلا رہی تھیں نا؟ مجھے نچلی منزل میں آواز آ رہی تھی۔"

میگن کے چہرے پر ہلکی سی سرخی دوڑ گئی۔" آپ چائے پیجئے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ کہیں تو میں اور چائے لا دوں"؟

"کبھی تمہیں اپنے کسی کام کو بھی فرصت ملتی ہے"؟

"واہ ملتی کیوں نہیں"؟

"آخر میرے بھی آنکھیں ہیں۔ میں نے تو تمہیں فارغ کبھی نہیں دیکھا۔"

میگن نے ماتھے پر تیوری ڈال لی۔ جیسے دماغ میں کوئی بات ہے۔ جسے سلجھا نہیں سکتی۔ چہرہ اور بھی لال ہو گیا۔ جب وہ چلی گئی۔ تو ایشرسٹ نے سوچا۔ کیا وہ یہ سمجھتی تھی۔ کہ میں اس سے دل لگی کر رہا ہوں۔ میں تو ایسے مذاق پر موت کو ترجیح دیتا ہوں۔

ایشرسٹ کی وہ عمر تھی۔ جس میں بعض لوگ حسن کو ایک پھول سمجھتے ہیں۔ اور اس کے نظارے سے ان کے دل میں عورت کی توقیر کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ ایشرسٹ اپنے گرد و پیش سے اکثر غافل رہتا تھا۔ چنانچہ اسے یہ احساس دیر کے بعد ہوا کہ وہ نوجوان جس کے متعلق گارٹن نے کہا تھا کہ شکل سے سیکسن معلوم ہوتا ہے

اصطبل کے دروازے کے باہر کھڑا ہے۔ بادامی رنگ کی میلی سی برجس کیچڑ سے بھرے ہوئے گیٹر اور نیلے رنگ کی قمیص میں وہ ایک رُوکھی پھیکی چیز معلوم ہوتا تھا۔ نہ چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ نہ بشرے پر ذہانت کے آثار۔ کسی اڑیل جانور کی طرح بجس و حرکت کھڑا تھا۔ چہرہ اور بازو سرخ تھے۔ سر پر دھوپ پڑ رہی تھی جس کی وجہ سے اس کے بال کاتی ہوئی اون کی طرح معلوم ہوتے تھے۔

جب اس نے دیکھا۔ کہ ایشرسٹ میری طرف دیکھ رہا ہے۔ تو احاطے میں سے گزر کر باورچیخانے کے دروازے کی طرف چل دیا۔ اور مکان کے کونے پر سے مڑ کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ چال سے ظاہر ہوتا تھا کہ نوجوان دیہاتی دہقانوں کی طرح آہستہ آہستہ بھاری بھاری قدم نہ اٹھا سکنے کی وجہ سے شرماتا ہے۔ ایشرسٹ پژمردہ سی پڑ گئی۔ اکھڑ لوگ! طبیعت پر کتنا ہی زور ڈالئے ایسے لوگوں سے نباہ بھلا کیسے ممکن ہے؟ لیکن اس لڑکی کو دیکھو۔ جوتے پھٹے ہوئے کھردرے ہاتھ۔ پھر بھی اس میں کتنی رعنائی ہے؟ شاید گارٹن ہی کا کہنا ٹھیک ہو۔ اور یہ سب کیلٹ خون کا اثر ہو۔ بہت ممکن ہے اس کی تعلیم اس سے زیادہ نہ ہو۔ کہ تھوڑا بہت لکھ پڑھ لیتی ہو لیکن وہ تو ہیرے کی مانند ہے۔ اسے تو قدرت ہی نے نجیب و اصیل پیدا کیا ہے۔

وہ ڈاڑھی مونچھ منڈا ادھیڑ عمر کا آدمی جسے کل رات باورچیخانے میں دیکھا تھا۔ ایک کتے کو ساتھ لئے احاطے میں داخل ہوا۔ گایوں کو دودھ دہنے لے جا رہا تھا۔ ایشرسٹ کو اب معلوم ہوا۔ کہ ایک ٹانگ سے لنگڑا ہے۔

"اچھے اچھے جانور لئے جا رہے ہو"۔

لنگڑے آدمی کا چہرہ چمک اٹھا۔ اس کی نظریں اوپر اٹھی رہتی نہیں (مدتوں دکھ سہنے سے آنکھ میں اکثر یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے)۔

"ہاں بہت خوبصورت ہیں۔ دودھ بھی بہت دیتی ہیں"

اُن کی شکل ہی سے معلوم ہو رہا ہے"۔

"آپ کی ٹانگ تو پہلے سے بہتر ہے"؟

"تھینک یو۔ رفتہ رفتہ اچھی ہو رہی ہے"۔

لنگڑے آدمی نے اپنی ٹانگ کو ہاتھ لگا کر کہا۔" اس دکھ کو میں خوب جانتا ہوں۔ صاحب! گھٹنے کی تکلیف بہت بڑی تکلیف ہے۔ میرا گھٹنا دس سال سے خراب ہے"۔

ایشرسٹ نے آواز سے ہمدردی کا اظہار کیا (ایسی ہمدردانہ آواز نکالنا مرفہ الحال لوگوں کے لئے بہت سہل بات ہے) لنگڑا آدمی پھر مسکرا دیا۔

"پھر بھی خدا کا شکر ہے۔ ورنہ وہ تو ٹانگ ہی کاٹنے لگے تھے"

"اچھا"؟

"جی ہاں۔ اور پہلے تو بہت ہی برا حال تھا۔ بس تو اسے بہت ہی غنیمت سمجھتا ہوں"۔

"میرے گھٹنے پر تو دوا باندھ گئی ہیں۔ جس سے بہت فائدہ ہے"۔

"ایک بوٹی تھی جو لڑکی کہیں سے توڑ لائی تھی (پھولوں سے بہت اچھی طرح واقف ہے یہ لڑکی) بعض لوگ صاحب بوٹیوں کی خاصیتیں خوب سمجھتے ہیں۔ میری ماں تو اس بات میں اپنا جواب نہ رکھتی تھی۔ اچھا صاحب خدا کرے آپ جلدی اچھے ہو جائیں۔ گو آن!"

ایشرسٹ مسکرا دیا۔" پھولوں سے واقف ہے! اور وہ خود پھول سے کیا کم ہے"؟

شام کے کھانے پر بطخ کا ٹھنڈا گوشت۔ جنکٹ اور سیب کی شراب تھی۔ کھانا کھا چکا تو لڑکی کمرے میں آئی۔

"خالہ پوچھتی ہیں۔ آپ ہمارے مے ڈے کیک کا ایک ٹکڑا کھائینگے"؟

"ہاں مگر باورچیخانے میں بیٹھ کر"۔

"شوق سے ـــــ آپ کے دوست تو چلے گئے۔ اکیلے آپ کا دل گھبراتا ہوگا"؟

"ارے نہیں ـــــ لیکن یہ کہو میرا باورچیخانے میں آنا کسی کو برا تو نہ لگیگا"؟

"واہ برا کیوں لگتا۔ ہمیں تو بلکہ بہت خوشی ہوئی"۔

ایشرسٹ کو اپنے گھٹنے کا خیال نہ رہا۔ یکلخت جو اٹھا۔ تو لڑکھڑا کر پھر بیٹھ گیا۔ لڑکی نے ایک سسکی بھری اور اپنے بازو سامنے پھیلا دئے۔ ایشرسٹ ان چھوٹے چھوٹے کھردرے سانولے ہاتھوں کو پکڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ جی میں آیا۔ ان ہاتھوں کو ہونٹوں سے لگالے لیکن اپنے آپ کو روکا۔ لڑکی نے قریب آکر کندھا آگے بڑھا دیا۔ ایشرسٹ اس کے سہارے چل کر دروازے تک پہنچا۔ اس شانے پر ہاتھ رکھنے سے جو لطف حاصل ہوا۔ عمر بھر کسی چیز کے مس سے نصیب نہ ہوا تھا۔ اتنی عقلمندی ضرور کی۔ کہ چلتے چلتے سٹینڈ میں سے اپنی چھڑی نکال لی۔ اور باورچیخانے میں پہنچنے سے پہلے ہاتھ لڑکی کے کندھے سے ہٹا لیا۔

اس رات وہ ایسا غافل سویا۔ کہ تن بدن کا ہوش نہ رہا صبح اٹھا۔ تو گھٹنے کا ورم بہت ہلکا ہوگیا تھا۔ دوپہر تک اسی چمن میں کرسی پر بیٹھا شعر موزون کرتا رہا۔ سہ پہر کے وقت ان دو چھوٹے لڑکوں کو جن کا نام نِک اور رِک تھا ساتھ لے کر ادھر ادھر گھومتا رہا۔ ہفتے کا دن تھا۔ اس لئے وہ اسکول سے جلدی لوٹ آئے تھے۔ ایک سات سال کا تھا ایک چھ سال کا۔ شرمیلے مگر ذہین۔ رنگ بہت گورا نہ تھا۔ اور بالوں کی رنگت بھی سیاہ تھی۔ ایشرسٹ سے بچے بہت جلد مانوس ہو جاتے تھے۔ چنانچہ تھوڑی دیر میں دونوں پٹر پٹر باتیں کرنے لگے۔ سوائے مچھلیوں کے باقی جانوروں کو مارنے کے جتنے طریقے انہیں یاد تھے چار بجے تک ایک ایک کرکے سب ایشرسٹ کو سکھا دئے۔ پھر پائنچے گھٹنوں تک چڑھا کر پیٹ کے بل ندی کے کنارے مچھلیوں کی تاک میں لیٹ گئے۔ گویا۔ اس فن میں بھی کچھ نہ کچھ مہارت انہیں ضرور حاصل ہے۔ لیکن ہنستے اس قدر تھے اور غل اس قدر مچاتے تھے کہ ایک مچھلی بھی قریب نہ پھٹکی۔ ایشرسٹ بیچ کے درختوں کے جھنڈ کے پاس ایک چٹان پر بیٹھا پرندوں کے گیت پر کان لگائے انہیں دیکھتا رہا۔ آخر کار نِک جو ان دونوں میں سے بڑا تھا۔ مچھلیوں کے کھیل سے اکتا کر اس کے پاس آکھڑا ہوا اور بولا :-

"جیسی ہوّا اسی پتھر پر بیٹھتا ہے"۔

"وہ کیا بلا ہے"؟

"معلوم نہیں۔ کبھی اُسے دیکھا نہیں۔ مگر میگن کہتی ہے کہ وہ یہیں بیٹھتا ہے۔ بڈھے جم کو ایک دفعہ نظر آیا تھا جس دن ابا کے سر میں ٹٹو نے لات ماری۔ اس سے پہلے رات کے وقت ہوّا یہاں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ یہاں بیٹھ کر سارنگی بجاتا ہے"۔

"کونسا راگ بجاتا ہے وہ"؟

"معلوم نہیں"۔

"اس کی شکل کیسی ہے"؟

"کالے رنگ کی۔ بڈھا جم کہتا ہے۔ اس کے جسم پر بال ہی بال ہیں۔ بڑا سخت ہوّا ہے۔ کبھی کبھی دن کو بھی آجاتا ہے"۔ پھر اپنی ترچھی سیاہ آنکھوں کے ڈھیلے پھرا کر کہا۔ "مجھے تو اٹھا کر نہیں لے جائیگا۔ میگن اس سے بہت ڈرتی ہے"۔

"میگن کو کبھی نظر آیا ہے"؟

"کبھی نہیں۔ لیکن میگن آپ سے نہیں ڈرتی"۔

"واہ مجھ سے بھلا کیوں ڈرتی"؟

"وہ آپ کے لئے دعا مانگتی ہے"۔

چل بدمعاش۔ تجھے بھلا کیسے معلوم ہے"؟

"جب میں سویا ہوا تھا۔ تو وہ کہہ رہی تھی۔ خدایا ہم سب پر اپنا فضل کر اور مسٹر ایشرسٹ پر بھی۔ بڑی دھیمی آواز میں دعا مانگ رہی تھی میں نے خود اسے سنا ہے۔"

"تم بڑے بدمعاش ہو۔ جو باتیں تمہیں خود بھی نہ سننی چاہئے تھیں وہ تم اوروں کو سناتے ہو۔"

لڑکا چپکا ہوگیا۔ اور پھر بڑے فخر سے بولا:۔

"میں خرگوش کی کھال اتار لیتا ہوں۔ میگن تو کھال اترتی ہوئی دیکھ بھی نہیں سکتی۔ مجھے لہو اچھا لگتا ہے۔"

"اچھا جناب کو لہو اچھا لگتا ہے؟ جن کہیں کا!"

"جن کیا ہوتا ہے؟"

"جن اسے کہتے ہیں جو دوسروں کو دکھ پہنچا کر خوش ہو۔"

چھوٹے لڑکے نے ماتھے پر تیوری ڈال کر کہا۔" جو خرگوش ہم کھاتے ہیں وہ تو مرے ہوئے ہوتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے نک۔ میں معافی مانگتا ہوں۔"

"میں مینڈک کی کھال بھی اتار لیتا ہوں۔"

لیکن ایشرسٹ کسی سوچ میں پڑگیا تھا۔" خدایا ہم سب پر اپنا فضل کر اور مسٹر ایشرسٹ پر بھی"۔ نک نے دیکھا۔ کہ ابھی تو اچھی خاصی باتیں کر رہا تھا۔ اور اب جیسے کچھ سن ہی نہیں رہا۔ بہت حیران ہوا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ تو دوڑتا ہوا پھر ندی پر جا پہنچا۔ جہاں فوراً ہی پھر دونو نے مل کر ہنسنا اور غل مچانا شروع کر دیا۔

جب میگن چائے لے کر آئی۔ تو ایشرسٹ نے پوچھا۔

"میگن۔ جپسی ہوا کیا چیز ہے"؟

میگن نے چونک کر سر اٹھایا:۔

"اس کا قدم بہت منحوس ہے۔"

"تم بھوت پریت کو مانتی ہو"؟

"اللہ کبھی اس کی شکل نہ دکھائے۔"

"نظر کیوں کر آئیگا۔ کچھ ہو تو نظر آئے۔ بڈھے جم نے یونہی کسی ٹٹو کو دیکھ لیا ہوگا۔"

"نہیں نہیں۔ ان چٹانوں میں بھوتوں کا ڈیرا ہے۔ یہاں ان لوگوں کے بھوت رہتے ہیں۔ جو بہت عرصہ پہلے یہاں آباد تھے"

"تو بہرحال جپسی تو نہ ہوئے نا! یہاں کے قدیم باشندے تو جپسیوں کے آنے سے بہت عرصہ پہلے مر کھپ گئے تھے۔"

میگن نے صرف اتنا کہا۔" سب منحوس ہیں"۔

"پر کیوں؟ اور اگر یہاں بھوت ہیں بھی۔ تو خرگوشوں کی طرح اپنا جنگل میں رہتے ہیں۔ اب جنگل میں جو پھول اگتے ہیں وہ منحوس ہوتے ہیں؟ یہ تھارن کے درخت بھی تو سب خودرو ہیں۔ یہ تو منحوس نہیں۔ اور بھوت منحوس ہو گئے! میں رات کو جنگل میں جا کر اپنی آنکھوں سے انہیں دیکھ آؤنگا۔ بلکہ ان سے دو چار باتیں بھی کر آؤنگا۔"

"ارے نہیں! نہیں!"

"میں ضرور جاؤنگا اور جا کر اس چٹان پر بیٹھونگا جہاں ہوا اٹھتا ہے۔"

لڑکی نے اپنے دونو ہاتھ جوڑ کر کہا۔" خدا کے لئے"!

"پر کیوں؟ اگر مجھے کچھ ہوگیا۔ تو بھی کیا مضائقہ ہے"؟

لڑکی نے کچھ جواب نہ دیا۔ ایشرسٹ پیار کے انداز میں بولا:۔

"خیر میں جاؤں نہ جانا ہی بہتر ہوگا۔ آخر اب یہاں سے بھی تو جلد کوچ کرنا پڑیگا۔"

"جلد"؟

"تمہاری خالہ آخر کب تک مجھے رہنے دینگی"؟

"ہم تو گرمیوں کے موسم میں ہمیشہ کمرے کرائے پر دے دیتے ہیں"۔

ایشرسٹ نے اپنی نظریں لڑکی کے چہرے پر گاڑ کر پوچھا:۔

"تم چاہتی ہو۔ میں ٹھہر جاؤں"؟

"ہاں۔"

"تو آج رات میں تمہارے لئے دعا کرونگا۔"

ایشرسٹ نے تمہارے کے لفظ پر خاص زور دیا۔ میگن کا چہرہ تمتما اٹھا۔ چین بجبیں کمرے سے باہر نکل گئی۔ ایشرسٹ نے چائے کو ابھی ہاتھ نہ لگایا تھا۔ پتیاں ابھی اچھی طرح بھیگی نہ تھیں۔ اپنے آپ کو بہت برا بھلا کہا۔ یہ کیا منہ سے نکل گیا؟ یہ میں نے کیا کیا؟ خوشنما پھولوں کو اپنے جوتے کی ٹھوکر سے کچل ڈالا۔ میں بھی رابرٹ گارٹن کی طرح گدھا ہوں۔ شہر کا رہنے والا۔ کالج کا طالبعلم۔ اس لڑکی کو سمجھنے سے بالکل قاصر۔

(۴)

اگلے ہفتے ایشرسٹ کو یقین ہوگیا۔ کہ اب گھٹنے کی تکلیف جاتی رہی کیونکہ اس نے اردگرد کے علاقے کی خوب سیر کی۔ ایشرسٹ پر اگلے سال موسم بہار کی وہ وہ کیفیتیں آشکارا ہوئیں کہ آنکھیں کھل گئیں۔ کبھی کسی پیچ کے سرخ وسفید شگوفوں کو جو گہرے نیلے آسمان کے بالمقابل دھوپ میں کھلے ہوتے یا کبھی کبھی سکاچ فر کے تنوں اور ٹہنوں کو جو تیز روشنی میں مٹیالے معلوم ہوتے تھے۔ ایک نشے کے عالم میں بیٹھا دیکھتا رہتا۔ یا پھر جنگل میں لارچ کے درختوں کا نظارہ کرتا۔ جو ہوا کے زور سے سلامی ہوگئے تھے۔ نچلے ٹہنے کالے کالے تھے۔ اوپر کی ٹہنیوں میں کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ جو ہوا کے جھونکوں سے پھڑک اٹھتیں۔ تو درخت میں ایک زندگی سی آجاتی۔ کبھی سڑک کے کنارے گھاس پر لیٹ جاتا۔ اور بنفشے کے پھولوں کے گچھوں کو دیکھتا رہتا یا سوکھے ہوئے برکین میں کھڑا ڈیوڑی کی گلابی گلابی کلیوں کو جن کے آر پار دکھائی دیتا تھا۔ انگلیوں سے چھیڑتا رہتا۔ کبھی ککو چہچہانے لگتے۔ کبھی سبز ہد ہد بول اٹھتے۔ کبھی آسمان کی بلندی سے کوئی لارک اپنے گیت کے موتیوں کو قطروں کی طرح ایک ایک کرکے زمین پر ٹپکاتا۔ بہاریں کئی دیکھی تھیں۔ لیکن ان میں یہ بات نہ تھی۔ وہ بہاریں سبزہ دگل کی بہاریں تھیں۔ یہ بہار دل کی بہار تھی۔ دن کے وقت گھر کے لوگوں سے ملنا کم ہوتا۔ جب میگن کھانا لے کر آتی تو یا گھر کے کسی کام کاج میں لگی ہوتی۔ یا اسے احاطے میں ننھے ننھے جانوروں کی دیکھ بھال کرتی ہوتی۔ اس لئے ایک دو باتوں سے زیادہ نہ ٹھہرتی۔ لیکن شام کے وقت ایشرسٹ باورچیخانے کی کھڑکی کے پاس بیٹھ جاتا۔ پائپ سلگا لیتا۔ اور لنگڑے جم یا مسز نیرو کو مبسے باتیں کرتا رہتا۔ لڑکی سینا پرونا لے بیٹھتی یا کھانے کے برتن سنبھالتی پھرتی۔ بعض دفعہ اسے یہ احساس ہوتا کہ میگن اپنی چھلکتی ہوئی بھوری بھوری آنکھوں سے ٹکٹکی لگائے میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھ رہی ہے۔ اس سے عجیب نخوت آمیز مسرت ہوتی۔ دل کی وہ کیفیت ہوتی۔ جو ایک بلی کی ہوتی ہوگی جب وہ میاؤں میاؤں کرتی ہے۔

ایک ہفتہ اور گزر گیا۔ اتوار کے دن شام کے وقت ایشرسٹ باغیچے میں لیٹا بلیک برڈ کی آواز پر کان لگائے ایک عشقیہ نظم موزوں کر رہا تھا۔ کہ اتنے میں پھاٹک کے بند ہونے کی آواز آئی۔ اور درختوں کے بیچ میں آگے آگے لڑکی اور اس کے پیچھے پیچھے وہ لال لال کلوں والا دہقان بھاگتے نظر آئے۔ ایشرسٹ سے بیس گز کے فاصلے پر آکر لڑکی ٹھہر گئی۔ جو بھی آن پہنچا۔ دونو آمنے سامنے کھڑے ہوگئے۔ ایشرسٹ گھاس میں لیٹا ہوا تھا۔ اس پر کسی کی نظر نہ پڑی لڑکا آگے بڑھتا تھا۔ لڑکی اُسے پیچھے ہٹاتی تھی۔ لڑکی کے چہرے پر طیش اور پریشانی تھی۔ اور لڑکے کا چہرہ؟ کسی کو کیا معلوم تھا۔ کہ اس دہقان کے لال چہرے پر بھی اتنا اضطراب ظاہر ہو سکتا ہے۔ ایشرسٹ کو یہ منظر دیکھ کر بہت دکھ ہوا۔ وہ یکلخت اٹھ کھڑا ہوا۔ دونو نے اسے دیکھا۔ میگن نے اپنے ہاتھ ڈھیلے چھوڑ دیئے اور ہٹتی ہٹتی ایک درخت کے تنے کے پیچھے جا کھڑی ہوئی لڑکا گھبرا کر کنارے کی طرف بھاگ نکلا اور چھلانگ مار کر غائب ہو گیا۔ ایشرسٹ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا لڑکی کے پاس آیا۔ وہ حسن کی مورت ہونٹ کو دانتوں میں دبائے بالکل بت بنی کھڑی تھی۔ نظریں زمین دوز تھیں۔ ملائم سیاہ بال چہرے پر پریشان تھے۔

ایشرسٹ نے کہا۔ "میں معافی مانگتا ہوں"۔

لڑکی نے سر نیچا ڈالے پلکیں اٹھا کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے

ایشرسٹ کو ایک نظر دیکھا ۔ایک سسکی بھری اور مڑ کر چل دی ایشرسٹ اس کے پیچھے گیا ۔

" میگن "

لیکن وہ نہ رکی ۔آخر ایشرسٹ نے پیچھے سے اس کا بازو پکڑ لیا اور آہستہ سے اسے اپنی طرف موڑ کر کہا ۔

" ٹھہر جاؤ ۔مجھ سے بات تو کرو "۔

" آپ مجھ سے کیوں معافی مانگتے ہیں ؟ مجھ سے معافی مانگنے کی کیا ضرورت ہے" ؟

" اچھا تو میں تم سے معافی مانگ لیتا ہوں "۔

" اسے میرے پیچھے آنے کی جرأت کیسے ہوئی" ؟

" تم پر عاشق ہوگا اور کیا" ؟

لڑکی نے زور سے پاؤں زمین پر مارا ۔

ایشرسٹ ہنس دیا ۔" کہو تو میں اسے ڈانٹ دوں" ؟

لڑکی یکلخت جذبے سے بیقرار ہو کر رونے لگی ۔

" آپ مجھ سے دل لگی کر رہے ہیں ۔آپ ہم لوگوں کی ہنسی اڑاتے ہیں ۔

ایشرسٹ نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے لیکن وہ پیچھے ہٹ گئی ۔حتیٰ کہ اس کا تمتمایا ہوا چھوٹا سا چہرہ اور اس کے پریشان بال ایک سیب کے درخت کے گلابی شگوفوں میں جا لگے ایشرسٹ نے اس کا ایک ہاتھ اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا ۔ دل میں سوچا میں عورت کی کتنی قدر کرتا ہوں ۔ وہ اکھڑ جو میرے مقابلے میں کتنا حقیر ہے ۔اور یہ احساس محض اتنی سی بات سے پیدا ہوا کہ اس کھردرے ہاتھ کو ہونٹوں سے چھو لیا تھا ۔میگن اس وقت تک اپنا جسم چرائے کھڑی تھی ۔لیکن اب یکلخت تھرتھر کانپتی ہوئی ایشرسٹ کی طرف بڑھی ۔میٹھی میٹھی سی حرارت ایشرسٹ کے بدن میں سر سے پاؤں تک پھیل گئی ۔سمجھ گیا کہ اس نازک بدن بھولی بھالی حسین دوشیزہ کو میرے ہونٹوں کے مس سے خوشی ہوئی ہے یکلخت بیتاب ہو کر باہیں اس کے گرد ڈال دیں ۔اور سینے سے لپٹا کر اس کا ماتھا چوم لیا ۔پھر کچھ سہم گیا ۔میگن کا رنگ زرد تھا ۔آنکھیں بند تھیں ۔لمبی لمبی سیاہ پلکوں نے بے رنگ رخساروں پر صف باندھ رکھی تھی ۔ بے جان بازو پہلوؤں کے ساتھ لگے تھے ۔اس کے سینے کے مس سے ایشرسٹ کے بدن میں کپکپی سی دوڑ گئی ۔ ایک آہ بھر کے کہا" میگن" اور اسے اپنی گرفت سے آزاد کر دیا ۔اس گہری خاموشی میں ایک بلیک برڈ چہچہایا ۔ پھر لڑکی نے ایشرسٹ کا ہاتھ زور سے پکڑ لیا ۔ پہلے رخسار پھر ہونٹوں سے لگایا اور اسے دیوانہ وار چوما اور پھر بھاگ کر سیب کے درختوں کے کائی دار تنوں میں غائب ہو گئی ۔

ایشرسٹ ایک پرانے مڑے تڑے درخت پر جس کی شاخیں زمین کے ساتھ ساتھ پھیلی ہوئی تھیں بیٹھ گیا ۔اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا ۔اور حواس پریشان تھے ۔ان گلابی گلابی کلیوں کو جن میں کی ایک کلی کھل کر سفید ستارہ بن گئی تھی ۔ان شگوفوں کو جنھوں نے میگن کے بالوں کے ارد گرد پھولوں کا ایک تاج گوندھ دیا تھا ۔کھوئی کھوئی نظروں سے تکتا رہا ۔حسن کے ہاتھوں شکست کھائی تھی یا خدا جانے بہار کا جادو چل گیا تھا ۔بہر حال دل مسرت اور احساس فتحمندی سے لبریز تھا ۔ٹانگیں اور بازو پھڑک رہے تھے ۔کچھ سہما ہوا بھی تھا ۔یہ آغاز ہے ۔مگر کاہے کا آغاز ؟ بھنگے اسے کاٹ رہے تھے ۔مچھر اڑ اڑ کر اس کے منہ میں گھسنے کی کوشش کر رہے تھے ۔ککو اور بلیک برڈ چہچہا رہے تھے ۔ینیل ہنس رہے تھے ۔سورج کی شعاعیں زمین کے متوازی پڑ رہی تھیں ۔سیب کے شگوفے کھلے ہوئے تھے ۔ اس کے چاروں طرف بہار کی کیفیات میں پہلے سے زیادہ حسن اور پہلے سے زیادہ زندگی آ گئی تھی ۔ درخت کے تنے سے اٹھا اور باغیچے سے باہر نکل گیا ۔اسے کسی کھلی جگہ کسی کھلے آسمان کی ضرورت تھی ۔جہاں چل کر اپنے جذبات سے مفاہمت کرے ۔اس نے

جنگل کا رخ کیا۔ جھاڑی میں سے ایک میگ پائی نے ایش کے درخت پر سے اڑ کر جنگل والوں کو اس کے آنے کی خبر کر دی۔

جس شخص کی عمر پانچ سال سے زیادہ ہو۔ اس کے متعلق کیا کوئی کہہ سکتا ہے۔ کہ اسے کبھی عشق نہیں ہوا؟ جب رقص کی تعلیم لے رہا تھا۔ تو جن کے ساتھ ناچتا تھا ان پر عاشق تھا۔ سکول کی چھٹیوں میں کئی لڑکیوں پر عاشق ہوا۔ عشق کا نشہ جب ایک دفعہ چڑھنا شروع ہوا۔ تو پھر شاید ہی کبھی اترا۔ ہمیشہ (کم و بیش دور سے) کسی نہ کسی کی پرستش کرتا رہا۔ لیکن یہ عشق سب سے نرالا تھا یہاں دوری کا تو سوال ہی نہ تھا۔ یہاں تو بات ہی کچھ اور تھی۔ یہاں تو روح مسرت سے لبریز تھی۔ اور دل میں مردانگی کے تکمیل پانے کا احساس تھا۔ ایسے جنگلی پھول کو انگلیوں میں تھامے رہنا۔ جب دل چاہے اسے ہونٹوں سے لگا لینا اور اسے خوشی کے مارے کانپتے ہوئے محسوس کرنا۔ اس میں کتنا سرور ہے۔

ہاں مگر اس سرور کے ساتھ ساتھ ایک الجھن بھی ہے۔ اس پھول کو آخر کرے کیا؟ دوبارہ اس لڑکی سے کس طرح ملے؟ پہلا پیار تو کچھ ٹھنڈے دل سے کچھ ترس کھا کر کیا تھا۔ لیکن اب تو ایسا کرنا ممکن نہیں۔ اب تو جانتا ہے۔ کہ اسے بھی مجھ سے عشق ہے کس جذبے کے ساتھ اس نے میرے ہاتھ کو چوما تھا۔ کس زور کے ساتھ اسے سینے سے لگایا تھا۔ بعض لوگ ایسے ہیں کہ جب انہیں خراج عشق ادا کیا جائے۔ تو ان کی فطرت میں ایک کرختگی آ جاتی ہے۔ لیکن ایشرسٹ ان لوگوں میں سے نہ تھا۔ جو محبوب بن کر جھک جاتے ہیں۔ کسی کو گرویدہ دیکھ کر خود مسحور ہو جاتے ہیں۔ ان کے جذبات میں گرمی اور طبیعت میں گداز پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ عشق کو ایک معجزہ سمجھتے ہیں۔ جس سے ان کی فطرت میں ایک علو پیدا ہوتا ہے۔

ایشرسٹ جنگل کے ٹیلوں کے درمیان بیٹھا عجب کشمکش میں گرفتار تھا۔ دل کے اندر جو بہار کھل گئی تھی اس کے مزے لوٹنے کو بے قرار تھا۔ لیکن ڈرتا بھی تھا۔ یہ نہ معلوم تھا کہ کس چیز سے لیکن ڈرتا ضرور تھا۔ دل سے کتنا ایسی خوبصورت لڑکی بھولا بھالا چہرہ چھلکتی ہوئی آنکھیں اس کے دل پر فتح حاصل کرنا یہ کیا کچھ کم فخر کی بات ہے۔ اب خدشہ کاہے کا ہے۔ لیکن پھر ایک مصنوعی سنجیدگی کے ساتھ سوچتا یہ سب کچھ سہی۔ لیکن تم انجام سے اچھی طرح واقف ہو سمجھ سے کام لو۔

اپنے خیالات میں محو تھا۔ کہ شام ہو گئی۔ چٹانوں کے ترشے ہوئے شامی وضع کے ڈھیروں پر تاریکی چھا گئی۔ اور قدرت کی آواز نے کہا یہ تمہارے لئے نئی دنیا ہے۔ جس طرح انسان گرمیوں کے موسم میں صبح چار بجے اٹھ کر باہر نکل جائے تو چرند و پرند اور درخت اسے گھور کر دیکھتے ہیں اور اسے محسوس ہوتا ہے گویا ہر چیز نئی ہے۔

وہ گھنٹوں وہاں بیٹھا رہا۔ لیکن جب سردی محسوس ہونے لگی تو اٹھا۔ پتھروں اور ہیدر کی جڑوں کے بیچ میں سے رستہ ٹٹولتا ہوا سڑک تک پہنچا۔ سڑک کی پگڈنڈی پر نکلا اور پھر مرغزار کے برابر ہوتا ہوا باغیچے میں داخل ہوا۔ وہاں پہنچ کر دیا سلائی جلائی اور گھڑی کو دیکھا۔ بارہ بجنے والے تھے! چھ گھنٹے پیشتر دن کی روشنی کچھ کچھ باقی تھی۔ اور پرندے چہچہا رہے تھے۔ لیکن اب تو چاروں طرف تاریکی مسلط تھی۔ اور کہیں بھی زندگی کے آثار نظر نہ آتے تھے۔ اور پھر یکلخت اس نے اپنے عشق رومانی کو بیرونی نقطۂ نظر سے دیکھا۔ تصور میں اس گھاگ عورت یعنی مسز نیرو کو سب کی ترشروئی اس کی سانپ کی سی مڑی ہوئی گردن اس کی تیز سیاہ آنکھ سب باتوں کا جائزہ لیتی ہوئی دکھائی دی۔ جیبی وضع لڑکوں کے شبہات ان کے ناشائستہ طعنے سنائی دئے۔ اکھڑ جو کا چہرہ غصے سے لال نظر آیا۔ صرف دکھ بھری آنکھوں والا لنگڑا جم ہی ایسا تھا۔ جس کا تصور تکلیف دہ نہ تھا۔ گاؤں کے شرابخانے میں کیا کیا چہ میگوئیاں نہ ہوں گی۔ بوڑھی عورتیں جنہیں اکثر سبز کے

وقت سڑک پر چلتے دیکھا تھا۔ کیا کیا باتیں نہ بنائینگی۔ اور پھر اس کے اپنے دوست کیا کہینگے۔ رابرٹ گارٹن تو رخصت ہوتے وقت افتخار انداز سے اور طنز کے ساتھ مسکرا رہا تھا۔ اس کا دل گھن سے بھر گیا لمحے بھر کو اسے اس اسفل طعنہ زن دنیا سے نفرت ہو گئی جس میں انسان زندگی گذارنے پر مجبور ہے۔ جس پھاٹک کے سہارے کھڑا تھا۔ اس کی سیاہی مدھم پڑ گئی۔ اور ایک نور کی جھلک اس کے برابر سے گذر کر نیلی نیلی تاریکی میں پھیل گئی۔ چاند نکل آیا۔ ایشرسٹ نے مڑ کر دیکھا۔ عجیب نظارہ تھا۔ چاند مٹی کے پشتے کے اوپر دکھائی دے رہا تھا۔ بیکن سرخ اور تقریباً گول۔ ایشرسٹ نے گھر کی طرف قدم اٹھائے۔ پگڈنڈی پر رات اور گوبر اور نوخاستہ سبزے کی خوشبو آ رہی تھی احاطے میں مویشی بڑے بڑے کالے کالے دھبے سے معلوم ہوتے تھے۔ اس سیاہی میں کہیں کہیں ان کے پیلے پیلے سینگوں کے قوس دکھائی دیتے تھے۔ جیسے آسمان سے ہلال نوکوں کے بل آ گرے ہوں۔ گھر میں کہیں روشنی نظر نہ آئی دبے پاؤں ڈیوڑھی تک پہنچا اور ایک یو کے درخت کی تاریکی میں گم ہو کر میگن کی کھڑکی کی طرف سر اٹھا کر دیکھا۔ کھڑکی کھلی تھی نہ معلوم میگن سو رہی ہے۔ یا اس کی جدائی میں پریشان بیقرار کروٹیں بدل رہی ہے۔ کھڑکی کو تک رہا تھا کہ ایک اُلّو بولا۔ بجز ندی کے ہلکے ہلکے مسلسل و متواتر شور کے چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ الو کی آواز جیسے رات کی تاریکی میں گونج اٹھی دن کو گگوؤں کا چہچہانا رات کو الوؤں کا بولنا۔ ایشرسٹ کے دل کے ہنگاموں کا ان سے بہتر ترجمان کون ہو سکتا ہے۔ دفعتاً میگن نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ ایشرسٹ درخت سے ذرا ہٹ آیا اور نہایت ہلکی آواز میں بولا "میگن"۔ میگن پیچھے ہٹی۔ غائب ہو گئی۔ پھر آئی باہر کو جھکی۔ ایشرسٹ اس گھاس کے قطعے پر پنجوں کے بل آگے بڑھا۔ سبز کرسی سے ٹھوکر لگی دم روک لیا۔ میگن کے چہرے اور پھیلے ہوئے بازو میں جو غیر واضح نظر آ رہے تھے۔ کوئی حرکت نہ ہوئی۔ ایشرسٹ نے کرسی سرکا کر دیوار کے ساتھ لگا دی اور چپ چاپ اس پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ ہاتھ بڑھایا تو میگن تک جا پہنچا۔ میگن کے ہاتھ میں دروازے کی بڑی سی چابی تھی۔ ایشرسٹ نے گرم ہاتھ ٹھنڈی چابی سمیت زور سے پکڑ لیا۔ میگن کا چہرہ دھندلا سا نظر آ رہا تھا۔ ہونٹوں کے بیچ میں دانت چمک رہے تھے اور بال پریشان تھے۔ کپڑے اس نے ابھی نہ اتارے تھے۔ بیچاری ایشرسٹ کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ "خوبصورت میگن" اس کی گرم گرم کھردری انگلیاں ایشرسٹ کی انگلیوں سے لپٹ گئیں بشرے سے کھوئی کھوئی معلوم ہوتی تھی۔ چہرے پر ایک عجیب کیفیت طاری تھی۔ اس چہرے تک ہاتھ کا پہنچ جانا بھی کتنی خوش نصیبی ہے الو پھر بولا۔ سویٹ برائر کی خوشبو ایشرسٹ کے نتھنوں میں سما گئی۔ فارم کا ایک کتا بھونکا۔ میگن کی انگلیاں ڈھیلی پڑ گئیں اور وہ پیچھے ہٹ گئی۔

"گڈ نائٹ میگن"۔

"گڈ نائٹ جناب"۔ وہ چلی گئی۔ ایشرسٹ آہ بھر کر نیچے اترا۔ کرسی پر بیٹھ کر جوتے اتارنے لگا۔ اس کے سوائے اب کیا ہو سکتا ہے۔ کہ چپ چاپ جا کر سو رہے۔ لیکن پھر بھی وہ بہت دیر تک بےحس و حرکت بیٹھا رہا۔ اس کے بازو اوس میں ٹھنڈے ہو رہے تھے لیکن وہ نیم متبسم چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے پھر رہا تھا۔ وہ گرم انگلیاں — اسے یاد آ رہی تھیں جو چابی اس کی ہتھیلی میں دبا کر اس کے ہاتھ کو لپٹ گئی تھیں۔ اور ایشرسٹ پر ایک نشہ سا چھایا ہوا تھا۔

۵

رات کو بھوکا ہی سو گیا تھا۔ لیکن صبح اٹھا۔ تو طبیعت میں گرانی سی تھی۔ جیسے رات کھانا پیٹ بھر کر کھایا ہو۔ کل کی سرگزشت عشق برسوں پہلے کی ایک کہانی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن اس دن پھر صبح میں ایک عجیب دلفریبی تھی۔ بہار کا موسم آج اپنے پورے جوبن پر تھا۔ اور رات سنہری پھول تمام مرغزار پر چھا گئے تھے اور کھڑکی میں سے باغیچہ

سیب کے شگوفوں سے ڈھکا ہوا نظر آتا تھا۔ جیسے کسی نے گلابی اور سفید رنگ کا لحاف بچھا دیا ہو۔ جب ایشرسٹ نیچے اترا۔ تو دل ڈر سا رہا تھا۔ کہ میگن سے سامنا نہ ہو جائے۔ لیکن جب اس کا ناشتہ میگن کی بجائے مسز نیرو کومب لے کر آئی۔ تو ایشرسٹ کو ناگوار گزرا اور مایوسی ہوئی۔ آج مسز نیرو کومب کی تیز آنکھ اور سانپ کی سی گردن پہلے سے بھی زیادہ چوکنی تھی۔ اسے کہیں معلوم تو نہیں ہو گیا!

"اچھا مسٹر ایشرسٹ۔ رات آپ گویا چاند کے ساتھ ساتھ سیر کرتے رہے۔ کھانا بھی کہیں کھایا یا نہیں"؟

ایشرسٹ نے سر ہلا دیا۔

"ہم نے تو آپ کے لئے کھانا رکھ چھوڑا تھا۔ لیکن میں جانوں آپ کا دماغ اتنا مصروف تھا۔ کہ کھانے کا خیال بھی نہ آیا ہوگا"

کیا وہ اپنے ویلز کے لہجے میں (جس پر یکھم کی بولی بہت غالب آتی جا رہی تھی) اس کا مذاق اڑا رہی تھی؟ اگر اسے اس بات کا علم ہو جائے تو —— ! ایشرسٹ نے اس وقت دل سے کہا "نہیں نہیں میں یہاں سے چلا جاؤں گا"۔

لیکن ناشتہ کر چکنے کے بعد میگن سے ملنے کی خواہش ہر لحہ بڑھتی گئی۔ دل میں ڈرتا تھا۔ کہ کہیں کسی نے اس سے ایسی ویسی بات نہ کہ دی ہو۔ جس سے سب بنا بنایا کھیل بگڑ جائے۔ تاہم دال میں کچھ کالا کالا ضرور ہے۔ جو صبح سے اس نے شکل تک نہیں دکھائی۔ وہ عشقیہ نظم جو کل سہ پہر کو سیب کے درختوں کے نیچے اس پر اس قدر چھائی ہوئی تھی۔ اب اسے اتنی پھیکی معلوم ہوئی کہ مسودہ پھاڑ ڈالا۔ اور اس کی بتیاں بنا بنا کر ان سے پائپ سلگایا۔ اس ہاتھ کو پکڑ کر چوم لینے سے پہلے وہ عشق کی رمزو سے محض بےخبر تھا۔ اور اب تو کوئی بھی کیفیت ایسی نہیں جس سے وہ آگاہ نہ ہو۔ لیکن ان کیفیات کو نظم کرنا گویا پانی کی لہریں گننا ہے۔ ایک کتاب لانے کو سونے کے کمرے میں گیا۔ وہاں پہنچا تو دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میگن اس کا بستر لگا رہی تھی ایشرسٹ دروازے میں کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ میگن نے جھک کر تکئے کو عین اس جگہ پر جہاں ایشرسٹ کے سر رکھنے سے پچک گیا تھا۔ چوم لیا۔ ایشرسٹ کے دل میں یکلخت مسرت کا ایک طوفان بپا ہوا۔ اب اس پر کس طرح ظاہر کرے کہ میں نے دیکھ لیا ہے۔ اگر دبے پاؤں واپس لوٹ گیا اور اس نے آہٹ سن پائی۔ تو اور بھی برا ہوگا۔ میگن نے تکئے کو ہاتھ میں اٹھا لیا۔ معلوم ہوتا تھا۔ رخسار کے نقش کو مٹانا نہیں چاہتی۔ پھر اسے نیچے رکھ دیا اور دروازے کی طرف مڑی۔

"میگن"

لڑکی نے چونک کر اپنے ہاتھ رخساروں پر رکھ لئے۔ لیکن اس کی آنکھیں ایشرسٹ کے آر پار دیکھ رہی تھیں۔ ایشرسٹ کو ان چھلکتی ہوئی آنکھوں کی گہرائی پاکیزگی اور ان میں رقت انگیز وفا کی جھلک۔ اتنا اس قدر احساس پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ رک رک کر بولا۔

"رات تم میرے انتظار میں بیٹھی رہیں۔ میں کس منہ سے تمہارا شکریہ ادا کروں"۔

لڑکی کچھ نہ بولی۔

"میں رات جنگل میں ادھر ادھر پھرتا رہا۔ بڑا سہانا وقت تھا اب میں۔ میں۔ کتاب لینے اوپر آیا تھا"۔

میگن کا وہ تکئے کو بوسہ دینا یاد آیا۔ ہمت بڑھی۔ دل میں ایک جوش سا اٹھا۔ قریب آیا اور اس کی آنکھیں چوم لیں۔ رگوں میں خون تیز تیز دوڑنے لگا۔ دل نے کہا "اب بتاؤ۔ کل جو کچھ ہوا تھا وہ تو دفعتاً۔ اضطراری حالت میں سرزد ہوا تھا۔ لیکن اب تم اب کس منہ سے کہو گے کہ. . . . ." لڑکی نے اپنا ماتھا ہونٹوں سے الگ نہ کیا۔ ایشرسٹ کے ہونٹ نیچے کو سرکتے گئے۔ اور آخرکار میگن کے ہونٹوں سے جا ملے۔ عمر بھر میں یہ پہلا موقع تھا کہ کسی کو کامل احساس عشق کے ساتھ چوما ہو۔ بوسۂ عشق جس میں کیف اور نشہ لیکن

ساتھ ہی ساتھ ایک معصومیت سی بھی تھی - اس سے دونوں میں سے کس کا دل زیادہ تڑپا ہوگا؟

"رات کو جب سب لوگ سو جائیں تو اس بڑے سے سیب کے درخت کے پاس ملنا۔ میگن وعدہ کرو"۔

میگن نے بڑی دھیمی آواز میں کہا "میں وعدہ کرتی ہوں"۔

میگن کا رنگ فق تھا۔ ایشرسٹ نے کچھ اسے دیکھا۔ کچھ اس سارے واقعے پر غور کیا۔ سہم گیا۔ لڑکی کو چھوڑ کر نچلی منزل میں اتر آیا جانتا تھا کہ اب پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔ اس کے عشق کو قبول کر لیا اپنا عشق ظاہر کر دیا۔ اب باقی کیا رہ گیا ہے؟ کتاب لایا تو بھول ہی گیا تھا۔ خالی ہاتھ اس سبز کرسی پر جا بیٹھا۔ اس کے سامنے ارد گرد فارم کے لوگ کام کاج میں مشغول تھے۔ لیکن ایشرسٹ کی نظریں مبہوت تھیں۔ اترا ابھی رہا تھا پچھتا بھی رہا تھا۔ نہ معلوم کتنی دیر یونہی بیٹھا رہا۔ اور پھر جو دیکھا۔ تو دائیں ہاتھ کو ذرا پیچھے ہٹ کر جو کھڑا تھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ کھیت پر سے ابھی ابھی لوٹا ہے جسم کا بوجھ کبھی اس ٹانگ پر ڈال دیتا کبھی اس ٹانگ پر چہرے کا رنگ ڈوبتے سورج کی مانند تھا۔ نیلی قمیص کی آستنیں چڑھا رکھی تھیں۔ بازوؤں کی رنگت اور چمک پکے ہوئے آڑوؤں کی سی تھی۔ لال لال ہونٹ کھلے ہوئے تھے اور سانس دھونکنی کی طرح سنائی دیتا تھا۔ نیلی نیلی آنکھیں۔ سن کی سی پلکیں۔ نظریں ایشرسٹ کے چہرے پر گاڑ رکھی تھیں۔ ایشرسٹ نے طنز سے پوچھا:-

"کیوں جو۔ کوئی خدمت میرے لائق"؟

"ہاں"

"کیا"؟

"تم یہاں سے چلے جاؤ۔ ہمیں تمہاری ضرورت نہیں"۔

ایشرسٹ پہلے ہی کونسا مسکین صورت تھا۔ اور اب تو وہ اور بھی تن کے بولا:-

"تمہاری بہت مہربانی ہے۔ لیکن تمہیں خدائی فوجدار بننے کو کس نے کہا"؟

جو ایک دو قدم آگے بڑھا۔ محنتی نوجوان کے پسینے کی بو ایشرسٹ کے نتھنوں کو ناگوار گزری۔

"تم یہاں کیوں ٹھہرے ہو"؟

"میری مرضی"۔

"چندیا کی استری ہوگئی۔ تو مرضی ورضی سب بھول جائیگی"۔

"تو تمہارا ہاتھ کس نے روکا ہے"؟

جو نے کچھ نہ کہا۔ صرف سانس اور بھی تیز ہوگیا۔ جوان اور بپھرے ہوئے سانڈ کی طرح آنکھوں سے آگ برسنے لگی۔ غصے کے مارے چہرے کے پٹھے اینٹھ گئے۔

"میگن تمہیں نہیں چاہتی"۔

اکھڑ بدتمیز دہقان کی یہ بات سن کر ایشرسٹ کے سر سے پاؤں تک آگ لگ گئی۔ حقارت اور غصے اور حسد سے آگ بگولا ہوگیا۔ اپنے آپ پر قابو نہ رہا۔ یکلخت اٹھا کرسی پیچھے کو دھکیل دی اور بولا:-

"ایسی کی تیسی تمہاری"۔

یہ الفاظ منہ سے نکالے تو سامنے میگن نظر پڑی۔ بادامی رنگ کا کتے کا پلا گود میں اٹھائے دروازے میں کھڑی تھی جلدی سے پاس آئی اور بولی "دیکھو اس کی آنکھیں نیلی ہیں"۔

جو چل دیا۔ گردن کا رنگ سچ مچ قرمزی ہو رہا تھا!

ایشرسٹ نے کتے کے ہونٹوں کو پیار سے چھیڑا۔ کتا بڑے سے مینڈک کی مانند موٹا تازہ بڑے مزے سے میگن کی گود میں لیٹا تھا۔

"یہ ابھی سے تمہیں پیار کرنے لگا ہے۔ سبھی تم سے پیار کرتے ہیں"۔

"جو آپ سے کیا کہ رہا تھا"؟

"کہتا تھا۔ تم یہاں سے چلے جاؤ۔ میگن کو تمہاری ضرورت نہیں"۔

لڑکی نے پاؤں زور سے زمین پر مارا۔ پھر آنکھ اٹھا کر ایک بچارن کی نظروں سے ایشرسٹ کو دیکھا۔ ایشرسٹ کانپ اٹھا۔ جیسے کسی پروانے کے پر جلتے دیکھ لئے ہوں۔

بولا۔ "آج رات! بھولنا مت"!

"نہیں"۔ سر جھکا کر کتے کو پیار کیا اور اس کے موٹے ملائے جسم سے چہرہ ڈھانپے اندر چلی گئی۔

ایشرسٹ پگڈنڈی کے ساتھ ساتھ چل دیا۔ مرغزار کے پھاٹک پر وہ لنگڑا آدمی ملا۔ گائیں چرا رہا تھا۔ ایشرسٹ بولا۔

"جم۔ بڑا اچھا موسم ہے"۔

"گھاس کے لئے بہت اچھا ہے۔ اس لئے اوک کے درخت ایش کے درختوں سے پہلے ہرے ہونگے۔ مثل ہے۔ کہ جب اوک کے درخت ایش سے پہلے ——"

ایشرسٹ نے یونہی پوچھا۔ "جم جب تمہیں جپسی ہوّا نظر آیا تھا۔ تو تم کہاں کھڑے تھے"؟

"بس اس بڑے سیب کے درخت کے نیچے سمجھ لیجئے"۔

"کیا واقعہ بھی کچھ تھا یا یونہی"؟

"اب یہ تو خدا جانے۔ کم از کم مجھے یہی معلوم ہوا۔ کہ کھڑا ہے"۔

"یہ ہوّا آتا کیوں ہے"؟

لنگڑے آدمی نے دھیمی آواز میں کہا:۔

"کسی کی برائی تو نہیں کرنی چاہئے۔ لیکن کہتے ہیں۔ کہ مسٹر نیرو کومب نسل کا جپسی تھا۔ آپ جانتے ہیں۔ جپسی لوگ اپنی نسل کے آدمی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ انہیں کسی نہ کسی طرح خبر پہنچی ہوگی۔ کہ مسٹر نیرو کومب مرنے والا ہے۔ چنانچہ انھوں نے بھوت کو بھیج دیا۔ کہ جاؤ۔ تم پاس رہو —— میں تو یہی سمجھتا ہوں"۔

"دیکھنے میں کیسا تھا"؟

"چہرے پر بال ہی بال۔ یوں چلتا تھا جیسے ہاتھ میں فڈل اٹھا رکھا ہو۔ بعض لوگ کہتے ہیں۔ بھوت پریت سب جھوٹ ہے۔ لیکن صاحب اندھیری رات میں اس کتے کے جسم پر رونگٹے کھڑے ہوتے تو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ خود چاہے مجھے بھوت نظر نہ آیا ہو"۔

"چاند نکلا ہوا تھا"؟

"کوئی بارھویں تیرھویں رات تھی۔ چاند ابھی ابھی نکلا تھا۔ اور ان درختوں کے پیچھے سنہری دکھائی دے رہا تھا"۔

"تمہارا خیال ہے بھوت منحوس ہوتے ہیں"؟

لنگڑے آدمی نے اپنی ٹوپی پیچھے سرکا دی۔ اوپر اٹھی ہوئی نظروں سے ایشرسٹ کو اور بھی غور سے دیکھنے لگا۔

"صاحب یہ تو خدا جانتا ہے۔ لیکن آخر بھوت یوں مارے مارے کیوں پھرتے ہیں۔ میں یہ کہتا ہوں۔ کہ خدا کے ان بھیدوں کو ہم کیا جانیں۔ بعض لوگوں کو کچھ نظر آتا ہے۔ بعض کو نہیں آتا۔ اب ہمارے جو کو یا ہمارے لڑکوں کو لیجئے۔ سامنے پڑی چیز دکھائی نہیں دیتی۔ لیکن میگن کی نظر کیا مجال کبھی چوک جائے۔ جو ہوگا۔ دکھائی دیگا۔ بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی نظر آئیگا"۔

"وجہ یہ ہے کہ وہ حساس ہے"۔

"کیا مطلب"؟

"میرا مطلب ہے وہ ہر چیز کو محسوس کرتی ہے"۔

"یہ سچ ہے۔ میگن کا دل بڑا نرم ہے"۔

ایشرسٹ کو اپنے چہرے پر خون دوڑتا ہوا محسوس ہوا۔ تمباکو کی تھیلی آگے بڑھا دی۔ "لو پائپ بھر لو"۔

ٹھینک حضور۔ بس لاکھوں میں ایک ہے یہ لڑکی۔"
ایشرسٹ نے جواب میں مختصر سا فقرہ کہا۔ تھیلی لپیٹ لی اور چل دیا۔

"اس کا دل نرم ہے"۔ بجا لیکن میں بھی بھلا کس فکر میں ہوں۔ میری نیت کیا ہے۔ ادھر ادھر کھیتوں میں گھومتا پھرا۔ لیکن اس خیال نے پیچھا نہ چھوڑا۔ کھیتوں میں بٹر کپ کے پھول اُگ رہے تھے اور لال رنگ کے بچھڑے گھاس چر رہے تھے۔ آسمان پر ابابیلیں اڑ رہی تھیں۔ واقعی ایش کے درخت ابھی ہرے نہ ہوئے تھے لیکن اوک کے درختوں پر بھورے بھورے سنہری پھول کھل رہے تھے۔ ہر درخت کا رنگ جدا تھا کسی کی اٹھتی جوانی تھی۔ کوئی اپنے پورے جوبن پر تھا۔ گلو اور ہزارہا پرندے چہچہا رہے تھے۔ چھوٹی چھوٹی ندیوں کا پانی دمک رہا تھا۔ قدیم زمانے کے لوگوں کا عقیدہ تھا کہ عیش و عشرت کا زمانہ آنے والا ہے ۔ ۔ ۔ باغ جنت میں ۔ ۔ ۔ ایک بھڑ اس کی آستین پر آ بیٹھی۔ ایک بھڑ سے دو ہزار بھڑیں پیدا ہوتی ہیں۔ اور ایک بھڑ کو مار ڈالو تو گویا جو سیب ان شگوفوں سے اگینگے وہ دو ہزار بھڑوں کی دستبرد سے محفوظ ہو جائینگے۔ پر کون ایسا سنگدل ہوگا۔ جو ایسے خوشگوار موسم میں کسی کی بھی جان لے سکے۔ ایک کھیت میں سرخ رنگ کا ایک جوان سانڈ چر رہا تھا۔ ایشرسٹ نے اسے دیکھا تو جو کی شکل یاد آئی۔ لیکن سانڈ نے ایشرسٹ سے کچھ تعرض نہ کیا۔ شاید یہ پسست قد جانور خود بھی اس سنہری چراگاہ کی خوبصورتی اور موسیقی سے مست تھا۔ ایشرسٹ بے کھٹکے ندی کے پاس ڈھلوان پر جا پہنچا۔ سامنے ایک پہاڑی چٹانوں کا تاج پہنے کھڑی تھی۔ بلیوبل اس کثرت سے اگ رہے تھے۔ کہ زمین پر ایک نیلی سی دھند چھا گئی تھی اور سیب کے کوئی بیس درخت شگوفوں سے لدے کھڑے تھے۔ ایشرسٹ گھاس پر لیٹ گیا۔ کھیتوں کے منظر پر اوک کے شگوفوں اور بٹر کپ کے پھولوں کا سنہری رنگ چڑھا ہوا تھا لیکن یہاں مٹیالے رنگ کی پہاڑی کے دامن میں تو جیسے آسمان کا حسن زمین پر اتر آیا تھا۔ ایشرسٹ اس فرق کو دیکھ کر محو حیرت تھا۔ گکوؤں کا چہچہانا اور ندی کا شور البتہ ویسے ہی سنائی دے رہا تھا۔ بہت دیر تک لیٹا رہا۔ شہد کی مکھیوں کے سوا اور کوئی ساتھی نہ تھا۔ سورج نے رفتہ رفتہ اپنا رخ بدل لیا۔ اور سیب کے درختوں کے سائے بلیوبل کے پھولوں پر پڑنے لگے۔ دیوانہ وار خیال آیا۔ آج صبح اسے چوما تھا۔ آج رات سیب کے پیڑ کے نیچے ملاقات ہوگی۔ بن دیویاں ایسے ہی درختوں میں آرام کرتی ہیں۔ اور سوکھے ہوئے برگین کی رنگت کے نکیلے کانوں والے دیوتا ان کے انتظار میں پڑے رہتے ہیں۔ ہوش میں آیا تو گکو چہچہا رہے تھے اور بہتے پانی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ لیکن سورج پہاڑی کے پیچھے جا چھپا تھا۔ ڈھلوان پر ایک خنکی سی آ گئی تھی۔ اور کہیں کہیں خرگوش باہر نکل آئے تھے۔ سوچا۔ "آج رات" جس طرح زمین سے ہر شے باہر ابھری آ رہی تھی اور ایک غیر مرئی ہاتھ کی نرم اور پر اسرار مشاطگی سے اس کا حسن ہر لمحہ آشکار تر ہو رہا تھا۔ اسی طرح اس کے دل اور اس کے حواس کی بھی جیسے تہیں ایک ایک کرکے کھلتی جا رہی تھیں۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا سیب کے درخت کی ایک ٹہنی توڑ لی۔ شگوفوں میں میگن کا سا حسن صحرائی دہی سپید۔ اشہابی رنگ۔ وہی تازگی اور کھلے ہوئے پھولوں میں میگن کی سی سفید رنگت۔ وہی دل کو موم کر دینے والی دلفریبی جلوہ گر تھی۔ ٹہنی کو کوٹ میں لگایا دل کے اندر جو بہار کھل رہی تھی اس کا تمام تر جوش فتحمندی کے ایک گہرے سانس کے ساتھ ہونٹوں سے باہر نکلا لیکن خرگوش بدک کر بھاگ گئے۔

٦

اوڈیسے کی جلد آدھ گھنٹے سے ایشرسٹ کے ہاتھ میں تھی۔ لیکن پڑھا ایک لفظ بھی نہ تھا۔ رات کے گیارہ بجنے والے تھے کتاب رکھ دی اور احاطے میں سے ہو کر باغیچے میں پہنچ گیا۔ پہاڑی کے عقب سے سنہری رنگ کا چاند ابھی ابھی نکلا تھا اور ایک ایش کے درخت کی نیم برہنہ ٹہنیوں میں سے ایک نورانی پر جلال محافظ فرشتے کی طرح جھانک رہا تھا۔ سیب کے پیڑوں کے نیچے ابھی

اندھیرا تھا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ میں کہاں ہوں اور مجھے کس طرف جانا ہے۔ ناہموار گھاس کو پاؤں سے ٹٹول ٹٹول کر آگے بڑھا۔ اس کے پیچھے قریب ہی کسی تاریک چیز نے حرکت کی اور ڈکار لینے کی سی آواز آئی۔ تین بڑے بڑے سؤر ذرا چونکے اور ہل جل کر پھر ایک دوسرے کے پہلو میں دیوار کے نیچے لیٹ گئے۔ اس نے کان لگا کر سنا۔ ہوا بند تھی۔ لیکن راہ میں ندی کی سرگوشیاں اور قہقہے دو چند سنائی دیتے تھے۔ ایک پرندہ (نہ معلوم کونسا) لگاتار پپ۔ پپ پپ کر رہا تھا۔ اور ایک نائٹ جار کے اڑنے اور ایک الو کے بولنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ایشرسٹ ایک دو قدم بڑھا اور پھر رک گیا۔ اسے ایسا معلوم ہوا جیسے اس کے سر کے اردگرد ایک دھندلی سی سفیدی چھائی ہوئی ہے جس میں زندگی دھڑک رہی ہے۔ ساکن اور سیاہ درختوں پر بیشمار کلیاں اور شگوفے جن کے نقش پھیلے ہوئے اور دھندلے سے دکھائی دے رہے تھے۔ بڑھتی ہوئی چاندنی کے طلسم سے زندہ ہو رہے تھے اُسے ایک عجیب احساس ہوا۔ کہ وہ تنہا نہیں بلکہ رفیقوں کی صحبت میں ہے۔ گویا کئی لاکھ پروانے یا فرشتے کہیں سے اڑ کر آئے ہیں اور تاریک آسمان اور تاریک زمین کے درمیان آکر ٹھہر گئے ہیں اور اس کی آنکھوں کے برابر اپنے پر کھول رہے ہیں اور بند کر رہے ہیں۔ اس ہوشربا لمحے کے حسن سے مسحور ہو کر جس میں کوئی آواز کوئی خوشبو نہ آتی تھی۔ وہ یہ بھی بھول گیا کہ باغیچے میں کیوں آیا تھا۔ وہ حسن پرّاں جس میں زمین دن بھر ملبوس رہی تھی چاندنی اسے تحلیل نہ کر سکی۔ صرف اس کی وضع بدل ڈالی۔ جھاڑیوں اور شاخوں میں سے ہوتا ہوا جن پر وہ زندہ سفیدی سفوف کی طرح بکھری ہوئی تھی۔ آگے نکل گیا اور بڑے سیب کے درخت تک جا پہنچا۔ اندھیرے میں بھی وہ درخت باقی درختوں سے گھیر اور بلندی میں قریباً دگنا۔ کھلے میدان اور ندی کی طرف جھکا ہوا صاف پہچانا جاتا تھا۔ گھنی ٹہنیوں کے نیچے پہنچ کر وہ پھر رک گیا اور کان لگا کر سننے لگا۔ وہی آوازیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں۔ اور نیم خوابیدہ سؤر دھیمی آواز میں ڈکرا رہے تھے۔ اس کے مس سے تنے کی کھردری کائی دار سطح میں سے کوئلے کی مٹی کی سی خوشبو نکلی۔ کیا وہ آئیگی؟ کیا سچ مچ؟ تھرتھراتے ہوئے مسحورِ ماہتاب درختوں کے درمیان اس کے دل پر ہر طرح کی بدگمانی نے احاطہ کر لیا۔ یہاں کی کوئی شے بھی اس دنیا کی معلوم نہ ہوتی تھی۔ یقیناً یہ مقام فانی عاشقوں کے لئے نہیں۔ ایشرسٹ اور اس دہقانی لڑکی کے لئے نہیں صرف دیوتاؤں اور دیویوں کے لئے بنا ہے۔ اگر وہ نہ آئی تو کیا طبیعت کو ایک اطمینان ایک مخلصی کا سا احساس نہ ہوگا؟ لیکن پھر بھی اس کے کان اسی کی آہٹ سننے کے منتظر تھے۔ وہ نامعلوم پرندہ بدستور پپ پپ کر رہا تھا۔ ندی کا شور بدستور سنائی دے رہا تھا۔ اور درخت کی ٹہنیوں میں محبوس چاند ندی کو جھانک رہا تھا۔ آنکھ کے برابر جو شگوفے تھے وہ معلوم ہوتا تھا ہر لمحہ زندہ تر ہو رہے ہیں۔ ان کا پراسرار نقرئی حسن بھی ایشرسٹ کی بیتابی کا ایک جزو بنا جا رہا تھا۔ اس نے ایک ٹہنی جس پر تین شگوفے کھل رہے تھے۔ توڑ لی۔ پھل دار درختوں کے شگوفوں کو نرم۔ پاکیزہ۔ مقدس۔ نوخیز شگوفوں کو توڑنا اور پھر پھینک دینا کیا یہ گناہ عظیم نہیں؟ یکلخت پھاٹک کے بند ہونے کی آواز آئی۔ سؤر پھر جاگ اُٹھے اور ڈکرانے لگے۔ ایشرسٹ درخت کے ساتھ سہارا لگائے کھڑا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ پیچھے کائی دار تنے کو دبا رہے تھے۔ میگن کو دیکھا۔ تو حیرت سے دم روک لیا۔ اس کی خاموش رفتاری ایک پری کی سی تھی جو درختوں کے بیچ میں پھر رہی ہو۔ جب قریب پہنچی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا تاریک جسم ایک چھوٹے سے درخت کا حصہ ہے۔ اس کا سفید چہرہ شگوفوں میں کا ایک شگوفہ ہے۔ وہ چپ چاپ ایشرسٹ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ایشرسٹ نے دھیمی آواز میں کہا میگن!

اور ہاتھ بڑھا دئے۔ وہ سیدھی دوڑ کر اس کے سینے سے آ لگی۔ جب اس کا دل اپنے دل کے ساتھ دھڑکتا ہوُا محسوس کیا۔ تو ایشرسٹ نے اپنے دل کو توقیر نسواں اور وفورِ عشق سے لبریز پایا چونکہ وہ اس دنیا کی نہ تھی۔ نوجوان تھی معصوم تھی۔ اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار تھی عشق میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اور کسی طرح اپنی حفاظت نہ کر سکتی تھی۔ اس تاریکی میں اس کا محافظ نہ بنے تو اور کیا کرے؟ مگر چونکہ وہ ہمہ تن حسن اور سادگی تھی اور زندہ شگوفوں کی طرح بہار کی اس رات کا ایک جزو تھی۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ کہ وہ جو کچھ دے وہ سب کا سب قبول نہ کرلے۔ اور اس کے دل کی بہار اور اپنے دل کی بہار دونوں کی تکمیل نہ کرے؟ یہ دو جذبے اپنی اپنی طرف اسے کھینچ رہے تھے۔ لڑکی کو زور سے سینے کے ساتھ لگایا۔ اور اس کے بالوں کو بوسہ دیا۔ کچھ معلوم نہ ہوُا۔ کہ کتنی دیر دونو یونہی خاموش وہاں کھڑے رہے۔ ندی بڑبڑاتی رہی۔ الّو بولتے رہے۔ چاند چپکے چپکے بلند تر اور سفید تر ہوتا گیا۔ ان کے ارد گرد شگوفے زندہ حسن کے دل کی دھڑکن سے اور بھی چمک اٹھے۔ ہونٹوں کے وصل نے گفتگو کے دروازے بند کر رکھے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے گفتار کا یہاں کوئی کام نہیں۔ بہار صرف سرسراتی ہے اور سرگوشیاں کرتی ہے۔ بہار بولتی نہیں۔ لیکن بہار کے کھلے ہوئے پھول پھوٹتی ہوئی کونپلیں ندیوں کی سسکیاں۔ ان کی خوش آہنگ والہانہ جستجو یہ تقریر و گفتار سے کہیں بڑھ کر ہیں۔ اسی طرح بہار بعض اوقات زندہ بھی ہو جاتی ہے۔ اور ایک پر اسرار ساحر کی طرح دو عاشقوں کے پاس کھڑی ہو کر ان دونوں کے گرد اپنی باہیں ڈال دیتی ہے۔ اپنے انگلیوں کے مس سے ان پر اپنا جادو پھیر دیتی ہے۔ اور پھر وہ ہونٹوں سے ہونٹ ملائے بجز اس بوسے کے سب کچھ بھول جاتے ہیں جب میگن کا دل اسکے دل کے ساتھ دھڑک رہا تھا اور میگن کے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر پھڑک رہے تھے۔ ایشرسٹ کے دل کو نشیلی مسرت کے سوا اور کوئی احساس نہ تھا۔ قسمت میں یہی لکھا تھا کہ وہ اس کی آغوش کو زینت بخشے۔ عشق کا کہا کون موڑ سکتا ہے؟ لیکن جب سانس لینے کو ان کے ہونٹ جدا ہوئے۔ تو دوئی فوراً حائل ہوئی۔ البتہ عشق کا جذبہ اب پہلے سے زیادہ منہ زور تھا ایشرسٹ نے ایک آہ بھر کر کہا:-

"او میگن۔ تم کیوں آئیں"؟

میگن نے نظر اٹھائی۔ کچھ حیران تھی۔ کچھ مجروح۔

"جناب آپ ہی نے بلایا تھا"۔

"میری جان مجھے جناب نہ کہو"۔

"تو پھر کیا کہوں"؟

"فرینک"۔

"میں نہیں کہہ سکتی۔ ہرگز نہیں"۔

"تو کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں"؟

"دل پر میرا زور نہیں۔ میں ہمیشہ آپ کے پاس رہنا چاہتی ہوں اور بس"!

"بس"۔

دھیمی آواز میں جو اسے بمشکل سنائی دیتی تھی۔ میگن نے کہا "آپ کے پاس نہ رہ سکی۔ تو میں مر جاؤنگی"۔

ایشرسٹ نے ایک لمبا سانس لیا۔

"تو آؤ پھر میرے پاس آؤ"!

"اوہ"!

اس "اوہ"! میں جو ڈر اور مسرت تھی اس سے ایشرسٹ پر ایک نشہ سا چھا گیا۔ دھیمی آواز میں بولا:-

"میں تمہیں لندن لے چلونگا۔ میں تمہیں سب دنیا کی سیر کراؤنگا۔ اور میگن میں قسم کھاتا ہوں کہ میں ہر طرح تمہارا خیال رکھونگا۔ کبھی تم سے درشتی کے ساتھ پیش نہ آؤنگا"

"اگر میں آپ کے پاس رہ سکوں تو یہی کافی ہے"۔

ایشرسٹ نے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیر کر کہا:-
"کل میں ٹورکی جاؤنگا۔ اور وہاں سے روپیہ لے کر تمہارے لئے کپڑے خریدونگا۔ اِن کپڑوں میں خواہ مخواہ لوگ شبہ کرینگے۔ پھر ہم چپکے سے لندن چلے جائینگے۔ اور وہاں پہنچ کر اگر تمہیں مجھ سے محبت ہوئی۔ تو شادی کر لینگے۔"

میگن کے بالوں کی تھرتھراہٹ سے اس کے سر کی جنبش کا پتہ چلتا تھا۔

"نہیں نہیں میں یہ نہیں کر سکتی۔ میں صرف آپ کے پاس رہنا چاہتی ہوں۔"

اپنی مردانگی سے خود ہی مخمور ہو کر ایشرسٹ نے کہا:-

"نہیں، بلکہ میں، تمہارے قابل نہیں۔ میگن تمہیں مجھ سے محبت کب پیدا ہوئی"؟

"جب میں نے آپ کو سڑک پر دیکھا اور آپ نے مجھ پر نگاہ ڈالی۔ پہلی ہی رات مجھے آپ سے محبت ہوگئی تھی۔ لیکن یہ کبھی میرے وہم میں بھی نہ آیا تھا۔ کہ آپ مجھے چاہینگے"۔

یکلخت گھٹنوں کے بل جھک کر ایشرسٹ کے پاؤں کو چومنے لگی۔

ایشرسٹ کانپ اٹھا۔ فوراً اس کو اٹھا لیا۔ اور بھینچ کر گلے سے لگا لیا۔ بہت پریشان ہوگیا تھا۔ اس لئے کچھ بول نہ سکا۔ میگن نے کہا۔ "آپ مجھے کیوں چومنے نہیں دیتے"؟

"مجھے تمہارے پاؤں چومنے چاہئیں"۔

میگن کی مسکراہٹ سے ایشرسٹ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے چاند کی روشنی میں ایشرسٹ کے قریب میگن کے چہرے کی سفیدی اور اس کے کھلے ہوئے ہونٹوں کا ہلکا گلابی رنگ۔ ان میں سیب کے شگوفوں کا سا زندہ غیر ارضی حسن تھا۔

اور پھر یکلخت میگن نے آنکھیں پھاڑ کر دکھے ہوئے انداز میں سامنے دیکھا۔ کسمسا کر اس کی آغوش سے اپنا آپ چھڑایا اور بولی۔

"وہ دیکھو"!

ایشرسٹ کو روشن ندی۔ ہلکے سنہری رنگ کے فرز چمکتے ہوئے بیچ کے درختوں اور ان کے پیچھے چاندنی میں اس پہاڑی کے سوا اور کچھ نظر نہ آیا۔ پیچھے سے اس کو میگن کی سہمی ہوئی آواز سنائی دی۔ "جپسی ہوّا"!

"کہاں"؟

"وہ درختوں کے نیچے۔ پتھر کے پاس"۔

ایشرسٹ نے برافروختہ ہو کر ندی کو پھاندا اور بیچ کے درختوں کے جھنڈ کی طرف چلا۔ چاندنی کا فریب ہے! کچھ بھی نہیں! چٹانیں اور تھارن کے درختوں کے بیچ میں، بڑبڑاتا اور لعنتیں بھیجتا ادھر ادھر بھاگتا اور ٹھوکریں کھاتا پھرا۔ واہیات! فضول! پھر سیب کے درخت کے پاس گیا لیکن وہ جا چکی تھی۔ اسے ایک سرسراہٹ۔ سؤروں کے ڈکرانے اور پھاٹک کے بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ وہ چلی گئی صرف وہ پرانا سیب کا درخت وہاں رہ گیا۔ اس نے اپنی باہیں تنے کے گرد ڈال دیں۔ کہاں اس کا نرم جسم کہاں یہ سخت تنا؟ کھردری کائی اس کے چہرے کو چھو رہی تھی۔ کہاں اس کا کھردراپن۔ کہاں اس کا نرم رخسار؟ صرف خوشبو جنگل کی خوشبو۔ کم وبیش ویسی تھی اور اس کے اوپر اور اس کے ارد گرد شگوفے پہلے سے زیادہ زندہ۔ چاندنی میں پہلے سے زیادہ روشن۔ دمکتے اور سانس لیتے معلوم ہوتے تھے۔

(۷)

ٹورکی سٹیشن پر ریل سے اتر کر ایشرسٹ نے سمندر کا رخ کیا اور ساحل کے ساتھ ساتھ رُک رُک کر ٹہلتا رہا۔ کیونکہ وہ انگلستان کے ساحلی مقامات کی اس ملکہ یعنی ٹورکی سے اچھی طرح واقف نہ تھا۔ اپنے لباس کا چنداں خیال نہ تھا۔ اس لئے اُسے اس بات کا احساس نہ ہوا۔ کہ یہاں کے باشندے اسے تعجب کی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ وہ ایک موٹی سی نارفوک جیکٹ۔ گرد آلود بوٹ اور پھٹی پرانی ٹوپی پہنے لمبے لمبے قدم اٹھائے چلا جا رہا تھا۔ اس بات سے

محض بیخبر کہ لوگ اس لباس کو حیرت سے تک رہے ہیں۔ اس کا بینک لندن میں تھا۔ لیکن وہ اس تلاش میں تھا کہ یہاں اس کی کوئی شاخ موجود ہو۔ تو یہیں سے روپیہ نکلوائے۔ جب بینک میں پہنچا تو اس کے خوشگوار خیالات کو پہلا دھچکا لگا۔ انہوں نے پوچھا۔ آپ ٹورکی میں کسی کو جانتے ہیں؟ جواب ملا۔ نہیں۔ انھوں نے کہا آپ لندن تار بھیجدیجئے۔ وہاں سے جواب آئیگا۔ تو ہم بڑی خوشی سے آپ کو روپیہ ادا کر دینگے۔ ٹھوس کاروباری دنیا کے منتبہ سانس نے اس کے درخشاں تصورات کو دھندلا کر دیا۔ لیکن تار اس نے بھیج دیا۔

ڈاک خانے کے سامنے عورتوں کے ملبوسات کی ایک دکان نظر پڑی۔ اس نے کھڑکی میں لٹکے ہوئے کپڑوں کو انوکھے پن کے احساس کے ساتھ دیکھا۔ اپنی محبوبہ دہقانی کے لئے کپڑے خریدنا خاصا پریشان کن ثابت ہوا۔ دکان کے اندر گیا۔ ایک جوان عورت سامنے آئی۔ اس کی آنکھیں نیلی تھیں اور ملتفے پر خفیف سے تعجب کے آثار تھے۔ ایشرسٹ بغیر کچھ بولے اُسے تکتا رہا۔

"کہئے جناب"؟

"مجھے ایک نوجوان خاتون کے لئے لباس خریدنا ہے"۔

نوجوان عورت مسکرا دی۔ ایشرسٹ نے ماتھے پر تیوری ڈالی یکلخت اور بڑے زور سے اس بات کا احساس ہوا۔ کہ یہ فرمائش انوکھی فرمائش ہے۔

نوجوان عورت نے جلدی سے کہا:-

"کس قسم کا لباس چاہیئے آپ کو؟ بہت وضعدار"؟

"نہیں سیدھا سادا"۔

"یہ نوجوان خاتون کس قد کی ہیں"؟

"معلوم نہیں۔ بس تم سے دو انچ چھوٹی ہونگی"۔

"کمر کا ناپ آپ مجھے بتا سکتے ہیں"؟

میگن کی کمر!

"بس یہی جو عام طور پر ہوتا ہے"۔

"بہت خوب"

جب وہ چلی گئی تو ایشرسٹ کھڑکی میں رکھے ہوئے لباسوں کو پریشان نظروں سے دیکھتا رہا اور یکلخت اسے خیال پیدا ہوا۔ کہ میگن ــــ اس کی میگن۔ سوائے کھردری ٹپی کے سلائے کھردرے بلاؤز اور دہقانی ٹوپی کے یعنی سوائے ان کپڑوں کے جن میں اُسے بارہا دیکھا تھا۔ کسی اور لباس میں بہت ہی عجیب معلوم ہوگی۔ نوجوان عورت بازو پر بہت سے کپڑے ڈالے واپس آئی۔ اور ایک ایک لباس کو اپنے طرحدار جسم کے ساتھ لگا لگا کر دکھانے لگی۔ ان میں سے ایک کا فاختئی رنگ ایشرسٹ کو بہت پسند آیا۔ لیکن میگن کو یہ لباس پہنے ہوئے تصور نہ کر سکتا تھا۔ نوجوان عورت چلی گئی اور چند اور کپڑے اٹھا لائی۔ لیکن ایشرسٹ کا دماغ سن ہوگیا تھا۔ کیا چننے اور کیونکر چنے؟ ٹوپی اور جوتا اور دستانوں کی بھی ضرورت ہوگی اور فرض کرو سب کچھ خرید کر اُسے پہنا دیا۔ اور اس لباس نے اسے بالکل ہی بے رنگ بنا دیا۔ جیسے اتوار کے کپڑے اکثر دہقانوں کو بنا دیتے ہیں۔ تو پھر کیا ہوگا! سفر میں بھی اپنے ہی کپڑے کیوں نہ پہنے؟ ہاں۔ لیکن اُن کپڑوں میں وہ بہت نمایاں معلوم ہوگی۔ یہ ہنسی کھیل نہیں۔ غور و فکر کا معاملہ ہے۔ نوجوان عورت کو بے معنی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ کیا معلوم یہ سب کچھ تاڑ گئی ہو اور مجھے محض ایک بدمعاش شخص سمجھتی ہو۔ آخر کار بولا: "یہ فاختئی رنگ کا لباس علیحدہ رکھ دو۔ میں اس وقت فیصلہ نہیں کر سکتا۔ دوپہر کے بعد پھر آؤنگا"۔

نوجوان عورت نے ایک آہ بھری۔

"بہت اچھا۔ بہت خوبصورت لباس ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کو اس سے موزوں لباس نہیں مل سکتا"۔

ایشرسٹ نے کہا۔ "غالباً نہیں"۔ اور چل دیا۔

مشتبہ دنیا کے کاروباری پن سے پھر ایک بار آزاد ہو کر اس نے ایک لمبا سانس لیا اور پھر اپنے تصورات میں مشغول ہو گیا۔ تصور میں اس بھولی بھالی پیاری لڑکی کو دیکھا جو اپنی زندگی اس کی زندگی کے ساتھ وابستہ کرنے کو تیار تھی۔ دیکھا کہ دونوں رات کے وقت چپکے سے باہر نکلے ہیں۔ چاندنی رات ہے۔ وہ جنگل میں جا رہے ہیں اس کا بازو لڑکی کی کمر کے گرد ہے۔ لڑکی اپنے نئے کپڑے اٹھائے جا رہی ہے۔ علی الصباح وہ کسی دور دراز جنگل میں پہنچ گئے ہیں۔ لڑکی نے اپنے پرانے کپڑے اتار کر نئے کپڑے پہن لئے ہیں۔ سٹیشن پر صبح کی گاڑی تیار کھڑی ہے۔ جس میں سوار ہو کر وہ اپنے ہنی مون کے سفر کو روانہ ہو گئے ہیں۔ اور پھر لندن نے انہیں نگل لیا ہے اور عشق کے خواب سچے ثابت ہو رہے ہیں

"فرینک ایشرسٹ! واللہ رگبی کے بعد تمہیں آج دیکھا ہے"

ایشرسٹ کے ماتھے کے شکن صاف ہو گئے۔ جو چہرہ اس کے قریب تھا۔ اس کی آنکھیں نیلی تھیں اور بشرے پر آفتاب کی جھلک تھی۔ ایسے شخص کا چہرہ تھا۔ جس کا آفتابِ دل آفتابِ فلک کے ساتھ مل کر اس کی زندگی کو درخشانی بخش رہا ہو۔

"ارے! فل ہیلی ڈے!"

"تم یہاں کیا کر رہے ہو"؟

"کچھ نہیں۔ یونہی گھوم رہا تھا۔ روپیہ لینے آیا تھا میں جنگل میں رہتا ہوں"۔

"لنچ کے لئے کہیں جانا تو نہیں؟ آؤ ہمارے ساتھ لنچ کھاؤ میرے ساتھ میری بہنیں بھی ہیں۔ انہیں خسرہ نکلا تھا"۔

ایک دوسرے کی بانہہ میں بانہہ ڈالے دونو وہاں سے روانہ ہوئے اور ایک پہاڑی پر سے ہوتے ہوئے شہر سے باہر نکل گئے ہیلی ڈے کا چہرہ آفتابی تھا۔ تو آواز میں بھی بہجت اور تازگی اور خوش دلی پائی جاتی تھی۔ کہ رہا تھا۔ کہ یہاں اس اجاڑ مقام میں تو سوائے نہانے اور کشتی چلانے کے اور کوئی شغل نہیں۔ ہوتے ہوتے مکانات کی ایک ہلالی قطار کے سامنے آ کر ٹھہر گئے۔ جو سمندر سے ذرا ہٹ کر واقع تھے۔ عین وسط میں ایک ہوٹل تھا۔ دونو اندر داخل ہو گئے۔

"میرے کمرے میں آ کر منہ ہاتھ دھولو۔ لنچ ابھی تیار ہوا چاہتا ہے"۔

ایشرسٹ نے اپنا چہرہ آئینے میں دیکھا۔ فارم ہوس میں پندرہ دن تک صرف ایک کنگھی اور دو قمیصوں پر گزارہ کیا تھا اور یہاں تو کئی کپڑے اور کئی برش رکھے تھے۔ سوچا عجیب بات ہے۔ انسان کو احساس بھی نہیں ہوتا۔ کہ ——— " کا ہے کا احساس؟ یہ اسے ٹھیک معلوم نہ تھا۔

ہیلی ڈے کے ساتھ بیٹھنے کے کمرے میں لنچ کھانے گیا تو تین اجنبی چہرے نظر آئے۔ رنگ بہت گورا۔ آنکھیں نیلی۔ ہیلی ڈے نے کہا "یہ فرینک ایشرسٹ ہیں۔ یہ میری چھوٹی بہنیں ہیں"۔ تینوں چہرے یکلخت اوپر اٹھے۔

دو تو بہت ہی چھوٹی تھیں۔ ایک دس سال کی ایک گیارہ سال کی لیکن تیسری کی عمر سترہ سال کے لگ بھگ تھی۔ قد لمبا بال ہلکے رنگ کے۔ سرخ و سفید رخسار جن کو سورج نے ذرا سنولا دیا تھا۔ بھویں سامنے سے نیچی دائیں بائیں سے ذرا اٹھی ہوئی تھیں۔ اور ان کی رنگت سر کے بالوں سے قدرے گہری تھی۔ آوازیں تینوں کی ہیلی ڈے کی طرح بلند اور بشاش تھیں تینوں سیدھی کھڑی ہو گئیں۔ جلدی جلدی ہاتھ ملایا۔ ایشرسٹ پر ایک متجسس نظر ڈال کر فوراً آنکھیں ہٹا لیں۔ اور سہ پہر کے مشاغل کے متعلق باتیں کرنے لگیں۔ ایک ڈائنا اور باقی دو اس کی داسیاں معلوم ہوتی تھیں۔ فارم کی زندگی کے بعد ان کی شوخ پرجوش۔ بے تکلف گفتگو۔ ان کا پرسکون منجھا ہوا بے تکلف انداز شائستگی پہلے تو انوکھا اور پھر اس قدر مانوس معلوم ہوا کہ فارم ہوس کا ماحول یکلخت کسی دور دراز دنیا کا خواب معلوم

ہونے لگا چھوٹی بہنوں کا نام سبینا اور فریڈا اور بڑی بہن کا نام سٹیلا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد سبینا اس کی طرف متوجہ ہوئی اور بولی۔

"آپ ہمارے ساتھ مچھلیاں پکڑنے چلینگے؟ بہت لطف رہیگا۔"

اس غیر متوقع بے تکلفی پر متعجب ہو کر ایشرسٹ نے کہا۔

"مجھے تو آج سہ پہر واپس جانا ہے۔"

"اچھا"؟

"جانا ملتوی نہیں کر سکتے"؟

یہ سٹیلا کا فقرہ تھا۔ ایشرسٹ اس کی طرف مڑا۔ اور سر ہلا کر مسکرا دیا۔ کیا حسن تھا! سبینا نے افسوس کے لہجے میں کہا:

"ملتوی کر دیجئے تو بہتر ہو" اس کے بعد پھر غاروں اور تیرنے کے متعلق باتیں ہونے لگیں۔

"آپ بہت دور تیر سکتے ہیں"؟

"قریباً دو میل۔"

"سچ مچ۔"

"خوب"!

"[illegible]"!

تینوں نے نیلی نیلی آنکھیں اس کے چہرے پر گاڑ دی تھیں۔ ایشرسٹ کو اپنی نئی اہمیت کا احساس ہوا۔ خوشگوار احساس۔ ہیلی [illegible] نے کہا:

"ایشرسٹ تمہیں ٹھہرنا پڑیگا۔ ہمارے ساتھ نہانے نہ چلوگے؟ میں تو کہتا ہوں۔ رات یہیں ٹھہر جاؤ"۔

"ہاں۔ ضرور۔"

لیکن ایشرسٹ نے پھر مسکرا کر سر ہلا دیا۔ اور پھر یکلخت ہی لڑکیاں اس کے کھیلوں اور جسمانی کرتبوں کے متعلق دھڑا دھڑ اس سے سوالات پوچھنے لگیں۔ رفتہ رفتہ معلوم ہوا کہ وہ کالج میں کشتی بھی چلاتا رہا ہے۔ فٹ بال کی ٹیم میں بھی شامل تھا۔ اور ایک میل کی دوڑ میں اوّل بھی آیا تھا۔ لنچ ختم ہونے تک اس نے اپنی ان صفات کی بدولت لڑکیوں کے دل میں گھر کر لیا۔ چھوٹی لڑکیاں مصر ہوئیں کہ ہمارے ساتھ چل کر وہ غار دیکھئے جہاں ہم کھیلنے جاتی ہیں۔ چنانچہ طوطوں کی طرح ٹائیں ٹائیں کرتی وہ ایشرسٹ کو ساتھ لئے غار کی طرف روانہ ہو گئیں۔ پیچھے پیچھے سٹیلا اور اس کا بھائی تھا۔ غار دوسرے غاروں کی طرح سیلا ہوا اور تاریک تھا۔ خوبی اس میں صرف یہ تھی کہ اندر ایک پانی کا تالاب تھا جس میں سے کئی جانور پکڑ کر بوتلوں میں بند کئے جا سکتے تھے۔ سبینا اور فریڈا نے جن کی سڈول سانولی پنڈلیاں موزوں سے بے نیاز تھیں۔ تالاب کے بیچ میں کھڑے ہو کر ایشرسٹ کو شمولیت کی دعوت دی۔ تاکہ تینوں اکٹھے مچھلیاں پکڑیں۔ ایشرسٹ نے ٹوپی اور موزے اتار دئے۔ جس کے دل میں احساس حسن ہو اُسے وقت گزرتا معلوم نہیں ہوتا۔ دو خوبصورت بچے پانی میں کھیل رہے تھے۔ نوجوان ڈائنا کنارے پر کھڑی تھی اور جو کچھ یہ تالاب میں سے نکال لیتے تھے۔ اُسے تعجب اور حیرت سے پکڑتی جاتی تھی ایشرسٹ یوں بھی وقت کا اندازہ ٹھیک نہ لگا سکتا تھا۔ جب گھڑی جیب سے نکالی۔ تو حیران رہ گیا۔ تین کب کے بج چکے تھے۔ گویا بینک بند ہو گیا ہوگا۔ اور روپیہ آج نہ مل سکیگا۔ اس کے بشرے کو دیکھ کر چھوٹی لڑکیاں چلانے لگیں۔

"ہاہا۔ اب تو آپ کو ٹھہرنا ہی ہوگا"

ایشرسٹ نے کچھ جواب نہ دیا۔ اُسے میگن کا چہرہ نظر آرہا تھا۔ ناشتے کے وقت میگن سے دھیمی آواز میں کہا تھا "میں چلن میں سامان خریدنے ٹورکی جا رہا ہوں۔ آج شام واپس آجاؤنگا اگر موسم اچھا ہوا۔ تو آج رات ہی چل دینگے۔ تم تیار رہنا۔" اسے یاد آیا کہ میگن تھرتھرا اٹھی تھی۔ اور اس کے الفاظ کو سن کر بہت خوش ہوئی تھی۔ وہ دل میں کیا کہیگی؟ پھر یکلخت احساس ہوا۔ کہ تیسری لڑکی۔ لمبا قد۔ گورا رنگ۔ ڈائنا کا سا حسن۔ تالاب کے

کنارے پر کھڑی متحیر نیلی آنکھوں سے اُسے بغور دیکھ رہی ہے۔ انہیں کیا معلوم کہ اس کے دل پر کیا گذر رہی ہے؟ انہیں کیا معلوم آج رات کے لئے اس نے دل میں کیا ٹھان رکھا تھا؟ اگر انہیں معلوم ہو جائے۔ تو وہ نفرت کا اظہار کر کے اسے تنہا غار میں چھوڑ کر خود چلے جائیں۔ اس خیال سے کچھ مایوسی ہوئی کچھ شرم سی آئی۔ گھڑی کو جیب میں ڈال کر یکلخت بولا:۔

"ہاں۔ آج تو نہیں جا سکتا"

"اہا ہا۔ اب تو آپ ہمارے ساتھ ہی نہائینگے"!

یہ خوبصورت بچے کس قدر بے فکر تھے۔ سٹیلا مسکرا رہی تھی۔ ہیلی ڈے کہ رہا تھا۔ "لطف آگیا۔ بس رات کے کپڑے میں تمہیں دے دونگا"۔ اس تمام خوشدلی سے متاثر نہ ہونا ناممکن تھا لیکن پھر بھی پشیمانی اور تمنا کے جذبات سے دل دھڑکنے لگا۔ اداسی کے لہجے میں بولا:۔

"مجھے ایک تار بھیجنا ہے"۔

تالاب کے کھیل سے اکتا گئے۔ تو ہوٹل کو لوٹ آئے۔ ایشرسٹ نے مسز ہیرو کومب کے پتے پر اس مضمون کا تار بھیجا۔ "افسوس ہے مجھے رات یہیں ٹھہرنا ہوگا۔ کل آؤنگا"۔ اس سے دل کچھ ہلکا ہوا موسم بہت خوشگوار تھا۔ ہلکی ہلکی سی گرمی جسم کو بہت اچھی معلوم ہوتی تھی۔ سمندر پرسکون اور نیلا نیلا تھا۔ اور ایشرسٹ تیراکی کا شوقین! خوبصورت بچوں کی تعریف و توصیف سے اس کی نخوت کی تسکین ہوتی تھی۔ سٹیلا کو اور ہیلی ڈے کے بشاش چہرے کو دیکھ کر طبیعت کو خوشی حاصل ہوتی تھی۔ گویا میگن کے ساتھ ایک نئی زندگی شروع کرنے سے پہلے اپنی اصلی زندگی کو آخری نظر دیکھ رہا ہے ہیلی ڈے سے غسل کا لباس مستعار لیا اور اکٹھے روانہ ہوئے۔ ہیلی ڈے اور ایشرسٹ نے ایک چٹان کی اوٹ میں کپڑے اتارے۔ سب سے پہلے ایشرسٹ پانی میں داخل ہوا۔ اور اپنی زبانی اپنی جو تعریف ان کو سنا چکا تھا۔ اس کو سچ ثابت کرنے کے لئے جان بوجھ کر دلیرانہ تیر کر دور نکل گیا۔ مڑ کر دیکھا۔ تو ہیلی ڈے ساحل کے ساتھ ساتھ تیر رہا تھا۔ لڑکیاں پانی اچھال رہی تھیں اور ڈبکیاں لگا رہی تھیں۔ اور چھوٹی چھوٹی لہروں کے سامنے بھی اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیتی تھیں ایشرسٹ عام طور پر ایسے نظارے کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا کرتا تھا۔ لیکن اس وقت لڑکیوں کی یہ کمزوری معقول اور دلکش معلوم ہوئی کیونکہ اس کے مقابلے میں اسکا اپنا کمال بہت ہی نمایاں معلوم ہوتا تھا۔ جب ان کے قریب پہنچا۔ تو سوچنے لگا۔ میں ایک اجنبی ہوں میری شمولیت کہیں انہیں ناگوار نہ گزرے۔ اس نازک بدن دوشیزہ کے قریب جاتے ہوئے اسے شرم آتی تھی۔ لیکن سبینا نے اسے خود بلایا کہنے لگی مجھے تیرنا سکھائیے۔ چھوٹی لڑکیوں نے اسے اس قدر مصروف رکھا۔ کہ اسے یہ معلوم کرنے کا کہ سٹیلا اس کے قرب سے مانوس ہو چکی ہے یا نہیں۔ موقع ہی نہ ملا۔ یکلخت سٹیلا چونک کر پکاری۔ ایشرسٹ نے دیکھا تو سٹیلا مرمری اور نازک بازو پھیلائے جسم ذرا آگے کو جھکائے کمر کمر تک پانی میں کھڑی ہے اس کے زرد چہرے پر دھوپ کی وجہ سے چتّیں سی پڑ رہی ہیں اور وہ سہمی ہوئی ایک طرف کو اشارہ کر رہی ہے۔

"فِل کو دیکھو! یہ کیا کر رہا ہے؟ ارے دیکھو"!

ایشرسٹ تاڑ گیا۔ کہ فِل خطرے میں ہے۔ وہ ایشرسٹ سے سَو گز کے فاصلے پر تھا۔ اس کے پاؤں اکھڑ چکے تھے اور وہ ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ یکلخت اس نے ایک چیخ ماری۔ بازو اونچے کئے اور پانی میں ڈوب گیا۔ لڑکی اپنے بھائی کی طرف بڑھی۔ لیکن ایشرسٹ نے "واپس جاؤ۔ سٹیلا" کہ کر اسے روک دیا اور خود لپکا۔ عمر بھر اس قدر تیز کبھی نہ تیرا تھا۔ ہیلی ڈے دو سے زیادہ غوطے نہ کھانے پایا تھا۔ کہ ایشرسٹ نے اسے پکڑ لیا۔ حادثے کی وجہ تشنج اعضا تھی لیکن اسے بچانے میں کوئی دقت پیش نہ آئی کیونکہ اس نے ذرا مزاحمت نہ کی۔ آخر وہاں پہنچے جہاں ایشرسٹ لڑکی کو روک گیا تھا۔ جب زمین پر پاؤں لگے تو لڑکی بھی آگے آئی

فل کو اٹھا کر ساحل پر لے گئے۔ ایشرسٹ اور سٹیلا اسکے بازووں اور ٹانگوں کو مالش کرتے رہے۔ چھوٹی لڑکیاں سہمی ہوئی پاس کھڑی رہیں۔ تھوڑی دیر میں ہیلی ڈے مسکرانے لگا اور اس قدر تکلیف کا موجب ہونے پر ندامت کا اظہار کرنے لگا۔ ایشرسٹ سے بولا۔ ذرا سہارا دو۔ تو میں کپڑے پہن لوں۔ ایشرسٹ سہارا دینے لگا۔ تو سٹیلا کے تر۔ اشک آلود۔ سرخ چہرے پر جس کا سکون برہم ہو چکا تھا۔ نظر پڑی۔ سوچنے لگا میں نے اسے سٹیلا کہ کر پکارا تھا۔ اس نے برا تو نہیں مانا۔

کپڑے پہن رہے تھے۔ تو ہیلی ڈے نے نیچی آواز میں کہا۔

"ایشرسٹ تم نے مجھے موت سے بچایا ہے"۔

"کیا کر رہے ہو"!

کپڑے پہن چکے تو ہوٹل میں آئے۔ لیکن ابھی کچھ پریشان تھے۔ باقی لوگ تو چائے پر بیٹھ گئے۔ ہیلی ڈے کو لٹا دیا۔ مربہ اور روٹی کے ایک دو ٹکڑے کھا چکی۔ تو سبینا بولی۔

"آپ نے تو بہت بہادری دکھائی"۔ اور فریڈا بولی

"آپ کمال کے آدمی ہیں"۔

ایشرسٹ نے دیکھا کہ سٹیلا کی نظریں نیچی ہیں۔ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ وہاں سے اس نے سبینا کو دھیمی آواز میں کہتے سنا۔ آؤ خونی قسم کھائیں۔ کہ ہم ہمیشہ دوست رہینگے۔ فریڈا تمہارا چاقو کہاں ہے؟ کنکھیوں سے دیکھا۔ کہ تینوں نے چاقو کی نوک اپنے جسم میں چبھا کر خون کا ایک ایک قطرہ نکالا ہے۔ اور کاغذ کے ایک ورق پر کچھ لکھ رہی ہیں۔ وہ مڑ کر دروازے کی طرف چلا۔

"اب نیوے نہ بنئے۔ یہاں آئیے"۔ چھوٹی لڑکیوں نے اسے بازو سے پکڑ لیا اور گھسیٹ کر میز تک لے آئیں۔ میز پر وہ کاغذ پڑا تھا۔ جس پر خون سے ایک انسان کی تصویر بنی تھی اور خون ہی سے تین نام لکھے تھے۔ سٹیلا ہیلی ڈے۔ سبینا ہیلی ڈے۔ فریڈا ہیلی ڈے۔ کاغذ پر بہتے ہوئے لہو سے ایسی شکل بن گئی تھی۔ جیسے ایک ستارے کی شعاعیں ادھر ادھر پھیل رہی ہوں۔ سبینا بولی۔

"یہ بیچ میں تم ہو۔ تمہیں معلوم ہے۔ اب تو ہم تمہیں چومینگی" اور فریڈا بولی۔ "ارے ہاں۔ واقعی"۔

ایشرسٹ کے لئے کوئی مفر نہ تھا۔ اس کے گیلے بال اس کی آنکھوں کے سامنے لٹک آئے تھے۔ کسی نے اس کی ناک کو جیسے کاٹ لیا۔ اس کے بائیں بازو پر کسی اور نے چٹکی بھری اور دانت اس کے رخسار پر آلگے۔ اس کے بعد انھوں نے اس کو چھوڑ دیا۔ اور فریڈا بولی:۔

"سٹیلا اب تمہاری باری ہے"۔

ایشرسٹ کا رنگ سرخ ہو رہا تھا۔ اس کا جسم اکڑا ہوا تھا میز کے اس طرف سٹیلا کا بھی یہی حال تھا۔ سبینا نے ایک طفلانہ قہقہہ لگایا۔ اور فریڈا پکاری:۔

"اب چلو بھی۔ نہیں تو سب مزا کرکرا ہو جائیگا"۔

ایشرسٹ کے جسم میں ایک عجیب وغریب محجوب سے اشتیاق کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے نیچی آواز میں کہا۔

"بکو مت۔ بہت شریر لڑکیاں ہو تم"!

سبینا پھر ہنس دی۔

"اچھا تو سٹیلا اپنا ہاتھ چوم لے اور تم اس کے ہاتھ کو لے کر اپنی ناک سے لگا لو۔ آپ کی ناک ہے بھی اس طرف کو مڑی ہوئی"۔

سٹیلا نے سچ مچ اپنا ہاتھ چوم کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ ایشرسٹ نے بڑی متانت کے ساتھ اس خنک نازک ہاتھ کو اپنے رخسار سے لگایا۔ چھوٹی لڑکیاں تالیاں بجانے لگیں اور فریڈا بولی:۔

بس اب جب موقع آیا ہمیں آپ کی جان بچانی ہوگی؟ ہیں

چائے کا ایک اور پیالہ پی لوں سٹیلا؟ لیکن ایسی ہلکی پانی سی چائے نہیں جیسے تم نے پہلے مجھے دی تھی"۔
چائے کا دَور پھر چلنے لگا۔ ایشرسٹ نے وہ دستاویز تہ کرکے جیب میں رکھ لی۔ پھر خسرے پر۔ نارنگیوں پر شیشے سے شہد کھانے پر اور سکول نہ جانے کے فوائد پر گفتگو ہوتی رہی۔ ایشرسٹ چپکا سنتا رہا۔ صرف کبھی کبھی سٹیلا سے جس کے چہرے کی سرخ وسفید رنگت پھر عود کر آئی تھی۔ آنکھیں چار ہو جاتیں۔ اور نظروں ہی نظروں میں عہدِ رفاقت کا اعادہ ہوتا رہتا۔ ایک اجنبی کے ساتھ ان بشاش لوگوں کے مشفقانہ سلوک سے ایشرسٹ کے دل کو راحت ہوئی۔ ان کے ہنستے ہوئے چہروں سے آنکھیں نہ ہٹا سکتا۔ چائے کے بعد چھوٹی لڑکیاں تو سمندری کائی کو خشک کرنے کے شغل میں مصروف ہو گئیں۔ اور ایشرسٹ کھڑکی کے قریب جو نشست تھی۔ اس پر بیٹھ کر سٹیلا سے باتیں کرتا رہا اور سٹیلا کی کھینچی ہوئی آبی رنگوں کی تصاویر کو دیکھتا رہا۔ اس پر ایک خوشگوار خواب کی سی کیفیت طاری تھی۔ وقت اور واقعے اور اہمیت اور حقیقت کا احساس معطل و معلق ہو گیا تھا۔ کل وہ پھر میگن کے پاس چلا جائیگا اور اس لطف و مسرت کی کوئی نشانی اس کے پاس نہ ہوگی۔ بجز اس کاغذ کے جو ان بچوں کے خون سے رنگین تھا۔ بچے! سٹیلا تو عمر میں میگن کے برابر ہے۔ وہ بچہ کیونکر ہوئی؟ اس کی باتیں۔ تیز تیز۔ قدرے خشک اور محجوب تاہم دوستی کے رنگ میں ڈوبی ہوئی۔ ایشرسٹ کی خاموشیوں میں کسی ساز کی آواز کی مانند گونج اٹھتی تھیں۔ سٹیلا کے انداز میں ایک خنکی۔ ایک دوشیزگی پائی جاتی تھی۔ جیسے کسی افسانے کی محبوبہ پھولوں کی جھونپڑی میں بیٹھی ہو۔ ہیلی ڈے کے پیٹ میں بہت سا کھاری پانی جا چکا تھا۔ اس لئے وہ کھانے پر نہ آیا۔
کھانے کے دوران میں سبینا بولی۔
"میں تو آپ کو فرینک بلایا کرونگی"۔
اور فریڈا پکار اٹھی۔ "فرینک۔ فرینک۔ فرینکی"۔
ایشرسٹ نے مسکرا کر تعظیماً سر جھکا دیا۔
"جب کبھی سٹیلا آپ کو مسٹر ایشرسٹ کہکر بلائے اسے جرمانہ ادا کرنا ہوگا۔ مسٹر ایشرسٹ کہنا کیا فضول معلوم ہوتا ہے"۔
ایشرسٹ نے سٹیلا کی طرف دیکھا۔ جس کا رنگ حجاب سے سرخ ہو رہا تھا۔ سبینا ہنس دی۔ فریڈا بولی:۔
"وہ دیکھو۔ وہ دیکھو شرما رہی ہے۔ اللہ رے شرم"۔
ایشرسٹ نے دائیں بائیں دونو لڑکیوں کے سنہری بال پکڑ لئے۔ اور بولا:۔
"دیکھو لڑکیو۔ سٹیلا کو مت چھیڑو۔ نہیں تو میں تم دونو کو باندھ دونگا"۔
فریڈا بولی۔ "تم بڑے وحشی ہو"۔
اور سبینا نے محتاط بن کر کہا۔ "تم جو اُسے سٹیلا بلاتے ہو۔ تو کیوں نہ بلاؤں؟ سٹیلا بہت اچھا نام ہے"۔
ایشرسٹ نے ان کے بال چھوڑ دئے۔ سٹیلا! اس گفتگو کے بعد وہ بھلا اُسے کس نام سے پکاریگی؟ لیکن اس نے نام استعمال ہی نہ کیا۔ سونے کا وقت آیا۔ تو ایشرسٹ نے عمداً کہا:۔
"گڈ نائٹ۔ سٹیلا"۔
"گڈ نائٹ مسٹر — گڈ نائٹ فرینک! آج تم نے بہت ہی بہادری دکھائی"۔
"اس کا ذکر مت کرو"۔
سٹیلا کا مصافحہ سیدھا سادا مصافحہ تھا۔ لیکن لمحے بھر کو اس نے ایشرسٹ کا ہاتھ ذرا زور سے دبایا۔ اور پھر یکلخت اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔
ایشرسٹ خالی کمرے میں بےحس و حرکت کھڑا رہا۔ صرف کل رات کا ذکر ہے۔ کہ سیب کے پیڑوں اور زندہ شگوفوں

کے نیچے کھڑا میگن کو سینے سے چمٹائے اس کی آنکھوں اور ہونٹوں کو چوم رہا تھا۔ یہ بات کیا یاد آئی جیسے کسی طوفان کے تھپیڑے سے پاؤں اکھڑ گئے۔ وہ ہانپنے لگا۔ آج رات ایک نئی زندگی کا آغاز ہونا تھا۔ ایک ایسی لڑکی کے ساتھ۔ جس کی تمنا صرف یہ تھی۔ کہ وہ اس کے ساتھ رہے! اور یہ سب کچھ ملتوی ہوگیا۔ چوبیس گھنٹے آگے جا پڑا۔ محض اس لئے کہ ـــ کہ اس نے اپنی گھڑی کو نہ دیکھا تھا۔ ان معصوم بچوں سے تعلقات کیوں پیدا کر لئے۔ جبکہ خود معصومیت ہی کو خیرباد کہنے والا تھا؟ لیکن پھر سوچا۔ میرا ارادہ تو اس سے شادی کرنے کا ہے۔ میں نے اُسے کہہ بھی دیا تھا۔

روشن شمع ہاتھ میں لئے سونے کے کمرے کی طرف چلا۔ ہیلی ڈے کا کمرا رستے میں پڑتا تھا۔ اس کے پاس سے گزرا تو ہیلی ڈے اندر سے پکارا:۔

"تم ہو ایشرسٹ؟ اندر آجاؤ"

ہیلی ڈے بستر پر بیٹھا پائپ منہ میں لئے پڑھ رہا تھا۔

"بیٹھ جاؤ"۔

ایشرسٹ کھلی ہوئی کھڑکی کے پاس بیٹھ گیا۔

ہیلی ڈے یکلخت بول اٹھا۔ "تمہیں معلوم ہے آج دن بھر مجھے بار بار تمہارا ہی خیال آتا رہا۔ لوگ کہتے ہیں جب انسان ڈوبنے لگتا ہے۔ تو گذشتہ زندگی آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ لیکن میرے حافظے میں ماضی کا بیشتر زمانہ جوں کا توں مدفون رہا۔ شاید میں موت سے ابھی بہت دور تھا"۔

"تو پھر تمہیں خیال کس بات کا آیا؟

ہیلی ڈے پہلے تو کچھ نہ بولا اور پھر کہنے لگا:۔

"عجیب بات ہے۔ مجھے کیمبرج کی ایک لڑکی کا خیال آیا۔ جس سے میں ایک دفعہ ـــ قریباً ـــ اب میں تمہیں کیا بتاؤں۔ تم خود ہی سمجھ لو۔ میں نے شکر کیا۔ کہ اس کے بارے میں میرا ضمیر صاف تھا۔ بہر حال تمہاری بدولت میں زندہ ہوں۔ ورنہ اس وقت تاریک گہرے سمندر میں محو استراحت ہوتا۔ وہاں نہ لیٹنے کو بستر ملتا۔ نہ پینے کو تمباکو۔ کچھ بھی نہ ملتا ـــ ایشرسٹ جب ہم مر جاتے ہیں تو کیا ہوتا ہے"؟

ایشرسٹ بولا:۔

"میں جانوں شعلوں کی طرح بجھ جاتے ہیں"۔

"واللہ"؟

"شاید بجھنے سے پہلے تھوڑا بہت ٹمٹما لیتے ہوں"۔

"یہ تو بہت غم انگیز خیال ہے۔ بہرحال ـــ میری بہنیں تو اچھی طرح پیش آئیں"؟

"بہت اچھی طرح"۔

ہیلی ڈے نے اپنا پائپ ہٹا دیا۔ اپنے ہاتھ گردن کے پیچھے ایک دوسرے پر رکھ لئے اور کھڑکی کی طرف سر موڑ کر بولا۔

"بچاری بُری نہیں"!

ہیلی ڈے بستر پر دراز تھا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی چہرے پر شمع کی روشنی پڑ رہی تھی۔ ایشرسٹ نے اپنے دوست پر نظر ڈالی تو کپکپی سی جسم میں دوڑ گئی۔ اگر زندہ نہ ہوتا۔ تو سمندر کی تہ میں پڑا ہوتا۔ چہرے پر مسکراہٹ نہ ہوتی۔ اور یہ بشاشت ہمیشہ کے لئے غائب ہو جاتی۔ شاید لیٹنا بھی نہ ملتا۔ ریت ہی میں دفن ہو گیا ہوتا۔ اور حشر کے لئے (نویں دن کا؟) منتظر رہتا۔ دفعتہً ایشرسٹ کی مسکراہٹ ایک عجیب و غریب چیز معلوم ہونے لگی۔ یہی زندگی کا شعلہ ہے۔ یہی سب کچھ ہے اٹھ کھڑا ہوا اور دھیمی آواز میں بولا:۔

"میرے خیال میں تمہیں سو جانا چاہئے۔ شمع بجھا دوں"؟

ہیلی ڈے نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
"تم جانتے ہو جو کچھ میرے دل میں ہے وہ ادا انہیں کر سکتا ہوں بہت بری چیز ہے۔ گڈ نائٹ ایشرسٹ۔"

ایشرسٹ کا دل بھر آیا۔ ہیلی ڈے کے ہاتھ کو دبا کر نچلی منزل میں آگیا۔ ہال کا دروازہ ابھی کھلا تھا۔ اس میں سے گزر کر مکانوں کی قطار کے سامنے جو چمن تھا وہاں جا پہنچا۔ آسمان کا رنگ گہرا نیلا تھا۔ تارے چمک رہے تھے اور ان کی روشنی میں لائلک کے پھولوں کی رنگت کہیں کہیں ایسی پراسرار دکھائی دیتی تھی جیسی رات کے وقت اکثر پھولوں کی دکھائی دیتی ہے اور جس کا بیان کرنا ناممکن ہے ایشرسٹ نے اپنا رخسار ایک ٹہنی پر رکھ دیا۔ آنکھیں بند کیں۔ تو میگن کتے کے بچے کو سینے سے چمٹائے سامنے کھڑی دکھائی دی۔ "مجھے کیمبرج کی ایک لڑکی کا خیال آیا۔ جس سے میں ایک دفعہ ___ قریباً ___ میں نے شکر کیا۔ کہ اس کے بارے میں میرا ضمیر صاف تھا۔" یکلخت سر کو لائلک کی شاخ سے ہٹا لیا اور گھاس پر ٹہلنے لگا۔ دو نو سروں پر دو لمپ روشن تھے۔ ان کی روشنی میں تصور لمحے بھر کو پھر زندہ ہو گیا۔ ایشرسٹ اس کے ساتھ شگوفوں کی زندہ سانس لیتی ہوئی سفیدی کے نیچے کھڑا تھا۔ ندی ہنستی کھیلتی بہہ رہی تھی۔ چاندنی کی نیلاہٹ تالاب کے پانی پر چمک رہی تھی۔ وہ اوپر کو اٹھا ہوا چہرہ۔ اس پر معصومیت اور عشق نیازمندی کی جھلک۔ وہ آگ لگا دینے والے بوسے۔ اس کافر رات کا وہ حسن اور دل کی وہ دھڑکن سب کچھ یاد آیا۔ لائلک کے سائے میں کھڑا ہو گیا۔ یہاں رات کے وقت ندی کی آواز نہ تھی یہاں سمندر کا شور تھا۔ اور سمندر سرسرا رہا تھا اور آہیں بھر رہا تھا۔ کوئی ننھا پرند کوئی الو۔ کوئی نائٹ جار یہاں بولتا نہ اڑتا تھا۔ ان کی بجائے پیانو کی آواز آرہی تھی اور سفید مکانات نے آسمان کو جیسے قینچی سے کتر دیا تھا۔ اور لائلک کی خوشبو سے فضا معمور تھی۔ کسی اونچی منزل پر ہوٹل کی ایک کھڑکی میں روشنی نظر آرہی تھی۔ پردے کے سامنے ایک سایہ حرکت کرتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے دل میں عجیب و غریب احساسات نے شورش بپا کر دی۔ جیسے کوئی ایک ہی جذبہ پیچ و تاب کھا رہا ہو بلویا جا رہا ہو۔ لپیٹا جا رہا ہو۔ جیسے بہار اور عشق پریشانی کے عالم میں ٹکریں مار رہے ہوں۔ رستہ ڈھونڈ رہے ہوں اور انہیں رستہ نہ ملتا ہو۔ یہ لڑکی جس نے اسے فرینک کہہ کر پکارا تھا۔ جس کے ہاتھ نے اس کے ہاتھ کو دفعتاً بھینچ لیا تھا۔ یہ شائستہ اور پاکیزہ لڑکی اس کے سرکش۔ خلافِ شرع عشق کا حال سن لے تو کیا کہے۔ وہ مکان کی طرف پیٹھ موڑے گوتم بدھ کے مجسمے کی طرح بےحس و حرکت آلتی پالتی مار کر گھاس پر بیٹھ گیا۔ کیا واقعی معصومیت میں نقب لگا کر چوری کرنے کا ارادہ تھا؟ کیا واقعی اس کا یہ ارادہ تھا۔ کہ جنگلی پھول کی خوشبو سونگھ لے۔ اور ___ شاید ___ پھر اسے پھینک دے؟ کیمبرج میں ایک لڑکی تھی۔ جس سے میں ایک دفعہ ___ تم خود ہی سمجھ لو۔" دونو ہتھیلیاں دائیں بائیں گھاس پر رکھ کر دبا دیں۔ ابھی گھاس میں گرمی کچھ کچھ باقی تھی۔ ابھی اس میں نمی نہ آئی تھی۔ ابھی اس کا سہارا لے سکتا تھا۔ اپنے آپ سے پوچھا "میں کیا کروں"؟ شاید میگن کھڑکی کے پاس کھڑی شگوفوں کو دیکھ رہی ہے۔ اور اس کے خیال میں محو ہے! بیچاری میگن! پھر خیال آیا۔ "کیا حرج ہے؟ میں تو اسے چاہتا ہوں! لیکن ___ لیکن۔ کیا مجھے اس سے واقعی محبت ہے؟ یا صرف اس لئے اس کو چاہتا ہوں۔ کہ وہ خوبصورت ہے اور مجھ سے محبت کرتی ہے؟ میں کیا کروں"؟ پیانو کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ تارے جگمگا رہے تھے۔ ایشرسٹ مبہوت ہو کر کالے سمندر کو تکتا رہا۔ آخر اٹھا۔ اعضا جیسے جڑ گئے تھے اور جسم کو خنکی محسوس ہو رہی تھی۔ کھڑکی میں اب روشنی نظر نہ آتی تھی۔ جا کر سو رہا۔

(۸)

ایشرسٹ گہری نیند سو رہا تھا۔ کہ کسی نے دروازے پر دستک دی اور آنکھ کھل گئی۔ پھر کوئی کرخت آواز میں پکارا:۔
"اٹھو بھائی ناشتہ تیار ہے"۔
ایشرسٹ یکلخت اٹھ بیٹھا۔ میں کہاں ہوں ___؟ ہاں ہاں یاد آگیا!

باقی لوگ مربہ کھا رہے تھے۔ سٹیلا اور سبینا کے درمیان ایک نشست خالی تھی۔ ایشرسٹ اس پر جا بیٹھا۔ سبینا کچھ دیر اسے بغور دیکھتی رہی۔ اور پھر بولی :۔

"ذرا جلدی کیجئے۔ ساڑھے نو بجے یہاں سے چل پڑنا ہے"۔

"ایشرسٹ۔ ہم بیری ہیڈ کو جا رہے تھے۔ نہیں بھی چلنا ہوگا"

ایشرسٹ نے سوچا۔ "میں ان کے ساتھ جاؤں۔ ناممکن اب مجھے تو چیزیں لے کر واپس جانا ہے"۔ اس نے سٹیلا کی طرف دیکھا سٹیلا نے جلدی سے کہا :۔

"ضرور چلئے"!

اور سبینا بولی :۔

"آپ کے بغیر کیا خاک لطف آئیگا"۔

فریڈا اٹھ کر کرسی کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔

"آپ چلئے۔ نہیں تو میں آپ کے بال کھینچونگی"۔

ایشرسٹ نے سوچا "اچھا۔ ایک دن اور سہی۔ اس میں کچھ غور بھی کرلونگا۔ ایک دن اور"! اور پھر بولا :۔

"اچھا اچھا میں چلتا ہوں۔ میری ابال کھینچنے کی ضرورت نہیں"۔

"ہُرّا"!

سٹیشن پر پہنچ کر اس نے ایک اور تار بھیجنے کا ارادہ کیا لیکن لکھ کر پھاڑ ڈالا۔ انہیں کیا بتائے کہ کیوں نہیں آسکتا؟ برکم سے ایک چھوٹی سی گاڑی میں سوار ہوگئے۔ ایشرسٹ سبینا اور فریڈا کے بیچ میں پچکا ہوا بیٹھا تھا۔ گھٹنے سٹیلا کے گھٹنوں سے جا لگے تھے رستے میں "اپ جینکنز" کا کھیل کھیلتے رہے۔ دل بہل گیا۔ سوچا تو یہ تھا۔ کہ ایک دن مزید غور کرنے میں صرف کرونگا۔ لیکن اب غور کرنے کو دل ہی نہ چاہتا تھا۔ دن بھر دوڑتے رہے۔ کشتی لڑتے رہے۔ گھٹنے گھٹنے پانی میں بھاگتے پھرے (نہانے کو کسی کا دل نہ چاہتا تھا) گیت گاتے رہے۔ کھیل کھیلتے رہے اور جس قدر سامان خورد و نوش ساتھ لائے تھے۔ سب چٹ کر گئے۔ واپسی میں چھوٹی لڑکیاں ایشرسٹ کے کندھے پر سر ٹکا کر سو گئیں۔ ایشرسٹ کے گھٹنے سٹیلا کے گھٹنوں کو چھو رہے تھے۔ یقین نہ آتا تھا۔ کہ تین گھنٹے پہلے وہ ان تین لڑکیوں میں سے (ان کے بال کس قدر ملائم تھے) کسی کو جانتا تک نہ تھا۔ ریل میں وہ سٹیلا سے شاعری کے متعلق تبادلۂ خیالات کرتا رہا۔ سٹیلا نے ایشرسٹ کو اور ایشرسٹ نے سٹیلا کو (مگر ایک خوشگوار احساس برتری کے ساتھ) اپنی اپنی پسند کے شعرا کے نام بتائے۔ یکلخت لڑکی نے دھیمی آواز میں کہا :۔

"فل کہتا ہے۔ آپ حیات بعد الموت کے قائل نہیں۔ یہ تو بہت بری بات ہے فرینک"!

ایشرسٹ نے پریشان ہو کر کہا :۔

"نہ قائل ہوں نہ منکر۔ میرا عقیدہ تو صرف یہ ہے۔ کہ ہم حیات بعد الموت کے متعلق کچھ جانتے ہی نہیں"۔

لڑکی نے جلدی سے کہا :۔

"میرا تو یہ عقیدہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ زندگی کا بھلا پھر فائدہ ہی کیا"؟

ان خوبصورت ابروؤں کے شکنوں پر نگاہ ڈالتے ہوئے ایشرسٹ نے جواب دیا :۔

"یہ کیا کہ جس چیز کے وجود کی تمنا ہو اس کے وجود پر انسان ایمان ہی لے آئے"۔

"لیکن اگر اس کے بعد اور کوئی زندگی نہیں۔ تو انسان کو دوبارہ زندہ ہونے کی تمنا ہی کیوں ہوتی ہے"؟

یہ کہا اور نظر بھر کر ایشرسٹ کی طرف دیکھنے لگی۔

ایشرسٹ اس کے جذبات کو مجروح تو نہ کرنا چاہتا تھا لیکن برتری کی خواہش غالب آگئی۔ بولا :۔

"جب تک انسان زندہ ہے۔ اس وقت تک اس زندگی کو دائمی بنانے کا آرزومند ہوتا ہے۔ یہ آرزو خود زندگی کا

ایک جزو ہے ۔ مگر اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ۔"
" تو کیا تم انجیل کو نہیں مانتے "؟
ایشرسٹ نے سوچا " اب ضرور اسے صدمہ ہوگا" ! بولا :
"یسوع مسیح نے پہاڑی پر جو وعظ سنایا تھا ۔ میں اس کو مانتا ہوں ۔ کیونکہ وہ بہت دلکش ہے ۔ اور اس کے الفاظ ہمیشہ سچے رہینگے ۔"
" لیکن کیا تم یسوع مسیح کو خدا کا جزو نہیں سمجھتے " ؟
ایشرسٹ نے سر ہلا دیا ۔

لڑکی نے اپنا چہرہ جلدی سے کھڑکی کی طرف موڑ لیا ۔ ایشرسٹ کو یکلخت میگن کی دعا یاد آئی " خدایا ہم سب پر اپنا فضل کر اور مسٹر ایشرسٹ پر بھی " ۔ اور کون ایسا ہوگا ۔ جو اس لڑکی کی طرح یوں اس کے لئے دعا مانگے ۔ اس لڑکی کی طرح جو اس وقت ضرور اس کی منتظر ہوگی ۔ اور سڑک پر کھڑی اس کی راہ تک رہی ہوگی ۔ دل نے کہا ۔
" تم کس قدر ذلیل ہو"!

یہ خیال بار بار دل میں اٹھتا رہا ۔ لیکن اس کی چبھن رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی (اکثر یہی ہوتا ہے) ۔ حتےٰ کہ ذلیل بننا ایک نہایت معمولی بات معلوم ہونے لگی ۔ اور (تعجب کی بات ہے!) اس کی سمجھ میں یہ نہ آتا تھا ۔ کہ واپس میگن کے پاس چلے جانا ذلیل بات ہے یا اس سے ملنے کا خیال ترک کر دینا ۔

شام کے وقت سب مل کر تاش کھیلتے رہے ۔ اور جب بچوں کے سونے کا وقت آن پہنچا اور وہ چلے گئے تو سٹیلا پیانو پر جا بیٹھی ایشرسٹ کھڑکی کے پاس اندھیرے میں بیٹھا شمعوں کے بیچ میں سے سٹیلا کو دیکھتا رہا (سر کے بال ہلکے رنگ کے ان کے نیچے وہ لمبی گوری گردن جو ہاتھوں کی حرکت کے ساتھ ساتھ خم کھاتی تھی) سٹیلا کے پیانو بجانے میں کوئی خاص رنگینی نہ تھی ۔ لیکن بلا تکلف بجاتی تھی ۔ ایشرسٹ کو وہ ایک دلکش مورت معلوم ہو رہی تھی ۔ جس کے اردگرد ہلکے سنہری رنگ کا نور جھلملا رہا تھا ۔ گویا انسان نہیں فرشتہ ہے ۔ اس لڑکی کی موجودگی میں جس کا لباس سفید جس کا سر فرشتوں کا سا اور جس کا جسم موسیقی کے ساتھ لچک رہا تھا ۔ کس کی جرأت ہے کہ بے عنان خواہشات یا گمراہ خیالات کا دل میں گزر بھی ہونے دے وہ شومان کا ایک گیت بجا رہی تھی جس کا نام " وارم" ؟ تھا ۔ اس کے بعد ہیلی ڈے نے اپنی بانسری نکالی ۔ اور طلسم ٹوٹ گیا ۔ پھر انھوں نے ایشرسٹ کا گانا سنا ۔ اور سٹیلا شومان کی گیتوں کی ایک کتاب کو سامنے رکھ کے اس کے ساتھ پیانو بجاتی رہی " لرخ گردل نخت" کا گیت ابھی ختم نہ ہونے پایا تھا ۔ کہ چھوٹی لڑکیوں نے (جو نیلے رنگ کے ڈریسنگ گون پہنے تھیں) دبے پاؤں کمرے میں داخل ہو کر پیانو کے پیچھے چھپنے کی کوشش کی لیکن بیسود ۔ اس کے بعد کھلبلی مچ گئی ۔ اور بقول سبینا کے " بڑا مزا آیا "۔

اس رات ایشرسٹ کو نیند نہ آئی ۔ اس کے دماغ میں طرح طرح کے خیالات چکر لگا رہے تھے اور وہ بےچینی کے عالم میں کروٹیں بدلتا رہا ۔ دو دن کے اندر اندر ان لوگوں سے اس قدر ربط پیدا ہو گیا تھا ۔ اور ان کی بے تکلفی اور اپنایت نے اس کے دل پر اس قدر احاطہ کر لیا تھا ۔ کہ فارم اور میگن ـــــ خود میگن ! خواب و خیال ہو گئی ۔ کیا سچ مچ اس سے اظہار عشق کیا تھا ؟ کیا سچ مچ اسے بھگا لے جانے کا اور اس کے ساتھ رہنے کا وعدہ کیا تھا ؟ نہیں نہیں وہ مسحور ہو گیا تھا ۔ اس پر جادو چل گیا تھا ۔ بہار کا ۔ رات کا ۔ سیب کے شگوفوں کا ! اس کو ۔ اس کم سن بچی کو جس کی عمر ابھی اٹھارہ سال بھی نہ ہونے پائی تھی ۔ اپنی داشتہ بنانا ۔ اس خیال کے آتے ہی ایشرسٹ کو اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی ۔ لیکن پھر بھی جسم میں گرمی اور خون میں تیزی پیدا ہو گئی ۔ دل سے کہا " میں نے بہت برا کیا ۔ میں نے بہت برا کیا "۔ شومان کی موسیقی اس کے پریشان خیالات کے ساتھ مل کر اس کے دل کے اندر جیسے دھڑکنے لگی ۔ اسے تصور میں سٹیلا کا چہرہ نظر آیا ۔ پر سکون ۔ مرمری ہلکے رنگ کے بال ۔ لچکدار گردن ۔ اردگرد فرشتوں کا سا نور ـــــ اس

نے سوچا۔ "میرے حواس قائم نہ تھے۔ میں دیوانہ تھا۔ مجھے کیا ہوگیا تھا؟ بدنصیب میگن" ! "خدایا ہم سب پر اپنا فضل کر اور مسٹر ایشرسٹ پر بھی"! "میں صرف آپ کے پاس رہنا چاہتی ہوں"! اس نے اپنا چہرہ تکیے میں ڈھانپ لیا۔ ہچکی بندھ چلی تھی لیکن اس نے آپ کو سنبھالا۔ واپس چلا جائے تو مصیبت۔ نہ جائے تو اور بھی آفت!

جوان آدمی اگر اپنے دل کی بھڑاس نکال لے تو اس کی بےچینی مٹ جاتی ہے۔ ایشرسٹ کی آنکھ لگ گئی۔ جب نیند آنے لگی تھی تو سوچ رہا تھا۔ "آخر ہوا کیا —— چند بوسے —— مہینہ بھر میں بھول جائینگے"!

اگلے دن صبح کے وقت اس نے چیک کے روپے وصول کر لئے۔ لیکن کپڑوں کی دکان کے پاس بھی نہ پھٹکا۔ اس فاختئی رنگ کے لباس کی بجائے اپنی ضرورت کی چند چیزیں خرید لیں۔ دن بھر اس کے دل کی عجیب حالت رہی۔ جیسے اپنے آپ سے روٹھا ہوا ہے۔ دو دن سے دل میں امنگیں اٹھ رہی تھیں۔ لیکن اب جذبات سے یکسر خالی تھا۔ جیسے آنسوؤں کے طوفان سے دل کے شعلے سب بجھ گئے ہوں۔ چائے کے بعد سٹیلا نے ایک کتاب اس کے پاس رکھ دی اور کچھ شرما کر بولی:

"فرینک تم نے یہ کتاب پڑھی ہے"؟

فیرر کی "سوانح یسوع"۔ ایشرسٹ مسکرا دیا۔ سٹیلا اس کے عقائد کے متعلق کس قدر فکرمند ہے۔ اس پر کچھ ہنسی آئی کچھ پیار آیا۔ اپنی طبیعت کو بھی گدگدی ہوئی۔ کہ اسے اپنا ہم عقیدہ بنانے کی کوشش کرے یا کم از کم اپنے عقائد کی حمایت میں کچھ بولے شام کے وقت چھوٹی لڑکیاں اور ہیلی ڈے اپنے اپنے جال کی مرمت کر رہے تھے۔ ایشرسٹ سٹیلا سے مخاطب ہوا:

"مذہب انعام اور صلے کا لالچ دلاتا ہے۔ کہ نیک زندگی بسر کی تو یہ کچھ ملیگا۔ گویا انعام کے لئے ہمیں بھیک مانگنا سکھاتا ہے۔ یہ رجا درحقیقت بیم سے پیدا ہوتا ہے"۔

وہ صوفا پر بیٹھی رسی کے ایک ٹکڑے میں گانٹھیں دے رہی تھی۔ اس نے یکلخت نگاہ اٹھائی:۔

"نہیں اس کی وجہ اور ہے۔ اور اس سے کہیں گہری ہے"

ایشرسٹ کے دل میں پھر وہی تحکم کی خواہش پیدا ہوئی: بولا

"کیا واقعی آپ کا یہ خیال ہے؟ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ کسی بات کی وجہ دریافت کرنے کی خواہش ہی سب سے زیادہ عمیق ہے۔ اور اس کی تہ کو پہنچنا بہت مشکل ہے"۔

سٹیلا نے ماتھے پہ تیوری ڈال لی۔

"میں نہیں سمجھی"؟

ایشرسٹ اپنی ہٹ پر قائم رہا۔ اور بولا:۔

"ذرا غور کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا۔ کہ آخرت کے معتقد بیشتر وہی لوگ ہوتے ہیں جو یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کی تمام خواہشات اس دنیا میں پوری نہیں ہوسکتیں۔ برعکس اس کے میں نیکی کا قائل اس لئے ہوں۔ کہ نیکی ایک اچھی چیز ہے"

"تو آپ نیکی کے قائل تو ہیں"؟

وہ کتنی خوبصورت معلوم ہوتی تھی اور اس کی صحبت میں نیکی کس قدر سہل! ایشرسٹ نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا:۔

"اس طرح کی گرہیں لگانا مجھے بھی سکھا دو"۔

جب گرہیں لگا رہے تھے۔ تو اس کی انگلیوں کے مس سے تسکین اور راحت ملتی تھی۔ سونے کو چلا تو بالارادہ اسی کے متعلق سوچتا رہا۔ اور اس کے درخشاں۔ پرسکون۔ خواہرانہ تصور کے انوار سے اپنا آپ یوں ڈھانپ لیا۔ جیسے اس ملبوس میں اب اسے کوئی ضرر نہیں پہنچ سکتا۔

اگلے دن معلوم ہوا۔ کہ وہ لوگ ریل میں سوار ہوکر ٹوٹنس جانا چاہتے ہیں۔ اور بیری پومرائے کاسل کے مقام پر پکنک کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ماضی کو دل سے محو کر دینے کا جو مصمم ارادہ کر چکا تھا۔ اسے فسخ نہ کیا اور گھوڑوں کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ گیا

کے ساتھ لینڈو میں بیٹھ گیا۔ سمندر کے ساحل کے ساتھ ساتھ چلے جا رہے تھے۔ اور سٹیشن کی طرف مڑنے ہی کو تھے۔ کہ ایشرسٹ کا دل دھک سے رہ گیا۔ میگن ـ خود میگن! ـــــ بڑی پگڈنڈی پر چلی جا رہی تھی۔ وہی پھٹا پرانا سایہ اس نے پہن رکھا تھا۔ وہی جیکٹ۔ وہی ٹوپی اور راہگیروں کے چہروں کا جائزہ لے رہی تھی۔ کچھ سوچے سمجھے بغیر ایشرسٹ نے بعجلت ہاتھ اٹھا کر چہرہ ڈھانپ لیا۔ اور ظاہر یہ کیا گویا آنکھ میں سے مٹی کا کوئی ذرہ نکال رہا ہے۔ لیکن انگلیوں کے بیچ میں سے میگن پھر بھی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی چال میں دہقانوں کی سی بے تکلفی نہ تھی۔ برعکس اس کے وہ کھوئی کھوئی سی معلوم ہوتی تھی۔ اس کے قدم متامل تھے۔ اور اس کی حالت رحم کی طالب۔ جیسے کوئی کتا اپنے آقا سے جدا ہو گیا ہو۔ اور یہ نہ جانتا ہو۔ کہ سیدھا دوڑتا چلا جائے یا واپس پلٹ جائے۔ اور جائے تو کہاں؟ یہ یہاں کیسے آگئی؟ بہانہ کیا بنایا ہوگا؟ یہ کس امید میں پھر رہی تھی؟ گاڑی کے پہیئے گھومتے چلے گئے۔ اور وہ میگن سے دور تر ہوتا گیا لیکن اس کا دل اس پر لعنت بھیج رہا تھا اور چیخیں مار مار کر اس سے کہہ رہا تھا۔ کہ ٹھہر جاؤ۔ گاڑی سے اتر جاؤ۔ اس کے پاس جاؤ! جب گاڑی سٹیشن کی طرف مڑی۔ تو ایشرسٹ سے نہ رہا گیا۔ دروازہ کھول کر بولا۔ "میں کچھ بھول آیا ہوں۔ تم چلو۔ میرا انتظار نہ کرو۔ میں اگلی گاڑی سے آ جاؤنگا۔ اور تمہیں کاسل میں آ ملونگا"۔ یہ کہہ کر گاڑی سے کود پڑا۔ ٹھوکر کھائی۔ گھوم گیا۔ پھر سنبھلا اور چل پڑا۔ ہیلی ڈے اور اس کی بہنیں حیران تھیں کہ یہ کیا ہو گیا۔ لیکن ان کی گاڑی آگے نکل گئی۔

موڑ پر سے اُسے میگن بہت دور دکھائی دے رہی تھی۔ ایشرسٹ چند قدم دوڑا۔ پھر رک گیا اور آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ جوں جوں میگن سے قریب اور ہیلی ڈے اور اس کی بہنوں سے دور تر ہوتا گیا۔ قدم ڈھیلے پڑتے گئے۔ اسے دیکھ لیا تو پھر کیا ہوا؟ اس سے کیا فرق پڑ گیا؟ اس سے جو ملاقات ہوگی۔ اور اس ملاقات کا جو نتیجہ ہوگا۔ اس کی کراہت کو کیونکر کم کرے؟ اچھی طرح جان چکا تھا۔ کہ ہیلی ڈے کی بہنوں سے ملنے کے بعد دل اس نتیجے پر پہنچ چکا ہے۔ کہ میگن سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔ چند دن اس سے عشق کریگا۔ تکلیفیں سہیگا۔ پچھتائیگا۔ اور پھر اکتا جائیگا۔ محض اس لئے کہ وہ اپنا سب کچھ دے ڈالیگی۔ اس لئے کہ وہ سادہ لوح ہے۔ بھولی ہے شبنم آلود ہے۔ لیکن شبنم جلد خشک ہو جاتی ہے۔ اس کی ٹوپی جو دور سے پھیکے رنگ کا ایک دھبہ سا معلوم ہوتی تھی۔ ہجوم میں نظر آ رہی تھی۔ جس سے میگن کی متامل حرکات کا پتہ چلتا تھا۔ وہ ہر چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ ہر کھڑکی پر نگاہ ڈالتی تھی۔ کیا کسی مرد کو اس سے بھی زیادہ دکھ کا لمحہ کبھی نصیب ہوا ہوگا! جو ارادہ کرتا۔ دل ہی پر ملامت کرتا تھا۔ اور اپنا آپ ذلیل معلوم ہوتا تھا۔ درد کی ایک ہلکی سی چیخ اس کے منہ سے نکلی جسے سن کر ایک راہگیر ملازمہ مڑ کر اس کا منہ تکنے لگی۔ سامنے دیکھا۔ تو میگن ساحلِ سمندر کے پاس جو دیوار کھڑی تھی۔ اس کے ساتھ سہارا لینے کو ٹھہر گئی۔ اور سمندر کی طرف دیکھتی رہی۔ ایشرسٹ بھی رک گیا شاید میگن نے سمندر اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا ہوگا۔ اس اضطراب کی حالت میں بھی وہ اس کے نظارے سے باز نہیں رہ سکتی۔ ایشرسٹ نے سوچا۔ اس بچاری نے ابھی کچھ بھی نہیں دیکھا۔ اس کا مستقبل ابھی خدا جانے کن کن نعمتوں کا سرمایہ دار ہے۔ چند ہفتوں کے عیش کی خاطر میں اس کی زندگی کے چیتھڑے اڑا دوں"؟ یکلخت تصور میں سٹیلا کی پرسکون آنکھوں سے آنکھیں ملیں۔ اس کے ملائم بال ہوا سے اس کے ماتھے پر متحرک نظر آئے۔ یہ دیوانگی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا۔ کہ جن چیزوں کو قابل احترام سمجھتا ہے۔ ان سب سے اور خود احترام نفس سے ہاتھ دھو بیٹھنا پڑیگا۔ مڑ گیا اور جلد جلد سٹیشن کی طرف قدم اٹھانے لگا۔ لیکن اس بے بس سراسیمہ لڑکی کی یاد سے جس کی متفکر آنکھیں راہ چلتوں

کے چہروں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ دل کو دھچکا لگا۔ اور وہ پھر سمندر کی طرف پلٹا۔ وہ ٹوپی اب نظر سے اوجھل ہو گئی تھی۔ وہ دھبہ سیر بینوں کے ہجوم میں کہیں غائب ہو گیا تھا۔ دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ سینے میں ایک خلا سا محسوس ہوا۔ (جب توقف و تامل کی وجہ سے کوئی چیز ہاتھ سے چھن جائے۔ تو یہی حال ہوتا ہے) وہ تیز تیز چلنے لگا۔ لیکن میگن کہیں دکھائی نہ دی۔ آدھ گھنٹے تک وہ اس کی تلاش میں پھرتا رہا اور پھر ساحل سمندر کی ریت پر پڑ کر اوندھا لیٹ گیا۔ جانتا تھا۔ کہ اس سے ملنے کی سہل ترکیب یہ ہے۔ کہ سٹیشن پر جا کر اس کا انتظار کرے۔ حتیٰ کہ وہ مایوس ہو کر لوٹ آئے۔ یا ریل پر سوار ہو کر فارم کو چلا جائے۔ تاکہ وہ واپس آئے۔ تو یہ وہاں پہلے ہی موجود ہو۔ لیکن پھر بھی بےحس و حرکت لیٹا رہا۔ اور اس کے اردگرد بے پروا ننھے بچے بیلچے اور بالٹیاں لئے کھیلتے رہے۔ اس متلاشی سرگردان لڑکی پر رحم ضرور آتا تھا۔ لیکن یہ رحم بھی کم و بیش خون کی اس گرمی اور تیزی کا ایک جزو بن گیا۔ جو بہار نے جسم میں پیدا کر دی تھی۔ اب دل میں صرف ایک بے عنان جذبہ باقی رہ گیا تھا۔ توقیر نسواں کے جذبات مفقود ہو چکے تھے۔ دل میں پھر میگن کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس کے بوسوں اس کے نازک اور گداز جسم، اس کی وارفتگی۔ اس کے کافرانہ عشق کی گرمجوشی کے لئے دل پھر بیقرار ہو گیا۔ مہتاب سے روشن سیب کے درختوں کی شاخوں تلے اس رات کا لطف پھر اٹھانا چاہتا تھا۔ اور اس کا دل ان خواہشات کی تکمیل کے لئے یوں مضطرب تھا۔ جیسے کوئی جنگل کا دیوتا کسی بن دیوی کے لئے مضطرب ہوتا ہے۔ اس ندی کا پرکیف شور۔ بڑکپ کے پھولوں کی دمک وہ پرانی تاریخی چٹانیں۔ ککو اور بیفل کی کوک۔ اُلوؤں کا بولنا سرخ چاند کا مخملی تاریکی میں سے شگوفوں کی زندہ سفیدی کو جھانکنا۔ وہ کھڑکی میں اس کے چہرے کا نظر آنا (ہاتھ وہاں تک پہنچ کر رہ جاتا تھا) اس کی عشق میں ڈوبی ہوئی نگاہیں۔ سیب کے درخت تلے دو دھڑکتے ہوئے سینوں کا ملنا۔ اپنے ہونٹوں سے اس کے پھڑکتے ہوئے ہونٹوں کا محسوس کرنا۔ ان تصورات نے اس کے دل کو محصور کر لیا۔ لیکن پھر بھی بےحس و حرکت لیٹا رہا۔ یہ کیا ہے جو رحم کے جذبات اور ان بیقرار خواہشات کے ساتھ دست و گریبان ہے اور جس نے اسے مفلوج بنا کر اس گرم گرم ریت پر لٹا رکھا ہے؟ تین ملائم بالوں والی لڑکیاں۔ ایک دلفریب چہرہ۔ جس کی نیلی آنکھوں میں دوستی کا جذبہ جھلک رہا ہے۔ ایک نازک ہاتھ جو اس کے ہاتھ کو بھینچ رہا ہے۔ ایک آواز جو جلدی سے اس کا نام پکار کر کہتی ہے: "تو آپ نیکی کے قائل تو ہیں"؟ یہ کچھ اور اس کے علاوہ ایک عجیب فضا جیسے چار دیواری کے اندر ایک باغیچہ ہو۔ قدیم انگریزی وضع کا (جس میں جابجا گلابی رنگ کے پھول ہوں۔ کارن فلاور اور گلاب کے پھول۔ اور لیونڈر اور لائلک کی خوشبو ہو) خنک اور دلفریب۔ انسانی مس سے غیر ملوث۔ مقدس۔ غرضیکہ ان تمام چیزوں کا نچوڑ جنہیں وہ بچپن سے پاکیزہ اور قابل احترام سمجھتا تھا۔ یکلخت اسے خیال آیا۔ "ممکن ہے وہ ادھر ہی کو آ نکلے اور مجھے دیکھ پائے" اٹھ کھڑا ہوا۔ ساحل سمندر کے دوسرے سرے پر ایک چٹان تھی۔ اس پر جا بیٹھا۔ سمندر کی چھینٹیں اس کے چہرے کو کاٹ رہی تھیں اس سے ہوش و حواس پھر بجا ہو گئے۔ فارم کو واپس چلے جانا اور وہاں جنگلوں میں اور چٹانوں کے درمیان رہ کر میگن سے عشق کرنا یعنی روستائی ماحول میں اس دہقان لڑکی کو چاہنا۔ قطعاً ناممکن ہے اسے کسی بڑے شہر میں لے آنا اور کسی فلیٹ میں رکھنا۔ اس سے اس کی شاعرانہ طبیعت کو صدمہ ہوتا تھا۔ کیونکہ جانتا تھا۔ کہ وہ لڑکی تو قدرتی مناظر کا ایک جزو ہے اسے شہر میں لا کر رکھا۔ تو محبت کا جذبہ ایک نفسانی خواہش بن کے رہ جائیگا اور دنوں ہی میں غائب بھی ہو جائیگا۔ لندن میں اس کی سادگی۔ اور اس کا گنوارپن

اس قدر نمایاں ہوگا ۔ کہ اسے محض کھلونا سمجھ کر رکھنا پڑیگا جس سے چوری چھپے دل بہلا لیا جائے ۔ وہ چٹان پر بیٹھا ایک سبزی مائل تالاب کے اوپر ٹانگیں لٹکائے جس کا پانی اتر رہا تھا ۔ ان خیالات میں محو تھا ۔ اور یہ سب باتیں اس پر روشن تر ہوتی جارہی تھیں ۔ لیکن ایسے معلوم ہوتا تھا ۔ جیسے میگن کے بازو اور اس کا جسم ڈھیلا پڑ رہا ہے ۔ آہستہ آہستہ نیچے کو جا رہا ہے اور پھر اس تالاب میں جا گرا ہے اور بہ کر سمندر میں جا پہنچا ہے ۔ میگن کا چہرہ اوپر کو تک رہا ہے ۔ اس کی کھوئی ہوئی نظروں میں ایک التجا ہے اور اس کے سیاہ بال بھیگے ہوئے ہیں ۔
اس تصور نے دل میں پنجے گاڑ دیئے ۔ ہر چند اسے دل سے ہٹانے کی کوشش کی ۔ لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا ۔ یہ خیال اسے رہ رہ کے ستاتا ۔ آخر کار وہ اٹھ کھڑا ہوا ۔ چٹان سے نیچے اترا اور پانی کے قریب ایک غار میں جاکر کھڑا ہوگیا ۔ شاید سمندر میں نہانے سے اس کا دل سنبھل جائے ۔ اور یہ بخار اتر جائے ۔ کپڑے اتار دیئے اور تیر کر دور نکل گیا ۔ چاہتا تھا تھک کر چور ہو جائے تاکہ حواس سن ہو جائیں اس لئے تیز تیز اور دور دور چکر کاٹے ۔ پھر دفعتاً بغیر کسی وجہ کے اسے خوف سا معلوم ہوا فرض کرو وہ واپس ساحل تک نہ جا سکا ۔ اور سمندر کی رو اُسے بہا کرلے گئی ۔ یا ہیلی ڈے کی طرح اس کے پٹھے اینٹھ گئے ۔ تو کیا ہوگا! یہ سوچ کر وہ واپس پلٹا ۔ سرخ رنگ کی چٹانیں بہت دور معلوم ہوتی تھیں ۔ اگر وہ ڈوب گیا ۔ تو کسی کی نظر اس کے کپڑوں پر پڑیگی ۔ ہیلی ڈے اور اس کی بہنوں کو تو خبر مل جائیگی لیکن میگن کو شاید کبھی علم نہ ہونے پائیگا (فارم کے لوگ کوئی اخبار نہیں خریدتے تھے) فل ہیلی ڈے کے الفاظ اُسے پھر یاد آئے "کیمبرج میں ایک لڑکی تھی جس سے میں شاید ــ بہر حال خدا کا شکر ہے کہ اس کی طرف سے میرا ضمیر صاف ہے "۔ مجنونانہ خوف کے اس لمحے میں اس نے قسم کھائی کہ میں میگن کی طرف سے اپنا ضمیر صاف رکھونگا ۔ لیکن خوف جاتا رہا ۔ اطمینان سے تیرتا ہوا ساحل پر آن پہنچا ۔ دھوپ میں جسم سکھایا اور کپڑے پہن لئے ۔ اس کا دل زخمی تھا ۔ لیکن درد محسوس نہ ہوتا تھا ۔ جسم خنک اور تر و تازہ ہوگیا تھا ۔

ایشرسٹ کی عمر میں رحم کا جذبہ شدت کے ساتھ محسوس نہیں ہوا کرتا ۔ جب واپس ہیلی ڈے کے کمرے میں پہنچا ۔ اور چائے پر خوب پیٹ بھر کر کھایا تو ایسے معلوم ہوا جیسے ایک بخار آیا تھا ۔ جو اب اتر چکا ہے ۔ ہر شے نئی نئی اور صاف ستھری معلوم ہوتی تھی ۔ چائے ۔ توس ان پر مکھن لگا ہوا ۔ مربا غرضیکہ ہر چیز میں اسے بہت مزا آیا ۔ تمباکو کی خوشبو آج تک اتنی اچھی معلوم نہ ہوئی تھی خالی کمرے میں ٹہلتا ٹہلتا رک جاتا ۔ کبھی اس چیز کو دیکھتا کبھی اس کو چھوتا ۔ پھر سٹیلا کی سینے پرونے کی ٹوکری اٹھائی ۔ تاگے کی گوٹوں اور خوشرنگ ریشم کی ایک گچھی کو مس کرتا رہا ۔ ٹوکری میں ایک تھیلی تھی ۔ جو کسی خوشبودار بوٹی سے بھری ہوئی تھی ۔ اسے اٹھا کر سونگھا ۔ پھر پیانو کے پاس جا بیٹھا ۔ اور ایک انگلی سے مختلف سر بجاتا رہا ۔ پھر سوچنے لگا ۔ کل وہ پھر بجائیگی اور میں پاس بیٹھا اُسے دیکھتا رہونگا ۔ اسے دیکھتے رہنے سے دل کو تسکین حاصل ہوتی ہے ۔ جو کتاب سٹیلا نے اس کے پاس لاکر رکھ دی تھی ۔ وہ وہیں پڑی تھی ۔ اُسے اٹھا کر اس کی ورق گردانی کرنے لگا ۔ لیکن میگن کی اداس شکل پھر آنکھوں کے سامنے پھرنے لگی ۔ اٹھ کھڑا ہوا ۔ اور کھڑکی میں سے باہر جھک کر باغیچے میں جو تھرش بول رہے تھے ان کو سنتا رہا ۔ اور سمندر کا نظارہ کرتا رہا ۔ جو درختوں کے نیچے نیلا نیلا اور خواب آلود نظر آتا تھا ۔ ایک ملازمہ اندر آئی اور چائے کے برتن اٹھا کر لے گئی لیکن وہ وہیں کا وہیں کھڑا شام کی ہوا کا لطف اٹھاتا رہا ۔ اسی کوشش میں کہ اس کا دماغ کسی بات کو سوچنے نہ پائے ۔ تھوڑی دیر کے بعد ہیلی ڈے اور اس کی بہنیں پھاٹک میں سے

اندر داخل ہوتی دکھائی دیں۔ سٹیلا آگے آگے تھی۔ اس کے پیچھے فل اور فل کے پیچھے چھوٹی لڑکیاں اپنی اپنی ٹوکری اٹھائے چلی آ رہی تھیں۔ انہیں دیکھ کر ایشرسٹ اضطراراً پیچھے ہٹ گیا۔ اس کا مجروح اور مایوس دل ان لوگوں کی ملاقات سے گھبراتا بھی تھا۔ اور ان کی دوستانہ شفقت سے تسکین بھی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ان کے سحر کو محسوس کر کے چڑتا تھا۔ لیکن ان کی پرسکون معصومیت اور سٹیلا کی دید سے مسرت اندوز بھی ہونا چاہتا تھا۔ پیانو کے پیچھے دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا تھا۔ کہ سٹیلا اندر داخل ہوئی لیکن کچھ کھوئی سی گئی جیسے کوئی مایوسی ہوئی ہو۔ پھر ایشرسٹ پر نظر پڑی مسکرا دی۔ اس کا تبسم بجلی کی طرح سریع اور درخشاں تھا جس سے ایشرسٹ کو مسرت بھی ہوئی اور کھج بھی گیا۔

"فرینک۔ تم نہ آئے نا"؟

"ہاں آنا ہی نہ ہوسکا"

"دیکھو ہم کیسے خوبصورت بنفشے کے پھول چن کر لائے ہیں اب ان کا موسم ختم ہونے کو ہے"۔ سٹیلا نے پھول آگے بڑھا دئے۔ ایشرسٹ نے انہیں سونگھا۔ دل میں مبہم سی خواہشات پیدا ہوئیں۔ لیکن پھر یکلخت مرجھی گئیں میگن کا متفکر چہرہ نظر آیا۔ وہ اوپر تک رہی تھی۔ راہگیروں کے چہروں کا جائزہ لے رہی تھی۔

اس نے مختصر سا جواب دیا "بہت خوبصورت ہیں" اور منہ موڑ لیا۔ چھوٹی بچی سیڑھیاں چڑھ رہی تھیں۔ ان سے بچتا ہوا اپنے کمرے میں چلا آیا اور بستر پر جا گرا۔ اور دونو بازوؤں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔ قرعہ پھینک چکنے کے بعد میگن کو چھوڑ چکنے کے بعد اسے نہ صرف اپنے آپ سے بلکہ کم و بیش ہیلی ڈے اور اس کی بہنوں اور ان کی انگریز گھرانوں کی سی خوش دلی سے بھی نفرت ہونے لگی۔ قسمت نے یہ کیا ظلم کیا کہ انہیں یہاں لے آئی اور اس کے اوّلین عشق کا گلا گھونٹ دیا اور اسے یہ سمجھایا کہ یہ عشق اوباشی سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ سٹیلا کا کیا حق تھا۔ کہ اس کا دلفریب محجوب حسن اُسے یقین دلا دے کہ وہ میگن سے کبھی شادی نہ کریگا اور اس کے عشق کو مذموم ثابت کر کے اس کا دل تاسف اور حسرت اور رحم سے بھر دے۔ میگن بیچاری تلاش کے بعد مایوس ہو کر واپس چلی گئی ہوگی۔ اور شاید یہ امید دل میں لئے گھر کو جا رہی ہوگی۔ کہ ایشرسٹ پہلے سے پہنچ گیا ہوگا۔ تاسف اور حسرت سے بیتاب ہو کر ایشرسٹ نے اپنی آستین کو کاٹ لیا۔ کھانے پر بیٹھا تو اداس اور چُپ چُپ تھا۔ اس کی اداسی کو دیکھ کر بچے بھی پژمردہ ہو گئے۔ سب کے سب تھکے ہوئے تھے۔ اس لئے ان کا مزاج برہم تھا۔ چنانچہ شام کا وقت بے لطفی میں کٹا۔ کئی بار ایشرسٹ کی سٹیلا سے آنکھیں چار ہوئیں وہ پریشان مجروح نگاہوں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ ایشرسٹ بگڑا ہوا تھا۔ اس لئے اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی۔ رات بھر بیچین رہا صبح بہت سویرے اٹھا۔ اور باہر نکل گیا۔ ساحل سمندر کے پاس پہنچا تو تنہائی کے عالم میں پرسکون۔ نیلے روشن سمندر کو دیکھ کر اس کا دل قدرے پسیجا۔ مغرور احمق۔ سمجھتا ہے میگن کو بہت ہی صدمہ ہوگا! ہفتے دو ہفتے میں وہ بھول بھی جائیگی! باقی رہا وہ خود۔ تو اُسے اپنی پاکبازی کا صلہ ملیگا! نیک لڑکا! سٹیلا کو اس کا علم ہو جائے تو وہ اس ضبط نفس کو کس قدر سراہے۔ وہ شیطان کی قائل ہے۔ سمجھے شیطان کو نیچا دکھایا یہ خیال آیا تو ایک کرخت قہقہہ لگایا۔ لیکن رفتہ رفتہ سمندر اور آسمان کے سکون اور حُسن اور سمندری پرندوں کی پرواز کے نظارے سے متاثر ہو کر اس کو شرم سی آنے لگی۔ نہایا اور گھر کو چلا +

سٹیلا مکان کے باہر باغیچے میں ایک سفری سٹول پر بیٹھی تصویر بنا رہی تھی۔ چپکے سے اس کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔ وہ کس قدر حسین ہے۔ جسم آگے جھکائے۔ موقلم ہاتھ میں تھامے۔ ماتھے

پر ہلکی سی تیوری ڈالے وہ کتنی پیاری معلوم ہوتی ہے۔

بڑے ملائم لہجے میں بولا:۔

"سٹیلا مجھے افسوس ہے کہ رات میں نے بہت ہی بدتمیزی کی"

سٹیلا چونک کر مڑی۔ چہرے پر سرخی دوڑ گئی حسب عادت جلد جلد بولی:۔

"اس کا ذکر مت کرو۔ میں سمجھ گئی تھی۔ کہ کچھ نہ کچھ بات ہوگی لیکن دوستوں میں ایسی باتوں کا تذکرہ ہی فضول ہے ہے نا؟"

ایشرسٹ نے جواب دیا۔

"ہاں دوستوں میں —— تو ہم آپس میں دوست ہیں ہیں نا؟"

سٹیلا نے اس کے چہرے کو دیکھا۔ بڑے زور سے اثبات میں سر ہلایا۔ برق صفت سریع اور درخشاں تبسم سے اس کے چمکتے دانت پھر دکھائی دیئے۔

تین دن کے بعد ایشرسٹ ان لوگوں کے ساتھ واپس لندن چلا گیا۔ فارم کے لوگوں کو خط نہ لکھا۔ لکھتا تو کیا لکھتا؟

اگلے سال اپریل کے آخری دن سٹیلا سے اس کی شادی ہوگئی........

یہی وہ واقعات تھے۔ جن کی یاد اب ایشرسٹ کے دل میں جبکہ وہ اپنی شادی کی پچیسویں سالگرہ کے دن گورس کے بیچ میں دیوار کا سہارا لگائے بیٹھا تھا۔ تازہ ہو رہی تھی۔ جہاں اب لنچ چن رکھا تھا۔ یہی وہ مقام ہوگا جہاں میگن اُسے پہلی دفعہ آسمان کے بالمقابل کھڑی دکھائی دی تھی۔ انسان کو زندگی میں کیسے کیسے اتفاقات پیش آتے ہیں۔ دل میں تمنا پیدا ہوئی کہ اس فارم اور باغیچے اور جیسی بُوٹے والے مرغزار کو پھر جا کر دیکھے۔ اس میں بہت وقت نہ لگیگا۔ سٹیلا ابھی شاید گھنٹے بھر تک نہ لوٹے۔

بلندی پر وہ چیڑ کے درختوں کا جھنڈ اور عقب میں وہ گھاس سے ڈھکی ہوئی ڈھلوان اُسے اچھی طرح یاد تھی! فارم کے دروازہ تک پہنچ کر رک گیا۔ وہ پتھر کی نیچی عمارت۔ یو کے درختوں کا وہ محراب۔ وہ انگور کے شگوفے۔ بالکل جوں کے توں تھے۔ وہ پرانی سبز رنگ کی چوکی بھی وہیں کھڑکی کے نیچے گھاس پر رکھی تھی جہاں کھڑے ہو کر اس نے میگن کے ہاتھ سے چابی لے لی تھی۔ پگڈنڈی پر چل کر باغیچے کے پھاٹک تک پہنچا۔ جو پہلے کی طرح اب بھی سیاہی مائل اور شکستہ تھا۔ درختوں میں ایک سیاہ رنگ کا سؤر بھی پھر ادھر ادھر پھر رہا تھا۔ کیا سچ مچ چھبیس سال گزر چکے ہیں۔ یا محض کسی خواب سے بیدار ہوا ہے اور اس بڑے سیب کے درخت کے پاس میگن اس کا انتظار کر رہی ہے؟ خود فراموشی کے عالم میں اپنی بھوری ڈاڑھی کو ہاتھ لگایا اور واقعات کی دنیا میں واپس آگیا۔ پھاٹک کھول کر باغیچے کے اندر داخل ہوا۔ اور خاردار جھاڑیوں میں سے ہوتا ہوا کنارے تک جا پہنچا۔ جہاں وہ پرانا سیب کا درخت کھڑا تھا بالکل ویسے کا ویسا ہلکے رنگ کی کائی پہلے سے قدرے زیادہ تھی۔ دو ایک شاخیں بھی خشک ہو چکی تھیں۔ لیکن ان کے سوا اس میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کل رات ہی کا واقعہ ہے جبکہ میگن کے بھاگ جانے کے بعد وہ اس درخت کے کائی دار تنے سے لپٹ گیا تھا۔ اور اس کی خوشبوئے چوبیں سے مشام کو لطف اندوز کیا تھا اور سر کے اوپر چاندنی میں شگوفے سانس لیتے ہوئے اور زندہ معلوم ہوتے تھے۔ اوائل بہار کا زمانہ تھا۔ کہیں کہیں کلیاں پھوٹ چکی تھیں۔ بلیک برڈ اپنے راگ الاپ رہے تھے۔ ایک کوکو کی کوک سنائی دے رہی تھی۔ دھوپ کھلی ہوئی تھی۔ اور اس کی میٹھی میٹھی گرمی خوشگوار معلوم ہوتی تھی۔ مقام حیرت ہے کہ کہیں کوئی تبدیلی نظر نہ آتی تھی۔ وہی شور مچاتی ہوئی ندی تھی اور وہی تنگ سا تالاب جس میں وہ ہر روز صبح کے وقت لیٹ جایا کرتا تھا۔ اور پانی

اچھال اچھال کر اپنے پہلوؤں اور سینے پر ڈالا کرتا تھا۔ ویران مرغزار میں بیچ کے درختوں کا وہی جھنڈ تھا اور ان کے پاس وہی پتھر جہاں کہتے تھے۔ کہ جیسی ہوا آن کر بیٹھتا ہے۔ گم کردہ شباب کا خیال آیا۔ عشق کی بربادی کا خیال آیا کہ کس بیدردی سے اس کی شیرینیوں کو ضائع کر دیا تھا۔ دل میں ایک ٹیس ایک ہوک اٹھی جس نے ایشرسٹ کا گلا گھونٹ دیا۔ اس غیر ملوث حسن سے بھری ہوئی دنیا میں انسان اسی لئے پیدا کیا گیا ہے۔ کہ جو مسرت اسے حاصل ہو اُسے دل سے جدا نہ ہونے دے۔ جس طرح یہ زمین اور یہ آسمان جدا نہیں ہونے دیتے! لیکن انسان بے بس ہے!

ندی کے کنارے پر پہنچا تو اُس چھوٹے سے تالاب پر نظر پڑی۔ سوچا۔ شباب اور بہار۔ کیا معلوم دونوں کہاں چلے گئے؟ پھر یکلخت ڈر گیا۔ کہ کسی سے سامنا ہو گیا تو یہ خوشگوار تصورات برہم ہو جائینگے۔ پگڈنڈی کی طرف پلٹا۔ اور کسی سوچ میں کھویا ہُوا پھر اس چوراہے پر جا پہنچا۔

موٹر کے پاس ایک کھردری ڈاڑھی والا بوڑھا شخص ایک چھڑی کا سہارا لئے کھڑا شوفر سے باتیں کر رہا تھا۔ ایشرسٹ کو دیکھ کر وہ یکلخت رک گیا۔ گویا کوئی بے ادبی کر بیٹھا ہے اور تعظیماً ٹوپی کو چھو کر لنگڑاتا لنگڑاتا پگڈنڈی پر ہولیا۔

ایشرسٹ نے مٹی کی اُس سبز ڈھیری کی طرف اشارہ کیا اور پوچھا۔ "تمہیں معلوم ہے یہ کیا ہے"؟

بوڑھا شخص ٹھہر گیا۔ چہرے سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ دل میں کہہ رہا ہے۔ "مجھ سے بہتر تمہیں بتانے والا اور کون مل سکتا ہے"۔

بولا۔ "یہ ایک قبر ہے"۔

"لیکن یہاں کیوں"؟

بڈھا مسکرا دیا۔ "یہ لمبی داستان ہے۔ میں اسے کئی دفعہ سنا چکا ہوں۔ کئی لوگ پوچھتے ہیں۔ کہ یہ ڈھیری کیسی ہے۔ ہم لوگ اسے دوشیزہ کی قبر کہتے ہیں"۔

ایشرسٹ نے تمباکو کی تھیلی آگے بڑھا دی۔ "پائپ بھرلو"۔

بڈھے نے اپنی ٹوپی کو چھوا۔ اور آہستہ آہستہ اپنا مٹی کا پائپ بھرنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں جو جھریوں اور بالوں میں سے اوپر کو تک رہی تھیں۔ ابھی چمک باقی تھی۔

"جناب اجازت ہو تو میں بیٹھ جاؤں۔ آج ذرا ٹانگ دکھ رہی ہے"۔ یہ کہہ کر وہ اسی ڈھیری پر بیٹھ گیا۔

"اس قبر پر ہمیشہ ایک آدھ پھول پڑا رہتا ہے۔ کچھ ایسی تنہائی بھی نہیں یہاں۔ اب تو جب سے یہ موٹروں کا جھمیلا شروع ہُوا ہے۔ اکثر لوگ ادھر سے گذرتے ہیں۔ پچھلے زمانے کی اور بات تھی۔ اب تو یہاں چہل پہل رہتی ہے۔ اس بیچاری نے خودکشی کر لی تھی"۔

ایشرسٹ نے کہا۔ "سمجھ گیا۔ جبھی چوراہے میں دفن ہے میرا خیال تھا۔ اب یہ دستور نہیں رہا"۔

"مگر یہ تو بڑے عرصے کی بات ہے۔ ان دنوں ہمارے ہاں کا پادری ایک بہت ہی خدا ترس شخص تھا۔ اگلے میکلمس میں میری پنشن کو چھ سال ہو جائینگے۔ اور جب یہ واقعہ ہُوا۔ اس وقت میں پچاسویں برس میں تھا۔ اب تو کوئی ایسا شخص زندہ نہیں۔ جسے اس کا حال مجھ سے بڑھ کر معلوم ہو۔ وہ یہاں قریب ہی رہتی تھی۔ اسی فارم میں جہاں مَیں مسز نیرو کومب کے ہاں کام کیا کرتا تھا۔ اب وہ فارم مِک نیرو کومب کے پاس ہے۔ میں کبھی کبھی اس کے ہاں بھی متفرق کام کر لیتا ہوں"۔

ایشرسٹ پھاٹک کے سہارے کھڑا پائپ سلگا رہا تھا دیا سلائی بجھ گئی۔ لیکن ایشرسٹ نے دیر تک خمیدہ ہاتھوں کو چہرے کے سامنے سے نہ ہٹایا۔

اس نے کہا "اچھا؟" لیکن اپنی آواز خود اپنے کانوں کو عجیب معلوم ہوئی۔ جیسے بیٹھی ہوئی ہو۔

"وہ لڑکی لاکھوں میں ایک تھی! میں جب گزرتا ہوں۔ یہاں ایک آدھ پھول ڈال جاتا ہوں۔ خوبصورت اور نیک تھی۔ گو انہوں نے اسے گرجے میں دفن نہ کیا۔ نہ وہیں دفنایا جہاں وہ خود چاہتی تھی۔"

بڈھا مزدور ٹھہر گیا اور اپنا بالوں والا، مڑا تڑا ہاتھ کھول کر اس ڈھیری پر ببول کے پھولوں کے پاس رکھ دیا۔

ایشرسٹ نے کہا "اچھا"؟

بوڑھے نے کہا "بس یوں سمجھئے کہ کسی سے عشق ہو گیا تھا اس لڑکی کو گو یقین سے کوئی نہ کہہ سکتا تھا کسی لڑکی کے دل کا حال اللہ ہی جانے۔ لیکن میرا خیال ہے۔ کہ اُسے عشق تھا۔" قبر پر ہاتھ پھیرا۔ "مجھے اس لڑکی سے بہت محبت تھی۔ سبھی کو اس سے محبت تھی۔ لیکن وہ خود بھی بہت زیادہ محبت کرنے والی تھی۔ یہی اس میں خرابی تھی۔" اس نے نظریں اوپر اٹھائیں اور ایشرسٹ نے جس کے ہونٹ اس کی ڈاڑھی کے بالوں میں چھپے ہوئے تھے لیکن پھڑک رہے تھے۔ کہا: "اچھا"؟

"یہ موسم بہار کا واقعہ ہے۔ بس یہی موسم تھا جو اب ہے۔ یا ذرا چند دن بعد ہوگا۔ شگوفوں کے دن تھے۔ فارم میں ایک کالج کا لڑکا آکر ٹھہرا تھا۔ اچھا لڑکا تھا۔ اپنا ذرا کھنچ کر رہتا تھا۔ مجھے بہت پسند تھا۔ میں نے تو صاحب کوئی ایسی بات نہیں دیکھی لیکن میرا خیال ہے۔ کہ اسی نے اس لڑکی کا سر پھرا دیا تھا۔"

بڈھے نے پائپ منہ سے ہٹایا۔ زمین پر تھوکا اور پھر بولا:۔

"بات یہ ہوئی۔ کہ یہ لڑکا ایک دن ایکا ایکی یہاں سے چل دیا اور واپس کبھی نہ آیا۔ اس کا تھیلا اور چھوٹی موٹی چیزیں ابھی تک فارم میں پڑی ہیں۔ میں ہمیشہ یہی سوچتا رہا۔ کہ اس نے اپنی چیزیں منگوائی کیوں نہیں۔ ایشر یا ایسا ہی کچھ نام تھا اس لڑکے کا۔"

ایشرسٹ نے پھر کہا: "اچھا"؟

بڈھے نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"اس دن سے لڑکی کے ہونٹوں پر تو جیسے مہر لگ گئی۔ دن بھر یوں پھرتی رہتی تھی جیسے حواس بجا نہ ہوں۔ وہ تو کچھ دیوانی سی ہوگئی۔ میں نے کبھی کسی کی حالت یوں بدلتے نہیں دیکھی۔ فارم میں ایک اور لڑکا تھا۔ جو نامی۔ وہ اُسے چاہتا تھا۔ میں جانوں لڑکی اس سے بہت ہی پریشان رہتی تھی۔ رفتہ رفتہ اس کی حالت بگڑتی گئی۔ بعض اوقات شام کے وقت میں بچھڑوں کو لے کر آتا۔ تو وہ لڑکی باغیچے میں بڑے سیب کے درخت کے پاس کھڑی ہوتی۔ اور بالکل سامنے تک رہی ہوتی۔ میں دل میں کہتا۔ یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ تمہیں کیا ہوگیا ہے۔ لیکن تمہاری حالت زار ہے۔"

بڈھے نے اپنا پائپ پھر سلگایا اور سوچ کے انداز میں کش لگانے لگا۔

ایشرسٹ نے کہا۔ "اچھا"؟

"ایک دن مجھے یاد ہے۔ میں نے اس سے کہا۔ میگن تمہیں یہ کیا ہوگیا ہے (اس کا نام میگن ڈیوڈ تھا اور وہ اور اس کی خالہ بڈھی مسز نیرو کومب دونو ویلز سے آئی تھیں) میں نے کہا تمہیں ضرور کوئی دکھ ہے۔ کہنے لگی نہیں جم مجھے کسی چیز کا دکھ نہیں۔ میں نے کہا۔ دکھ کیسے نہیں۔ ہے اور ضرور ہے۔ کہنے لگی۔ نہیں تو۔ یہ کہا اور اس کی آنکھوں سے دو آنسو چھلک پڑے۔ میں نے کہا۔ تو پھر تم روتی کیوں ہو؟ اس نے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ یہاں دکھ ہوتا ہے۔ لیکن تھوڑے دنوں میں آپ ہی ہٹ جائیگا۔ پھر کہنے لگی۔ جم اگر مجھے کچھ ہوگیا تو مجھے اسی سیب کے درخت تلے

دفن کیجیو۔ میں ہنس دیا۔ میں نے کہا۔ تمہیں کیوں کچھ ہونے لگا پگلوں کی سی باتیں منہ سے مت نکالو۔ وہ بولی۔ نہیں۔ میں پگلوں کی سی بات نہ کرونگی۔ میں نے دل میں سوچا۔ لڑکیوں کی باتوں کا کیا ہے۔ آپ ہی ٹھیک ہو جائیگی۔ چنانچہ اس بات کا خیال میں نے دل سے نکال دیا۔ لیکن دو دن بعد کوئی شام کے چھ بجے میں بچھڑوں کو لئے آ رہا تھا کہ میں نے ندی میں سیب کے درخت کے پاس کالی سی چیز پڑی دیکھی میں سمجھا سؤر ہے۔ پھر خیال آیا۔ یہ بھی کوئی سؤر کے لیٹنے کی جگہ ہے قریب پہنچا۔ تب معلوم ہوا کہ کیا۔ ہے ہے!

بڈھا رک گیا۔ اس کی آنکھیں اوپر کو تک رہی تھیں۔ نظر میں چمک تھی اور دکھ بھرا تھا۔

"ندی میں ایک چٹان ہے اس سے رک کر پانی کا ایک تالاب سا بن گیا ہے۔ وہاں وہ لڑکی پڑی تھی۔ اسی مقام پر میں نے اس لڑکے کو ایک دو مرتبہ نہاتے بھی دیکھا تھا۔ لڑکی پانی میں اوندھی پڑی تھی۔ اور اس کے سر کے پاس ایک پتھر کے شگاف میں سے سنہری پھولوں کا ایک پودا اُگ رہا تھا۔ چہرے کو دیکھا تو اس پر ایسا حسن آ گیا تھا کہ آپ سے کیا کہوں۔ ننھے بچے کی طرح پرسکون اور خوبصورت تھا۔ جب ڈاکٹر نے اسے دیکھا۔ تو بولا۔ اتنے پانی میں ڈوبنا تو ناممکن ہے۔ اور سچ پوچھئے تو اس کے چہرے سے بھی یہی معلوم ہوتا تھا۔ میں تو زار قطار رو دیا۔ وہ کتنی خوبصورت معلوم ہو رہی تھی۔ جون کا مہینہ تھا لیکن اُسے سیب کے شگوفے کی ایک آدھ ٹہنی کہیں سے مل گئی تھی۔ اُسے بالوں میں لگا رکھا تھا۔ اسی لئے میں کہتا ہوں۔ کہ اُسے شادی مرگ ہوئی تھی ورنہ اس بناؤ سنگھار سے کیوں مرتی اور پھر پانی بھی تو فٹ ڈیڑھ فٹ سے زیادہ نہ تھا۔ لیکن یہ میں آپ سے کہ دوں۔ کہ یہ جنگل بھاری ہے۔ مجھے بھی معلوم ہے اُسے بھی معلوم تھا۔ اور کوئی کہے۔ کہ بھاری نہیں۔ تو میں کبھی نہ مانوں۔ میں نے لوگوں سے کہ دیا۔ کہ وہ سیب کے درخت تلے دفن ہونا چاہتی تھی۔ لیکن یہ سن کر لوگ اور بھی خلاف ہو گئے۔ انہیں یقین ہو گیا۔ کہ اگر یہ بات ہے۔ تو ضرور خودکشی ہی کی ہوگی۔ چنانچہ انہوں نے یہاں دفنا دیا۔ ہمارے پادری کو ایسی باتوں کا بہت خیال تھا۔"

بڈھے نے پھر ڈھیری پر ہاتھ پھیرا۔

اور پھر رُک رُک کر بولا۔ "لڑکیاں عشق کی خاطر کیا کچھ نہیں کر گزرتیں۔ وہ بڑی محبت کرنے والی لڑکی تھی۔ میرے خیال میں اس کا دل ٹوٹ گیا تھا۔ لیکن یقین سے کسی کو کچھ معلوم نہیں" داد لینے کے لئے اس نے نظر اوپر اٹھائی۔ لیکن ایشرسٹ وہاں سے چل دیا تھا۔ اس طرح کہ گویا اس کے سوا اور کوئی وہاں موجود ہی نہ تھا۔

پہاڑی کی چوٹی پر جہاں پیچ چن رکھا تھا۔ اس سے پرے نظروں سے اوجھل وہ زمین پر اوندھا لیٹ گیا۔ تو اس کی پاکبازی کا صلہ یہ تھا! یہ عشق کی دیوی سائپرین کا انتقام! اس کی پرنم آنکھوں کو میگن کا چہرہ دکھائی دیا۔ جس کے سیاہ بھیگے ہوئے بالوں میں سیب کے شگوفے لگے تھے۔ اس نے دل سے پوچھا "میں نے کیا گناہ کیا تھا؟ میں نے کیا کیا تھا؟" لیکن اسے کوئی جواب نہ ملا۔ وہ تو یہ سمجھتا تھا کہ اس کے دل میں جذبات خیز۔ گل ریز۔ مترنم بہار نے طوفان بپا کر دیا تھا۔ اس کے اور میگن دونو کے دل میں۔ لیکن کیا دراصل عشق کو محض کسی کی جان لینا مطلوب تھا! تو پھر وہ یونانی ہی راستی پر ہے۔ اور "ہپالٹس" کے الفاظ آج بھی سچے ہیں۔

عشق کا دل دیوانہ ہے
اور اس کے پروں کی چمک سنہری ہے
اور جب وہ جست بھر کر اڑتا ہے
تو کوئی اس کے جادو کی تاب نہیں لا سکتا۔

وہ تمام زندگی جو پہاڑ اور موج اور آبِ جو میں
شباب اور خودسری سے مست ہے
ہر وہ شے جو سینۂ زمین سے پھوٹتی ہے
یا سورج کی شہابی شعاعوں میں سانس لیتی ہے
ہاں یہ سب کچھ اور ہر مرد اور ہر عورت
سب کے اوپر اے سائپرین۔ اے سائپرین تو حکومت کرتی ہے،
صرف تو۔

یونانی سچ کہتا ہے۔ میگن! حسرت زدہ میگن! پہاڑی سے نیچے اترتی ہوئی! میگن۔ پرانے سیب کے درخت کے نیچے راہ تکتی ہوئی! ہیجان۔ مردانہ میگن جس پر حسن کی مہر ثبت ہے!

ایک آواز کانوں میں پڑی۔
"وہاں ہو تم۔ لو آؤ دیکھو"
ایشرسٹ اٹھا۔ بیوی نے جو تصویر کھینچی تھی۔ اُسے ہاتھ میں لیا اور چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔
"فرینک اس کا پیش منظر ٹھیک ہے"؟
"ہاں"
"لیکن پھر بھی کچھ کمی رہ گئی ہے۔ ہے نا"؟
ایشرسٹ نے اثبات میں سر ہلا دیا" کمی؟ سیب کا درخت موسیقی اور سنہری پھول"!

مترجم سید احمد شاہ بخاری پطرس

فرمودۂ پطرس

اے حسن تو ز یاد تماشا کنم ترا
عمرم دراز باد تمنا کنم ترا
برہم نظر مکن من ناکردہ کار را
گر التجائے بوسۂ بے جا کنم ترا

بہ تبسم چہ تسلی بہ نگاہے چہ قرار
لشکرِ آرزوئے از لبم انگیختۂ
بر سرِ خاکِ من تشنہ لبے ریختہ باد!
قطرۂ مے کہ تو از لغزشِ پا ریختۂ

سید احمد شاہ بخاری پطرس



احسن

آرزو

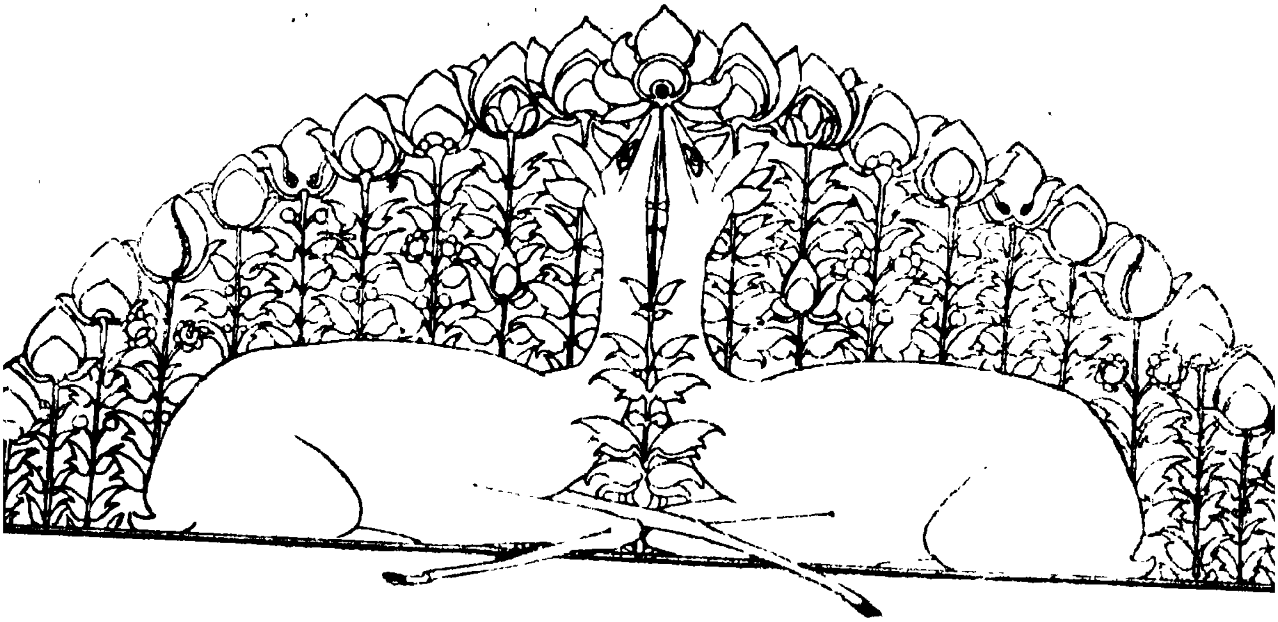
یارب مجھے آزادی دے بادِ سحر کی سی
بستی سے بیاباں سے۔ صحرا سے گلستاں سے
وادی سے کہستاں سے
یوں سن سے گذر جاؤں
جس طرح کسی دل میں۔ جو غم سے ہو افسردہ
چپکے سے خیال آئے۔ گذری ہوئی راحت کا
اور ابر سا چھا جائے۔ اس دل پہ مسرت کا
یونہی میں گذر جاؤں
بستی سے بیاباں سے صحرا سے گلستاں سے
وادی سے کہستاں سے
یونہی میں گذر جاؤں

جھولا کروں پھولوں میں۔ اور خشک ببولوں میں
خوشبو کو چرا لاؤں۔ کانٹوں کو اڑا لاؤں
دیکھا کروں نہروں کو۔ چھیڑا کروں لہروں کو
سوتے ہوئے سبزے کو۔ چپکے سے جگا جاؤں
دلگیر سے غنچوں کو۔ چپکے سے ہنسا جاؤں
اور صبح کے آنے کا۔ پیغام سنا جاؤں
نغموں کے تلاطم سے
پُر ہو مری خاموشی
دنیا کو میں سکھلا دوں
آلامِ فراموشی

آرامِ جوانی سے۔ خوشیوں کی کہانی سے
الفت کے تکلم سے۔ شوخی کے تبسم سے
محبوب جفاؤں سے۔ مرغوب اداؤں سے
دامانِ نظر بھر لوں
نظاروں سے پُر کر لوں
مایوس نگاہوں سے۔ حسرت بھری آہوں سے
دلسوز خیالوں سے۔ اور صبح کے نالوں سے
رنجور کی آنکھوں سے۔ ٹپکے ہوئے اشکوں سے
دامن کو میں پُر کر لوں
ان موتیوں سے بھر لوں

افریقہ کے صحرا سے۔ اور مصر کے دریا سے
بھارت کے پہاڑوں سے۔ کانگو کے اجاڑوں سے
ایران کے نظاروں سے۔ پرکیف بہاروں سے
میں پل میں گذر جاؤں
دم بھر نہ رکوں ان سے
ہرگز نہ جھکوں ان سے
میں اور نہ محفل ہو
یونہی میں گذر جاؤں
بستی سے بیاباں سے صحرا سے گلستاں سے
وادی سے کہستاں سے
یونہی میں گذر جاؤں
یارب مجھے آزادی دے بادِ سحر کی

ممتاز حسن احسن



مجید ملک

تقدیر

کون تقدیر کے پردے میں عمل کرتا ہے
میری تدبیر میں جو رد و بدل کرتا ہے
عشق سے کیوں نہیں انساں کی رہائی ممکن
کوئی اس عقدۂ دشوار کو حل کرتا ہے

میں گنہگار ہوں لیکن میں گنہگار نہیں
یعنی اندوہِ عقوبت کا سزاوار نہیں
اب وہ دوزخ میں مجھے بھیجتے ہیں بھیجنے دو
میں بہر حال ترحم کا طلب گار نہیں

مجید ملک

حیرت

تغزل

مشورے ہیں مرے مٹانے کے
حوصلے دیکھنا! زمانے کے

دستِ صیاد میں ملے، اکثر
تنکے بلبل کے آشیانے کے

یہ زمیں اور آسماں دونوں
دو ورق ہیں مرے فسانے کے

آج بھی جو وفا پہ قائم ہیں
وہ بھی ہیں لوگ کس زمانے کے

شوق پامال، آرزو رسوا
یہ کرشمے ہیں دل لگانے کے

گل و گلزار ہی نہیں، ہم بھی
منتظر ہیں بہار آنے کے

ہیں نظر میں نئے نئے عنواں
دل سے افسردگی مٹانے کے

اس کو کیا کیجئے کہ باقی ہیں
دن ابھی سختیاں اٹھانے کے

کچھ عجب دل کا حال ہے حیرت
کہیں آنے کے ہیں نہ جانے کے

عبد المجید حیرت

تاجدار

رحمٰن چغتائی

سیبا کا سب سے بڑا شہر بعلصورا جہاں قوم عرم کو حکومت کرتے صدیاں گذر گئی تھیں تجلیوں کا گہوارہ تھا۔ بعلصورا کو قوم عرم نے بسایا تھا۔ وہ اس کی رونق تھے اور وہ ان کا فخر تھا۔ ابن حسام نے جو قوم عرم کا سب سے پہلا بادشاہ تھا اس کی بنیاد رکھی تھی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ اس نے اپنی قوم کے لئے چھوڑا اس کی بہترین یادگار بعلصورا تھا۔ بعلصورا کے رہنے والے زندگی کی حقیقی لذتوں سے آشنا تھے۔ ان کے نزدیک زندگی عمل کا دوسرا نام تھا۔ انہوں نے زندگی کو معراج کمال تک پہنچانے کے لئے ان گنت قربانیاں کی تھیں وہ دل رکھتے تھے۔ انسانوں کا سا دل۔ کون کہہ سکتا ہے انہیں زندگی کامیاب قائم کرنے میں کتنی جد وجہد کرنی پڑی؟ مورخین کا بیان ہے کہ انہوں نے قوم اسرائیل کو جب وہ انتہائی مصیبتوں میں سے گذر رہی تھی۔ اپنے ملک میں پناہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اور فقط اس لئے انکار کر دیا تھا کہ بنی اسرائیل کی حد سے بڑھی ہوئی غلامانہ ذہنیت میں وہ اپنے مستقبل کے لئے ایک خطرہ عظیم دیکھتے تھے۔

کہنے میں قوم عرم کا سب سے بڑا بادشاہ۔ بادشاہ نعمان بادشاہ کے جیس پر خدا کا پیغام تھا۔ نعمان بادشاہ تھا۔ اس کا دل بادشاہوں کا دل تھا۔ اور سانپ کی طرح جب تک اس پر پاؤں نہ پڑے وہ کسی کو نہ ڈستا تھا۔ نعمان کی عظمت اور جبروت کی تاریخ شاہد ہے۔ آج تک اس کا ملک اور اس کی قوم اس کے بنائے ہوئے قانون اور روایات کو احترام سے بھرے ہوئے دل اور نیاز سے جھکی ہوئی آنکھوں سے دیکھتی ہے۔ وہ ایک صحیح قسم کا بادشاہ۔ صرف بادشاہ تھا ——

آخن بن عاصم بعلصورا کا سب سے بڑا مورخ لکھتا ہے کہ جب وہ تخت پر بیٹھا تو صحرا کی فضا میں ایک روشنی نمودار ہوئی اور ماؤں نے اس نیک ساعت کی یاد میں اپنے بچوں کے بازوؤں پر تعویذ باندھے اس کا بیان ہے کہ جب نعمان تخت پر رونق افروز ہوتا تھا تو اس کی کشادہ پیشانی پر تجلیاں نمودار ہوتی تھیں۔ اور اس کے سرخ لبوں پر ایک مسرت آمیز تبسم موج حیات بن کر دوڑ جاتا۔ اس کی آنکھیں جہان کی آئینہ دار تھیں۔ اور وہ خود انسان کا مستقبل نظر آتا تھا۔ نعمان سے کبھی کوئی لغزش نہ ہوئی تھی۔ اس کے ہاں اولاد کی کمی نہ تھی۔ بچوں کی تربیت کا اسے غیر معمولی ذوق عطا ہوا تھا۔ خصوصیت سے اس کے عہد میں عورتوں نے علم و ادب مردوں کے دوش بدوش حاصل کیا تھا۔ اس کا سبب اس کی لڑکیاں تھیں۔

نعمان نے برسوں کی سوچ بچار کے بعد اپنے رہنے کے لئے ایک محل تیار کرایا تھا۔ فن تعمیر کا نمونہ۔ آہستہ آہستہ مشرق و مغرب میں آپ اپنی مثال بن کر رہ گیا۔ اس کے بڑے بڑے ستون بلند گنبد اٹھائے ستاروں بھری رات میں یوں دکھائی دیتے گویا صحرا زادیاں محملوں کے نیچے کھجوروں کے جھنڈوں میں سے گذر رہی ہیں۔ یہ محل جس میں نعمان رہا کرتا تھا۔ بعلصورا کی پیشانی پر اس طرح روشن تھا جیسے فرمان شاہی پر مہر ثبت کر دی گئی ہو۔ صدیوں کی روایات اس کے پیچھے رحمت حق کی طرح پر کھولے کھڑی تھیں —— انجام کا یہ محل جسے نعمان نے اپنی ذات کے لئے بنایا تھا۔ مظلوموں کی داد رسی کے لئے وقف ہو گیا۔

وہ شان اور جاہ و جلال جو قوم عرم کی پُر وقار زندگی کا ثبوت تھا اور جس کا بنیادی پتھر ابن حسام کی وسعت نظری نے رکھا تھا قوم عرم کی قدیم روایات بعلصورا کے وارثوں میں اب بھی موجود تھیں لیکن رفتہ رفتہ زمانہ گذشتہ کی یاد ایک قدیم سکے کی طرح زنگ آلود ہو رہی تھی کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ آیا یہ تغیر محض بزرگ اور برگزیدہ ہستیوں کے چلے جانے کی وجہ سے ہے یا قوم کے انحطاط کے امکانات ہیں۔

نعمان کا محل صوفیا شہر سے دور تھا اور پشت کی جانب سے کچھ اس طرح پہاڑوں کے دامن اور چوٹیوں سے ملا دیا گیا تھا کہ آج تک کسی نے اس کی صحیح وسعت کا اندازہ نہیں لگایا۔ "صوفیا" طوبا کے صحراؤں میں مصر کے دیوتا ابوا لہول کی طرح کھڑا قوم عرم کی تہذیب کا زندہ معجزہ کہلاتا تھا۔ بعلصورا کے اندر بادشاہ آئے اور گئے مگر وہ نقشہ جو نعمان نے اختراع کیا تھا ویسے کا ویسا موجود تھا اس میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی تھی دو پہرہ دار ستونوں کی طرح مضبوط سرخ آنکھوں والے ہاتھوں میں آہنی علم لئے دن رات صوفیا کے سامنے کھڑے رہتے تھے۔ محل کی بلندی میر عمارت کے کمال سے بادشاہ نعمان کی شبیہ معلوم ہوتی تھی۔ اس کے گرد زرد۔ سرخ کھجوروں کے جھنڈ اس طرح نظر آتے تھے گویا بڑھاپے کے حصے میں کسی کے بال ادھر ادھر بکھر گئے ہیں۔

صوفیا کوہ ادفا کے دامن میں استادہ لالہ صحرا کی طرح خودستائی کی داستان کہہ رہا تھا۔ اس کے وارث نہ جانتے تھے کہ اس نے کیا کیا دیکھا ہے۔ انسانی نظریں بلندی کی جانب اٹھتیں تو تدبر لب ہلا کر کہتا کہ صوفیا کی تعمیر میں بادشاہوں کی دولت عقل کا سرمایہ۔ محبت اور عقیدت سب کچھ استعمال ہوا ہے۔ صوفیا درحقیقت ایک چھوٹے سے صحن کا نام تھا۔ جو سفید سنگ مرمر سے تیار کیا گیا تھا۔ عرب کے بڑے بڑے صناعوں نے اس کی چھت اور دیواروں پر شیشے اور کانچ کا کام کچھ اس طرح کیا تھا کہ بادشاہ آنے جانے والوں کو ہر زاویۂ نگاہ سے دیکھ سکتا تھا۔ سمیع جو اس وقت سب سے بڑا صناع تھا اس نے بادشاہ کی نشست تیار کی تھی جس پر اس کا نام کندہ تھا۔ ایک مورخ لکھتا ہے صوفیا نعمان کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ جو اس کی زندگی میں مر گیا تھا۔ وہ ایک ہسپانوی شہزادی کے بطن سے تھا جب یہ صحن تیار ہو چکا تو نعمان کو اس میں ایک کھوئی ہوئی خوشی چلتی پھرتی نظر آئی اس نے اپنے بیٹے کی یاد میں اسی کے نام سے منسوب کر دیا۔

محل کے باہر وہ دراز قد پہرہ دار جو حکومت کا وقار اور اس کے شکوہ کا ثبوت تھے بالکل چپ کھڑے رہتے تھے۔ ان کی خاموشی میں ہزاروں پرمعنی الفاظ کی فصاحت تھی۔ وہ ایک ہی نظر میں بہت کچھ کہہ جاتے۔ جب بادشاہ ان کے سامنے سے گزرتا تو ان کے آہنی علم کچھ اس طرح جیسے خود سجدہ ان کے سامنے آ کر رک گئے ہوں رک جاتے۔ وہ چلتے چلتے ٹھہر جاتے ان کے سر جھک جاتے۔ ایک نوبت بجتی اور بادشاہ معہ اپنے مصاحبوں کے کاروان انجم کی طرح محل میں داخل ہو جاتا بعلصورا کے رہنے والے یہ سب کچھ جانتے تھے کیونکہ یہ رسوم صدیوں سے چلی آتی تھیں۔

ایک شب بعلصورا بھولے بھٹکے خوابوں کی یاد میں محو تھا۔ لیکن صوفیا کے اندر ایک بزم طرب جو بادشاہوں کے شایان شان تھی جمی ہوئی تھی۔ نعمان کے اپنی راہ سے بھٹکے ہوئے وارث وقت اور زندگی کا لطف لے رہے تھے۔ اس وقت صوفیا سے دور دور تک کوئی آہٹ اور کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ صحن کے باہر دیواروں پر ستاروں کی دھیمی دھیمی روشنیاں نیند کی غنودگی میں اونگھتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ پہرہ دار سامنے دائیں بائیں اور پیچھے نظریں جما کے دیکھ رہے تھے۔ معاً وہ اس ہرن کی طرح ہوشیار ہو گئے جو گھنے جنگل میں کسی آنے والے خطرے کی آہٹ سنتا ہے۔ ساتھ ہی وہ چیتے کی طرح مستعد اور حملہ کرنے کے لئے آمادہ ہو گئے۔ انہوں نے ایک سایہ دیکھا جو اس رات کی تاریکی میں کالے

دیوں کی سرعت لیکن نسیم کی خاموشی کے ساتھ بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ انھوں نے اپنے آہنی بلموں کو حرکت دی لیکن اس سے پیشتر کہ وہ اپنے شکار پر جھپٹتے سایہ رک گیا۔

ایک آواز آئی "بادشاہ کہاں ہے۔ مجھے بادشاہ سے ملنا ہے"

پہرہ دار ٹھٹھک کے رہ گئے۔ نوجوان سردار نے نخوت سے کہا "دروازہ بند ہو چکا ہے۔ اور بادشاہ آرام میں ہے" لیکن آنے والے نے نوجوان سردار کی ایک نہ سنی اور کہا "مجھے بادشاہ سے ملنا ہے۔ نعمان اور ابن حسام کا وارث کہاں ہے"۔ پہرہ داروں نے اپنے بلموں کو زمین پر زور سے مارا اور کہا "یہ وقت بادشاہ کے آرام کا وقت ہے۔ پرانے قانون تبدیل کر دیئے گئے ہیں نعمان اور ابن حسام کا وارث آرام کر رہا ہے۔ اور اس کے آرام میں کسی فریادی کی آواز خلل انداز نہیں ہو سکتی۔ تو عورت ہے اس لئے تجھے سزا سے محفوظ رکھا جاتا ہے۔ ورنہ ـــــ" لیکن عورت نے کہا "میں ابن حسام کے وارث سے ملنا چاہتی ہوں میں سخاوت نہیں چاہتی۔ میں فریاد نہیں لائی۔ میں قوم عرم کے بادشاہ سے ملنا چاہتی ہوں۔ پھر اس نے بوڑھے سردار کو مخاطب کر کے کہا "اے سردار میں تیرے بادشاہ سے ملنا چاہتی ہوں۔ یہ الفاظ کچھ اس نے اس طرح سے کہے کہ اس کی آنکھوں میں سے آنسو نکل آئے۔ اس نے بوڑھے سردار کے بلم کو پکڑ لیا اور کہا "اے سردار تو دانشمند ہے تیرا ساتھی نوجوان ہے۔ تو نے عمر کی بہت سی منزلیں دیکھی ہیں میں کسی کے جذبات پر غلبہ حاصل کرنا نہیں چاہتی۔ مجھے کچھ مانگنا نہیں وہ بادشاہ ہے میں اس کی رعیت ہوں۔ اے سردار میں اپنے بادشاہ سے ملنا چاہتی ہوں"۔

بوڑھے سردار نے بلم کو زمین پر ٹیک دیا۔ نگاہیں دور ہوا میں پیوست کر دیں گویا اپنی گذشتہ زندگی کا جائزہ لے رہا ہے۔ پھر شاہین کی طرح جو بلند فضاؤں میں اڑ رہا ہو عورت کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔ آخر اس نے اپنا دایاں ہاتھ جو غالباً کانپ رہا تھا اس کے سر پر رکھ دیا۔ شاید وہ ایسا کرنا نہ چاہتا تھا اس کے فرائض اسے اجازت نہ دیتے تھے۔ مگر جذبات کی شدت نے اس پر غلبہ حاصل کر لیا اور وہ بولا "تیری آرزو میں موت کی مسکراہٹ اور تیرے جذبات میں زندگی کی جھلک نمایاں ہے۔ آ ہم بادشاہ کے حضور میں چلتے ہیں۔ میں بہت بوڑھا ہو گیا ہوں موت میرا انتظار کر رہی ہے۔ آ اے جذبات کی دنیا میں رہنے والی۔ آ ایوان شاہی کو یہ راستہ جاتا ہے۔

سردار سینے پر ہاتھ رکھے بادشاہ کے حضور میں کھڑا تھا۔ وہ زمین تک جھک گیا اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اس کی زبان پر مہر لگ گئی۔ بادشاہ نے سردار کی طرف بادشاہوں کی سی خشمناک نگاہ سے دیکھا پھر اس کے ساتھی پر نگاہیں گاڑ دیں۔ عورت سینے پر ہاتھ رکھے زمین تک جھک گئی۔ "آداب محفل" "شاہی احترام" وہ سب کچھ جانتی تھی۔ اس نے کہا۔ "اے بادشاہ یہ بازو ابھی تک تیرے بچپن کی مسرتوں سے سرشار اور تیری محبت سے لرزاں ہیں۔ اے بعلصورا کی قسمت کے مالک میں نے کئی برس اس چھت کے نیچے گذارے ہیں۔ یہاں کا ذرہ ذرہ میری آواز سے آشنا ہے۔ اے بادشاہ تو نہیں جانتا ان ایوانوں میں کیا کچھ ہو چکا ہے اور کیسے کیسے باکمال صناعوں نے اہل نظر سے اپنے کمال کی داد حاصل کی ہے۔ یہ جگہ بادشاہوں کی جگہ ہے جہاں زندگی اپنے مدارج پہچانتی ہے اور نکتہ چین نگاہیں حق کا اظہار کرنے میں ذرا بھی نہیں جھجکتیں میں نے بھی ان لازوال مسرتوں میں اپنی زندگی کے بہت سے دن گذارے ہیں۔ اے بادشاہ تو دیکھتا ہے میری آواز تیرے محل کے کونے کونے میں سما گئی ہے۔ تیرے محل کے گنبدوں اور محرابوں نے میری آواز کو دل کے اندر جذب کر لیا ہے۔ اے بادشاہ تو بھی تو کھویا سا گیا ہے"۔ بوڑھے سردار نے اطمینان کا ایک سانس لیا۔ اس کی جرأت نے کروٹ لی۔ وہ عجز سے جھک گیا اور اس نے پہلے کی طرح پھر ایک بار عورت کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اس کے لبوں پر کسی قسم کے

جذبات کی جھلک نمایاں نہ تھی ۔ نووارد عورت نے دنیا بدل دی تھی بادشاہ کی آنکھوں کے سامنے بادشاہت کا نیا باب کھل گیا ۔ اس کی گردن جھک گئی اسے ماضی اور مستقبل دونوں کے درمیان جہاں مجاہدوں کے قدم آچکے تھے یا آنے والے تھے ایک مضبوط دیوار حائل نظر آئی ۔ طرح طرح کے خیالوں نے اسے جھنجھوڑا اگر عورت نے سلسلۂ کلام جاری رکھا اور کہا میں دربار کی مطربہ ہوں میں مغنیہ ہوں ۔ میں محسوس کرتی ہوں کہ میں ابن حسام کے وارثوں میں بیٹھی اپنا بربط زانوؤں پر رکھے نغموں کا نوج الہامی روشنیوں کی طرح مشرق و مغرب کی بیداری کے لئے نچھاور کر رہی ہوں "۔

مدھم مدھم روشنیاں جو صحن کے اندر باہر اجالا کئے ہوئے تھیں دیکھتے دیکھتے دھندلی پڑ گئیں ۔ تھکا ہارا بادشاہ بدن ڈھیلا چھوڑے جیسے کوئی سستا رہا ہو عورت کا چہرہ تک رہا تھا ۔ لذتوں کی انتہا پیدا کرنے والی ہر شئے قرینے سے چنی ہوئی تھی ۔ مینائیں فانوسوں کے نیچے رنگین لباس پہنے خواصوں کی طرح گویا سہمی ہوئی کھڑی تھیں بادشاہ کی شکل وصورت نے مطربہ کے ذہن پر کوئی ایسی کیفیت پیدا کی جس سے وہ اپنی پہلی آزادی کھو بیٹھتی ۔ کرب کی وہ کیفیت جس سے انسان جنون کے درجہ تک پہنچ جاتا ہے مغنیہ اسی کیفیت میں کھڑی تھی ۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ اس میں ابھی تک سحر کی طاقت موجود ہے ۔ اور جس طرح پہلے بڑی بڑی شخصیتوں کو اس نے وقت کی بساط پر مات دی تھی اب بھی دے سکتی ہے ۔

عورت کے پیش نظر صرف ایک پیغام تھا ۔ وہ چاہتی تھی کہ پیغام کی ایک تصویر بن جائے ۔ تاکہ بادشاہ رنگوں اور خطوں کی خوبصورتی میں امتیاز پیدا کر سکے ۔ وہ ایک لمحہ چپ رہی اور دھیمی آواز میں بولی " اہل کمال کو شاہوں کے قرب کی سخت ضرورت ہوتی ہے "۔ وہ بیتاب سی تھی ۔ شاید وہ کہنا چاہتی تھی کہ شہریار بھی اہل کمال کے محتاج ہیں ۔ اس کی آنکھیں گزری ہوئی یادوں سے مخمور تھیں ۔ بادشاہ بت بنا بیٹھا تھا ۔ گویا اس میں احساس کا نشان تک نہ تھا ۔ اس میں اس بات کے اظہار کی بھی طاقت نہ تھی کہ یہ وقت اس کے آرام کا وقت تھا ۔ مطربہ نے کسی بہت بڑے جذبہ کی یاد میں اپنے دونوں ہاتھ زمین پر ٹیک دئے اور آنکھیں بادشاہ پر جما دیں ۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ جو کچھ وہ کہنا چاہتی ہے اگر وہ کہہ سکی تو اسکا مقصد اسے حاصل ہو جائیگا ۔ وہ بولی اے بادشاہ بخشش کا اظہار شخصیتوں پر ہے ۔ حکومتوں کی دولت مزدور کا سرمایہ ہے وہ اسی سے دنیا کی ہر مادی شئے پر قادر ہیں ۔ تو خوش ہو کہ دنیا تیری ضیا سے روشن ہے وہ تیرے خوش ہونے سے خوش ہے لیکن اے بادشاہ کسی کو شریک غم نہ بنا کیونکہ غم اور فکر نعمت ہیں جو انسان کو پختہ تر بنا دیتے ہیں ۔ میں ایک مطربہ ہوں ۔ میں نے سوز و ساز کی تصویریں کھینچی ہیں ۔ میں نے ان میں رنگ بھرے ہیں اور جب چاہا اور جس طرح چاہا ان کو بدل دیا ہے ۔ میں نے دنیا کو ایک سرمدی سرور بخشا تھا میں مطمئن ہوں کہ میں نے جو کچھ کیا بڑی دیانتداری سے کیا ۔ اے بادشاہ میں ایک بہت بڑی طاقت ہوں ۔ میں نے بڑے بڑے حکمرانوں اور باکمالوں کو ان آنکھوں کے سامنے اور کا اور ہوتے دیکھا ہے ۔ ایک آرزو جو محبت کی صورت اختیار کر لیتی ہے کسی کی محکوم نہیں یہانتک کہ جس کے اندر وہ پیدا ہوتی ہے اس پر بھی حکومت کرنے لگتی ہے ۔ اے بادشاہ تو جانتا ہے محبت نے جنت کا راز بھی افشا کر دیا تھا ۔ محبت کا حسین ترین لباس آنسو ہیں اور آنسو عورت کا شیوہ ۔ تو یقین جان کہ عورت ہی محبت کرنا جانتی ہے ۔ اے بادشاہ میں نے بھی محبت کی ہے ۔ اور اپنے آپ کو کسی طاقت کے سامنے لرزتے اور بے دست و پا ہوتے دیکھا ہے ۔ " ضحا " ملک کا بہترین سپاہی بعلصورا کی محفلوں کی رونق یہاں کا ذرہ ذرہ اس کی محبت کا دم بھرتا ہے ۔ میری حیات و ممات اس کی خوشنودی پر موقوف تھی ۔

بعلصورا کی تہذیب نے جب دنیا بھر کو اپنے اثر میں لے لیا اور اس کے اخلاق اور ثروت نے دلوں پر تسلط حاصل کر لیا تو

کچھ ایسے لوگ اس کی طرف متوجہ ہوئے جن کی پیشانی کے خط بعلصورا کی عالمگیر شہرت نے بدل ڈالے تھے۔ ان دنوں بعلصورا کی یہ حالت تھی کہ بوڑھے سینے ابھارے گردنیں اٹھائے جوانوں کی طرح سیدھے چلتے تھے اور نوجوان بوڑھوں کی طرح نشاط اور گوناگوں لذتوں سے سرشار لڑکھڑاتے نظر آتے تھے۔ اے بادشاہ تو ان کا وارث ہے لیکن وہ تجھ سے بہت مختلف تھے۔ ترے اوصاف تیرے ہی ہیں۔ تو خیرات دینا جانتا ہے مگر خیرات لینے والوں کے احساس سے ذرا واقف نہیں۔ وہ تخلیق اور تکمیل کے ماہر تھے ہم ان کی نقل کرنا بھی بھول گئے ہیں۔ میں غنی ہوں اور میرا دل ایک غیر معمولی دل ہے۔ وہ دولت جو مجھے قدرت کی طرف سے ودیعت ہوئی تھی میں نے شاہ وگدا پر نچھاور کر دی ہے . . . . اے بادشاہ مجھے کیا کہنا تھا اور میں کیا کہ رہی ہوں۔ میں یہ کہنا چاہتی تھی کہ میں اپنی دولت لٹا چکی ہوں۔ میں مفلس ہوں میں پھر ایک بار بادشاہ نعمان کے صحن میں بیٹھی نظر آ رہی ہوں اور اس لئے آئی ہوں کہ گذشتہ یادوں کو تازہ کروں اور ان لمحوں کی طاقت پھر اپنے دل کے اندر محسوس کروں۔ جب ہمارے بوڑھے بادشاہ یعنی تیرے پیش رو کے خون نے جسم میں جوش مار کر جذبات کو مشتعل کیا تھا اور کس طرح میں نے سپاہیوں کے دلوں میں الفاظ اور آواز کے طلسم سے حیات اور اس کے مقصد کو جو کبھی فنا نہیں ہوتا بجلی کی طرح بھر دیا تھا۔ یہاں کا ذرہ ذرہ میرا دیکھا ہوا ہے وہ مجھے جانتا ہے اور میرا ممنون احسان ہے ـــ اے بادشاہ جب بعلصورا کے دشمنوں نے بوڑھے بادشاہ کی امیدوں کو غم و غصہ سے بدل دیا تو میرے نغموں نے۔ ان نغموں نے جو صحرا نوردوں نے اپنی جستجوؤں کو زندہ رکھنے کے لئے بنائے تھے۔ بوڑھے بادشاہ کو جواں سال بنا دیا۔ اے بادشاہ میں دیوانی نہیں۔ میں عقل سلیم رکھتی ہوں۔ میں اپنے حقوق کی پامالی کا ذکر کرنے نہیں آئی میں ان اوصاف کا ذکر کرنے آئی ہوں جن پر بعلصورا کے بسنے والوں کی زندگی کا انحصار تھا۔ مجھے تو صرف یہی کہنا ہے کہ میں مطربہ ہوں اور آپ بادشاہ تو بادشاہ ہے۔ موسیقی میری آنکھوں سے آنسوؤں کی صورت میں ظاہر نہ ہوگی۔ مجھ میں اب کچھ باقی نہیں۔ میرے نغمے میرے ساتھ نہیں۔ لیکن یاد رکھ میں بعلصورا کی مٹی سے بنائی گئی ہوں اگر جذبات کا اظہار انسان کی تصویر ہے تو وہ تصویر میں ہوں۔ کاش میری زبان کچھ کہ سکے اور میں کہوں کہ صخا ایک بہت بڑا مجاہد تھا اس نے اپنی بہادری سے ملک کے دشمنوں کا خاتمہ کر دیا تھا۔ خاموشی اس کی عادت تھی لیکن اس کے عمل اس کی طاقت تھے۔ جب اس نے دیکھا کہ بوڑھا بادشاہ رحمتوں کا سرچشمہ دشمنوں کی یورش محسوس کرتا ہے تو اس کی رگوں میں جوش عقیدت اور ملک کی محبت بیدار ہوئی۔ اس نے اپنے آپ کو پیش کیا اور بادشاہ سے کہا "اے بعلصورا کی قسمت کے مالک اس جنگ میں دشمن ذلیل ہو گئے اور پھر ان کی نسلوں میں سے کوئی اس طرف آنے کا نام بھی نہ لیگا۔ میں اور ملک کے سارے نوجوان تیرے قدموں پر نثار ہیں"۔ بوڑھے بادشاہ کا دل بھر آیا اس نے ان کی سلامتی کی دعا کی اور ان کی خدمات اور عقیدت کا اعتراف کیا اور کہا "اے میرے بچو میں نعمان کا وارث ہوں میں بادشاہت کے فرائض کو پہچانتا ہوں۔ مجھے سب کچھ معلوم ہے۔ تم سپاہی ہو میں بھی ایک سپاہی ہوں"۔ بادشاہ کا دل جوانی کی سی امنگوں سے سرشار وراثت کی ذمہ داریوں کی طرف کشاں کشاں جا رہا تھا۔ اس نے نوجوانوں کو مخاطب کر کے کہا "میرے بالوں کی سفیدی میرے اندرونی جذبات پر پردہ ڈالنے کی انتہائی کوشش کر رہی ہے مگر میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ بادشاہ کے الفاظ قدرت کا فیصلہ ہوتے ہیں۔ یاد رکھو غالب اور فاتح قوموں کے ساتھ ہمیشہ نفرت کا اظہار کیا جاتا ہے۔ مغلوب اور مفتوح قوموں کا شیوہ ہے کہ وہ زندہ قوموں کی برکات اور احسانوں کو اپنے کمزور اور دریدہ دامنوں سے چھپانے کی کوشش کریں۔ تہذیبوں اور قوموں کو بنانے کے لئے محض دماغی نشو و نما ضروری نہیں یہاں بسا اوقات

دماغی توازن شکست کا مترادف ہوتا ہے۔ اس نے بہت سی لڑائیوں کا ذکر کیا جن میں وہ ایک سپاہی کی حیثیت سے لڑا تھا۔ اس نے کہا میدان جنگ بادشاہ کا طالب ہے وہ میدان جنگ نہیں جس میں بادشاہ اپنے جاں نثاروں کے دوش بدوش نہ لڑے۔ اس نے حارث بن احمر کا ذکر کیا جس نے اپنی قوم کو جنگ اور دشمنوں پر فتح حاصل کرنے کا سبق دیا تھا اور جس نے جان بوجھ کر اپنے سپاہیوں کو خطرات میں ڈال کر خطرات سے بچنے کا طریقہ سکھا دیا تھا۔ اس نے ابن حسام کا ذکر کیا جس نے اس سلطنت کی بنیاد رکھی تھی اس کے احکام پڑھ کر سنائے۔ اس نے کچھ اس طرح بادشاہوں اور مجاہدوں کے پیغام کی ترجمانی کی کہ دربار میں سب پر ایک سکتے کا عالم طاری تھا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ تہذیب نے ہمیشہ جہالت پر فتح حاصل کی ہے۔ تم اپنے اصول سے ہرگز ہرگز سرمو تجاوز نہ کرو۔ کیونکہ انسانوں کی موت کی یہی ایک سیاہ وجہ ہے پھر اس نے صفا اور اس کے نوجوانوں کو مخاطب کیا اور کہا گو تمہارا بادشاہ بہت بوڑھا ہو گیا ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ وہ خطرات میں ہے۔ مگر یاد رکھو وہ ابھی زندہ ہے۔ وہ ایک بادشاہ کا وارث بادشاہ ہے۔ وہ جنگ میں جائیگا اور ان لوگوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھیگا جو اس کی زندگی اور دنیا میں خطرہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ان سے انتقام لینے کی کوشش کریگا۔ جنہوں نے اس کے بچوں اور ان بچوں کی ماؤں کے خون کو ارزاں کرنے کی ٹھان رکھی ہے تم دیکھو گے کہ جام شہادت ایک بوڑھے انسان کے لئے کس قدر خوشگوار شے ہے۔ جہانگیری و جہانداری زندگی سے نہیں نام سے ہے مسند پر بیٹھے ہوئے بوڑھے بادشاہ کو تمہارے پیغام کا انتظار زندہ درگور کر دیگا۔ ہم سب جنگ کو چلینگے۔ جب میں تم جیسے وفاداروں کی گود میں لڑتے لڑتے دم توڑ دونگا۔ اس وقت میرا چہرہ لافانی نور کی روشنی سے چمک رہا ہوگا۔"

پھر لے بادشاہ اس مسند سے جہاں تو بیٹھا ستا رہا ہے ہمارا بوڑھا بادشاہ ایک جفاکش سپاہی کی طرح اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اپنے سپاہیوں کے ساتھ جنگ پر جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ بادشاہ نے کہا ہم کو زندگی کے ان مراحل سے گذرنا ہے اور ان حوادث کا مقابلہ کرنا ہے جو ملک کو پہلے پیش نہ آئے تھے۔ پھر اس نے مجھ سے ایک گانا گانے کی فرمائش کی۔ میں نے ابوسعید کی ایک نظم پڑھی۔ مجھے یاد ہے میں نے نظم کا ایک ایک شعر کئی کئی بار دہرایا تھا۔ خصوصیت سے یہ الفاظ کہ "جاؤ۔ سدھارو۔ فتوحات تمہارا انتظار کر رہی ہیں"۔ یہاں تک کہ بربط میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا یقین جانو اسے بادشاہ تمام بعلصور ایک زبان ہو کر کہہ رہا تھا۔ "جاؤ سدھارو۔ فتوحات تمہارا انتظار کر رہی ہیں"۔

بادشاہ نے کہا میری تلوار لاؤ جو آج حق کی حمایت کے لئے کمر میں آویزاں کی جائیگی جس کو امانت کے طور پر میرے آباؤ اجداد نے مجھے سونپا تھا۔ بادشاہ کا چہرہ نور کی طرح روشن تھا اس نے کہا میں اپنا تاج اس وقت تک نہ پہنونگا جب تک وہ بالکل محفوظ نہ ہو جائے اس کی آنکھوں میں استقلال اور مستقبل کی جھلک نمایاں تھی۔ پھر وہ تخت سے نیچے اتر آیا اور کہا یہ تخت فاتحوں کے لئے ہے۔ اس پر وہ بیٹھ سکتا ہے جو فتحیاب ہو۔ اس کا جسم جذبات کی شدت کی وجہ سے الہام کی نازک ساعتوں کی طرح سکڑ گیا۔ وہ لرز رہا تھا۔ انسانوں کا یہ عالم تھا کہ ہماری پُر نم آنکھوں کے سامنے ایک بحر بیکراں موجیں مار رہا تھا۔ پھر بادشاہ نے سب کو مخاطب کر کے کہا۔ ہم اپنی تلواروں کو حق کی راہ میں استعمال کرینگے ہم اپنے بچوں اور عورتوں کی حفاظت کرینگے۔ ہم قوانین قدرت کو مستحکم کرنا چاہتے ہیں"۔ نغموں کا تموج اور ساحرانہ نگاہیں بیقرار روحوں کے درمیان لرز رہی تھیں۔ صوفیا کے نقش و نگار فانوسوں کی رنگ برنگ کی روشنیوں سے جگمگا رہے تھے ایوان میں جوش کی لہریں بلند ہو رہی تھیں۔ گلاب پاشوں کی جھنکار جل ترنگ کی ہم آہنگی پیدا کر رہی تھی بچے اور بڑی بوڑھی عورتیں اوڑھنیاں ہلا ہلا کر اپنے ناموس کی حفاظت

انشان بلند کر رہی تھیں۔ بادشاہ نے کہا ہماری عورتیں سپاہیوں کی درتیں ہیں۔ سپاہی جنگ پر جائینگے عورتیں ملک کی حفاظت کرینگی۔ پھر ہر مجاہد کمر میں تلوار لگاکر باری باری اپنے بادشاہ کے سامنے سے گزرا اور آخر کار۔ آہ میں کیسے بتاؤں کہ کس طرح بوڑھا بادشاہ ایک سپاہی کی حیثیت سے بعلصورا کی وادیوں میں سے گزرا۔ اے بادشاہ اس سے پہلے بعلصورا نے کبھی اپنے لبوں پر ایسی خاموشی نہ دیکھی تھی۔

ایک احساس ہے جس سے میں ایک شعلہ کی طرح جل رہی ہوں میں بارہ دری میں کھڑی تھی۔ بیگمات اور شہزادیاں مجھے محبت سے دیکھ رہی تھیں۔ صوفیا عروس نو بنا ہوا تھا۔ بادشاہ نے میری پیشانی پر بوسہ دیا۔ وہ کس قدر ناقابل بیان گھڑی تھی جب وہ پرشکوہ بادشاہ اپنے نوجوانوں کے درمیان بلند حوصلگی اور شوکت شاہی کے ساتھ آہستہ آہستہ وادی سے دور پہاڑوں کے دامنوں میں ہماری آنکھوں سے اوجھل ہوگیا۔

زیادہ دن نہ گذرے تھے کہ ملک میں فتح و نصرت کی خبریں پھیل گئیں۔ وقت اپنی یاد کس طرح چھوڑ جاتا ہے۔ ملک کے بچے اور ان کی مائیں اپنے فاتح سپاہیوں کی راہ دیکھ رہی تھیں۔ اے بادشاہ وہ مجاہد جنہوں نے تیرے دشمنوں کو شکستیں دی تھیں بوڑھے بادشاہ کی سلامتی اور فتح و نصرت کی آوازیں بلند کرتے ہوئے اپنی روانگی کے وقت سے بھی زیادہ شان اور وقار سے واپس آئے۔ ہم نے انہیں اسی راہ سے آتے دیکھا تھا جس راہ سے وہ رخصت ہوئے تھے۔ اے بادشاہ ضحا کا غیر فانی نام سپاہیوں کی واپسی سے پہلے ہی ملک کے بچے بچے کی زبان پر تھا۔ میں اس وقت کی تصویر نہیں کھینچ سکتی جب ضحا اپنے بادشاہ کی خوشنودی اور مبارکبادیں حاصل کرکے فتحمند فوج کا مرکز بن کے واپس آیا۔ اگر میں اس وقت کی تصویر کھینچنے کی کوشش کروں تو مجھے ڈر ہے کہ میں خوشی سے مرجاؤنگی اور تو اس پیغام سے محروم رہ جائیگا جو میں تجھے اس آڑے وقت میں پہنچانے کے لئے آئی ہوں۔ ہاں تو جب فتحمند بادشاہ اپنے فاتح سپاہیوں کے ساتھ بعلصورا کو لوٹا تو فتح و نصرت کی مسرتیں صوفیا کے ایوانوں میں ایک نئی زندگی کے ساتھ چل پھر رہی تھیں۔ اس وقت بادشاہ نے اس تلوار کو جسے تیرے آباؤ اجداد نے حق کے استحکام کی خاطر بار بار جنگوں میں استعمال کیا تھا تمام رعیت کے سامنے اپنی کمر سے اتار کر ضحا کی کمر میں باندھ دیا اور کہا "یہ تیرے لائق ہے اور تو اس کا اہل ہے"۔ بادشاہ کی طرف سے وہ نایاب تلوار ضحا کے لئے اس کی شجاعت اور مردانگی کا تحفہ تھا۔

اے بادشاہ ایک راز جو میرے اور ضحا کے سینے میں برسوں سے پوشیدہ چلا آتا تھا۔ بادشاہ اس راز سے باخبر تھا۔ اس دن اس نے بھری محفل میں ہمارے راز کو فاش کر دیا۔ اور مجھے ایک نعمت غیر مترقبہ کہ کر ضحا کو دے ڈالا۔ اگرچہ بادشاہ مجھے ایک گھڑی کے لئے بھی اپنے دربار سے جدا نہ کرسکتا تھا۔ لیکن اے بادشاہ وہ ہماری محبت سے باخبر ہمارے جذبات کے متعلق سب کچھ جانتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ محبت خودسر دولت کی طرح اندھی ہوتی ہے۔ اس کی آنکھیں اتھاہ سمندروں سے عمیق فقرا اور شاہوں کی آنکھوں سے بھی روشن تر ہوتی ہیں ــــ اے بادشاہ میں اور ضحا اس چار دیواری کو اس صحن کو اس صوفیا کو جس کے اندر میں پھر ایک بار بیٹھی ہوئی نظر آرہی ہوں ہمیشہ کے لئے چھوڑ گئے۔ ہم نے اپنے رہنے کے لئے ایک نئی جنت آباد کی تھی۔ اس جنت ارضی میں ہم برسوں رہے ہیں۔ اور اس میں ہم نے اپنی زندگی کے بہترین ایام گذارے ہیں۔

اے بادشاہ وہ تلوار میں آج اپنے ساتھ لائی ہوں۔ یہ سرخ لبادہ میں لپٹی ہوئی وہ تلوار ہے۔ جو مرحوم بادشاہ نے ضحا کو اپنی بہترین یادگار کے طور پر دی تھی۔ آہ اس کا مالک! اے بادشاہ اس کا مالک ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگیا ہے۔ اے بادشاہ اب اسے وہ زندگی حاصل ہوگئی ہے جو کبھی ختم نہ ہوگی۔ وہ اس جگہ چلا گیا ہے جہاں سے وہ کبھی

واپس نہ آئیگا"۔

عورت کے آنسو بہ نکلے۔ وہ بالکل بدل گئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ اس کی طاقت بیان سلب ہو چکی ہے۔ وہ صرف اتنا کہ سکی" اے بادشاہ سب اوصاف کھوئے جا چکے ہیں۔ تمام امیدیں مٹ چکی ہیں۔ آنکھیں ابھی تک ترستی ہیں۔ اگرچہ قصہ بہت طویل ہے۔ مگر میں اپنے آپ کو اپنے جذبات کے اظہار کے ناقابل پاتی ہوں۔ ہاں یہ ایک امانت ہے۔ تجھے اس کی ضرورت ہے۔ تو ہی اس کا وارث اور مالک ہے۔ یہ لے۔ میں اسے تیرے حوالے کرتی ہوں۔

بادشاہ ابن خلدون' ابن حسام کے وارث کی آنکھوں میں ا
غیر معمولی روشنی چمکتی ہوئی دکھائی دی۔ اس کی نظریں بوڑھے ر
کی طرف اٹھ گئیں۔ بوڑھے سردار کی آنکھوں میں ایک عنابی آ
ہچکیاں لے رہا تھا۔ اس نے بڑھاپے کی دانائی اور مسرت
نمایاں کرتے ہوئے بادشاہ کی طرف دیکھا اور کہا" اے بادر
وہ میرا بیٹا تھا"۔

رحمٰن چغتائی

"نگار خانۂ چین"

تین دوست

شراب کی صراحی لے کر میں باغ کے ایک الگ تھلگ گوشے میں پینے جاتا ہوں۔ ہم ہمیشہ تین بس تین ہی ہوتے ہیں۔ میں۔ میرا سایہ۔ اور میرا دوست روپہلی کرنوں والا چاند۔ خوش قسمتی سے چاند کو پینے پلانے کے لطف کا کچھ علم نہیں۔ اور میرا سایہ کبھی تشنہ نہیں ہوا۔

جب میں گاتا ہوں۔ چاند خاموشی سے میرا گیت سنتا ہے۔ جب میں ناچتا ہوں۔ میرا سایہ بھی میرے ساتھ رقص کرتا ہے۔

محفل نشاط کے برخاست ہونے پر دوست بچھڑ جاتے ہیں لیکن ایسا حسرت انگیز نظارہ میرے دیکھنے میں نہیں آیا۔ جب میں جھومتا جھامتا گھر لوٹتا ہوں۔ تو چاند میرے ہمراہ چلتا ہے۔ اور میرا سایہ بھی لڑکھڑاتا ہوا میرے پیچھے پیچھے آتا ہے۔

غلام عباس

آسکر وائلڈ

محبوبہ سے درخواست

(خیامِ فرنگ کی شراب اردو کے شیشے میں)

مترجم عبدالمجید سالک

نہیں نہیں آ ! ہم ایک آگ سے دوسری آگ میں جا پڑیں !
دردِ عاشقی کی اقلیم سے نکلیں اور مہلک تر عشرت کے دیار میں پہنچ جائیں !
میں ابھی نوجوان ہوں۔ آرزو کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ تو ابھی نوخیز ہے۔ موسمِ گرما کی اس رات کو رائگاں نہ جانے دے۔ اور وہ فضول سوالات نہ پوچھ۔ جو پرانے زمانے میں لوگ پیغمبروں اور کاہنوں سے پوچھا کرتے تھے۔ اور جن کا کوئی جواب نہ ملتا تھا !

کیونکہ اے میری جان ! محسوس کرنا جاننے سے بہتر ہے۔ اور دانش ایک لاوارث ترکہ ہے !
نبضِ آرزو کی ایک حرکت ــــــ شعلۂ شباب کی پہلی لپک داناؤں کی تمام جمع کی ہوئی کماؤتوں سے بھی زیادہ بیش بہا ہے۔
اپنی روح کو مردہ فلسفے سے گرانبار نہ کر۔ جب تک ہمارے پاس چومنے کے لئے لب محبت کرنے کے لئے دل اور دیکھنے کے لئے آنکھیں موجود ہیں !

اے میری پیاری۔ کیا تو نہیں سنتی۔ کہ بلبل یوں زمزمہ پیرا ہے جس طرح

کسی نقرئی مرتبان سے پانی اچھل اچھل کر بہ رہا ہو۔ بلبل کا نغمہ نہایت دھیما ہے !
چاند آسمان پر بیٹھا ہوا اپنی دوری اور بلندی پر زہر کھا رہا ہے۔ وہ عندلیب کا عشق افروز نغمہ نہیں سن سکتا۔ اور پیچ و تاب کے عالم میں کہرے کے نقاب کے اندر منہ چھپا رہا ہے !

یہ سوسن کے پھول جن کی کٹوریوں میں شہد کی سنہری مکھیاں خواب دیکھ رہی ہیں !
تیز ہوا بلوط کے شگوفوں کو بکھیر کر ان کی پتیوں کو برف کی طرح گرا رہی ہے۔
پانی میں نوجوانی کے اعضا کا عکس نظر افروزی کر رہا ہے۔ کیا یہ مناظر تیرے لئے کافی نہیں ہیں۔ کیا تو کچھ ان سے بھی زیادہ چاہتی ہے؟
افسوس! اس سے زیادہ تو ہمارے خدا بھی تجھے اپنے جاودانی خزانوں سے کچھ عطا نہیں کر سکتے

کیونکہ ہمارے بلند مرتبت خدا اب ہمارے مسلسل اور پیہم گناہوں سے تھک چکے ہیں۔ ہم تکلیفوں۔ دعاؤں اور دینی پیشواؤں کی مدد سے جوانی کے رائگاں ایام کا کفارہ ادا کرنے کی بے سود کوشش کرتے ہیں۔ ہمارے خدا ہماری ان کوششوں سے بھی بیزار ہو چکے ہیں !
اب وہ نیکی اور بدی کی طرف بالکل التفات نہیں کرتے۔ اور جب چاہتے ہیں۔ انصاف پسند اور بے انصاف دونوں پر اپنی باران رحمت برسا دیتے ہیں۔

اب ہمارے خدا چین سے بیٹھے ہیں۔ وہ اپنی معطر شراب میں گلاب کی پتیاں بکھیرے آرام کر رہے ہیں۔ وہ لہلہاتے ہوئے درختوں کے نیچے محو خواب ہیں۔ جہاں گلاب اور زرد کنول ایک دوسرے سے بغلگیر ہو رہے ہیں۔

ہمارے خدا ان مسرت آمیز ایام کا ماتم کر رہے ہیں - جب وہ نہیں جانتے تھے - کہ انسان کا دل کیسی کیسی برائیوں کے خواب دیکھ سکتا ہے !

آہ ! ہم گنہگاری کے احساس سے تھک چکے ہیں
ہم عشرت کے یاس آفرین انجام سے تھک چکے ہیں -
ہم ہر اس عبادت گاہ سے بیزار ہو چکے ہیں جو ہم نے بنائی
ہم ان دعاؤں سے تھک چکے ہیں - جو جائز تھیں - لیکن ان کا کوئی جواب نہ ملا -
کیونکہ انسان کمزور ہے ! خدا سو رہا ہے ! اور آسمان دور ہے !
اب کیا مطلوب ہے ؟ ایک لمحۂ آتش رنگ ! ایک عظیم الشان عشق ! اور بس - پھر موت اور صرف موت !

یہ گرم اور تابناک شعلہ جس سے ہمارے جسم جل رہے ہیں - کسی نہ کسی مرغزار کو نرگس کے پھولوں سے لالہ زار بنا دیگا - اور ہاں تیری نقرئی چھاتیاں کنول کے پھول بن جائیں گی -
جن کھیتوں میں کسان کاشت کر رہے ہیں - وہ ہماری آج رات کی محبت کے باعث زیادہ سیر حاصل اور زرخیز ہو جائینگے -
فطرت کے کارخانے میں کوئی چیز ضائع نہیں ہوتی - بلکہ ہر شے موت کے علی الرغم زندہ رہتی ہے !

نوجوان کا پہلا بوسہ ! سنبل کی پہلی کونپل ! انسان کی آخری آرزو ! اور وہ آخری سرخ "نیزہ" جو سوسن کے پھول سے نکلتا ہے - نسترن کا پھول جو اپنے غنچوں کو محض اس خوف سے کھلنے نہیں دیتا - کہ وہ حد سے زیادہ حسین ہونگے - اور عاشق کی نگاہوں کے سامنے دولھا کا شرم و حجاب

یہ سب ایک ہی مقدس بندھن میں گرفتار ہیں۔ تمنائیں صرف ہم ہی کو نہیں دی گئیں۔ بلکہ ساری دھرتی انہیں سے معمور ہے۔ وہ زرد پھول جو نور کے تڑکے جوشِ سرور میں جھومتا ہے اسی حقیقی مسرت سے سرشار ہوتا ہے۔ جو ہمیں اُس وقت نصیب ہوتی ہے۔ جب ہم کسی نظر فریب گلزار میں چشموں کی روانی سے مخمور ہو جاتے ہیں۔ اور ہمیں زندگی حسین تر نظر آنے لگتی ہے۔

پس جب لوگ ہمیں بید مجنوں کے نیچے دفن کر دینگے۔ تو میری جان! تیرے سرخی آلود ہونٹ گلاب کا پھول بن جائینگے۔ تیری دلنواز آنکھیں گل نافرمان بن جائینگی۔ جن پر شبنم کے قطرے جھلک رہے ہونگے۔ اور جب سفید نرگس شوخی سے اپنی بھولی نسیم کے بوسے لے گی۔ تو ہماری خاک کے ذروں میں پھر محبت کی کلکنی پیدا ہوگی۔ اور ہم پھر ساجن اور موہنی بن جائینگے۔

اور پھر اس طرح زندگی کے کرب آفرین احساس درد سے آزاد رہ کر ہم کسی پیارے پھول کے اندر آفتاب کی تمازت کو محسوس کرینگے۔ خوش گلو قمری کی آواز میں پھر گائینگے۔ پھر وہ چتکبرے سانپوں کی طرح اپنی قبروں پر لہراتے پھرینگے۔ یا وہ چیتوں کی طرح اس گرم جنگل میں سے رینگتے ہوئے گزرینگے۔ جس میں زرد آنکھوں والے ہولناک شیر برسو رہے ہونگے۔

اور پھر ان میں اور ہم میں جنگ ہوگی! آہ! میرا دل موت کے بعد اس شاندار زندگی کے تصور سے جو درندوں۔ پرندوں اور پھولوں میں بسر کی جائیگی۔ کس قدر اچھل رہا ہے اور جب یہ پیمانہ شراب سے اس قدر لبریز ہو جائیگا۔ کہ سانس لینے کے لیئے پھٹ پڑیگا۔ اور فصل خزاں کے کسی دن زرد پتوں کے درمیان روح جو اس دھرتی کی پہلی فاتح تھی اس کا آخری شکار بن جائیگی۔

ہاں! اگر ہم دونوں کے درمیان محبت نہ ہوئی ہوتی۔ تو کون جانتا ہے۔ کہ سورج مکھی کا پھول بھونرے کو مسرور کر کے اپنے سنہری شکم میں چھپا لیتا۔ یا گلاب کا کوئی پھول اپنے چھوٹے سے پودے میں آتشیں چراغ آویزاں کر سکتا میرا تو یہ خیال ہے۔ کہ اگر عشاق کے بوسہ دینے والے لب اور شاعروں کے گانے والے ہونٹ نہ ہوتے۔ تو فصل بہار میں کسی درخت پر کوئی کونپل تک نہ پھوٹتی۔

اگر ہم فطرت کی دولت کے وارث ہیں اور ہمارے دل نبض حیات کی ہر حرکت کے ساتھ دھڑک رہے ہیں۔ تو کیا اس سے ہمارے طلائی آفتاب کا نور معدوم ہو جائے گا؟ یا یہ پُراسرار زمین کچھ پہلے سے کم خوبصورت ہو جائیگی۔ نہیں! بلکہ آسمان پر سے نئے آفتاب گزرینگے۔ پھول کو نئی شان و شوکت دی جائیگی اور سبزہ نئی آن بان سے لہرائیگا۔

اور ہم دونوں عاشق و معشوق دور بیٹھ کر فطرت پر نکتہ چینی نہیں کرینگے بلکہ مسرور و سرشار سمندر ہماری پوشاک بنے گا۔ اور دمدار ستارے ہماری مرضی کے مطابق ناوک افگنی کیا کرینگے اور پھر ہم اس عظیم الشان آفاق کا ایک جزو بن جائینگے۔ اور ہزارہا صدیوں تک "روح کائنات" سے ہمارا اختلاط رہیگا۔

ہم اُس عالمگیر راگ کی تانیں بن جائیں گے۔ جس کے زیر و بم نے اجرام آسمانی کے سرود رفتار پر احاطہ کر رکھا ہے۔ اور ساری دنیائے حیات کے دل کی دھڑکن ہمارے دلوں کی حرکت سے ہم آہنگ ہو جائیگی۔ وہاں گزرتے ہوئے سالوں اور مہینوں کی دہشت انگیزی بے نشان ہو چکی ہوگی۔ ہم موت کی دستبرد سے آزاد ہونگے۔ اور یہ کائنات خود ہی ہماری جاودانی حیات بن جائیگی۔

عبدالمجید سالک

تاثیر

عورت کی محبّت

تو نے الفت مجھ سے کرنی ہے تو کر میرے لئے
وقف کر دے اپنا دل اپنا جگر میرے لئے

مجھ سے الفت تو نہ کر میرے تبسّم کے لئے
لرزشِ لب کے لئے طرزِ تکلّم کے لئے

چار دن کی چاندنی ہے یہ جوانی کچھ نہیں
کچھ نہیں ہے کچھ نہیں ہے حسنِ فانی کچھ نہیں

یہ مرا جوبن تو رفتہ رفتہ ڈھلتا جائے گا
تیرا دل بھی ساتھ ساتھ اس کے بدلتا جائیگا

تو نے الفت مجھ سے کرنی ہے تو کر میرے لئے
وقف کر دے اپنا دل اپنا جگر میرے لئے

مجھ سے الفت غمگساری کے لئے بھی تو نہ کر
دردمندی سوگواری کے لئے بھی تو نہ کر

آنسوؤں کو میرے رخساروں پہ ڈھلتا تو نہ دیکھ
سوزشِ غم سے مرے سینے کو جلتا تو نہ دیکھ

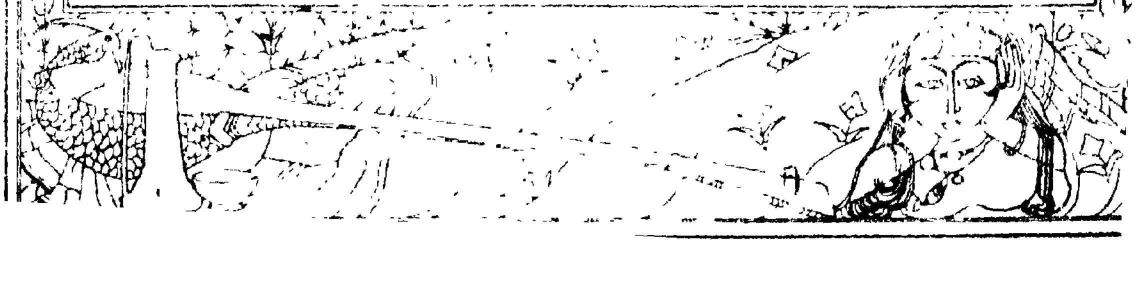
برگِ گل پر قطرۂ شبنم رہے گا کب تلک
آکے پہلو میں تمہارے غم رہیگا کب تلک

خشک ہو جائیگا میرا دیدۂ پُر آب جب
پُرسکوں ہو جائیگا میرا دلِ بیتاب جب

جب تری الفت کا سرچشمہ فنا ہو جائے گا
آنسوؤں کی طرح تو بھی بے وفا ہو جائے گا

تو نے الفت مجھ سے کرنی ہے تو کر میرے لئے
وقف کر دے اپنا دل اپنا جگر میرے لئے

محمد دین تاثیر



تپش

کلامِ تپش

تمہارا منتظر ہوں موت کا پیغام آنے تک
یہی اک آسرا ہے زندگی کا شام ہونے تک

بہارِ گُل ہوائے آشیاں نغماتِ آزادی
یہ افسانے ہیں سب بلبل کے زیرِ دام آنے تک

جمودِ گم شدہ کی جستجو اچھی نہیں ہمدم!
ہوائے کاروانِ گردشِ ایام آنے تک

نہ دی اشکوں نے مشتِ خاک کو پرواز کی رخصت
تمہارے نقشِ پا کا میرے سر الزام آنے تک

کریں گے نرگسِ مخمورِ ساقی سے اشارے بھی!
اگر باقی رہے کچھ ہوش اپنے جام آنے تک

تمہاری خودنمائی اللہ اللہ اک تماشا ہے
تصور دل میں رہتا ہے زباں پہ نام آنے تک

جفائیں ان کا شیوہ ہیں وفاؤں کا ہوں میں خوگر!
کئے جائیں وہ اپنا کام میرے کام آنے تک

بدل جائیگی کیفیت جو وضعِ زندگی بدلی!
مری تردامنی ہے جامۂ احرام آنے تک

لبِ خاموش کا اپنے تحیّر ہم بھی دیکھینگے!
ترے دل میں خیالِ لذتِ دشنام آنے تک

کہاں ملتی ہے فرصت شکوۂ لبریز کی ساقی!
تری محفل سے آوازِ صلائے عام آنے تک

تپش رہنے دے مجھ کو بے نیازِ سجدۂ طاعت
جبیں ہیں میری نورِ فطرتِ اسلام آنے تک

شیخ عبداللطیف تپش

وحشت کلکتوی

غزل

دل جگر جب تنگ آ کر نالہ و زاری کریں
عشق میں ہم کیسے پھر دعوائے خودداری کریں

کیوں نصیبِ دشمناں دل اپنا وہ بھاری کریں
دوستوں پر شوق سے مشقِ جفا کاری کریں

دیر سے ہوں منتظر مشقِ نگاہِ یار کا
تا بکے اندوہ و غم دل پر گرانباری کریں

وضع پر رہتا ہے قائم کون، دیکھا چاہیئے
تم جفا کاری کرو اور ہم وفاداری کریں

یہ سمجھ رکھئے نہیں ہوگی دل آزاری مری
آپ چاہیں جس قدر میری دل آزاری کریں

کیا یہ ممکن ہے کہ غمخواری سے ہو غم کا علاج
کہہ دو اب احباب سے میری نہ غمخواری کریں

جو طریقہ آپ کا ہوگا وہ ہوگا دل نواز
آپ دلداری کریں یا خاطر آزاری کریں

وحشت اس محفل میں کیا انصاف اپنا ہو جہاں
سب انہیں کی سی کہیں اُن کی طرفداری کریں

خان بہادر رضا علی وحشت

منتخب اشعار

(۱) سر عبد القادر

(۲) خلیفہ عبد الحکیم

(۳) عبد المجید سالک

(۴) غلام رسول مہر

(۵) سید سلیمان ندوی

منتخب اشعار کا یہ مجموعہ یقیناً قارئین کاروان کی دلچسپی کا موجب ہوگا۔ لیکن یہ امر واضح کرنا ضروری ہے کہ یہ منتخب اشعار اردو زبان کے "بہترین" اشعار کے طور پر پیش نہیں کئے جا رہے۔ یہ وہ "اچھے" اشعار ہیں جو ان حضرات کو بہت پسند ہیں اور جو عام طور پر ان کی زبان پر رہتے ہیں یا بغیر کسی خاص کاوش کے ان کے ذہن میں آ گئے ہیں۔ اسی سلسلے میں سخنہائے گفتنی بھی ملاحظہ فرمایئے

سر عبدالقادر

پانچ پسندیدہ شعر

میرے دوست مجید ملک صاحب کی فرمائش ہے کہ رسالۂ کارواں میں اشاعت کے لئے اردو کے صرف پانچ شعر لکھ بھیجوں۔ جو مجھے بہت پسند ہوں۔ اساتذہ اردو کے کلام میں دلچسپ اشعار کی تعداد بیشمار ہے۔ اور ان میں سے صرف پانچ شعر پیش کرنا بہت مشکل کام ہے۔ سوائے اس کے کیا کر سکتا ہوں۔ کہ اچھے اشعار میں سے جو پہلے یاد آجائیں۔ پیش کر دوں۔

سب سے پہلے تبرکاً میرؔ کا ایک شعر لکھتا ہوں۔ کیونکہ وہ مسلمہ طور پر غزل اردو کے استاد مانے جاتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں ؎

شمع تک تو ہم نے بھی دیکھا کہ پروانہ گیا　　　پھر نہ دیکھا کچھ بجز یک شعلۂ پرپیچ و تاب

شمع اور پروانے کے مضمون پر بہت لوگوں نے طبع آزمائی کی ہے۔ مگر ایسا نازک اور واقعیت سے بھرا ہوا خیال پیدا نہیں ہوسکا۔ پروانے کے جل کر فنا ہونے کی تصویر اس سے بہتر کیا کھینچی جا سکتی ہے۔ کہ وہ خود شعلۂ پُرپیچ و تاب بن جائے۔ اور سوائے اس کے کچھ نظر نہ آئے۔ کہ پروانہ ابھی تھا اور ابھی گم ہوگیا۔ میں نے جب یہ شعر پہلی مرتبہ پڑھا تو مجھ پر اس کا بہت اثر ہوا۔ میں نے اپنے دوست مرزا اعجاز حسین مرحوم کو سنایا۔ وہ خود شاعر تھے اور اعلےٰ درجے کے سخن فہم۔ دیر تک اسے دہراتے رہے۔ اور وجد کرتے رہے۔

اردو شاعری کے عروج کا دوسرا دور وہ ہے جس میں غالبؔ اور مومنؔ اور ذوقؔ دہلی میں اور ناسخؔ اور آتشؔ لکھنؤ میں مصروفِ غزل گوئی تھے۔ اب ان میں سے کس کے کلام کو بطور نمونہ پیش کیا جائے۔ ایک کا رنگ ایک سے الگ اور سب اپنی اپنی جگہ لاجواب۔ چونکہ آج کل غالبؔ کی طرف زیادہ ترمیلان طبائع ہے۔ اس لئے غالبؔ کا شعر ہدیۂ ناظرین ہے ؎

مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ　　　آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد

دیکھئے کیسے پرلطف پیرائے میں حسابِ گنہ سے چھٹکارا پانے کی راہ نکالی ہے۔ اور قلبِ انسانی کی اندرونی کیفیات کی کیا خوب ترجمانی کی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ جہاں میں اپنی آرزوؤں کو پورا کرنے کے لئے کسی حکم کی خلاف ورزی کر کے کسی گناہ کا مرتکب ہوا ہوں۔ وہاں اس سے زیادہ آرزوئیں ہیں جو پوری نہیں ہوئیں اور ان کی حسرت ہی رہ گئی ہے۔ اور جب مجھ سے گناہوں کا حساب لیا جائے تو مجھے اپنی حسرتیں یاد آتی ہیں اور اگر یہ ملحوظ ہے کہ میں نے کہاں کہاں اپنے جذبات کو روکا ہے تو بجائے بازپرس کے میری حالت قابلِ رحم سمجھی جائیگی۔

غالبؔ کے زمانے کے بعد جن شعرا کو فروغ حاصل ہوا۔ ان میں داغؔ دہلوی اور امیرؔ مینائی نے سب سے زیادہ شہرت پائی ہے۔ اور اصلاحی اور جدید رنگ میں مولانا حالیؔ اور اکبرؔ الہ آبادی درجۂ اول کے سخنور ہوئے ہیں۔ سب کے کلام کے نمونے تو درج نہیں ہوسکتے۔ اس دور کے شعرا میں سے جسے ختم ہوئے ابھی تھوڑا عرصہ گزرا ہے۔ ایک شعر داغؔ کا اور ایک شعر اکبرؔ کا یہاں درج کرتا ہوں۔ داغؔ کی ایک مشہور غزل کا یہ مطلع

مجھے بیحد پسند ہے ؎

بھویں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں　　　کسی سے آج بگڑی ہے کہ وہ یوں بن کے بیٹھے ہیں

زبان کی خوبی الفاظ کی بندش اور محاورہ کی چستی ملاحظہ ہو۔ الفاظ میں تصویر کھینچنا اسی کو کہتے ہیں۔ مصور اگر ان لفظوں کو تصویر میں منتقل کرنا چاہے تو پورے نقش موجود ہیں۔ صرف رنگ بھرنے کی ضرورت ہے۔ امیر مینائی مرحوم نے خود اس زمین میں غزل لکھی اور اس کے مقطع میں بے اختیار داد دینے پر مجبور ہو گئے۔ فرماتے ہیں ؎

امیر اچھی غزل ہے داغ کی جس کا یہ مصرع ہے　　　بھویں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں

جدید رنگ میں اکبر کا کلام بہت نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے بہت سے شعر اکثر پڑھتا ہوں اور ہر دفعہ ان کے پڑھنے سے نیا لطف حاصل ہوتا ہے۔ یہ شعر جو نیچے درج ہے خاص طور پر دلچسپ ہے۔ اس میں ایک بڑی حقیقت کا اظہار ہے اور ان قوموں کے لئے جو اوج بلندی سے پستی کی طرف جا چکی ہوں یہ شعر ایک حوصلہ افزا پیام امید ہے۔ حضرت اکبر لکھتے ہیں ؎

اور بھی دور فلک ہیں ابھی آنے والے　　　ناز اتنا نہ کریں ہم کو مٹانے والے

یہ سب ادیبان بلند پایہ جن کے نام اوپر درج کئے گئے ہیں۔ ملک شاعری پر حکمرانی کے بعد اس دنیا سے رحلت کر گئے ہیں۔ جو قابل قدر سخنور خدا کے فضل سے اب تک ہمارے ملک میں موجود ہیں۔ ان میں حضرت اقبال (ڈاکٹر سر محمد اقبال بالقابہ) کا کلام مقبول خاص و عام ہے۔ ان کا ایک شعر پیش کرتا ہوں۔ جو غالباً ان کے اردو کلام کے مطبوعہ مجموعہ میں درج ہونے سے رہ گیا ہے۔ مگر اپنے رنگ میں بے مثل ہے۔ وہ شعر یہ ہے ؎

شب فرقت تصور تھا مرا۔ اعجاز تھا کیا تھا　　　تری تصویر کو میں نے بلایا ہے تو بولی ہے

مدت ہوئی یہ غزل لکھی گئی تھی۔ میں اس وقت موجود تھا۔ سیالکوٹ میں ایک تقریب میں ہم لوگ جمع تھے۔ مصرع طرح اسی وقت دیا گیا۔ اور جو شعر اس زمین میں نکلے وہ اسی وقت بعض دوستوں نے نقل کر لئے۔ یہ شعر مجھے بہت ہی دلچسپ معلوم ہوا تھا اور اس وقت سے میرے حافظے میں محفوظ ہے۔ تصویر سے باتیں تو بہت سے شاعروں نے کی ہیں۔ مگر خود تصویر کے بولنے کا ایسا اچھا ثبوت اور جگہ میری نظر سے نہیں گزرا۔

عبدالقادر

خلیفہ عبدالحکیم

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی — عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا
غالب

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب — ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا
غالب

آہستہ سے چل میانِ کہسار — ہر سنگ دکانِ شیشہ گر ہے
درد

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق — عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی
اقبال

بارہا دیکھا ہے اس دارِ مکافات میں میر — اینٹ اٹھانے بھی نہ پائے تھے کہ پتھر آیا
میر

عبدالمجید سالک

بھائی مجید! آپ نے چند روز سے عجیب گورکھ دھندے میں ڈال رکھا ہے۔ عمر بھر میں ہزاروں اشعار سنے۔ سیکڑوں اچھے معلوم ہوئے۔ بیسیوں نے تڑپایا۔ بعض دماغ میں ایسے جمے۔ کہ ہستی کا جزو بن کر رہ گئے۔ اب آپ نے فرمادیا کہ پانچ ایسے اشعار لکھ دو۔ جو تمہیں بہت زیادہ پسند ہوں۔ پسند ہونے کو تو مجھے کسی زمانے میں یہ شعر بھی بہت اچھا معلوم ہوتا تھا۔ کہ ؎

سالہا سال ہوئے ہیں ترے پیچھے پھرتے — جنوری تو ہے تو اے ماہ دسمبر میں ہوں

جب سمجھ ذرا جوان ہوئی۔ طبیعت میں شباب کی شوخیاں آئیں۔ تو اکبر کے اس قسم کے اشعار پسند آنے لگے ؎

عاشقی قیدِ شریعت میں جو آجاتی ہے — جلوۂ کثرتِ اولاد دکھا جاتی ہے

لیکن اردو میں ایسے اشعار بہت ہی کم نظر آئے۔ جو ہزار دفعہ دہرانے پر بھی باسی معلوم نہ ہوں۔ بہرحال حسب فرمائش پانچ ایسے اشعار لکھتا ہوں۔ خدا جانے اربابِ ذوقِ سلیم ان کو پڑھ کر میرے متعلق کیا رائے قائم کریں۔ لیکن اب "پھنسنے پر پھڑکنا کیا"۔ جو ہوگا

دیکھا جائیگا۔

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے
ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے
حفیظ جونپوری

عجز و نیاز سے تو وہ آیا نہ راہ پر
دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچئے
غالب

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا
غالب

رہبر نے راہِ عشق میں برسوں دئیے چکر مجھے
غافل سے جب پوچھا کہا اب آگئے منزل کے پاس
داغ

تھی وہ اک درماندہ رہرو کی صدائے دردناک
جس کو آوازِ رحیلِ کارواں سمجھا تھا میں
اقبال

غلام رسول مہر

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گناہ کا حساب اے خدا نہ مانگ
غالب

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو
غالب

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے
نالہ پابندِ نے نہیں ہے
غالب

بس ہجومِ ناامیدی خاک میں مل جائیگی
یہ جو اک لذت ہماری سعیِ بیحاصل میں ہے
غالب

عجز و نیاز سے تو وہ آیا نہ راہ پر
دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچئے
غالب

سید سلیمان ندوی

اشعار کی پسندیدگی کا یہ حال ہے کہ وہ بھی زمان و مکان کی قید سے آزاد نہیں۔ ایک شعر ایک وقت میں پسند ہوتا ہے، دوسرے وقت میں وہ گر جاتا ہے اور دوسرا زبان پر آجاتا ہے۔ اس لئے شعر کی مطلق اور بے قید پسندیدگی تقریباً محال ہے۔ غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ یہ عمل بھی احوال و مقامات و جذبات کے ماتحت ہوتا ہے۔ آپ کا خط جس وقت آیا۔ اس وقت بلا تامل مزید جو شعر زبان پر آئے وہ حوالۂ قلم ہیں:-

سفر ہے شرط، مسافر نواز بہتیرے　　ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہیں
آتش

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں　　موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں
غالب

اک ہوک جگر سے اٹھتی ہے اک درد سا دل میں ہوتا ہے　　میں چپکے چپکے روتا ہوں جب سارا عالم سوتا ہے
میر

ہوگا کسی دیوار کے سایہ میں پڑا میر　　کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو
میر

کیونکر یہ کہیں منت اعدا نہ کریں گے　　کیا کیا نہ کیا عشق میں کیا کیا نہ کریں گے　　لاعلم

ڈاکٹر جیمز کزنز

چغتائی کا آرٹ

مترجمہ۔ رشیدہ ذکاء اللہ

بعض حضرات کا وتیرہ ہوتا ہے کہ جب کسی نوعمر مصور کی تصویر دیکھتے ہیں تو ان دو چار چھپی ہوئی تصاویر کو جو کبھی ان کی نگاہ سے گزر چکی ہوتی ہیں۔ ذہن میں لا کر ایک مبصرانہ اور بیش و کم حقارت آمیز انداز سے فرماتے ہیں۔" اس مصور اور اس کی تصویروں پر جاپانی مصوری کا اثر ہے"۔ اہل فہم خوب جانتے ہیں کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ بالکل برعکس۔ " اتا مارو" کی خواتین ہندوستان کی " شکنتی " کی اولاد ہیں ایسی اولاد جو جاپانی لباس میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ جاپانی طریقے سے بال سنوارتی ہے۔ اور جس کے اعضا میں جاپان کا طبعی سبک پن ہوتا ہے۔ اندریں حالات کیا یہ ہندوستانی آرٹسٹوں کا قصور ہے کہ جاپانی مصوری میں اور ان کی مصوری میں مشابہت ہے؟ اگر کسی کی صورت اپنے مورثِ اعلےٰ کی صورت سے ملے تو یہ مورثِ اعلےٰ کا قصور کیونکر ہو سکتا ہے؟

اسی قسم کے حضرات جب چغتائی کی تصاویر دیکھتے ہیں تو فرماتے ہیں۔ "چغتائی ایرانی مصوری سے متاثر ہے"۔ نادان یہ نہیں سمجھتے کہ یہ کوئی عیب کی بات نہیں۔ اور آخر چغتائی پر ایرانی اثر کیوں نہ ہو۔ چغتائی ایرانی النسل ہے۔ اس کا سلسلۂ نسب ان "تاتاری مغلوں" سے ملتا ہے جنہوں نے ایران کو اپنا مسکن بنایا اور جنہوں نے انجام کار موتی مسجد اور تاج محل جیسی رفیع الشان عمارتیں برپا کیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ چونکہ چغتائی ایرانی النسل ہے اس لئے اس کی مصوری میں ایرانی رنگ کی موجودگی لازمی ہے۔ سولھویں اور سترھویں صدی کے مغل آرٹ کے بعض ماہرین پکے ہندو تھے۔ اور آجکل کے بعض ہندوستانی مصور جو غیر ملکی آرٹ کی نقالیاں کرتے ہیں "پکے" کچھ بھی نہیں۔ لیکن چغتائی! چغتائی کی بات بالکل مختلف ہے۔ اس کے دم سے ایرانی مصوری از سر نو زندہ ہو گئی ہے۔ اُس مصوری میں اور اِس مصوری میں فرق ہے تو صرف اتنا جو چغتائی کی عظیم شخصیت اور صدیوں کی آمد و شد کی وجہ سے لازمی تھا۔

یوں معلوم ہوتا ہے کہ چغتائی کے تصور میں آج بھی اکبر کے پرشکوہ زمانے کا ہندوستان بستا ہے۔ جہاں تک آرٹ کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں چغتائی کا یہ تصور ہمارے ہی لئے کار آمد ثابت ہوا ہے۔ اگر آج ہندوستان واقعی اکبر کے زمانے کا ہندوستان ہوتا تو یقینی طور پر

چغتائی کوئی اور دنیا تخلیق کرتا۔ اور یہ بات عرصے سے کون کہ سکتا ہے کہ وہ نئی دنیا بھی اسی قدر حسین ہوتی جیسی خوابوں کی یہ خوبصورت دنیا ہے جو چغتائی کے تخیل نے اب آباد کی ہے۔ یقینی بات صرف اس قدر ہے کہ وہ ایک نئی اور مختلف بنابنا تا ضرور کیونکہ اس کا تعلق اس پر از رومان گروہ سے ہے جن کا کاروان ہمیشہ ساحل دوش یا کنار فردا پر خیمہ زن ہوتا ہے۔ اس گروہ کا ایک رکن انگریز شاعر کیٹس تھا۔ جو اپنے گرد و پیش کی دنیا سے بھاگ کر اپنے تخیل کی مخلوق یونانی دنیا میں پناہ گزین ہوا تھا۔

بیرون ایشیا جو چیز چغتائی کے مداح پیدا کرتی ہے وہ اس کی تصاویر کا مشرقی تخیل ہے۔ اس کی تصاویر میں جو حیرت انگیز فنی کمال ہے وہ ہر صاحب فہم کا دل لبھاتا ہے۔ لیکن ریلزم سے وہ بعد جو چغتائی نے ارادتاً اختیار کیا ہے۔ ان لوگوں کے لئے باعث تشکر ہے جو اس چیز سے جس کو مرئی حقیقت کہتے ہیں، اکتا چکے ہیں اور تخییلی حقیقت کے متلاشی ہیں۔ اس تخییلی حقیقت کو واضح کرنا صدیوں سے مشرقی آرٹ کا مقصد اور مطمح نظر رہا ہے۔ اگر پرانے ایرانی شاہکاروں اور چغتائی کی تصویروں کو سامنے رکھ کر موازنہ و مقابلہ کیا جائے تو واضح طور پر معلوم ہو جائیگا کہ ان میں یگانگت کس حد تک ہے۔ اور کس حد تک چغتائی نے اس جوش طبیعت سے جو ایک ایسے خلاق آرٹسٹ کا خاص امتیاز ہوتا ہے جو اپنی روایات سے کما حقہٗ آگاہ ہو۔ اپنا ذاتی کمال ایزاد کیا ہے۔ قدیم ایرانی شاہکاروں میں اور چغتائی کی تصاویر میں تغزل اور ایک نازک۔ پرسکوت توازن مشترک ہیں۔ لیکن رنگوں کا خوبصورت امتزاج۔ خطوط کی ہم آہنگی جس کی بدولت خطوط تصویر کے خطوط نہیں رہتے بلکہ ان شاعرانہ جذبات کے جو الفاظ کی گرانباری کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ نقوش بن کر نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ لباس کی تزئین و ترتیب جس کا مقصد محض انسانی جسم کو مستور یا عریاں کرنا نہیں ہوتا۔ بلکہ جو بجائے خود ایک جمالیاتی کارنامہ ہے۔ اور ساسانی عمارات کا پس منظر جو انسانی تخیل کو اس دنیا سے دور رومان اور حسن کی دنیا میں لے جاتی ہے۔ یہ تمام صفات چغتائی کی خصوصیت ہیں اور اس کی تصاویر میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

("سٹوڈیو۔ لنڈن")

مترجمہ مس رشیدہ ذکاء اللہ

ایم۔ اسلم

شکارے والی

پچھلا پہر تھا اور ڈل کا کنارہ۔ میں سبزے کے زمردیں فرش پر ہاتھ کا سرہانہ بنائے ڈل کے سینہ پر شعاعِ آفتاب کی کرشمہ سازیاں دیکھ رہا تھا۔ ڈل کا منظر یوں بھی کچھ کم پرلطف نہیں ہوتا۔ لیکن مختلف اوقات میں آفتاب کی شعاعیں جس انداز سے اس کے آبی سینے پر ملمع کاریاں کرتی ہیں وہ نہایت دلآویز ہوتا ہے۔ مشرق کی جانب اونچے اونچے پہاڑ تھے جن پر مشاطۂ قدرت نے گویا سبزے کی چادر ڈال دی تھی۔ اور کہیں کہیں سنگلاخ چٹانیں کچھ اس طرح کھڑی تھیں جیسے کوئی گدائے بے نوا راہ سے الگ ہو کر اپنی بیکسی پر غور کر رہا ہو۔

مجھ سے ذرا فاصلے پر ایک ہوس بوٹ اور دو چار خوبصورت شکارے لنگر ڈالے کھڑے تھے۔ ان شکاروں میں چند ایک سیاح بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ ہوس بوٹ کی چھت پر دو چار انگریز چائے پی رہے تھے اور ہوس بوٹ کے پاس کنارے پر ایک شکستہ حال نوجوان صورتِ سوال بنا بیٹھا تھا۔

ایک شکارے پر سے کسی نے کہا :-

"جاؤ! کیا دیکھتے ہو"؟

وہ خستہ حال نوجوان وہاں سے اٹھا۔ دونوں ہاتھ کمر کے پیچھے رکھے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا میری طرف آیا اور پاس پہنچ کر بولا:-

"کیوں حضرت! کوئی خدمت"!

میں نے انکار کے طور پر سر ہلا دیا۔

"کوئی کام ہو تو میں کروں حضرت"!

اس نوجوان کے لب ولہجہ سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ کشمیر کا رہنے والا نہیں۔ معاً میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ آواز میں نے پہلے بھی کہیں سنی ہے۔ میں غور سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ پھٹے پرانے کپڑے تھے۔ بے ڈھنگی سی ڈاڑھی تھی۔ سر کے بال ماتھے پر گر رہے تھے اور گریبان کھلا تھا۔ میں نے مزید غور سے اس کی طرف دیکھا تو مجھے یقین ہوگیا کہ میں نے اُسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ لیکن اس حال میں نہیں۔ وہ بھی مجھے ایک خاص انداز سے دیکھ رہا تھا۔ بلکہ زیرِ لب ہنس رہا تھا۔ پھر وہ آنکھیں جھپک کر بولا:-

"کیا دیکھتے ہیں حضرت"؟

اس کے اس طرح آنکھیں جھپکنے کے انداز سے میرے دل ودماغ پر ایک بجلی سی کوندگئی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور تعجب سے کہا:-

ہارون ؟
وہ سن کر بولا :۔
"ہاں ہارون ۔شکر ہے تم نے پہچان تو لیا "۔

ہارون میرا کالج کے وقتوں کا دوست تھا ۔ہم ایف ۔اے کلاس میں تھے کہ وہ کالج چھوڑ کر چلا گیا ۔میرا دوست بڑا منطقی تھا ۔ضد کا پورا اور ہٹ کا پکا ۔ اور بہت غیور ۔جب بھی ہم سینما یا رسٹوران میں جاتے تھے ۔ دام وہ ادا کرتا تھا ۔ لیکن کالج چھوڑنے کے بعد اس نے کبھی اطلاع نہ دی کہ وہ کہاں ہے اور کیا کرتا ہے ۔ آج تقریباً پندرہ سولہ سال کے بعد اس سے پھر ملاقات ہوئی تھی +

وہ میرے پاس خاموش بیٹھا مسکرا رہا تھا ۔میں نے کہا :۔
"ہارون ! بھئی تم تو ایسے غائب ہوئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ ۔ کہاں رہے" ؟
"غنیمت ہے ! آج ملاقات تو ہوگئی ۔ رہی یہ بات کہ میں کہاں رہا تو بھائی ۔ ملکِ خدا تنگ نیست ۔ پائے گدا لنگ نیست" +
"لیکن یہ حال کیا بنا رکھا ہے تم نے" ؟
"جو دل کو پسند ہے "۔
"یہاں کب سے ہو" ؟
"ایک مدت سے" !
"کہاں رہتے ہو" ؟
"شہر میں" اور پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے " چلو گے ؟ چائے پلاؤنگا "۔
میں دل میں سوچنے لگا کہ ابھی ابھی تو یہ شخص خود صورتِ سوال بنا بیٹھا تھا اور اب مجھے چائے کی دعوت دے رہا ہے ۔ ہارون غالباً میری خاموشی کا مطلب بھانپ گیا ۔اور ہنس کر کہنے لگا ۔
"بہت غریبانہ چائے ملیگی "۔
"چلو ! ہارون جیسے دوست کی دلشکنی مجھے کب گوارا تھی ۔
"لیکن میرا گھر یہاں سے دور ہے" !
"تو شکارے میں کیوں نہ چلیں" ؟
"ہاں لیکن کرایہ تمہیں دینا ہوگا "۔ ہارون نے ہنس کر کہا ۔

ہمارا شکارا ابھی ڈل گیٹ سے کچھ فاصلہ پر تھا کہ راستے میں سیاحوں کے اور بہت سے شکارے مل گئے ۔ اگر کبھی یہ شکارے پاس آجاتے تھے تو مانجی ایک دوسرے سے آگے نکلنے کے لئے زور زور سے چپو چلاتے ۔ڈل گیٹ کے قریب ایک اور شکارا ریشمی پردوں سے آراستہ ہمارے پاس سے گذرا ۔ اس میں ایک نوجوان عورت چہرے پر ایک باریک سا نقاب ڈالے بیٹھی تھی ۔ کچھ دور

تک دونوں شکارے ایک دوسرے کے دوش بدوش چلتے رہے۔ معاً اس عورت نے چہرے پر سے نقاب اُٹھا کے ہماری طرف دیکھا۔ بہت خوبصورت عورت تھی۔ اور اس کا نقاب پلٹ کر یوں یک بیک دیکھنا گویا چشمک برق تھا۔

ہارون سر جھکائے بیٹھا تھا۔ خوبصورت عورت نے جھک کر اپنے ہانجی سے کچھ کہا۔ لیکن اس اثنا میں ہمارا شکارا آگے بڑھ چکا تھا۔ ہم اس سمت جا رہے تھے جہاں زیادہ تر مزدوری پیشہ لوگوں کے گھر ہیں۔ میں نے پوچھا :۔

"کشمیر کی سیر تو تم نے خوب کی ہوگی"؟

"بہت گھوما۔ چپہ چپہ دیکھ ڈالا"۔

"سری نگر میں کب سے ہو"؟

"یہی کوئی دو تین مہینے سے"۔

"لیکن یہ تم نے حال کیا بنا رکھا ہے"؟

"حال"! ہارون نے اپنے لباس پر ایک نگاہ ڈال کر کہا۔ "وہی جو غریبوں کا ہوتا ہے"۔ پھر تھوڑی سی خاموشی کے بعد "جو مزا اس غربت میں ہے وہ آسودگی میں میسر نہ تھا۔ اب نہ فکر نہ غم۔ روکھی سوکھی مل گئی تو کھا لی۔ ورنہ یوں ہی پڑ رہے لیکن ایک بات ہے۔ پیدا کرنے والے کو اپنے بندوں کی فکر بھی ضرور ہے۔ حال تو تم میرا دیکھ ہی رہے ہو۔ لیکن فاقہ آج تک نہیں آیا"۔

پھر جیب میں ہاتھ ڈال کر اور ایک دونّی نکال کر :

"ایک وقت کی روٹی کے دام اس وقت بھی میرے پاس ہیں"۔

میں خاموش بیٹھا ہارون کی باتیں سنتا رہا۔ اس وقت ہمارا شکارا ایک چھوٹے سے نالے میں سے گذر رہا تھا۔ دو طرف کچے مکان تھے اور مکینوں کی شکل وصورت سے غربت اور افلاس ظاہر تھا۔ جب ہم اس نالے کے موڑ کے قریب پہنچے تو وہی شکارا جس میں نقاب پوش عورت بیٹھی تھی دوسرے موڑ کی طرف سے پھر ہمارے سامنے آ گیا۔ اس جگہ پاٹ بہت تھوڑا تھا۔ عورت کے شکارے والا ہانجی آگے نکلنا چاہتا تھا۔ لیکن ہمارے شکارے والے نے اُسے ڈانٹا۔ اس نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ دونوں میں کچھ جھگڑا ہو رہا ہے۔ آخر نقاب پوش عورت کی آواز آئی :۔

"آہستہ چلو تم"۔

یہ آواز سن کر ہارون نے سر اٹھایا۔ لیکن ہمارا شکارا آگے نکل چکا تھا۔ شہر کا یہ حصہ بہت بدبودار تھا۔ ہارون ایک دو تنگ کوچوں میں سے ہوتا ہوا ایک مکان کے سامنے رکا۔ مکان نہیں بالاخانہ سمجھئے۔ ہم اوپر پہنچے۔ کمرے میں تاریکی تھی۔ ہارون نے ایک موم بتی روشن کی۔ ایک چھوٹا سا چوبی کمرہ تھا۔ وسط میں تین ٹانگوں والی ایک بھدی سی میز رکھی تھی۔ ایک جانب لکڑی کی دو اونچی اونچی چوکیاں تھیں اور ایک مقفل الماری۔ میز پر روغنی مٹی کی چائے دانی۔ ایک کونے میں ایک چھوٹا سا سماوار تھا۔ پاس ہی ایک مٹکا اور ٹین کا آفتابہ۔ گلی کی جانب دیوار میں دو کھڑکیاں تھیں۔ دونوں کے کواڑ بند تھے۔ ان کھڑکیوں کے ساتھ ایک چارپائی

تھی اور چارپائی پر سیاہ رنگ کی ایک لوئی اور ایک بوسیدہ سا کمبل - یہ تھی اس کمرے کی کل کائنات

"بیٹھ جاؤ"! ہارون نے سماوار اٹھاتے ہوئے کہا - "میں ذرا گرم پانی لے آؤں "۔

میں دل میں سوچنے لگا کہ کسی طرح ہارون کی کچھ امداد کروں - یہ کمرہ اور اس کا سامان ہارون کی مفلسی اور پریشانی کا بین ثبوت تھا - لیکن میں اپنے دوست کو خوب جانتا تھا - وہ کبھی کسی کا شرمندۂ احسان نہیں ہوا تھا - اس کو اس بات پر آمادہ کرنا کہ وہ کچھ مالی امداد قبول کرے سخت مشکل تھا۔

وہ کوئی پانچ ایک منٹ میں گرم پانی لے کر آگیا - سماوار میز پر رکھ کر اس نے الماری کا قفل کھولا - اور اس میں سے کاغذ کی دو پڑیاں اور نصف کے قریب ایک کشمیری نان نکال کر میرے سامنے رکھ دیا اور کہا : -

" ایک پڑیا میں چائے ہے دوسری میں شکر - تم سماوار میں چائے ڈال دو میں پیالیاں صاف کرتا ہوں " -

اتنے میں کسی کے سیڑھیوں پر چڑھنے کی آواز آئی - ہارون نے بیٹھے بیٹھے پوچھا - "کون ہے بھائی "؟ اور پھر خود ہی "کمبخت مکان والا کرایہ مانگنے آیا ہوگا "

دروازہ کھلا اور ایک عورت ہمارے سامنے آکھڑی ہوئی - یہ وہی تنکارے والی عورت تھی - شمع کی دھندلی دھندلی روشنی میں بھی آنے والی کی شمع حسن کی تابش خوب نمایاں تھی - ہارون نے اس کی طرف گھور کر دیکھا اور پھر سر جھکالیا - میں نے انگریزی میں پوچھا :-

" یہ کون ہے "؟

ہارون نے انگریزی میں جواب دیا - " ناگن " !

" ناگن " !

" ناگن نہ سہی - جادوگرنی سہی "

اس کے چہرے پر انتہا درجے کا کرب تھا - آخر وہ نووارد کی طرف مخاطب ہوا ـــــ "کیا میری رہائی ناممکن ہے - آخر کب تک اور کہاں تک میرا پیچھا کیا جائیگا " ؟

"میں تو معافی مانگنے آئی ہوں - آپ کے دل میں کچھ رحم نہیں " ؟

" خدا کے واسطے مجھے میرے حال پر چھوڑ دو - میرے دل میں نہ رحم کی جا ہے نہ محبت کی "

" لیکن میرا قصور " ؟

" اس کا جواب قیامت کے دن ملیگا " اس کے چہرہ پر ہلکی ہلکی سرخی آگئی - " قیامت کے دن انصاف ہوگا - اس دنیا میں انصاف نہیں ہے - اس دنیا میں انصاف نہیں اور میں بزدل ہوں "! اب وہ غصہ سے تمتما اٹھا " میں بزدل ہوں ورنہ تو آج اس دنیا میں نہ ہوتی "۔

" کاش مرحومہ ـــــ "

ہارون تڑپ کے اٹھا۔ " خبردار۔ اپنی ناپاک زبان سے اس کا نام نہ لینا" اور پھر دیوانہ وار ۔" میری آنکھوں کے سامنے سے دور ہو جا، ملعونہ ۔ قاتلہ "۔

اس عورت نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا ۔" میں جاتی ہوں ۔ ہارون ! خدا انصاف کرنے والا ہے "۔

ہارون کچھ دیر تک خاموش رہا ۔ آہستہ آہستہ اس کا غصہ فرو ہو گیا ۔ اور اس نے گویا بات کی اہمیت کم کرنے کے لئے کہا :۔

" اسے کہتے ہیں کھیل میں کھیل ۔کیوں ؟ کیسا پارٹ ادا کیا ؟ کچھ داد تو دو "۔

" یہ تھی کون " ؟ میں نے پوچھا ۔

" رقاصہ ! فاحشہ ! اور کون ؟

" خوب ! تو گویا یہ سب گل اسی کے کھلائے ہوئے ہیں " ؟

" جی ہاں " !

" وہ کیسے " ؟

" یہ داستان سنو گے " ؟

" ہاں ! ہاں ! کیوں نہیں "۔

" تو سنو " ! ہارون بولا ۔" کوئی لمبا قصہ نہیں ۔ چند ایک خانگی مجبوریوں کے باعث مجھے کالج چھوڑنا پڑا تھا ۔ ادھر کالج چھوڑا ادھر شادی ہو گئی ۔ اور پھر ایک دفتر میں ملازمت کا سلسلہ بھی ہو گیا ۔ اس ملازمت کے سلسلہ میں جگہ جگہ میری تبدیلی ہوتی رہی ۔ جہاں جاتا بیوی کو ساتھ لے جاتا ...... خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والی میں ۔ خدا کی قسم کوئی چراغ لے کر بھی ڈھونڈے تو ایسی بیوی نہ ملے ۔ شادی ہوئے کوئی پانچ سال ہو چکے تھے ۔ ان دنوں میں ایک ایسے مقام پر تھا جو ایک بارونق شہر ہونے کے علاوہ ایک مشہور چھاؤنی بھی تھا ۔ اس جگہ میرے ایک دوست تھے انہیں گانا سننے کا بہت شوق تھا شہر میں کئی اچھی گانے والیاں تھیں ۔ یہ سب سے اچھا گاتی تھی ...... "

" یہ کون " ؟ میں نے بات کاٹ کر پوچھا ۔

" یہی خورشید جو ابھی یہاں آئی تھی ۔"

" تو اس کا نام خورشید ہے اور طوائف ہے "۔

" جی ہاں اور دغاباز جھوٹی ۔ میرا دل کچھ خود بخود اس کی طرف کھنچنے لگا ۔ مجھے اس کے گانے کی نسبت اس کی باتوں میں زیادہ لطف آتا تھا ۔ اچھی خاصی تعلیم یافتہ عورت تھی ۔ بڑے بڑے استادوں کا اردو اور فارسی کلام یاد تھا ۔ پانچ چھ مہینے تک یہ سلسلہ جاری رہا ۔ آخر اس آمد و رفت کا وہی نتیجہ نکلا جو نکلنا چاہئے تھا ۔ قول و اقرار ' عہد و پیمان سب پکے ہو گئے اور خورشید "میری" ہو کر رہنے لگی ۔ بہت سے لیل و نہار بڑے لطف اور پیار سے گذرے ۔ اس عورت نے اپنے طرز عمل سے یہ جتایا کہ اس میں کسی کی ہو کر رہنے کی صلاحیت موجود ہے ۔ اور ادھر میرے دل میں یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ اگر یہ راہ گم کردہ میری کوشش اور توسل سے راہِ راست پہ آجائے تو ثواب کا کام ہو گا ۔

الغرض، وقت خوب مزے سے گذر رہا تھا۔ کہ میری بیوی سخت بیمار ہوگئی۔ میرے گھروالوں میں سے اس وقت ایک بوڑھی نانی اماں زندہ تھیں لیکن وہ مجھ سے کافی کوسوں دور تھیں۔ میری بیوی کے ماں باپ برسوں سے مر چکے تھے۔ دور کے رشتہ دار تھے ان میں سے جو دو ایک زندہ تھے ان سے ہمارا میل ملاپ نہ تھا۔ میری بیوی کا مرض شروع تو معمولی بخار سے ہوا۔ لیکن بعد میں پیچیدگیاں پیدا ہوگئیں۔ میں نے ایک ہوشیار ڈاکٹر کو علاج پر لگا رکھا تھا۔ مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ مجھے خود رخصت لیکر مریضہ کی تیمارداری کرنی پڑی۔ اور رخصت لینے سے پیشتر میں نے خورشید سے بھی اپنی بیوی کی بیماری کا ذکر کر دیا۔

خورشید بولی۔

"مانو تو ایک بات کہوں"؟

"ہاں کہو نا"۔

"نہیں! پہلے اقرار کیجئے پھر عرض کروں گی"۔

"تم کہو تو سہی"!

"اگر آپ پسند کریں۔ تو میں بیگم صاحبہ کی خدمت خود چل کر کروں"۔

میں نے تعجب سے پوچھا۔

"خورشید! کیا کہہ رہی ہو؟ تم میری بیوی کی خدمت کرو گی"؟

"ہاں کیوں نہیں"! اس نے کہا۔" دو چار روز آزما دیکھئے۔ میں پیشہ ور سہی۔ لیکن عورت ہوں اور پھر ایک شریف زادی کی خدمت کروں گی تو شاید یہی خدمت میرے گناہوں کا کفارہ ہو جائے۔ آپ مجھے ایک موقعہ تو دیں۔

قصہ مختصر میں اُسے گھر لے آیا۔ میرے ہاں آتے ہی خورشید وہ پہلی سی چنچل اور طرحدار خورشید نہ رہی۔ بلکہ چال سے ڈھنگ سے گفتگو سے پوری شریف زادی معلوم ہونے لگی۔ اور میری بیوی کی تیمارداری ایسی دلسوزی اور محبت سے کرنے لگی کہ میں دیکھ دیکھ کر حیران ہوتا تھا۔ لیکن قسمت کا لکھا کون ٹال سکتا ہے۔ کوئی چار پونے چار مہینے کی مسلسل علالت کے بعد میری بیوی ملک عدم میں جا بسی۔

لیکن اس سے تم یہ نہ سمجھنا کہ میری بیوی بیماری کی وجہ سے قدرتی موت مر گئی۔ بالکل نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں اپنی بیوی کا قاتل ہوں۔

"تم! وہ کیسے"؟

سنو۔ سنو۔ ٹھنڈے دل سے سنو۔ اس کی قاتل خورشید ہے۔ لیکن چونکہ اس مکان میں خورشید کی موجودگی کا ذمہ دار میں تھا۔ اس لئے میں قاتل ہوں ـــــ یہ راز مجھے ماما سے معلوم ہوا۔

"سنئے میاں"! ماما نے کہا۔" ایک روز رات کے وقت یہ چڑیل بیگم صاحبہ کا سر سہلا رہی تھی۔ میں کمبل اوڑھے پاس ہی پڑی تھی۔ یہ سمجھی ہوگی کہ میں سوتی ہوں۔ لیکن میں جاگتی تھی۔ بیگم صاحبہ اس سے کچھ ہولے ہولے باتیں

کر رہی تھیں۔ بیگم صاحبہ نے پوچھا:۔

"تو تمہیں میاں سے سچی محبت ہے"؟

اس نے جواب دیا:۔

"جی ہاں! سچی۔"

پھر کچھ باتیں ہوئیں جو میں سن نہ سکی۔ پھر بیگم نے پوچھا۔

"آپ سے ملاقات ہے تم سے"؟

تو اس نے شاید پانچ چھ سال بتائے۔ یہ شاید کچھ کم کہا۔

پھر بیگم صاحبہ نے پوچھا۔

"اور خرچ اخراجات کی کیا صورت ہے"؟

اس نے ایک آہ بھر کر کہا:۔

"اللہ مالک ہے۔ گذران ہوتی چلی جاتی ہے"

بیگم صاحبہ نے فرمایا:۔

"میں تو اب کوئی دن کی مہمان ہوں۔ مجھے اپنے مرنے کا تو غم نہیں۔ لیکن یہ اکیلے رہ جائیں گے۔"

"آپ مایوس کیوں ہوتی ہیں" اس نے کہا "مرنا تو سبھی کو ہے۔ کوئی آگے کوئی پیچھے"۔

"سچ ہے" بیگم بولیں "اچھا اب تمہیں مبارک ہو"۔

"بس میاں سچ جانو" ماما نے کہا "اسی رات سے بیگم صاحبہ کی حالت زیادہ خراب ہوگئی اور دو چار روز کے بعد ہی دنیا کے دکھ سے نجات پاگئیں"۔

یہ حالات سن کر میرے دل پر ایک زخم لگا جو کبھی مندمل نہ ہوگا۔ میری پاکدامن بیوی مرگئی۔ اور اس کو ایک فاحشہ عورت نے اور ایک آوارہ آدمی نے مل کے مار دیا۔ اس دن سے میں نے خورشید سے کنارہ کشی کرلی۔ میں بھی قاتل ہوں وہ بھی قاتل ہے۔ لیکن اب مجھے اس سے نفرت ہے"۔

"نفرت"۔ میں نے کہا۔ "نفرت تمہیں اب بھی نہیں"۔

"ہاں نفرت ہے۔ خیر مہینہ بھر بعد ہمارے دفتر میں کچھ غبن ہوا۔ اور چونکہ حساب کتاب کا ذمہ دار میں تھا اس لئے مجھ پر بھی زد پڑی۔ مقدمے نے بہت طول کھینچا۔ جو کچھ میرے پاس تھا۔ سب مقدمے کی نذر ہوگیا۔ آخر خدا خدا کرکے میری خلاصی ہوئی اور اصل ملزم نے سزا پائی۔ لیکن اس کے ساتھ کچھ واقعات ایسے بھی تھے کہ محکمہ والوں نے کوئی دو مہینے بعد مجھے استعفا داخل کرنے پر مجبور کیا۔ اور میں اس طرح ملازمت سے علیحدہ ہوگیا۔ سچ ہے جب قسمت بگڑتی ہے تو پھر کسی کی کچھ نہیں چلتی۔ میرے مقدمے کے دوران میں اس فاحشہ نے میری ضمیر کو خریدنے کی یوں بھی کوشش کی کہ اس نے میرے لئے عدالت میں ۲۵ ہزار روپے کی ضمانت پیش کی"۔

کچھ دیر ہم دونوں خاموش بیٹھے قہوہ پیتے رہے - پھر میں نے پوچھا :-
" تو اب ارادہ کیا ہے " ؟
" ارادہ کچھ بھی نہیں "۔ یکایک ہارون کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے -" میں نے تمہیں یہاں لاکر خواہ مخواہ بے مزا کیا " !
" وہ کیسے ؟ تم سے مل کر جو مسرت مجھے ہے - تم کیا جانو - اب چلو میرے ساتھ -
" کہاں ؟ کہاں چلوں " ؟
" میرے ساتھ چل کر رہو - میں یہاں اکیلا ہوں "۔
" تم کہاں رہتے ہو " ؟
" میرا ہاؤس بوٹ ڈاکخانہ کے قرب وجوار میں ہے "۔
" اس وقت معاف کرو - کل چلونگا "۔
" ہارون ! کبھی کسی کا کہا بھی مان لیا کرو "۔
" کہ تو رہا ہوں کل چلونگا "۔
" سچ کہتے ہو " ؟
" کبھی تم نے مجھے جھوٹ بولتے بھی سنا " ؟
" کہاں ملاقات ہوگی " ؟
" اسی جگہ " !
" کل صبح " ؟
" نہیں ! کل شام " !

ہارون سے رخصت ہوکر جب میں نیچے آیا تو خورشید گلی میں کھڑی میرا انتظار کر رہی تھی - مجھے دیکھ کر کہنے لگی -
" مجھے آپ سے کچھ عرض کرنا ہے "۔
" فرمائیے " !
" یہاں نہیں " - اس نے ہارون کے مکان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا -" وہ دیکھ لینگے تو اور بھی بگڑینگے - آپ کا شکارا تو کھڑا ہے "۔
" ہاں ہے تو سہی " !
" تو بس اسی میں چل بیٹھئے "۔
جب ہم شکارے میں بیٹھ چکے تو خورشید نے کہا :-
" آپ میری جرأت معاف فرماویں "۔

میں نے ہنس کر کہا ۔ "ہاں ! مرتے کو مارنا واقعی جرأت کا کام ہے"۔
"آپ بھی ہارون صاحب کے ہم خیال معلوم ہوتے ہیں"۔
پھر ایک آہ بھر کر۔ "کم از کم آپ کو ہارون سے اتنا تو معلوم ہوگیا ہوگا کہ میں کون ہوں"؟
"جی ہاں" ! میں نے مسکرا کر کہا۔ "خوبصورت بلا"۔
"نام تو اچھا ہے لیکن آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا"۔
"کس بات کا"؟
"میرے اور ہارون صاحب کے تعلقات کا تو آپ کو کچھ علم ہوگیا ہوگا"؟
"تعلقات یعنی تمہاری جفاکاریوں کی داستان"؟
"جفاکاریاں"؟ خورشید کے ماتھے پر بل تھے ۔
"جفاکاریاں ! میری"؟
"خورشید" ! میں نے جواب دیا۔ "سب کچھ جانتے بوجھتے بھی انجان ہو تو اس کا کیا علاج"۔
"میں انجان بنتی ہوں"؟ وہ سر ہلا کر کہنے لگی۔ "یا کہنے سننے والے دیدہ و دانستہ انجان بن رہے ہیں"۔
"کہنے سننے والے کون"؟ میں نے پوچھا۔
"معاف فرمائیے" ! خورشید بولی۔ "آپ نے ان کی تو سن لی۔ گو مجھے یہ معلوم نہیں کہ آپ کے اور ان کے ـــــــ"
میں نے بات کاٹ کر کہا۔ "پہلے تم یہ سنو ۔ ہارون میرا بہت پرانا دوست ہے"
"یہ تو میں نے پہلے ہی سمجھ لیا تھا ۔" خورشید بولی۔ "ورنہ آپ سے یوں بے تکلفی سے باتیں کرنے نہ بیٹھ جاتی"۔
"لیکن تم ذرا دل میں سوچو تو سہی"۔ میں نے کہا۔ "کہ ہارون کو تم نے کس کس طرح پریشان کیا۔ غریب کا گھر برباد ہوا۔ پھر ملازمت بھی گئی اور آبرو بھی گئی"۔
"تو گویا ان سب باتوں کی ذمہ داری مجھ پر ہے"۔
"اور کس پر ؟ وہ تمہاری چکنی چپڑی باتوں پر پھسل کر تمہیں اپنے گھر لے گیا اور اس کے گھر آ کر جو گل تم نے کھلائے وہ تم جانتی ہو"۔
"تو کیا میں نے ان کی بیگم صاحبہ کو زہر دے دیا یا گلا گھونٹ کر مار دیا۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ نیکی برباد گناہ لازم ۔ آخر میرا قصور بھی تو مجھے معلوم ہو"۔
"سنو خورشید" ! میں نے کہا ۔ "تمہارا یہ ظلم کیا کم ہے کہ تم نے مرحومہ سے اپنے اور ہارون کے تعلقات کا ذکر کردیا۔ اور وہ غریب اسی غم میں گھل گھل کر مرگئی"۔
خورشید تصویر حیرت بن گئی ۔ "کیا کہا" ؟ اور پھر یکدم غصہ میں آ کر ۔ "کیا ہارون اب اس قدر گر گیا ہے کہ مجھ پہ جھوٹی تہمتیں دھرتا ہے ـــ کیا ـــ"

"نہیں یہ تہمت نہیں ۔ اسے یقین ہے کہ تم نے اس کا راز فاش کر دیا"۔
خورشید کا چہرہ جوش اور غصہ سے تمتما اٹھا۔ "میرا خدا جانتا ہے کہ یہ الزام محض جھوٹ ہے۔ افترا ہے۔ مرحومہ جانتی ہے۔ مرحومہ کی روح جانتی ہے کہ یہ الزام جھوٹا ہے۔ بلکہ مرحومہ نے مرنے سے پہلے وصیت کی تھی۔ کہ ہارون سے محبت کرنا"۔
میں نے پوچھا "وہ کیسے"؟
خورشید نے کہا۔ "آپ کو اتنا تو معلوم ہے کہ بیگم صاحبہ بیمار تھیں۔ تیمارداری کرنے کے لئے خدمتگاروں کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ میں نے خدمت کے لئے آمادگی ظاہر کی۔ ہارون مجھے گھر لے گیا۔ اور اس کا دل جانتا ہے کہ میں نے کس محبت سے مرحومہ کی خدمت کی۔ وہ مجھ سے بہت مانوس ہو گئی تھی۔ اور اکثر "بہن خورشید" کہا کرتی تھی۔ ایک رات باتوں باتوں میں اس نے مجھ سے کہا۔
"بہن خورشید! کس محبت سے تم میری خدمت کر رہی ہو۔ خدا کی قسم میں تمہارے احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتی"۔
پھر کچھ سوچ کے بولی:-
"خورشید! تم نے مجھ سے اپنے گھر کی بات کبھی نہیں کی"۔
میں نے کہا:-
"کوئی گھر ہوتا تو آپ کو کچھ سناتی"۔
"آخر بال بچے بھی تو ہونگے"۔ مریضہ نے مسکرا کر پوچھا۔
"نہ گھر نہ گھاٹ۔ نہ بچے نہ خاوند"۔ میں نے ہنس کر جواب دیا۔
"تو کیا تم نے ابھی تک شادی نہیں کی"؟
"کی تو تھی لیکن بن نہ آئی"۔
"کیوں"؟ مریضہ نے پوچھا۔ "تم ایسی خوبصورت با سلیقہ بی بی سے کیوں بن نہ آئی"؟
"اللہ جانے"!
"تم کو اپنے میاں سے محبت تو ہوگی"؟
"بہت"! میں نے ہنس کر کہا۔
"کتنا عرصہ ہوا علیحدہ ہوئے"؟
"کوئی دو تین سال"!
"تب سے یتیم خانے ہی میں کام کرتی ہو"؟ (مرحومہ سے یہی کہا گیا تھا کہ خورشید لڑکیوں کے یتیم خانے میں ملازم ہے)
"اور کیا کرتی؟ آخر پیٹ بھی تو بھرنا تھا کسی طرح"۔
"پھر اور شادی کیوں نہ کر لی"؟

"پہلی شادی سے کیا پھل پایا تھا جو پھر اس جنجال میں پڑتی"!

"بہن خورشید"! مرینہ نے میرا ہاتھ پکڑ کر پوچھا۔ "تمہیں میرے سر کی قسم سچ کہنا۔ میاں کو کب سے جانتی ہو"؟

"کوئی دو تین سال سے"۔

"کیسے"؟

"میرے شوہر سے ان سے بہت مراسم تھے"۔

"اور پردہ"؟

"نہیں"! میں نے کہا۔ "میرا شوہر پردہ سے منع کیا کرتا تھا"۔

مرینہ یہ سن کر کچھ دیر خاموش رہی اور پھر کہا:۔

"خورشید! مجھے زندگی کی آس نہیں۔ لیکن ...."

"ایسا مت کہئے"! میں نے ٹوک کر کہا۔ "انشاءاللہ موسم بہار میں صحت ہوجائیگی"۔

"لیکن تم مجھ سے ایک وعدہ کرو"۔

"فرمائیے"!

"یوں نہیں"۔ مرحومہ نے کہا۔ "پہلے قسم کھاؤ کہ اپنا وعدہ پورا کروگی"۔

"لیکن کچھ معلوم بھی تو ہو"! میں نے ہنس کر کہا۔ "پھر قسم میں کھا لونگی"۔

"نہیں میرے سر کی قسم کھاؤ"! مرینہ نے بھی ہنس کر کہا۔ "کہ جو کچھ میں کہونگی تم ضرور مان لوگی"۔

"اچھا جیسے آپ کی مرضی"!

"سنو! اگر میں مرگئی تو میاں کو نہ چھوڑنا ......"

میں نے یہ سن کر سر جھکا لیا۔ اور مرینہ میرا ہاتھ پکڑ کر بولی:۔

"خورشید! اب اپنے وعدہ سے نہ پھرنا ورنہ روز محشر تمہارا دامن پکڑونگی"۔

"تو جناب"! خورشید نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ وہ سرگذشت ہے جو آج میں نے پہلی مرتبہ آپ سے بیان کی ہے۔ اگر ایک لفظ بھی جھوٹ کہا ہو تو پھر خدا کا عذاب مجھ پر نازل ہو اور حشر کے دن تک میری قبر جلتی رہے۔ بیگم صاحبہ کے مرنے کے چند روز بعد بے تقصیر، بے سبب، بغیر کچھ اتہ پتہ بتلائے انہوں نے مجھ سے ملنا جلنا ترک کردیا اور کوئی دو ماہ کے بعد ایسے غائب ہوئے کہ ہزار تلاش کیا کچھ پتہ نہ چلا۔ مجھے یہاں آئے آج اکیسواں دن ہے۔ خیال بھی نہ تھا کہ حضرت یہاں ہونگے۔ لیکن یہ بھی میری محبت کی صداقت کا ثبوت ہے کہ بچھڑے مل گئے۔ یہ ہے کل سرگذشت"۔

میرا ہاؤس بوٹ خورشید کے ہاؤس بوٹ سے کوئی میل بھر کے فاصلہ پر تھا۔ جب میں اپنی منزل پر پہنچا تو میرے دل میں یہ خیال آیا کہ میں نے اس بدنصیب عورت کو نہ کچھ تسلی دی ہے اور نہ امید دلائی ہے۔ جانے دل میں کیا سمجھتی ہوگی۔ ساتھ

ہی یہ فکر بھی دامنگیر ہوئی کہ مبادا ہارون جو اس عورت سے بھاگا پھرتا ہے۔ راتوں رات ہی کہیں غائب ہو جائے۔

میں اپنے دوست کی غلطی پر سخت متاسف تھا۔ میرے نزدیک خورشید ان عورتوں میں سے تھی جو اپنی وفا اور محبت اور ایثار سے اپنے محبوب کی زندگی کو جنت بنا دیتی ہیں۔ ایسی عورت کی قدر نہ کرنا کفران نعمت ہے۔ وہ عورت جو فطرتاً ناز برداریاں کرانے کی عادی ہو اگر خود کسی کے ناز اٹھانے لگے اور کسی کی خاطر اپنی دنیا بدلنے پر آمادہ ہو جائے تو اس کی گذشتہ زندگی کتنی ہی ناپاک کیوں نہ ہو وہ عورت قابلِ احترام ہے اور ہر شخص کا فرض ہے کہ اس کی مدد کرے تاکہ وہ اپنے عزم پر قائم رہ کر اپنی راہ سے بھٹکی ہوئی بہنوں کے لئے قابلِ تقلید بن جائے۔

ان خیالات کے زیر اثر میں علی الصباح پھر ہارون کے مکان پر پہنچا۔ رستہ میں دریا کی سیر بہت پر لطف تھی۔ آسمان سوسنی رنگ میں رنگا ہوا تھا اور کوہسار کی ہوا گویا افسونِ بیداری پڑھ پڑھ کر کائنات پر پھونک رہی تھی۔ شمال مغرب کی جانب ستارہ سحر کسی حسینہ کے آویزۂ گوش کی طرح چمک رہا تھا اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ "سن مرگ" کی فلک پیما برف پوش چوٹیاں اس سے کچھ راز کی بات کہہ رہی ہیں۔ رود بار جہلم کا آئینہ نما پانی بڑی سبک رفتاری کے ساتھ چل رہا تھا۔ شکارے کے ساتھ ساتھ چاندی کے ننھے ننھے جانور کلیلیں کرتے جاتے تھے اور ذرا سا غیر مانوس کھٹکا ہونے پر پارے کی طرح تلملا کر پانی میں غائب ہو جاتے آہستہ آہستہ مغرب کی جانب سے سوسنی رنگ کے آسمان پر ہلکی ہلکی سرخی پھیلنے لگی۔ معلوم ہوتا تھا کہ قدرت نے آفتاب کی فصد کھول دی ہے اور اس خون کی لالی انسان کے لئے پیغامِ عمل بن گئی ہے۔

میں نے ہارون کے مکان پر پہنچ کر اسکا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس نے مجھے دیکھا تو کہا:-

"آجاؤ! بہت سویرے آگئے۔ خیر تو ہے"؟

میں نے ہنس کر کہا:-

"تم ایسے سیلانی آدمی کا کیا اعتبار۔ کون جانے کہیں نکل جاؤ تو پھر شاید قیامت تک نہ ملو"۔

"بیٹھو"! ہارون نے ایک چوکی چارپائی کے پاس کھینچ کر کہا۔ "میں چائے لاتا ہوں"۔

"ابھی نہیں۔ ٹھہر کر چائے پئیں گے"۔

"تم جانو"! یہ کہہ کر وہ چارپائی پر بیٹھ گیا اور ہنس کر بولا۔ "تم تو صبح قرقی کرنے والوں کی طرح آدھمکے"۔

"ہارون"! میں نے کہا۔ "رات میں بہت دیر تک سوچتا رہا کہ تمہاری اس مصیبت کا اصلی باعث کیا ہے"۔

"تو پھر تم کس نتیجے پر پہنچے"؟

"میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ تم نے خدا کے ایک بندے سے بہت برا سلوک کیا ہے۔ ایک ایسے بندے سے جس نے نجات کے لئے تمہارا دامن پکڑا لیکن تم نے اسے دھتکار دیا"۔

"سمجھ گیا"! ہارون نے مسکرا کر کہا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ تم پر بھی خورشید کا جادو چل گیا"۔

"مجھ پر جادو کیا چلیگا"! میں نے کہا۔ "لیکن تم خوش قسمت ہو کہ مجھے اس سے بات چیت کرنے کا موقع ملا"۔

"پھر اس نے کیا کہا تم سے"؟

میں نے جو کچھ خورشید سے سنا تھا ہارون سے کہ دیا۔ وہ خاموش بیٹھا سنتا رہا اور پھر بولا :۔

"لیکن اس ظالم نے مرنے والی سے میرے اور اپنے تعلقات کا ذکر کیا۔"

"محض لوگرانی کی بکواس تھی"! میں نے کہا۔ "افسوس! تم اتنا تو سوچتے کہ اگر اس کے دل میں کچھ شرارت ہوتی تو رنڈی ہو کر مرحومہ کی خدمت کیوں کرتی اور خدمت بھی ایسی کہ خود تم کو اعتراف ہے"۔

یہ سن کر ہارون نے سر جھکا لیا۔ میں نے پھر کہا۔

"ہارون! خدا کی قسم! چراغ لے کر بھی ڈھونڈو تو خورشید ایسی عورت نہ ملیگی"۔

وہ خاموشی سے سنتا رہا۔

"اور پھر عیب سے پاک تو صرف خدا کی ذات ہے۔ اگر مان بھی لیا جائے کہ اس کی زبان سے کوئی لفظ اس قسم کا نکل بھی گیا تو کیا۔ کیا تمہارے دل میں اس کے ایثار اور اس کی خدمتوں کی کچھ قدر نہیں۔ ہارون! تم احسان فراموش تو کبھی نہ تھے۔ ذرا ٹھنڈے دل سے خورشید کے ایثار اور خدمتوں پر غور کرو اور پھر خدا لگتی کہنا کیا اس کی محبت کا صلہ یہی ہونا چاہیئے تھا"؟

ہارون نے پھر ایک لمبا سانس لیا اور میری طرف دیکھ کر آنکھیں جھکا لیں۔ میں نے کہا :۔

"خدا کی قسم! اس تمام وبال کا اصلی باعث صرف یہ ہے کہ تم نے . . . . . ."

ہارون بات کاٹ کر بولا۔ "لیکن دل نہیں مانتا"۔

"کیا نہیں مانتا"؟ میں نے پوچھا۔ "ذرا دل میں سوچو کیا کر رہے ہو۔ اور کس کے متعلق کر رہے ہو؟ معاف رکھنا اکل شام جو سلوک تم نے خورشید سے کیا۔ اور اس کے بعد جو حالات میں نے اس کی زبان سے سنے اب جو صلہ نہیں پڑتا کہ تم سے منہ دکھاؤں"۔

"پھر میں کیا کروں"؟ ہارون نے پوچھا۔ "ہاتھ جوڑ کر معافی مانگوں۔ یا . . . ."

"کون کہتا ہے"۔ میں نے بات کاٹ کر کہا۔ "کہ تم ہاتھ جوڑ کر معافی مانگو۔ عورت کی طرف اگر ایک بار محبت کی نگاہ سے دیکھ لو تو وہ سب کچھ بھول جاتی ہے۔ پیار کا ایک لفظ کہ دو تو وہ دنیا بھر کی خطائیں معاف کر دیتی ہے اور پھر خورشید ایسی عورت! بیشک مرحومہ فرشتہ سیرت عورت تھی۔ لیکن شکر کرو کہ خدا نے اس کا نعم البدل بھی تم کو ایسا ہی عطا کیا ہے کس قدر حماقت ہے کہ تم نے سنی سنائی بات پر تو اعتبار کر لیا۔ لیکن جس نے تمہاری خاطر دنیا بھر کی خاک چھانی اس کی سنے بغیر اس سے ایسے روٹھے کہ شہر چھوڑ دیا"۔

"قسمت"! ہارون نے ایک آہ بھر کر کہا۔ "قسمت"!

"کیوں پھر اب کیا ارادہ ہے تمہارا"؟

ہارون نے میری طرف دیکھا اور کہا :۔

"میں جس کے چنگل سے نکلا ہوں تم پھر اس کے چنگل میں مجھے پھنسانا چاہتے ہو۔ جو زنجیریں میں توڑ چکا ہوں تم چاہتے ہو کہ پھر انہی میں جکڑا جاؤں"۔

"نہ تو میں تمہیں کسی کے چنگل میں پھنسانا چاہتا ہوں نہ تم کو زنجیروں میں جکڑا دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم انصاف

کرو۔ اور خدا کے خوف سے ڈرو"۔

"میں انصاف کروں! خدا کے خوف سے ڈروں"!

"ہاں! ہاں! میں نے کہا۔" سنا نہیں خدا کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے"۔

ہارون دیر تک کسی گہری سوچ میں رہا۔ آخر میری طرف دیکھ کر بولا:۔

"تم سچ کہتے ہو۔ مجھے خورشید کا احسانمند ہونا چاہئے۔ میں اس کے پاس جاؤنگا۔ اور اس سے معافی مانگونگا۔ لیکن خدا کی قسم اس سے زیادہ میں اور کچھ نہیں کرسکتا"۔

"کہو تو میں اسے لے آؤں"؟

"نہیں! میں خود اس کے پاس جاؤنگا . . . . . . اس کا مجرم جو ٹھیرا"۔

میں نے ہارون کو اس کے ہاؤس بوٹ کا نمبر وغیرہ بتایا اور پوچھا۔

"کب جاؤگے"؟

"آج شام کے بعد۔ تم بھی میرے ساتھ چلوگے"؟

"نہیں! میں وہیں تم سے آملونگا"۔

رات ہوچکی تھی۔ نیلے نیلے آسمان پر تاروں نے اپنی محفل جما رکھی تھی۔ ہوا میں خنکی تھی اور "میراں کدل" میں ایک عجیب قسم کی رونق "فسٹ برج" پر بہت سے خوش فکرے کھڑے تھے۔ میں نے ایک شکارا لیا اور اس سے پوسٹ آفس کی طرف چلنے کو کہا۔ دریا میں ادھر ادھر جو ہوس بوٹ کھڑے تھے۔ ان میں بجلی کے لیمپ روشن ہوچکے تھے۔ اکثر لوگ شکاروں میں بیٹھے دریا کی سیر کا لطف اٹھارہے تھے۔ جب ہم پوسٹ آفس کے قریب پہنچے تو میں نے شکارے والے سے کہا کہ وہ ذرا کنارے کے ساتھ چلے اور دھیرے دھیرے شکارا چلائے۔ تھوڑی دیر کے بعد خورشید کا ہوس بوٹ نظر آیا۔ میں نے شکارے والے سے کہا کہ وہ ہوس بوٹ کے پاس سے ہوکر گذرے۔ خورشید کے ہوس بوٹ میں بجلی جل رہی تھی۔ کھڑکیاں کھلی تھیں اور ان کے سامنے ارغوانی رنگ کے ریشمی پردے پڑے تھے۔ جب میں نزدیک پہنچا تو ستار بجنے کی آواز سنائی دی۔ ستار کے نغموں میں سوز نہ تھا۔ خوشی اور مسرت کے نغمے تاروں سے نکل نکل کر فضا میں پھیل رہے تھے۔ جب میرا شکارا ہوس بوٹ کے مقابل آیا تو میں نے ذرا اٹھ کر اندر کی جانب دیکھا۔

خورشید صوفے پر بیٹھی ستار بجا رہی تھی اور اس کے زانوؤں پر سر رکھے ہارون لیٹا تھا۔ اس خوشی اور مسرت کے وقت میں نے مخل ہونا مناسب نہ سمجھا اور اتنی دیر میں میرا شکارا ہوس بوٹ سے آگے نکل چکا تھا +

ایم۔ اسلم

ناطق

جام باقی

لبوں پہ رندوں کے میکدہ کی شکایتیں ہیں مدام باقی
بقدر حاجت ہر اک کو مے دی ہر اک ہے پھر تشنہ کام باقی

ہوا کا جھونکا ہے یہ زمانہ جدھر کیا رخ اکھاڑ پھینکا
بہت سے ایسے مٹے کہ جن کا نہ نام باقی نہ کام باقی

گرے تو ہیں لڑکھڑا کے لیکن اسی طرف رخ کئے پڑے ہیں
ہے دل میں مستوں کے میکدہ کا ابھی تلک احترام باقی

جو آئے کعبہ سے میکدہ میں تو ہم نے بدلا نہ اپنا مشرب
وہی ہیں سجدے اس آستاں کے وہی قعود و قیام باقی

یہ سوچ کر خوش ہوا ابھی سے کہ جسم کا بوجھ ڈھو چکے ہم
ابھی نہیں روح کو فراغت ابھی بہت سے ہیں کام باقی

یہی ہے ساقی جو کال مے کا تو سن لے ہیں خوش مرا خدا خوش
اس اک مہینہ پہ کیا مقرر رہے ہمیشہ صیام باقی

چلے جو صیاد کی ہمیشہ تو باغ عالم ہو دم میں ویراں
ہوا کا جھونکا کچھ ایسا آیا نہ صید باقی نہ دام باقی

بدل گیا رنگ میکدے کا یہی ہے دور اخیر ساقی
نہ اپنی حالت میں اب ہے ساغر نہ اپنے بس میں ہے جام باقی

جہاں میں ساقی رہے ہمیشہ رچا بچا تیرا بادہ خانہ
جو خم ہے باقی تو مے ہے باقی جو مے ہے باقی تو جام باقی

نہ بیٹھ ناطق تو ہو کے غافل اٹھو اٹھو دور کا سفر ہے
بہت سے ساماں ہیں جمع کرنے ابھی بہت سے ہیں کام باقی

ابو العلا ناطق لکھنوی

فیض

سرودِ شبانہ

نیم شب۔ چاند - خود فراموشی
محفلِ ہست و بود ویراں ہے
پیکرِ التجا ہے خاموشی
بزمِ انجم فسردہ ساماں ہے
آبشارِ سکوت جاری ہے
چار سو بیخودی سی طاری ہے
زندگی جزوِ خواب ہے گویا
ساری دنیا سراب ہے گویا

سو رہی ہے گھنے درختوں پر
چاندنی کی تھکی ہوئی آواز
کہکشاں نیم وا نگاہوں سے
کہ رہی ہے حدیثِ شوقِ نیاز
سازِ دل کے خموش تاروں سے
چھن رہا ہے خمارِ کیف آگیں
آرزو - خواب تیرا روے حسیں

فیض احمد فیض

غلام عباس

محبّت کا گیت

شاہی باغ کے مالی کے نوجوان بیٹے چندر نے راجکماری پدماوتی کے حسین چہرے کی طرف کبھی آنکھ اٹھا کے بھی نہیں دیکھا۔ نہ راجکماری نے اس کی زبان سے کبھی کوئی بات سنی۔ اس پر بھی اسے پورا یقین ہے۔ کہ چندر مجھ سے محبت کرتا ہے۔

رات کو پچھلے پہر کے سناٹے میں راجہ کے محل سے کچھ دور ایک ویران ٹیلے سے بانسری کی ایک پرسوز صدا نالہ و فریاد کرتی ہوئی آتی اور راجہ کے محل کی دیواروں سے دیوانہ وار ٹکراتی اور راجکماری پدماوتی کی خوابگاہ تک پہنچ کر اسے بیدار کر دیتی۔ پدماوتی اپنی سیج پر تڑپتی۔ تلملاتی۔ غصے سے پیچ و تاب کھاتی۔ مگر بانسری کا یہ فسوں کار نغمہ اس کی مرضی کے خلاف اس کے کانوں سے اتر کر دل و دماغ اور بدن کے رونگٹے رونگٹے میں سرایت کر جاتا۔ وہ کروٹیں بدل بدل کر آخر اٹھ بیٹھتی۔ اس کی رگوں میں شاہی خون کھولنے لگتا۔ اسے ایسا محسوس ہوتا۔ گویا چندر بانسری کی لے میں اسے محبت کا گیت سنا رہا ہے۔ راجکماری کی محبت کا گیت! اور اس کے تن بدن میں آگ سی لگ جاتی۔ غیرت مند راجکماری ایک لمحہ کو بھی یہ گوارا نہ کر سکتی تھی۔ کہ چندر جیسا نیچ اس کی محبت کا دم بھرے۔ مارے غصے کے نیند اس کی آنکھوں سے اڑ جاتی اور وہ چندر کو اس کی گستاخی کی سزا دینے کی تجویزیں سوچنے لگتی ...... ننگے بدن پر بید لگائے جائیں .... بید جو اس کے گوشت کے ٹکڑے اڑا دیں ...... لوہے کی تپتی ہوئی سلاخوں سے آنکھیں پھوڑ ڈالی جائیں ...... ہاتھ کاٹ ڈالے جائیں تاکہ وہ پھر کبھی بانسری نہ پکڑ سکے .... یا پھر مست ہاتھی کے سامنے ڈال دیا جائے جو اپنی سونڈ اور پاؤں سے اسے چیر کر رکھ دے .....

کئی بار اس کے جی میں آیا کہ راجہ سے کہ کر اس گستاخ کو کیفر کردار تک پہنچائے۔ مگر بانسری بجانا کوئی جرم نہ تھا۔ وہ منتظر تھی کہ چندر سے کوئی ایسی حرکت سرزد ہو جو اس کی محبت کا راز آشکار کر دے۔ ایک دزدیدہ نگاہ۔ ایک حسرت بھری آہ۔ ایک آنسو کی بوند۔ اور وہ اس کا سر قلم کروا دے۔ مگر چندر کی محبت بظاہر ان باتوں سے بے نیاز معلوم ہوتی تھی۔ وہ اوّل تو اپنے باپ کے ہاں آتا ہی کم تھا اور جب آتا بھی تھا۔ تو ہمیشہ نظریں نیچی کئے رہتا تھا۔ ہاں بانسری ..... مگر بانسری بجانا کوئی جرم نہ تھا۔

کبھی کبھی خوشدلی کی حالت میں وہ چندر کی ذہانت کی داد بھی دیا کرتی تھی۔ بے شک اپنے جذبات کے اظہار کے لئے موسیقی سے بڑھ کر اور کوئی ذریعہ نہیں۔ یہ وہ زبان ہے۔ جس میں ہم ادنےٰ و اعلیٰ دوست و دشمن ہر ایک سے ہر قسم کی باتیں بے جھجک کہ لیتے ہیں مگر کوئی گرفت نہیں کر سکتا۔ حالانکہ وہ یہ باتیں خوب سمجھ لیتے ہیں لیکن پھر یہ احساس کہ وہ اس گستاخ کو سزا دلانے سے عاجز ہے اسے برہم کر دیتا۔ اور وہ بے قراری سے ادھر ادھر ٹہلنے لگتی۔

بعض اوقات اسے بانسری کی آواز صاف طور پر یہ کہتی ہوئی معلوم ہوتی۔ "راجکماری میں تجھ سے محبت کرتا ہوں۔ راجکماری میں تجھ سے محبت کرتا ہوں"۔ اور راجکماری ایک دیوانگی کے عالم میں اپنی سیج سے اٹھ بیٹھتی۔ اِدھر اُدھر ٹہلنے لگتی۔ محل کی مہتابی پر جا چڑھتی وہاں سے اتر کر صحن میں پھرنے لگتی۔ کنیزوں کے کمروں میں جاتی۔ مگر اس ڈر سے کہ وہ جاگ نہ اٹھیں۔ الٹے پاؤں لوٹ آتی۔ اور اس دوران میں بانسری کی لے ہر جگہ اس کا تعاقب کرتی۔ "راجکماری میں تجھ سے محبت کرتا ہوں ۔۔۔۔"

راجکماری کی خوابگاہ میں ایک کھڑکی تھی جس کے پاس کھڑی ہو کر وہ پائیں باغ کا نظارہ کیا کرتی تھی۔ ایک دن اس نے سوچا۔ کہ اسے بند کر دینا چاہیئے۔ شاید اس طرح بانسری کی آواز میرے کانوں میں نہ پہنچنے پائے۔ چنانچہ سر شام ہی سے دریچہ بند کر دیا گیا۔ اور پدماوتی اپنی سیج پر سکھ کی نیند سو گئی۔

ٹھیک آدھی رات کو جب سارا رنواس نیند میں مدہوش تھا۔ یکبارگی راجکماری چونک اٹھی۔ اسے ایسا معلوم ہوا۔ جیسے اس کے باغ کا کوئی خوش الحان پرندہ جسے اچانک شکاری کے تیر نے زخمی کر دیا ہے۔ اس کی خوابگاہ کی کھڑکی کے باہر بڑی دردناک آواز سے چیخ رہا ہے۔ معلوم ہوتا تھا۔ زخم بہت کاری ہے۔ اور وہ اپنی مالکہ کو جلد سے جلد اپنی حالت سے آگاہ کر دینا چاہتا ہے۔ مگر کھڑکی کے پٹ اس کی راہ میں حائل ہیں۔ اور وہ کرب آلود چیخوں سے اپنی مالکہ کو بلا رہا ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔

مجبوراً راجکماری نے کھڑکی کھول دی اور پھر بانسری کی وہی سوز بھری لے۔ "راجکماری میں تجھ سے محبت کرتا ہوں ۔۔۔۔"

راجکماری روز روز کی بے خوابی اور غموں فکروں سے گھلتی جا رہی تھی۔ چہرے کا رنگ زرد پڑتا جا رہا تھا۔ اور وہ چپ چپ اور اُداس اداس سی رہنے لگی تھی۔ راجہ اور رانی نے اس کی یہ حالت دیکھی۔ تو بیحد فکرمند ہوئے دُور دُور کے طبیب اور وید بلائے گئے۔ مگر پدماوتی کے اصل مرض تک کسی کی دوربین نگاہ نہ پہنچ سکی۔ اس کی حالت اور بھی ابتر ہوتی گئی۔ وہ سارا سارا دن بستر پر پڑی رہتی۔ اس کی سکھیاں اس کے دل کا حال پوچھتیں۔ مگر وہ کچھ جواب نہ دیتی۔ اور جب رانی کی التجاؤں کی حد نہ رہتی۔ تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی لیکن چندر کے متعلق ایک لفظ بھی اس کی زبان سے نہ نکلتا۔

پورن ماشی کی رات ہے۔ راجکماری پدماوتی محل کی مہتابی پر اپنی سیج پر پڑی ہے۔ راجہ رانی اور دوسرے لوگ بے حد فکرمندی کی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ چودھویں کا پورا اور گول چاند ایک بدلی میں سے نمودار ہوتا ہے۔ راجکماری یکبارگی آنکھیں کھول دیتی ہے۔ کچھ دیر ٹکٹکی لگائے اسے تکتی رہتی ہے۔ پھر آپ ہی آپ مسکرانے لگتی ہے۔ راجہ رانی بڑے غور سے اس کی یہ حرکات دیکھتے ہیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ انہیں ان باتوں پر خوش ہونا چاہیئے یا افسردہ۔ اور وہ ایک دوسرے کا منہ دیکھ دیکھ کر خاموش رہ جاتے ہیں۔ داسیاں راجہ رانی کا منہ تک رہی ہیں۔ نہیں جانتی کہ مسکرائیں یا رونی صورت بنائیں۔

آدھی رات گزر جاتی ہے۔ راجہ رانی اور دوسرے لوگ بدستور راجکماری کی سیج کے آس پاس بیٹھے ہیں۔ راجکماری کچھ سو رہی ہے کچھ جاگ رہی ہے۔ یکایک وہ چونک اٹھتی ہے۔ اسے ایسا محسوس ہوتا ہے۔ گویا ابھی ابھی اس کے کانوں میں کسی اپسرا کے بین کرنے کی آواز پہنچی ہے۔ بلاشبہ یہ کوئی اپسرا ہی ہے۔ جو اس فانی دنیا کے کسی مرد کی بیوفائی پر آسمانوں پر روتی پھرتی ہے۔ راجکماری تکیے پر سے سر اٹھا اٹھا کر ادھر ادھر فضاؤں میں اپسرا کو ڈھونڈنے لگتی ہے۔ لیکن جلد ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا ہے۔ بیشک یہ چندر

کی نے نوازی کا کمال ہے جو بانسری کی لے کو مختلف آوازوں میں تبدیل کر سکتا ہے۔

وہ نیم دیوانگی کے عالم میں اٹھ کر سیج پر بیٹھ جاتی ہے اور سوچتی ہے کہ اس گستاخ کو سزا دلانے کی اب صرف یہی صورت ہے کہ اسے یہاں بلوا کر سب کے سامنے بانسری بجانے کو کہا جائے۔ ممکن ہے پتاجی یا ماتا جی بانسری کا گیت سن کر اس کے دل کا بھید جان لیں۔ چنانچہ پہلی مرتبہ اپنی نسوانی حیا پر غالب آ کر پدماوتی راجہ سے کہتی ہے۔

"پتاجی آپ نے آواز سنی"؟

"کیسی آواز"؟

"جیسے کوئی بانسری بجا رہا ہے"۔

"نہیں بیٹی ...... ہاں ہاں آ تو رہی ہے لیکن بہت ہی دھیمی آواز ہے"۔

"پتاجی میرا جی چاہتا ہے۔ کہ اس بانسری بجانے والے کو یہاں بلاؤں۔ اور اُسے اپنے سامنے بانسری بجاتے سُنوں"۔

راجہ خوشی خوشی ایک خادم کو بلا کر کہتا ہے کہ سامنے کے ٹیلے پر جو شخص بانسری بجا رہا ہے اُسے بلا لاؤ۔ خادم چلا جاتا ہے۔ راجکماری پھر بستر پر لیٹ جاتی ہے۔ آنکھیں بند کر لیتی ہے۔ اور کان بانسری کی آواز پر لگا دیتی ہے۔ تھوڑی دیر میں آواز ختم جاتی ہے۔ راجکماری جان لیتی ہے کہ خادم چندر کے پاس پہنچ گیا۔

سائے کی طرح آہستہ آہستہ چلتا ہوا۔ پھٹی سی دھوتی باندھے۔ نحیف و نزار چندر بانسری لئے راجہ کے سامنے پیش ہوتا ہے۔ سیج پر پڑی ہوئی راجکماری کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ اٹھ کر بیٹھ جائے۔ مگر وہ اس جذبے کو دبا لیتی ہے۔ اور لیٹے لیٹے اس کی طرف منہ پھیر کر اُسے دیکھتی ہے۔ مگر وہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کے بھی نہیں دیکھتا۔

راجہ پوچھتا ہے۔ "اے نوجوان تم کون ہو"؟

چندر کہتا ہے۔ "میں شاہی باغ کے مالی کا بیٹا چندر ہوں"۔

راجہ پوچھتا ہے۔ "اس سامنے کے ٹیلے پر بانسری تم ہی بجا رہے تھے"؟

چندر کہتا ہے۔ "ہاں"۔

"روز بجایا کرتے ہو"؟

"ہاں"

"آدھی رات کو"؟

"ہاں"۔

"کیوں بجاتے ہو"؟

چندر اس کا کوئی جواب نہیں دے سکتا۔ اور وہ نظریں زمین پر گاڑ دیتا ہے۔ راجہ کی نظر پدماوتی پر پڑتی ہے۔ جو نہایت بےچینی سے ان دونوں کی طرف دیکھ رہی ہے۔ راجہ گھبرا کر چندر سے کہتا ہے۔ "میری بیٹی تمہاری بانسری سننا چاہتی ہے۔ اُسے سناؤ"۔

راجکماری کے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر تبسم کھیلنے لگتا ہے۔ مگر چندر اب بھی اس کی طرف نہیں دیکھتا۔ اور بانسری ہونٹوں کے پاس لے جاتا ہے۔ اور وہی نغمہ الاپنا شروع کرتا ہے جس سے شہزادی کے کان مدت سے آشنا ہو چکے ہیں۔

"راجکماری میں تجھ سے محبت کرتا ہوں۔۔ دیکھا میرا سچا پریم مجھے تیرے قدموں میں لے آیا۔ لیکن کیا اس سے میری محبت کی آگ ٹھنڈی ہو جائیگی؟ آہ نہیں۔ وہ تو صرف اس وقت بجھیگی جب تو ——"

راجکماری ہاتھ سے اشارہ کرتی ہے۔ کہ بس ٹھہر جاؤ۔ وہ حیران ہے۔ کہ بانسری کی یہ صاف صاف باتیں۔ محبت کا یہ کھلا ہوا اظہار یہ بینابیاں۔ یہ ولولے راجہ اور رانی کیوں نہیں سمجھ سکے۔

راجہ پھر چندر سے پوچھتا ہے۔ "نوجوان۔ تم نے میری بات کا جواب نہ دیا۔ میں نے پوچھا تھا۔ کہ تم یوں آدھی رات کو ٹیلے پر چڑھ کر بانسری کیوں بجاتے ہو"؟

چندر پھر خاموش رہتا ہے۔

راجہ تیسری مرتبہ پوچھتا ہے۔ اور اس دفعہ اس کا لہجہ تحکمانہ ہے۔ "نوجوان بولو۔ جواب کیوں نہیں دیتے"؟

چندر آہستہ آہستہ سر اٹھا کر راجہ کی طرف دیکھتا ہے۔ راجہ کو چاندنی میں اس کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں میں آنسو چھلکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ چندر اب راجہ سے اپنا دلی راز کہ دینے پر آمادہ ہے۔ راجکماری سیج پر اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے۔ اس دفعہ وہ اس جذبہ کو دبا نہیں سکتی۔ چندر راجہ کے قریب آجاتا ہے اور ایک ایسی آواز میں جو سانس سے ذرا ہی اونچی ہے کہنا شروع کرتا ہے:-

"بچپن میں میرا چھوٹا بھائی گوپال وبا میں مبتلا ہو کر مر گیا۔ میں اس کی تتلی باتوں کا شیدائی تھا اور وہ میری بانسری کا عاشق۔ کئی برس گزر گئے۔ مگر اس کی باتوں کی یاد دل سے نہیں مٹتی۔ اور میں آدھی رات کو جبکہ ہر طرف سناٹا ہوتا ہے ٹیلے پر چڑھ کر کرشن مہاراج سے بانسری کے ذریعے اس ظلم کی شکایت کرتا ہوں جو میرا بھائی چھین کر مجھ پر کیا گیا ہے۔۔۔۔ اور بس"

راجکماری اپنے اعضا کو سیج پر اس طرح پٹک دیتی ہے۔ جس طرح موتیوں کی مالا ٹوٹ جائے۔ اور دانے بکھر جائیں۔ ایک آنسو آنکھ سے پھوٹتا ہے۔ اور پلکوں میں آکر اٹک جاتا ہے۔ پدماوتی اسے پونچھنے کی کوشش نہیں کرتی۔ اور وہ آنسو کا قطرہ پلک پلک پھرتا اس کی چولی میں آگرتا ہے۔ آج اس پر پہلی مرتبہ اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے۔ کہ اس تمام دوران میں چندر اس سے نہیں۔ بلکہ وہ خود چندر سے محبت کرتی رہی ہے۔

غلام عباس

پجاری

ہندوستان میں بدھ مت کے زمانے میں دستور تھا اور جاپان میں اب بھی دستور ہے کہ افلاس زدہ والدین اپنی لڑکیوں کو امیر لوگوں کی خدمت گزاری کیلئے مندروں اور اجارہ داروں کے پاس چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ لڑکیاں "گیشا" کہلاتی ہیں۔ گیشا کی تربیت ایک اجارہ دار گیشا کے گھر میں ہوتی ہے۔ اسے خاطر مدارات، معاشرتی تہذیب، شیریں سخنی، موسیقی اور رقص کی تعلیم دی جاتی ہے۔ مختلف شاعروں کے گیت اور اشعار یاد کرائے جاتے ہیں۔ خوبصورت اور حسین بننے کا فن سکھایا جاتا ہے۔ بارہ تیرہ سال کی عمر تک اس کی انتہائی سختی سے نگہداشت کی جاتی ہے۔ سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں وہ اپنے فن میں کمال حاصل کر کے پہلی مرتبہ لوگوں کے سامنے آتی ہے۔ اور اگر خوبصورت اور ہوشیار ہو تو ہر جگہ اس کی مانگ ہوتی ہے۔ آہستہ آہستہ اپنے شہر کے تمام ممتاز افراد سے روشناس ہو جاتی ہے۔ اس کی زندگی صرف رات کی زندگی ہے۔ وہ حواس کھونے کے بغیر "ساکی" پینا جانتی ہے۔ اس کے متعدد شیدائی ہوتے ہیں۔ ایک حد تک اسے اظہار محبت کے لئے آزادی بھی حاصل ہوتی ہے۔

"گیشا" لڑکیاں عیاشانہ قسم کا رقص و سرود بھی جانتی ہیں لیکن معمولی تقریبوں اور مہذب حلقوں میں وہ قدیم مقدس جاپانی ناچ ناچتی ہیں۔ وہ ہلکی سے ہلکی آواز پیدا کئے بغیر پیالوں میں "ساکی" انڈیلنا جانتی ہیں۔ ان کا لباس نہایت خوش وضع اور قیمتی ہوتا ہے۔ ان کی کمر کے گرد شہزادوں کی طرح پٹکے ہوتے ہیں۔ ان کے گندھے ہوئے بال خوبصورت اور خوش رنگ پھولوں سے آراستہ ہوتے ہیں۔ گیشا کی زندگی ظاہراً نہایت شیریں معلوم ہوتی ہے۔ لیکن حقیقت میں بہت تلخ ہوتی ہے۔ اور سنسان کمروں کی تنہائی میں بسر ہوتی ہے۔ قدیم زمانے کی گیشائیں آجکل کی گیشاؤں جیسی نہ تھیں۔ انہیں میں سے ایک کے متعلق یہ کہانی ہے۔

یشمازاکی ٹوسون

(جاپانی افسانہ)

پجاری

بوڑھا ٹوزیو بدھ مت کا پجاری اپنی دھن میں مست، چلتے چلتے گیشاؤں کی گلی میں جانکلا۔ گیشاؤں کے محلات گلی میں دو رویہ چلے گئے تھے۔ ان کی ظاہری زیب و زینت اور آرائش کو دیکھ کر اس نے کہا "گیشاؤں کے عشرت کدوں اور خدائے بدھ کے مندر میں کس قدر فرق ہے"۔

یہ ایک تنگ سی گلی تھی۔ چھوٹی چھوٹی، رنگ رنگ کی جاپانی قندیلوں کی روشنی سے منور۔ ٹوزیو نے ایک جگہ لکھا ہوا دیکھا۔ "سنہری گھر جس میں ادما رہتی ہے"۔ ایک دوسرے مکان پر لکھا تھا۔" یہاں ساریشا اپنی دلفریب رعنائی کے ساتھ مقیم ہے"۔

آہ! ٹوزیو نے کہا۔" گناہوں میں پھنسے ہوئے لوگوں کے لئے کوئی نجات نہیں۔ یہ ناچنے والی لڑکیاں اس چیز پر کیوں کر غور کرسکتی ہیں جو غور کرنے کے قابل ہے۔ وہ گلی میں سے گزر رہا تھا۔ ایک گھر سے قہقہوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اور اس سے ذرا آگے رقص کی جھنکار اور سازوں کی سریلی صدائیں۔ ٹوزیو نے جوش میں آکر کہا۔" او غفلت کیشو۔ ایک پل کی خوشی چاہنے والو خدا سے دعا کرو کہ وہ تمہیں چپ رہنے کے فوائد اور زیادہ بولنے کی خرابیوں سے آگاہ کرے"۔ ٹوزیو تیزی سے چل رہا تھا کیونکہ وہ بیتاب تھا کہ وہ شرفا کے بازاروں میں پہنچ جائے۔

قندیلیں ہوا سے ہل رہی تھیں۔ ان کی روشنی میں بوڑھا ٹوزیو اپنی مالا پھیرتا۔ پرارتھنا کے منتر گنگناتا چلا جا رہا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ اس گلی سے بہت دور نکل جائے۔ وہ چلا جا رہا تھا کہ اس کا دوست اکرہا اس کو ملا۔

"ٹوزیو تم یہاں"؟ اکرہا نے کہا۔" کیا تم اس گلی کو گناہ اور حماقت کا سرچشمہ، نہیں کہا کرتے۔ کیا تم لوگوں کو اس میں جانے سے منع نہیں کرتے۔ پھر تم خود یہاں کیسے پھر رہے ہو۔ اے دیوتاؤں کے پجاری تمہیں تو اپنے مندر میں ہونا چاہئے تھا۔ جہاں لوگ رات کی خاموشی میں صدیوں کے بوسیدہ منتر پڑھتے پڑھتے اگلے جنم کے خیال میں اونگھتے ہوئے گہری نیند سو جاتے ہیں۔ ٹوزیو مسکرایا "میرے دوست" اس نے کہا۔" کیا اس محتاج رحم گلی میں کسی کا بھول کر آجانا بہتر ہے یا تمہاری طرح ارادتاً اور کسی مطلب کو لے کر آنا؟ مہربان من! تم یقین جانو کہ تمام دنیا کی کلفتیں ان عورتوں کے دروازے پر دھری رہتی ہیں۔ جب وہ اشاروں سے تم کو بلائیں تو ان کے اشاروں کی پرواہ نہ کرو۔ ان کی چمکیلی آنکھوں اور دلکش باتوں سے، ان کے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے جو ہر وقت" ساکی" انڈیلتے رہتے ہیں۔ اور ان کے دلفریب ناچ سے دور بھاگو کیونکہ یہ سب چیزیں تباہی اور آگ کی طرف لے جانے والی ہیں۔ ان کے برف کی طرح سفید بازو جو ریشمی آستینوں کے اندر سے بلور کی مانند نظر آتے ہیں اور ان کے گلاب کی طرح رنگین رخسار دیکھ کر مرعوب نہ ہو جاؤ۔ یہ سب افیون کی طرح مہلک اور نقصان دہ ہیں۔ گیشا دیکھنے میں شوخ اور حسین لطیف اور نوخیز نظر آتی ہے۔ لیکن حقیقت میں ایک عیارہ ہے نوجوانوں کو تباہ کرنے والی۔ خاندانوں کا نام مٹا دینے والی ——

تمہیں چاہیئے کہ مہاتما بدھ کے احکام پر غور کرو۔ ان پر عمل کرنے کی کوشش کرو۔"

اکر ہا نے بوڑھے پجاری کے جسم کو چھو کر کہا دیکھو کتنا خشک جسم ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں خون نام کو بھی نہیں۔ بیشک تم ایک بلند مرتبت پجاری ہو لیکن میں یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ تم عورتوں کے معاملے میں اپنے آقا کا سا استقلال اور التفات نہیں رکھتے تم ان کے معاملے میں ہمیشہ سے سخت اور تنگ دل واقع ہوئے ہو۔ یہ سب اس لئے ہے کہ تمہارا دل دنیائی لذتوں سے ناآشنا رہا ہے۔ تمہارا جسم اس مردہ کی طرح ہے جو عرصے سے دفنایا نہ گیا ہو۔

ٹوزیو نے سنجیدگی سے کہا۔" اوگیشاؤں کی گلی میں خوش و خرم پھرنے والے۔ جب تو حد سے بڑھی ہوئی خواہشات سے اکتا جائے اور تیرا دل دنیائی لذات سے بیزار ہو جائے اور سب سے زیادہ یہ کہ جب تیرے دل کو کوئی عورت اپنی جفا سے توڑ ڈالے تو اس وقت تو میرے پاس آئیو۔ میں تجھے اطمینان قلب اور ابدی زندگی حاصل کرنے کا راستہ بتاؤں گا۔" پجاری یہ کہہ کر چلا گیا۔

اکر ہا پجاری کو جاتے ہوئے دیر تک دیکھتا رہا۔ اسے اس کی حالت پر رحم آرہا تھا۔ وہ بولا۔ دنیا کی لذتوں سے محروم۔ کس قدر قابل رحم ہستی ہے۔ یہ ان لوگوں میں سے ہے جنہوں نے خوشگوار زندگی کو ایک موہوم دنیا کے تصور میں تیاگ رکھا ہے!

اکر ہا نے خوش ہو کر کہا یہ خوش قسمتی ہے کہ تمام دنیا پجاریوں کی نہیں کیونکہ پھر گیشاؤں کے لئے کوئی جگہ نہ رہتی۔

پجاری گلی سے جا چکا تھا۔ اکر ہا چلتے چلتے ایک مکان کے آگے آکر رک گیا۔ دروازے پر لکھا تھا۔ "خوشبوؤں سے معطر کلی"۔ اس نے دروازے پر دستک دی۔

گھر کی منتظمہ نے آکر دروازہ کھولا۔ اکر ہا کو پہچان کر بولی۔ "میں تمہارا اس ٹوٹے پھوٹے گھر میں آنا باعثِ عزت سمجھتی ہوں مگر تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ تمام لڑکیاں کسی تقریب کے سلسلہ میں باہر جا چکی ہیں۔"

"سب جا چکی ہیں"؟ اکر ہا نے مایوس ہو کر پوچھا۔

"ہاں صرف کوہانہ گھر میں موجود ہے"۔ یوشیما گھر کی منتظمہ نے ہنس کر کہا۔" تم کوہانہ سے ملنا چاہتے ہو"؟

اکر ہا نے کہا۔" یوشیما یہ تمہاری مہربانی اور عنایت ہے کہ تم مجھ سے کوہانہ سے ملنے کو کہتی ہو۔"

یوشیما بولی۔" بہت سے آدمی یہاں اسی مطلب کے لئے آتے ہیں۔ بیشتر اس سے شادی کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ وہ سب کے سب اسے بڑی بڑی رقمیں دینے کو تیار ہیں۔ مگر کوہانہ صرف مسکرا دیتی ہے۔ وہ زندگی کو مذاق تصور کرتی ہے۔ کوئی بتا نہیں سکتا کہ اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے۔ وہ انسان کی سمجھ سے بالاتر ہے۔"

یوشیما نے ایک چھوٹے سے کمرے کے آگے سے ایک خوبصورت اور نقش و نگار سے مزین پردے کو ہٹا کر اکر ہا کو داخل ہونے کی دعوت دی۔ اور خود واپس چلی گئی۔ کمرے میں روشنی بالکل مدھم تھی۔ اکر ہا کو خیال ہوا۔ کہ اکیلا ہے لیکن تھوڑی دیر کے بعد اس نے دیکھا کہ کوہانہ ایک کونے میں زرنگار فرش پر بیٹھی، چہرے پر جاپانی ساخت کا پنکھا رکھے اس کے پیچھے سے جھانک رہی ہے۔ وہ فاختئی رنگ کا خوبصورت لباس جس پر سفید ریشم کے پھول کڑھے ہوئے تھے پہنے بیٹھی تھی۔ "کوہانہ"۔ اکر ہا نے پر اشتیاق لہجے میں کہا۔" یوشیما نے میرے دل کو مجروح کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ تم جانو میں تمہارے بغیر زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہ سکتا جس دن سے تمہیں خدائے بدھ کے تیوہار پر ناچتے دیکھا ہے میں تم سے

محبت کرتا ہوں۔

کوہانہ نے ہنس کے کہا: "میں نہیں سمجھتی کہ میں کس کس کی محبت کا جواب دے سکتی ہوں۔ کل رات شمزد یہاں تھا۔ اس نے مجھ سے محبت کی میٹھی میٹھی اور دلکش باتیں کیں۔" وہ اپنی آنکھوں میں آنسو بھر کر بولا۔ "میرا دل ایک خشک جھیل کی مانند تھا۔ لیکن اب ایک اتھاہ جھیل ہے۔ جو چاند اور تاروں کی روشنی سے نورانی ہے۔"

کیا یہ سوز اور درد سے لبریز تقریر نہیں؟

اگرہا نے آزردہ دل ہو کے کہا۔ "میں ایسی باتوں کی پروا نہیں کرتا۔"

کوہانہ نے کہا۔ "تو کیا میں آپ کو وہ باتیں بھی سناؤں جو اور لوگ کرتے ہیں"؟

"نہیں ہرگز نہیں۔"

"آپ ناراض ہیں۔ میں آپ کی پیشانی پر غصے کی علامات دیکھتی ہوں۔ اگر ایسا ہی ہے تو میں آپ کے لئے گیت گا سکتی ہوں۔ اور ناچ ناچ سکتی ہوں۔ اگرہا میں چاہتی ہوں۔ میری دلی خواہش ہے کہ تم مجھے کسی کام کا حکم دو۔"

"نہیں کوہانہ۔"

"نہیں کوہانہ"! کوہانہ نے اگرہا کے الفاظ کو دہرا کے کہا۔ "اچھا تو میں تمہارے لئے ارغوانی ساکی کا جام بھر سکتی ہوں۔ میں تمہاری خوشی کے لئے سب کچھ کر سکتی ہوں۔ اگرہا آج تمہاری صحبت کس قدر خشک ہے شاید میرے لفظوں سے تمہارے نازک دل کو رنج پہنچا ہے۔ میں شام سے اکیلی۔ دھندلے تصورات لئے مغموم بیٹھی تھی۔ تمہاری آمد سے میرے دل کو بیحد مسرت حاصل ہوئی۔ لیکن غلطی سے میں نے تمہارے سامنے دوسروں کا ذکر کر کے تمہیں افسردہ کر دیا۔ اگرہا اب میری خاطر مسکرا دو۔ تمام باتوں کو بھول جاؤ۔ تمہارا آنا میرے لئے باعثِ عزت ہے۔"

"نہیں کوہانہ میں افسردہ نہیں"۔ اگرہا کی آواز تھرتھرا رہی تھی۔ "تم ایک دلکش اور چمکیلے پروں والی تیتری کی مانند ہو جو گلشن میں خوش رنگ پھولوں کا رس چوستی رہتی ہے۔"

"اگرہا یہ کس قدر بلند خیالی ہے۔ تم شاعروں کے سے جذبات رکھتے ہو۔"

مگر اگرہا نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "کوہانہ محبت کے چمن میں ایک پھول ہے جو چاہتا ہے کہ خوبصورت پروں والی تیتری ہر وقت اس کے اردگرد منڈلاتی رہے۔ اس کی خواہش ہے کہ وہ کسی دوسرے پھول کے پاس نہ جائے۔

"کچھ سمجھتی ہو کوہانہ"؟

"شاید"۔ کوہانہ نے مسکراتے ہوئے کہا اور ایک مرصع آئینہ اٹھا کر زرنگار سنگاردان سے سنگار کی اشیا نکالیں۔ اپنے بالوں کو درست کیا۔ لبوں پر مسی کی ایک اور تہ جمائی اور خوش رنگ غازہ سے اپنے رخساروں کو جلا دی۔ اور عرصے تک آئینہ میں اپنا منہ دیکھتی رہی۔

آخر کوہانہ نے اپنی خوبصورت آنکھوں کو آئینہ سے اٹھایا اور ایک دلکش انداز سے کہا۔ "اگرہا تمہاری تیتری کے بازو ہمیشہ خوبصورت نہیں رہینگے۔ وقت قریب ہے کہ تیتری شکستہ پر ہو جائیگی۔ تم اپنی تیتری کے حسن اور اس کی زندگی کو سمجھنے میں غلطی کر رہے ہو۔"

"کچھ بھی ہو لیکن میں نہیں چاہتا کہ میری تیتری کسی اور پھول کو پسند کرے۔ میری یہی تمنا ہے کہ وہ میری ہو کر رہے۔"

کوہانہ نے کہا: "لیکن جب تیتری ایک پھول سے اڑ کر دوسرے پھول تک نہ جا سکے گی تو اس کی خوبصورتی مٹ جائیگی۔ کس قدر دردناک انجام ہے۔"

"نہیں میں اسے ایک شاندار انجام سمجھتا ہوں۔ کوہانہ میں تمہارے بغیر جی نہیں سکتا۔"

"اکرہا میں تمہارے مصائب کو اچھی طرح جانتی ہوں ان سب سے زیادہ جو یہاں آتے ہیں اور جنہوں نے آج تک مجھے چاہا ہے میں تمہیں پسند کرتی ہوں۔ مگر اکرہا یہ ہرگز نہ بھولو کہ میں دیوتاؤں کے آگے اور امرا کے سامنے بیاہ شادی یا تیوہار کے موقع پر ناچنے والی گیشا ہوں۔ ہم نے دیوتاؤں کے روبرو زندگی کو یونہی بسر کرنے کی قسم کھائی ہے۔ ہمیں اس زندگی سے آزادی حاصل نہیں ہو سکتی۔ گو ہم میں سے بعض اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر شادی کر لیتی ہیں۔ مگر میں کبھی ایسا نہ کرونگی۔ میں اپنی قسم کو ہرگز نہ توڑونگی۔"

اکرہا نے اس کی طرف رحم بھری نظروں سے دیکھا۔ اور کہا "جب ہم محبت کرتے ہیں تو صاحب عقل نہیں ہوتے۔ محبت ایک سمندر ہے۔ جب جوش میں آتا ہے تو ہر ایک چیز کو بہا کر لے جاتا ہے۔ میرے دل سے امید منقطع نہیں ہوگی۔ میں متواتر آتا رہونگا۔"

"اکرہا تمہارا آنا کچھ مفید نہ ہوگا۔ تمہیں سب کچھ بھول جانا چاہیئے۔"

کوہانہ کے خوبصورت ہاتھ کو جو ہلکے خاکی رنگ کی آستین سے باہر نکل آیا تھا اکرہا نے اپنے دونو ہاتھوں میں تھام لیا۔ پھر یکایک اسے اپنے ہونٹوں تک لے گیا۔ اور کچھ کہے بغیر چلا گیا۔

اکرہا ہفتوں کوہانہ کو دیکھنے اور ملنے کے لئے آتا رہا۔ کوہانہ ہمیشہ خندہ پیشانی اور تپاک سے اس کا استقبال کرتی تھی۔ لیکن بار بار واپس چلے جانے کو کہتی تھی۔ ایک رات کوہانہ نے کہا اگر تم کو مجھ سے سچی محبت ہے تو اس محبت کا واسطہ دے کر میں تم سے کہتی ہوں کہ تم میری یاد اور الفت کو شہر کے ہنگاموں سے دور سمندر کے ساحل پر انسان کی نظر سے پوشیدہ دفن کر آؤ۔ تمہارا رنج و غم بیسود ہے اور میرے لئے تکلیف دہ۔ تمہارا چہرہ اور اس کی یاد میری راتوں کے پرمسرت لمحوں میں آ کر حائل ہوتی ہے۔ تم میری روح میں آہستہ آہستہ غم بن کر سمائے جا رہے ہو۔ راحت کے خواب دیکھنے والی تیتری۔ ٹھنڈی ہوا اور خوش رنگ بادلوں میں رہنا چاہتی ہے۔" میں تا دم مرگ یہیں رہا کرونگی اکرہا۔ تا دم مرگ۔" کوہانہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اکرہا نے آج تک اس کی آنکھوں میں آنسو نہ دیکھے تھے۔ اس نے ایک آہ بھر کر کہا۔ "کوہانہ کیا واقعی تمہارا دل یہی چاہتا ہے کہ میں ہمیشہ کے لئے چلا جاؤں۔ میں اپنے خوابوں کی تعبیر نہ دیکھوں اور اپنی محبت کے شجر کو پھلنے پھولنے سے پہلے اپنے ہاتھوں آپ ہی تباہ و برباد کر دوں۔ اگر تمہاری یہی مرضی ہے اور تم دل سے یہی چاہتی ہو تو میں قسم کھاتا ہوں کہ میں اپنی محبت کو ہمیشہ کے لئے دفن کر دونگا۔ تم مجھے کبھی نہ دیکھوگی۔"

کوہانہ بالکل چپ تھی۔

"خدا حافظ۔" اکرہا نے کہا۔ "اب تم بھی مجھے ہمیشہ کے لئے بھول جاؤ۔"

اس نے اپنی زندگی میں آخری بار کوہانہ کے ہاتھ کو چوما اور آنکھوں سے لگایا۔ اور کہا۔ "کوہانہ اپنی آنکھیں بند کر لو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے جاتے ہوئے نہ دیکھو۔ یہ بات میرے لئے رنجدہ ہے کہ خوش رنگ تیتری کوئی پر درد نظارہ دیکھے۔"

کوہانہ نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ جب اس نے انہیں کھولا تو اکرہا جا چکا تھا۔ اس نے کہا "یہی بہتر ہے"۔ اور آہستہ سے سر اٹھایا۔ مگر ——

اس کی آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے اور اس کا خوبصورت عکس مدھم پڑ گیا۔ آئینہ میں کوئی دل افروزی باقی نہ رہی۔ وہ دونوں ہاتھوں میں اپنا سر دبائے، بےحس و حرکت فرش پر گر پڑی۔ "خوبصورت تیتری" کے سینے میں دبا ہوا سوز بھڑک اٹھا وہ محبت کی آگ میں جلی جا رہی تھی۔ تڑپ رہی تھی ——

اکر ہا گیشاؤں کے کوچہ سے ہمیشہ کے لئے جا رہا تھا۔ اسے علم نہ تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ وہ چلتے چلتے اس مندر کی طرف جا نکلا جہاں بوڑھا پجاری ٹوزیو رہتا تھا۔

بوڑھے ٹوزیو نے اپنے دوست کو پہچان لیا۔ اس نے کہا۔ "میرے دوست معلوم ہوتا ہے کہ تم مجھے ملامت کرنے آئے ہو۔ تم مجھے بیوقوف کہنے آئے ہو۔ اس کے علاوہ شاید تم یہ بھی کہو گے کہ گیشا اس دنیا پر ایک حور آسمانی ہے۔ اس کے عشرت کدوں میں جنت سے بڑھ کر لطف ہے۔ اس کی محبت حاصل کرلینا باغ حیات ہے۔

اکر ہا تکان سی محسوس کر رہا تھا۔ اس نے کہا "نہیں میں اطمینان قلب حاصل کرنے آیا ہوں۔ میں دنیا کی آلائشوں سے بچ کر خدائے بدھ کے نروان تک پہنچنے کا صحیح راستہ معلوم کرنے کے لئے آیا ہوں۔ اے دوست میری مدد کر"۔

پجاری اگر دنیا سے نفرت کا سبق دے سکتا تھا تو اس کا دل دنیا داروں کو خدا کی طرف بھی بلا سکتا تھا۔ اگر وہ کسی سے نفرت کرنا جانتا تھا تو شفقت کرنا بھی جانتا تھا۔ خدائے بدھ کا سچا پجاری لوگوں کا ہمدرد اور مہربان باپ تھا۔ اس نے اکر ہا کے محبت کے میدان میں ہزیمت خوردہ دل کو تسلی دی اور کہا "کوئی غم نہ کرو۔ تمہارے دل کا زخم بہت جلد مندمل ہو جائیگا۔ اور تمہارے ٹوٹے ہوئے دل کو راحت میسر ہوگی۔ خدائے بدھ کی برکت سے تم لافانی اطمینان حاصل کرو گے۔ گیشا کی فانی الفت کی یاد تمہارے دل و دماغ سے جاتی رہیگی۔ میرے دوست تم یقین رکھو کہ حد سے بڑھی ہوئی خواہشات سے بچ کر تم آخری نروان حاصل کر لوگے۔ . . . ."

دیوتاؤں کے استھان پر رہنے والے اکر ہا کو آخر کار ایک غیر فانی اطمینان حاصل ہو گیا۔ اس کے دل سے کوہا کی یاد بالکل جاتی رہی۔ کاماکورو کے مندر میں بدھ مت کا پجاری شکتی حاصل کرنے کی دھن میں دن رات سمادھی لگائے بیٹھا رہتا تھا۔ وہ ہمیشہ امیدہ بدھ کے بت کے سامنے اس کے حلیم اور خاموش چہرے سے نروان حاصل کرنے کی فکر میں چپ چاپ اپنا جیون سمپرن کرنے کو بیٹھتا۔ شام اور صبح کی مدھم روشنی میں وہ یوں محسوس کرتا کہ خدائے بدھ خود وہاں تشریف رکھتے ہیں۔ اس پتھر کی مورت کے آگے اس کا دل خود بخود جھک جاتا تھا۔ اور وہ سمجھتا تھا کہ وہ راحتوں سے بھری ہوئی دنیا کی طرف پرواز کر رہا ہے۔ اس کی مسرت اور خوشی کا کچھ ٹھکانا نہ تھا۔ اس کی فقط ایک ہی خواہش تھی اور وہ دن رات دعائیں کرتا تھا۔ کہ دنیا کی آلائشوں سے پاک ہو کر ابدی نجات حاصل کرلے۔

ایک دن امیدہ بدھ کی مورت کے سامنے ایک لڑکا ایک پرندے کو مارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پرندے کا بازو زخمی ہوچکا تھا اس نے کمال شفقت سے اسے اٹھا لیا اور لڑکے سے کہا۔ "کسی جاندار کے مارنے کی کوشش نہ کرو کیونکہ ہر جاندار چیز خدائے بدھ کو پیاری ہے"۔ اکر ہا پرندے کو اپنے ساتھ لے گیا اور جب ایک دو دن کی تیمارداری کے بعد اس کو مکمل آرام ہو گیا تو اکر ہا نے اسے آزاد کر دیا۔ پرندے کی آزادی پر اس کی خوشی کا کچھ ٹھکانا نہ تھا۔ بیکس پرندے نے خوشی کے ساتھ نیلے اور وسیع آسمان کی طرف اڑان لی اور پھر ایک درخت پر بیٹھ کر نہایت خوش الحانی کے ساتھ خدا کی تعریف میں ایک گیت گایا۔ پجاری نے اس سے پہلے کبھی اتنی خوشی محسوس نہ کی تھی۔ اس کی روح انتہائی مسرت سے لبریز تھی۔

ایک دن موسم بہار کی صبح کو مندر کے باہر خوش رنگ اور خوبصورت پھول کھلے ہوئے تھے۔ خوشگوار فضا میں چھوٹے چھوٹے بچے کھیل رہے تھے۔ اکر ہا مندر کے صحن میں بیٹھا تھا۔ اس نے دور کہیں ایک عورت کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ حیران ہوا۔

لا کا ماکورو کے مندر میں آج تک اس نے عورت کی صورت یکھی تھی۔ عورت مندر کی طرف آرہی تھی۔ اس نے اپنے چہرے ایک موٹا سا نقاب ڈال رکھا تھا۔

"اکرہا"! عورت نے نہایت آہستہ سے کہا۔

"تم ہو"؟ پجاری بولا۔ اس نے کوہانہ کی آواز کو پہچان لیا ۔ کوہانہ کی آواز میں اب کوئی شیرینی باقی نہ تھی۔ "تم کیوں آئی"؟

کوہانہ نے نقاب اٹھا کر کہا۔ "اکرہا جب سے تو نے مجھے ڑا ہے میرا دل باد شمال کے تیز اور تند جھونکوں کی طرح آوارہ نتا رہتا ہے۔ میں محبت کی آگ میں پھنک رہی تھی۔ میں اُسے بجھانے کی بیحد کوشش کی۔ لیکن جذبات کی آگ بجھ نہ ۔ تیری محبت روز بروز بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ میں تیری تلاش چل نکلی اور آخر کار میں نے تجھے ڈھونڈ نکالا۔ مجھے گاؤں ں نے بتایا تھا۔ کہ تم پجاری بن چکے ہو۔ میرے لازم تھا۔ کہ میں اس بات کے معلوم ہونے پر واپس لوٹ ۔ مگر میں واپس نہیں گئی۔ ایک شکستہ پر تیتری تیری الفت دمیں مر رہی ہے۔

اکرہا نے جواب دیا۔ "بیسود ہے۔ کوہانہ تم بہت دیر سے ہو۔ میں نے اپنا تن من سب کچھ خدائے بدھ کی نذر کر دیا ہے ے لئے اب کچھ باقی نہیں رہا۔ تو واپس لوٹ جا۔ لیکن گیتاؤں کی کی طرف نہیں بلکہ اس راستے کو اختیار کر جو نجات کا راستہ ہے"۔

کوہانہ کے دل پر ایک چوٹ لگی۔ وہ کیسے یقین کر لیتی کہ اکرہا جاری بنا اس کے سامنے بالکل بےحس و حرکت بیٹھا تھا۔ اب اس دلدادہ نہیں رہا۔ وہ کیسے مان لیتی کہ وہ لب جنہوں نے ایک دن ں کے ہاتھوں کو بوسہ دیا تھا۔ اب اسے ہمیشہ کے لئے دھتکار گے۔

اس نے کہا۔ "اکرہا تمہاری محبت کیا ہوئی"؟

اکرہا نے ایک ہلکا سا سانس لے کر کہا: "وہ ایک خواب تھا۔ کوہانہ تمہاری مہربانی ہوگی اگر تم مجھے چھوڑ کر چلی جاؤ"۔

کوہانہ نے جواب دیا۔ "ابھی نہیں۔ اکرہا میں تمہارے منہ سے محبت کا ایک لفظ سن کر جاؤنگی۔ فقط ایک لفظ۔ کیا تیرے بجھے ہوئے دل میں محبت کی کوئی چنگاری باقی نہیں"؟

"میں جواب دینے سے معذور ہوں"۔

"میں ضرور جواب لے کر جاؤنگی"۔

"اگر تمہیں میرا جواب سننے کی ایسی ہی ضد ہے تو آج رات تمہیں میرا جواب مل جائیگا۔ اکرہا کی آواز میں درد تھا۔ اس نے کہا لیکن کوہانہ تجھے یاد ہوگا کہ ایک وقت تھا۔ جب میری محبت تجھے خوشی دینے کے بجائے رنج دیتی تھی"۔

"ہاں مجھے یاد ہے۔ میں نے تجھے ہمیشہ کے لئے رخصت کر دیا تھا"۔

"نہیں تو نے مجھے فقط چلے جانے کو نہیں کہا تھا بلکہ اپنی محبت کو دور سمندر کے ساحل پر دفن کر دینے کو کہا تھا۔ کوہانہ اگر تجھ کو مجھ سے اب محبت ہے۔ تو مجھے بھی اس وقت تجھ سے محبت تھی اس لئے میری حالت پر رحم کر اور جواب سننے سے پہلے واپس لوٹ جا"۔

کوہانہ پجاری کی طرف دیکھتی رہی۔ وہ محبت کی بھوکی تھی۔ اس نے کہا۔ "میں نہیں جانتی تیرا کیا مطلب ہے۔ مگر آج میں جواب سننے کے لئے ضرور آؤنگی"۔

اکرہا نے کہا۔ "اگر تیری یہی مرضی ہے تو آج آدھی رات کے وقت تو جواب سن لیگی۔ اس کے چہرے پر غم اور رنج کے آثار تھے۔ کوہانہ اس کی عظمت کی تاب نہ لاسکی۔

آدھی رات سے پیشتر کوہانہ مندر کی طرف لوٹ آئی۔ اس نے دیکھا۔ اکرہا باہر صحن میں چاند کی روشنی میں سمادھی لگائے

بیٹھا ہے۔ اسکے چہرے پر مسرت کھیل رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مسافر اپنی منزل تک پہنچ گیا ہے۔

"تو بہت جلد آگئی ہے"۔ اس نے کہا۔" معلوم ہوتا ہے تو جواب لئے بغیر نہ جائیگی"۔

کوہانہ بولی۔" ہرگز نہیں"۔

"اگر تیری یہی مرضی ہے تو اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے۔ تیرا ہاتھ کانپ رہا ہے کوہانہ"! اکرہا نے کہا۔" ہم تھوڑی دور تک سفر کرینگے"۔

وہ مندر کے صحن میں سے گذر رہے تھے۔ کوہانہ نے اس پر بہت سے سوال کئے۔ مگر پجاری نے کسی کا جواب نہ دیا۔ جب وہ "بیشو" کے بت کے پاس سے گذرے تو اکرہا نے مشتاق نگاہوں سے اس کے سنجیدہ اور پروقار چہرے کی طرف دیکھا۔

اکرہا نے دبی زبان سے کہا " معاف کرو"۔ ان لفظوں کو کوہانہ سن نہ سکی۔ اکرہا کا چہرہ نور اطمینان سے چمک رہا تھا۔ چاندنی امیدہ بدھ کے بت پر مندر کے صحن میں، باہر سڑک پر، سنہری بادلوں پر، آسمان پر پھیلی ہوئی تھی۔ اکرہا نے کوہانہ سے کہا "مجھ کو، جواب دینے سے پہلے میں آج رات امیدہ بدھ کی پرارتھنا کرنی چاہتا ہوں۔ میں تجھ سے ملتجی ہوں کہ تھوڑی دیر کے لئے اپنی آنکھیں بند کر لے اور منہ پر نقاب ڈال لے"۔

کوہانہ نے ایسا ہی کیا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور چہرے پر نقاب ڈال لیا۔ ہوا سرسراتی ہوئی گزر رہی تھی۔ اور کس قدر معطر تھی۔ سمندر سے دور سمندر کی موجیں میٹھے راگ الاپ رہی تھیں۔

اکرہا عبادت میں مشغول تھا۔

"کیا میں آنکھیں کھول دوں اکرہا۔ میں تمہاری پرارتھنا سننا چاہتی ہوں"۔

لیکن اکرہا کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔

سمندر کی لہروں کی آوازیں اور ہوا کی سرسراہٹ۔ اس کے سوا کوہانہ کے سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔

وہ بہت دیر تک انتظار کرتی رہی۔ اس نے تنگ آکر نقاب اتار ڈالا۔ اور آنکھیں کھول دیں۔

فضا میں ایک چیخ گونجی —— پجاری کی پرنور لاش امیدہ بدھ کی گود میں بےحس و حرکت پڑی تھی۔

"آہ تیرا جواب"! اس نے رو کے کہا "میں نہ سمجھتی تھی کہ تیرا جواب اس قدر خوفناک ہوگا"۔ پھر وہ امیدہ بدھ کے بت کے سامنے جھک گئی اور ایک فاتحانہ انداز میں بولی۔" اے خدائے بدھ اکرہا میرا ہے وہ میرا ہی ہوکر رہیگا......

امیدہ بدھ کا بت روح پرور چاندنی سے پرنور یوں معلوم ہوتا تھا کہ خدائے بدھ خود یہاں تشریف رکھتے ہیں۔ پجاری کی پرنور لاش پر کوہانہ کا بےحس و حرکت جسم پڑا تھا۔

مترجم فضل حسین

بورس پلینیاک

لومڑ دیوتا

(روسی افسانہ)

مجھے جاپانی مصنف نگاکی سے پہلی مرتبہ ملنے کا اتفاق ٹوکیو میں ہوا۔ یہی ہماری آخری ملاقات تھی۔ ایک ادبی مجلس میں متعارف ہونے کے بعد ہم نے جو باتیں کیں وہ میرے ذہن سے اتر چکی ہیں مجھے صرف اس قدر یاد ہے۔ کہ اس کی بیوی روسی تھی سانولا رنگ میانہ قد چاق چوبند اور خوبرو یعنی اتنا خوبرو جتنا ایک جاپانی ایک یورپین کی نظر میں ہو سکتا ہے۔

مجھے معلوم ہوا کہ دنیائے ادب میں اس کی شہرت کا ذریعہ ایک ناول تھا جس میں اس نے ایک یورپین عورت کا نفسیاتی تجزیہ کیا تھا وہ میری یاد سے ان ہزارہا لوگوں کی طرح جو مجھے اتفاقیہ ملے بالکل محو ہو جاتا۔ اگر ــــ .... لیکن جاپانی شہر 'کوبے' میں روسی قونصل جنرل کا سکرٹری میرا دوست کامریڈ ژورُبا مجھے ایک شام شہر کے باہر پہاڑی پر لے گیا۔ جہاں وہ معبد ہے جسے "لومڑ کا مندر" کہتے ہیں جاپانی علم الاصنام میں لومڑ مکاری اور عیاری کا دیوتا ہے۔ اور اگر کہیں اس کی روح کسی شخص کے جسم میں حلول کر جائے تو اس کے سارے خاندان کا ناش ہو جاتا ہے۔

مندر کے قریب ایک سرائے ہے۔ جہاں ٹھنڈی بیئر ملتی ہے ٹھنڈی بیئر ہو شمشاد کے درختوں میں ہوا سرسرا رہی ہو سامنے سمندر کی نیلگوں موجیں رقص کر رہی ہوں۔ تو غیر سرزمین میں دو ہم وطن خوب باتیں کر سکتے ہیں۔

یہاں کامریڈ ژوربا نے مجھے وہ واقعہ سنایا جس سے 'نگاکی' مصنف کی یاد میرے دل میں تازہ ہو گئی۔

اس رات میں نے 'صوفیہ نگاکی' سے متعلق وہ سارے حالات پڑھے جو اس نے روس کو واپس جانے کے لئے پاسپورٹ حاصل کرنے کی غرض سے اپنی درخواست میں قلمبند کئے تھے۔ بات یوں ہوئی کہ جو روسی باشندہ غیر ملک سے اپنے وطن کو مراجعت کرنے کا آرزومند ہو اسے عرضداشت میں اپنے "مختصر سوانح حیات" درج کرنا پڑتے ہیں۔ اس قاعدہ کے تحت میں 'صوفیہ نگاکی' نے اپنی زندگی کے واقعات لکھنے میں اختصار کے بدلے تفصیل سے کام لیا۔ اور ایک اچھی خاصی خود نوشت سوانح عمری' تیار کر ڈالی اور اسے اپنی درخواست کے ساتھ منسلک کر دیا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے صوفیہ کی زندگی کا آغاز اس وقت سے ہوتا ہے جب اس کا جہاز جاپانی بندرگاہ 'سروگا' میں داخل ہوا۔

اس کے حالات اپنی نوعیت میں غیر معمولی اور ان لاکھوں روسی عورتوں سے مختلف ہیں۔ جن کی زندگی کی تفسیر پہلی محبت شادمانی۔ خاوند۔ بچہ۔ اور سویٹ روس میں مضمر ہے اور بس۔

اس کہانی میں ایک مرد ہے اور ایک عورت۔

گزشتہ ماہ اگست کے آخری ہفتے میں مجھے 'ولیڈی واسٹک' جانا پڑا۔ اس شہر کا اثر میرے دل پر ایک تیز و تند شراب کی مانند ہوا۔ یہاں صاف ہوا کے طوفان نیلے سمندر سے آتے ہیں۔ آفتاب کی کرنیں طلائی آبشار کی طرح لاجوردی آسمان سے گرتی ہیں۔ بڑی

بڑی ناہموار اور مہیب چٹانیں دور تک پانی میں چلی گئی ہیں۔ جن پر سمندر کی لہریں سر ٹکراتی ہیں۔ سفیدہ کی خوشبو فضا میں طاری و ساری ہے۔

'صوفیہ وجسوبیا' اسی شہر میں پلی تھی۔ ثانوی سکول کا نصاب ختم کرنے کے بعد وہ معلمہ ہو گئی۔ اور پرانے روس کی دوسری لاکھوں لڑکیوں کی طرح شادی ہونے تک پشکن کے ناول پڑھتی رہی۔ اس نے چیخوف کے افسانہ بھی پڑھے جو نیوا میگزین میں ضمیمہ کے طور پر چھپتے تھے۔ پشکن کے الفاظ میں یہ لڑکی 'خدا ہمیں معاف کرے کس قدر بے وقوف واقع ہوئی تھی'۔ اٹھارہ سال کی عمر میں اس نے اپنے تعلیمی معیار کی روشنی میں اپنے گردو پیش کے حالات کا جائزہ لینا شروع کیا۔ وہ کہا کرتی تھی۔ کہ جاپان کے ریشمی کمونو جسے خود جاپانی نہیں پہنتے بلکہ غیر ملکیوں کے پاس فروخت کی غرض سے تیار کرتے ہیں بہت خوبصورت ہیں۔ دنیا بھر کا انصاف سٹی مجسٹریٹ پر ختم ہے جو سلام کا جواب ہنس کر دیتا ہے۔ "رومان کی دنیا" ایوان سان ملاح تک محدود ہے جو اس سے چھپ چھپ کر پیار کرتا تھا۔ ادب کی کائنات اس طاق میں ہے۔ جہاں پشکن اور چیخوف کی کتابیں قرینے سے پڑی تھیں۔

پاسپورٹ حاصل کرنے کے لئے اس لڑکی نے جو حالات اپنی درخواست میں منضبط کئے۔ انہیں پڑھنے کے بعد مجھے اور میرے دوست کامریڈ ژوربا کو تعجب ہوا۔ کہ اس نے اپنے سوانح حیات میں ان ہنگامہ خیز واقعات کی طرف اشارہ تک نہیں کیا جو اس زمانہ میں ہماری زندگی کا لازمی جزو بن چکے تھے۔ ۱۹۲۰ء میں جاپان کی شاہی فوج مشرق بعید کے روسی حصے میں مقیم تھی۔ تاکہ وہ حصہ جاپان کے زیر نگیں آجائے۔ اور یہ عام بات ہے کہ روس نے اس فوج کو اپنے یہاں سے نکال دیا۔ صوفیا نگاکی کی خود نوشت سوانح عمری میں اس کشمکش کے متعلق ایک لفظ بھی موجود نہیں۔ کیا وہ ان واقعات سے غیر متاثر رہی؟

نگاکی جاپانی فوج منصرفہ کے جنرل سٹاف کا افسر تھا۔ ولاڈی واسٹک میں اس کی اقامت اس مکان میں تھی جس کے ایک چھوٹے سے کمرے میں صوفیہ رہتی تھی۔ صوفیہ اپنی سوانح عمری میں اس کے متعلق لکھتی ہے:-

'ہر شخص حیران تھا کہ نگاکی ہر روز دو مرتبہ نہاتا ہے۔ رات کو ریشم کی قمیص اور پاجامہ پہنتا ہے۔ وہ اس کا احترام کرنے لگے شام کو وہ ہمیشہ گھر ہی میں رہتا تھا۔ اور ان روسی شعرا اور افسانہ نگاروں کے شعر اور افسانے بلند آواز سے پڑھا کرتا تھا جن سے میں واقف تک نہ تھی۔ وہ روسی زبان میں بخوبی باتیں کر سکتا تھا گو اس کا روسی تلفظ کچھ ایسا عجیب و غریب تھا کہ میں اسے سن کر بے اختیار ہنس پڑتی تھی۔ ایک شام اس نے کہا:-

"ممکن ہے مادام کو دعوت دینا خلاف آداب ہو۔ لہذا میں خود آپ کی خدمت میں حاضر ہونگا"

میں گھبرا گئی۔ اور "معاف فرمائیے" کہہ کر اپنے کمرہ میں چلی گئی۔ دوسرے دن وہ میرے کمرے میں آیا اور اس نے مجھے چاکولیٹ کا بکس دیا "تکلف اور وضعداری کو مدنظر رکھ کر"۔ جاپانی افسر کے اخلاق سے صوفیہ بہت متاثر ہوئی۔ وہ ایوان سان ملاح سے کتنا مختلف تھا۔ جو تاریک گوشوں میں اس سے لپٹنے کی کوشش کرتا اور بوسہ لینے پر اصرار کرتا۔ نگاکی تھیئٹر میں صوفیہ کے لئے بہترین نشست منتخب کرتا۔ اور تماشہ ختم ہونے پر اس نے کبھی صوفیہ کو کسی ہوٹل میں جانے کے لئے نہیں کہا۔

صوفیہ نے اس جاپانی افسر کے اوصاف حمیدہ کے متعلق اپنی ماں کو طویل چٹھی لکھی۔ اور اپنے اعترافات میں اس نے شرح و بسط سے بیان کیا ہے کہ کس طرح ایک رات وہ معمول سے زیادہ دیر تک میرے کمرے میں بیٹھا رہا۔ اور پھر یکایک اٹھ کر چلا گیا۔ وہ اس کا سبب سمجھ گئی۔ کہ محبت کا بے پناہ طوفان جاپانی کے دل

میں اٹھ رہا ہے ۔ اور وہ اس کا اظہار کرنا نہیں چاہتا۔ وہ کتنی رات گزرے تک سو نہ سکی ۔ اور تکیہ اس کے آنسوؤں سے تربتر ہوگیا۔ اُسے احساس ہوا ۔ کہ یہ اجنبی میرے لئے ایک عجیب اور پراز اسرار شخصیت ہے ۔ سوفیا کے اپنے الفاظ ہیں :۔

کچھ مدت بعد" عشق کی وہ آگ جسے یہ شخص کامل سکون کے ساتھ چھپا سکتا تھا میرے دل میں بھی مشتعل ہونے لگی ۔ جاپانی افسر نے اپنا اظہار محبت " ٹرجینیف " کے ہیرو کے انداز پر کیا۔ فوجی وردی میں ملبوس سفید دستانے پہنے ہوئے چھٹی کے دن صبح کے وقت مالک مکان کی موجودگی میں اس نے اپنا سب کچھ سوفیہ کے قدموں پر ڈال دیا ۔

ایک ہفتے کے بعد اس نے مجھ سے کہا کہ سرخ فوج عنقریب شہر میں داخل ہونے والی ہے ۔ اور اب میرے لئے جاپان کو جانا ناگزیر ہوگا۔ تم میرے بعد آ جانا ۔ جاپان کے فوجی ضابطے کی رو سے کوئی جاپانی افسر کسی غیر ملکی عورت کے ساتھ شادی نہیں کر سکتا ۔ اور پھر جنرل سٹاف کے افسر مقررہ وقت سے پیشتر شادی کرنے کے مجاز نہیں ۔

اندریں حالات اس نے تاکید کر دی ۔ کہ میں اس وقت تک سارے معاملے کو صیغہ راز میں رکھوں جب تک وہ ملازمت سے سبکدوش نہ ہولے ۔ یہ قرار پایا کہ میں اس اثنا میں اس کے والدین کے پاس رہوں جو ایک جاپانی گاؤں میں رہتے تھے۔ اس نے پاسپورٹ کے علاوہ ڈیڑھ ہزار ین متفرق اخراجات کے لئے میرے حوالے کر دئے۔ ۔ ۔"

مجھے جاپانی بندرگاہ سروگا میں جانے کا اتفاق نہیں ہوا ۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ وہاں کے جاپانی بھی جاپانی پولیس کو "انو" کے ہتک آمیز خطاب سے یاد کرتے ہیں ۔ انو کے معنی ہیں کتا پولیس والوں نے نہ صرف صوفیا کے اسباب کی تلاشی لی بلکہ اس کے رازہائے اندرون پردہ کو معلوم کرنے کی انتہائی کوشش کی۔ وہ اسے پولیس سٹیشن میں لے گئے ۔ اور وہاں جو کچھ ہوا وہ اس کے اپنے بیان سے ظاہر ہے :۔

"میں سارا دن حوالات میں رہی ۔ وہ مجھ سے بار بار پوچھتے تمہارا یہاں آنے سے کیا مطلب ہے ۔ تگاکی سے تمہارا کیا تعلق ہے ۔ اس نے تمہیں سفارش کی چٹھی کیوں دی ۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا ۔ مجھے کہنا پڑا کہ میں تگاکی سے منسوب ہوں اس اعتراف کے بعد وہ میرے لئے کچھ چاول اور لکڑی کے دو چمچے لائے ۔ جن کا استعمال میرے لئے معمہ تھا۔"

اسی شام کو تگاکی پولیس سٹیشن میں اس کے پاس پہنچ گیا اس کے ہمراہ پولیس کمشنر تھا۔ جب اس سے صوفیہ کے متعلق سوالات کئے گئے تو اس نے مردانہ وار ساری حقیقت بیان کر دی ۔ پولیس کمشنر نے اسے بار بار جاپانی فوجی ضابطہ کی سخت گیری کا حوالہ دیا اور کہا اس لڑکی کو واپس بھیج دو لیکن تگاکی نہ مانا ۔ تگاکی اپنی منسوبہ کو لئے ریلوے سٹیشن پر آیا ۔ اور ٹرجینیف کے ہیرو کی طرح اس کا بوسہ لے کر اسے ٹرین پر سوار کر دیا ۔ اس نے صوفیہ سے کہا :۔" اوساکا میں میرا بھائی تمہارے استقبال کے لئے سٹیشن پر موجود ہوگا ۔ مجھے فی الحال کچھ کام ہے ۔"

تگاکی رات کی تاریکی میں غائب ہوگیا ۔ اور ٹرین کالے پہاڑوں میں پیچ کھاتی چلی گئی ۔ صوفیہ کے دل و دماغ پر گہری افسردگی طاری ہوئی ۔ وہ بار بار تگاکی کی محبت کے جذبہ سے پر اضطراب تنہائی کے احساس کو دور کرنے کی کوشش کرتی۔ گاڑی کی محدود روشنی کے سوا کھڑکیوں کے باہر ہر چیز تاریکی میں جذب ہو رہی تھی ۔ ہر چیز اس کے فہم و درک سے بالاتر تھی ۔ وہ گھبرا گئی دہشت زدہ ہوگئی ۔ گاڑی میں جاپانی مرد عورتیں اور بچے سونے سے پہلے ایک دوسرے کے سامنے کپڑے

اتار رہے تھے۔ سٹیشنوں پر چھوٹی بوتلوں میں گرم چائے اور لکڑی کے ڈبوں میں چاول مچھلی مولیاں ایک چھوٹا سا کاغذی رومال ایک خلال اور لکڑی کے دو چمچے لینے کے لئے مسافر کھڑکیوں میں سے ہاتھ پھیلاتے تھے۔ پھر گاڑی میں روشنی بجھ گئی۔ لوگ سو گئے۔ وہ ساری رات سو نہ سکی۔ اداسی تنہائی اور خوف کے مارے سو نہ سکی۔ وہ کچھ سمجھ نہ سکی کہ کیا بات ہو گی۔

اوساکا میں پلیٹ فارم خالی ہونے پر وہ سٹیشن سے باہر نکلی۔ دروازے پر ایک شخص بھورے رنگ کا دھاری دار کمونو پہنے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ تعظیماً جھکا۔ اس نے اپنا کارڈ پیش کیا۔ اور صوفیہ کے بازو کو چھوتے ہوئے باہر کی طرف اشارہ کیا۔ وہ روسی کا ایک لفظ نہیں جانتا تھا۔ جب ان کی موٹر کار شہر میں داخل ہوئی۔ تو شہر کی روشنیوں بلند عمارتوں اور شور سے صوفیہ کے ہوش اڑ گئے۔ ولیڈی واسٹک اس عظیم شہر کے مقابلہ میں ایک گاؤں تھا۔ ایک ریستوران میں اس نے انگریزی طرز کا ناشتہ کھایا۔ تگاکی کا بھائی اس اثنا میں مسکراتے ہوئے چپ چاپ بیٹھا رہا۔ پھر وہ ایک اور ٹرین میں سوار ہوئے گہری شام کے وقت وہ اترے۔ اس کی قوت ارادی مسلوب ہو چکی تھی۔ وہ رکشا میں بیٹھ گئی۔ شہر کی آبادی میں سے گزرتے ہوئے جہاں گھر سبزہ زاروں میں چھپے تھے وہ پہاڑی کی بلندی پر آ گئے۔ جہاں سمندر کی لہریں گونجتی تھیں۔ رکشا ایک چھوٹے سے مکان کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ مکان میں سے ایک بوڑھا ایک بڑھیا پیچھے اور ایک نوجوان عورت باہر نکلی۔ سب نے کمونو پہن رکھے تھے۔ ان کے پاؤں میں لکڑی کی کھڑاویں تھیں ان میں سے کسی نے صوفیہ کے ساتھ مصافحہ نہ کیا۔ بلکہ انھوں نے اس کے پاؤں کی طرف اشارہ کیا۔ پھر اس کے منسوب کے بھائی نے اسے بنچ پر بٹھا دیا۔ اور اس کے بوٹ کے تسمے کھول دیئے۔ وہ مکان میں ننگے پاؤں داخل ہوئی۔ مکان ایک کھلونے کی طرح تھا۔ آخری کمرے کی دیوار ہٹا دینے سے سمندر کا کشادہ منظر پہاڑ کی شاداب چوٹیاں اور صاف آسمان دکھائی دیتا تھا۔ اس نے زمین پر بیٹھ کر ان کے ساتھ کھانا کھایا۔

دوسرے دن تگاکی پہنچ گیا۔ وہ سب سے پہلے اپنے باپ اور بھائی اور پھر اپنی ماں کے سامنے از راہِ ادب جھکا۔ اس کے بعد وہ صوفیہ کے قریب آیا۔ جو اس سے بغلگیر ہونے کو بے قرار تھی۔ وہ ایک لمحہ تک خاموش کھڑا رہا۔ پھر اس نے سوچ کر اپنا ہاتھ بڑھایا۔ اور اس کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔

اس نے بتایا کہ میں سیدھا ٹوکیو سے آیا ہوں۔ فوجی حکام نے ضابطہ کی خلاف ورزی کے جرم میں اسے ملازمت سے برطرف کر دیا تھا۔ اور اسے دو سال تک جلاوطنی کی سزا دی تھی لیکن اس کی گذشتہ خدمات کو مدنظر رکھ کر اسے اپنے گاؤں میں نظربند رہنے کا حکم دیا۔ صوفیہ بہت خوش تھی۔ تگاکی اپنے ساتھ بہت سے ریشمی کمونو لایا تھا۔ وہ اسی دن پولیس کے دفتر میں اپنی شادی کا اندراج رجسٹر میں درج کرانے کے لئے آئے۔ صوفیہ نے نیلے رنگ کا کمونو پہنا۔ اپنے بالوں کو جاپانی وضع پر آراستہ کیا۔ جاپانی سلیپر پہنے اور پولیس افسر کے سامنے تگاکی کی بیوی قرار دی گئی۔

موسمِ خزاں کی آمد پر تگاکی اور اس کی بیوی کے سوا گھر کے سب آدمی چلے گئے۔ ٹوکیو سے روسی جاپانی اور انگریزی کتابوں کے پارسل تگاکی کے نام باقاعدہ آتے رہے۔ صوفیہ نے اپنے اعترافات میں یہ بتانے کی کوشش نہیں کی کہ وہ اس دوران میں فرصت کا وقت کیونکر کاٹتی تھی۔ سمندر سے زہریلی ہواؤں کے طوفان اٹھتے تھے۔ اور پہاڑیوں میں گونج پیدا کرتے تھے۔ وہ کبھی کبھی نئے روسی افسانوں سے دل بہلاتی تھی اس نے چاول اور مچھلی پکانے کے نئے نئے ڈھنگ سیکھ لئے۔ صبح کے وقت اس کا خاوند فرش پر بیٹھ کر کتابوں میں غرق رہتا

اور وہ ناشتہ تیار کرتی۔ وہ دونوں مل کر چائے پیتے۔ نمکین مچھلی اور بغیر نمک کے چاول کھاتے۔ بعض اوقات وہ اپنے لئے روسی کھانا بناتی۔ ناشتے کے بعد تنگاکی پھر کتب بینی میں مصروف ہو جاتا۔ اور وہ تین میل پیدل چل کر شہر میں آتی۔ اور سودا سلف خرید کر لے جاتی۔ شام کو وہ دونوں سیر کو نکلتے۔ کبھی سمندر کے کنارے پر کبھی پہاڑ کی چوٹیوں پر گھومتے۔ رات کو وہ دیر تک مطالعہ کرتے صوفیہ اپنے خاوند کو محبت عزت اور خوف کی نظروں سے دیکھتی تھی وہ ایک خلیق طاقتور اور خاموش آدمی تھا۔ اسے اس دوران میں پتہ لگا کہ اس کے خاوند کا باپ ٹوکیو میں ریشم کے کارخانے کا مالک ہے۔ بعض اوقات ٹوکیو اور کیوٹو سے تنگاکی کے دوست ان کے یہاں آتے۔ وہ اپنی بیوی کو یورپین لباس پہننے کی تاکید کرتا۔ یہ لوگ ان محفلوں میں جاپانی شراب پیتے۔ صوفیہ بھی ان کی خاطر سے ان کے ساتھ شریک ہو جاتی۔ دوسرے دور کے بعد ان کی آنکھیں خون کی طرح سرخ ہو جاتیں۔ وہ لگاتار باتیں کئے چلے جاتے تھے۔ پھر سب مل کر گاتے تھے اور صبح ہونے سے پیشتر شہر کو چلے جاتے تھے۔

موسم سرما گزر گیا۔ گرمیوں میں سمندر کے مد و جذر سے ایک شور سا برپا رہتا تھا۔ ان کی زندگی کی یک رنگی میں کوئی فرق نہ آیا تسبیح کے دانوں کی طرح دن گذرتے گئے۔

ہم اس مقام پر اس افسانہ کو ختم کر سکتے تھے۔

ایک سال گزر گیا۔ اور پھر ایک اور سال کے منقضی ہونے پر تنگاکی کی جلا وطنی کی میعاد ختم ہو گئی۔ لیکن وہ بدستور اسی جگہ رہے۔ اسی طرح تیسرا سال بیت گیا۔ اور پھر یکایک ان کی خاموش زندگی میں ایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔ لوگ انہیں ملنے کے لئے دور دور سے آنے شروع ہوئے۔ فوٹو گرافروں نے ان کے گاؤں ان کے مکان اور ان کی تصویریں اتاریں۔ اخباری نمایندوں نے ان سے خاص ملاقاتیں کیں۔ صوفیہ سے پوچھا گیا۔ کہ جاپان اور جاپانیوں کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔ صوفیہ کو معلوم ہوا کہ اس کے خاوند نے ایک کتاب لکھی ہے۔ جب اس کا تذکرہ اپنے خاوند سے کرتی تو وہ اسے ٹال دیتا۔ ان کے فوٹو بے شمار میگزینوں میں چھپتے۔ انہیں مضامین لکھنے کی فرمائشیں موصول ہونے لگیں۔ اس اثنا میں صوفیہ نے جاپانی زبان میں کسی قدر مہارت پیدا کر لی تھی۔ اب وہ ایک مشہور مصنف کی بیوی تھی۔ لیکن اس سے اس کی نفسیات میں کوئی خاص تغیر واقع نہ ہوا ہاں اتنا ضرور ہوا۔ کہ اسے ان اجنبی لوگوں سے جو وحشت ہوتی تھی وہ یکسر دور ہو گئی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر اپنے خاوند سے اس کے مشہور شاہکار کے متعلق دریافت کیا۔ اور اس کے خاوند نے متبسم نفی میں جواب دیا۔ اس کے بعد صوفیہ نے اسے نہایت معمولی بات سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ جب تنگاکی کا باپ انہیں ملنے کے لئے آیا۔ تو وہ صوفیہ کے ساتھ خاص احترام سے پیش آیا۔ اب ایک لڑکا ان کا کھانا تیار کرتا تھا۔ عین ممکن ہے۔ کہ صوفیہ ایک نہایت اچھی بیوی ثابت ہوتی۔ لیکن آخر کار اسے اپنے خاوند کے مشہور ناول کے موضوع کا پتہ لگ گیا۔ ٹوکیو سے ایک اخباری نمایندہ ان سے ملاقات کے لئے آیا۔ اور وہ روسی زبان سے واقف تھا۔ وہ تنگاکی کی غیر حاضری میں ان کے گھر پہنچا۔ صوفیہ اسے سیر کے لئے باہر لے گئی۔ دوران گفتگو میں اس نے نمایندہ مذکور سے پوچھا۔ کہ میرے خاوند کے ناول کی حیرت انگیز مقبولیت کا کیا راز ہے۔

آخر یہ راز کھل گیا۔

صوفیہ کی خود نوشت سوانح عمری پڑھنے کے بعد میں نے دوسرے دن تنگاکی کا ناول بازار سے خریدا۔ ثریا نے میری خاطر سے اس کا ترجمہ پڑھ کر سنایا۔ یہ جاپانی کتاب اس وقت بھی میری میز پر میرے سامنے پڑی ہے۔

تنگاکی نے جلا وطنی کے ایام میں اپنی روسی بیوی کے کل حالات

ایک ناول کی صورت میں قلمبند کر دئیے تھے۔ صوفیہ کی معمولی سے معمولی بات کو بھی اس نے نظر انداز نہ کیا۔ جب ٹوکیو کے اخباری نمایندہ نے اس سے ناول کا موضوع تفصیل وار بیان کیا۔ تو صوفیہ کو احساس ہوا۔ کہ گویا وہ اس ناول میں اپنے جسم و روح کا عکس دیکھ رہی ہے۔ صوفیہ کے جذباتِ عشق تک کو اس کے خاوند نے ایک کتاب کی صورت میں منضبط کر ڈالا تھا۔ صوفیہ کی ساری زندگی اس کے خاوند کی نظروں میں ایک ناول کے لئے مواد سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی تھی۔ وہ محض ایک جاسوس کی طرح اس کی ہر حرکت کا بغور مطالعہ کرتا رہا۔ تاکہ اس کے ناول کی دلچسپی میں اضافہ ہو سکے۔

صوفیہ نے ان تمام واقعات کو اپنے سوانح حیات میں کمال سادگی اور صاف گوئی کے ساتھ درج کر دیا۔ وہ آخر جاپان کی شاہی فوج کے سابق افسر اعلےٰ اور مشہور ناول نویس کے تاریکی گاؤں سے نکل کر ولیڈی واسٹک کے پرائمری سکول میں واپس آگئی۔ لوگوں کے اخلاق کے متعلق رائے زنی کرنا میرا کام نہیں۔ "جاپانی علم الاصنام میں لومڑ مکاری اور عیاری کا دیوتا ہے اور اگر کہیں اس کی روح کسی شخص کے جسم میں حلول کر جائے تو اس کے سارے خاندان کا ناش ہو جاتا ہے"۔

مترجم غیر معروف جرنلسٹ

تاثیر

خزاں

جب سارنگی سسکیاں بھر بھر کر خزاں کے گیت گاتی ہے میرا دل ڈوبتا جاتا ہے۔ غم کی اٹھتی ہوئی لہریں مجھے سمیٹ لیتی ہیں۔ میرا سر میرے سینے پر آ گرتا ہے۔ اور میری باہیں لٹک کر زمین سے لگ جاتی ہیں۔

جب سارنگی بہار کے غم میں فریاد کرتی ہے میں بیدار ہو جاتا ہوں۔ پرانی یادیں مجھے اپنی آغوش میں لے لیتی ہیں۔ مردہ مسرتوں کے خون سے میری آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں۔ اور میرے بدن میں پرانی یادوں کی شراب انگڑائیاں لینے لگتی ہے۔

خزاں کی ہوا کے جھونکے مجھے ایک زرد پتے کی طرح کہاں سے کہاں اٹھا کر لے جاتے ہیں! —

محمد دین تاثیر



ثاقب

جذبات ثاقب

تو نے کتنا فرق اے بیتابیٔ دل کر دیا — سانس لینا بھی مرا اب غم سے مشکل کر دیا
پوچھنا کیا ہے تو مجھ سے اسکی الفت کا مآل — جس نے مجھ کو بے نیازِ فکرِ منزل کر دیا
اے فریبِ زیست، اے امید دنیائے خیال — تو نے مجھ کو مبتلائے سعیٔ ساحل کر دیا
یہ ہوا آخر مآلِ انتہائے جستجو — میری خاکِ شوق کو منزل بمنزل کر دیا
زندگی کی ابتدا تو غرق ہو جانے میں تھی — دل نے کیوں منت کشِ دامانِ ساحل کر دیا
کاش مجھ سے چھین لیتا میری تخئیلِ وسیع — دل کے خلوت خانے کو جب رشکِ محفل کر دیا
کتنا آگے بڑھ گیا ہوں منزلِ مقصد سے میں — تو نے مجھ کو اور بھی گم شوقِ منزل کر دیا
میں تو قائل ہوں ترا اے مالکِ سوز و گداز — کچھ نہ تھا دل عشق نے لیکن مجھے اب دل کر دیا
اب غرورِ حسن سے وہ ملتفت ہوتے نہیں — کیا کیا تو نے کہ ذکرِ حسرتِ دل کر دیا

اس کے اعجازِ محبت پر ہوں اے ثاقب نثار
عشق کی بیجا صلی کو جس نے حاصل کر دیا

سید ابو محمد ثاقب

میرزا یگانہ

کلامِ یگانہ

تو کہاں اور کہاں وہ جلوۂ پاک — دلِ بیباک تیری آنکھ میں خاک
کھا گیا کتنے جاں نثاروں کو — پردے پردے میں شعلۂ بیباک
دیکھیے کیا خدا دکھاتا ہے؟ — آپ نازک مزاج۔ ہم بیباک!
گھل گئے جیسے موم کی مریم — کیوں بڑھایا تھا دل جلوں سے تپاک؟
بدگمانوں کی مہربانی سے — پاک دامن بچے نہ دامن چاک
ذات میں اپنی کیا نہیں موجود؟ — عشق سازِ ہر عقل سازِ پاک
آسماں کی ذرا سی گردش میں — کوئی ہلکان اور کوئی ہلاک!

میں کہاں اور کہاں کے پست و بلند
ایک ٹھوکر میں تھا بکھیڑا پاک!

میرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی

چارلس لوئس فلپ ۔ فرانسیسی افسانہ

دیا سلائی

ہنری لیف ٹینگ سوئزرلینڈ کی طرف جا رہا تھا۔ دوران سفر میں وہ ایک شام کو زیورچ میں پہنچا۔ وہاں اس کو اچانک ایک ایسا ہوش ربا واقعہ پیش آگیا۔ کہ یاد رہے شاید ہنری صاحب ثروت آدمی ہونے کی وجہ سے سفر میں بھی آرام و آسائش کا متمنی تھا۔ شام کی گاڑی سے زیورچ پہنچا۔ سوار ہو کر ایک ہوٹل میں آیا۔ گائیڈ بک میں اس ہوٹل کے انتظام و اہتمام کی بے حد تعریف کی گئی تھی۔ اس میں لکھا تھا۔ کہ ہوٹل میں کھانا اچھا ملتا ہے۔ یہاں عموماً معقول طبقہ کے لوگ رہتے ہیں۔ ہنری نے ہوٹل میں پہنچکر نچلے کمرے میں ہی کھانا کھایا۔ سفر کی تکان محسوس کر رہا تھا۔ اٹھا اور اپنے کمرے میں جو بالائی منزل پر تھا۔ چلا گیا۔ بستر آرام دہ اور پر تکلف تھا۔ اور گو اس کو نیند نہ آئی تھی۔ مگر وہ بستر پہ دراز ہو گیا۔

ہنری لیف ٹینگ معمولی دل و دماغ کا آدمی تھا۔ وہ زیورچ کی سیر کو آیا تھا۔ اور جب تک وہ زیورچ نہ پہنچا۔ شہر کو دیکھنے کی خواہش اس کے دل میں برابر موجود رہی۔ مگر تجربے کی بات ہے۔ کہ جونہی شام کے وقت انسان کسی شہر میں پہنچتا ہے۔ تو شہر کو دیکھنے کی خواہش قدرے کند ہو جاتی ہے۔ یا یوں کہئے۔ کہ جونہی آدمی کسی نئے شہر میں پہنچتا ہے۔ اس شہر کو دیکھنے کی خواہش قریب قریب پوری ہو جاتی ہے۔ اور انسانی دماغ اس بات پر اکتفا کر لیتا ہے "میں اس شہر میں ہوں اور شہر اپنے محل وقوع پر موجود ہے" اور بس۔ چنانچہ ہنری لیف ٹینگ بھی زیورچ میں تھا۔ زیورچ کے ایک معقول ہوٹل کے کمرے میں لیٹا ہوا تھا۔ اور بجلی کا لیمپ جس سے کمرہ منور تھا۔ شہر زیورچ کے ایک ہوٹل کے کمرے کا لیمپ تھا۔ اس نے جیب سے اپنا سگریٹ کیس نکال کر نزدیک کی میز پر رکھ دیا۔ پھر اس میں سے ایک سگریٹ نکالا۔ اور ہونٹوں میں رکھ لیا۔ وہ زیورچ کے ایک پر تکلف ہوٹل کے کمرے میں سگریٹ پی رہا تھا۔ اور یہ تمام باتیں اس کے دل کی تسلی کے لئے بہت کافی تھیں۔

جب وہ سگریٹ سلگا چکا۔ تو اس نے دیا سلائی فرش پر پھینک دی۔ اور ساتھ ہی ایک وہم یا دور اندیشی میں مبتلا ہو گیا۔ اسے خیال آیا۔ کہ سلگتی ہوئی دیا سلائی کہیں ہوٹل میں آگ لگ جانے کا باعث نہ ہو جائے۔ یہ سوچ کر وہ اٹھا۔ اور دیا سلائی کو فرش پر سے اٹھانے کے لئے جھکا۔ اس کا یہ فعل قابل فہم تھا۔ کیونکہ دیا سلائی ابھی سلگ رہی تھی۔ وہ چاہتا تھا۔ کہ سلیپر پہن کر اٹھے۔ اور سلگتی ہوئی دیا سلائی کو پاؤں سے مسل ڈالے۔ کہ دفعتاً خوف کے مارے اسے اپنے ارادے سے باز رہنا پڑا۔ کیونکہ عین اس وقت پلنگ کے نیچے سے ایک ہاتھ نکلا۔ اور اس نے صاف طور پر چار انگلیوں اور ایک انگوٹھے کو اکٹھا ہوتے اور دیا سلائی کو مسل کر بجھاتے دیکھا۔ دیا سلائی بجھ گئی۔ اور ہاتھ پھر بستر کے نیچے غائب ہو گیا۔

قاعدہ ہے۔ کہ جب آنکھیں کسی چیز کو دیکھتی ہیں۔ تو انسانی دماغ بھی اس سے متاثر ہو کر اس چیز کا جائزہ لیتا ہے۔ ہنری کے دماغ پر جو اثرات مسلط

ہو چکے تھے۔ وہ اس واقعہ کے متعلق تھے۔ جو اس نے ابھی ابھی بچشم خود دیکھا تھا۔ جس وقت کسی جلتی چیز کو ہاتھ سے مس کیا جاتا ہے۔ تو ہاتھ کے جل جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ مگر ہاتھ کے مالک نے کیوں اس خطرے کو محسوس نہ کیا۔ اور کس طرح بے باکانہ جلتی دیا سلائی کو بجھا دیا۔ ہنری کو خیال آیا۔ کہ شاید ہاتھ کے مالک نے اپنی انگلیوں کو لعاب دہن سے تر کر لیا ہو گا۔ لیکن اس صغریٰ کبریٰ سے نتیجہ اخذ کرنے میں جو تھوڑا سا وقت صرف ہوا۔ اس کے فوراً بعد ہنری نے کہا: "او ہو۔ میرے پلنگ کے نیچے کوئی آدمی ہے"۔ اور پھر اس خیال سے ایک اور خیال آہستہ آہستہ اور لفظ لفظ ہو کے اس کے دماغ میں آیا: "وہ اس بات کے انتظار میں ہے۔ کہ میں سو جاؤں۔ تو مجھے مار ڈالے"۔

جب اس نے یہ سمجھ لیا۔ اور اس خیال کو اچھی طرح دماغ میں تول لیا۔ اور اس بھیانک خیال کے ایک ایک لفظ کو محسوس بھی کر لیا۔ تو ہنری کے دماغ میں اور کسی خیال کا امکان نہ رہا۔ اس کے تمام خیالات کی جگہ ایک مہیب سکوت نے لے لی۔ اور یہ سکوت اچانک کمرے میں داخل ہو کر چاروں طرف چھا گیا۔ کمرے میں اس سکوت کی موجودگی۔ ہاتھ کے مالک کی موجودگی سے جو قتل کے ارادے سے چھپا ہوا تھا۔ کہیں زیادہ مہیب اور خوفناک معلوم ہونے لگی یہ خوفناک سکوت ایک ضرب کی طرح ہنری کے سر پر پڑا۔ اور اس کو ایسا معلوم ہوا۔ کہ وہ ابھی ابھی گہری نیند سے بیدار ہوا ہے۔ گویا اس کو ایک ایسی چیز یاد آگئی۔ جس کو وہ کافی دیر سے فراموش کئے ہوئے تھا۔ اس نے دل میں کہا: "ہاں اب وقت آگیا ہے۔ مجھے خیال ہی نہ رہا تھا۔ کہ ایک دن مجھے مرنا ہے"۔ اس کا لعاب دہن اس قدر تلخ تھا۔ گویا اس کا ذائقہ ہمیشہ اس کے حلق میں رہے گا: "ہاں تو آج رات میں قتل کیا جاؤں گا"۔ اس کو یوں معلوم ہونے لگا۔ کہ گویا اس کے مردہ ہونے کا احساس بھی اس کے حلق میں موجود ہے۔ وہ اس حالت کو برداشت نہ کر سکتا تھا۔

پھر انتہائی احتیاط کے خیال سے اور کسی گمنام شے کے ڈر سے اس نے اپنی گردن ادھر ادھر پھیر کر کمرے میں چاروں طرف ترچھی نظروں سے ہر ایک شے کو دیکھا۔ ایک برتن رکھنے کی میز تھی۔ جس کو وہ شناخت بھی نہ کر سکا۔ ایک کپڑوں کی الماری تھی۔ اور ایک معمولی میز۔ کچھ کرسیاں تھیں۔ جو اس نے گنیں تعداد میں چار تھیں۔ ایک صوفہ تھا۔ جو قریباً اس کی نظر سے اوجھل تھا۔ ان تمام اشیا میں سے کسی نے اس کو کوئی مدد نہ کی۔

دس منٹ کا عرصہ گزر گیا۔ اور "نوشتہ تقدیر" کا خیال آہستہ آہستہ پرلے درجے کی یاس اور ناامیدی میں تبدیل ہو گیا۔

"او خدا! یہ تمام حادثہ مجھے کیوں پیش آرہا ہے۔ میں اس وقت زیورچ میں کیوں موجود ہوں۔ میں اس وقت کسی اور شہر مثلاً بیسل۔ جنیوا یا لنڈن میں کیوں نہ ہوا۔ تاکہ اس خطرے سے بچ جاتا۔ زندگی بھی کیا احمقانہ شے ہے۔ میں آخر اس کمرے میں آیا کیوں۔ ساتھ والے کمرے میں کیوں نہ ہوا۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ بستر پر دراز ہونے سے پیشتر میں نے چارپائی کے نیچے کیوں نہ دیکھ لیا"۔ پھر دل میں کہا: "میں نے اپنے لئے آپ ایک جال بنا لیا ہے۔

اس نے اپنی طبیعت پر پورا زور ڈال کر پہلے تو اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دیا۔ ازاں بعد اس کو جو کچھ بھی یاد آیا وہ پرحسرت دیاس خیالات کا ہجوم تھا۔ جو ایک ایسے آدمی کو آتے ہیں۔ جو بغیر اپنی کسی غلطی کے اس دنیا کو خیرباد کہنے والا ہو۔

ہنری کے دماغ میں موت کا خیال ہمیشہ سزا اور عقوبت کے ساتھ وابستہ رہا تھا۔ اس لئے وہ بآواز بلند پکارنا چاہتا تھا: "آخر میں نے کیا کیا ہے"۔ پھر خیال آیا: "میں نے کچھ نہیں کیا۔ اور میں بالکل بے گناہ ہوں۔ ایک مرنج و مرنجاں آدمی ہوں"۔

فی الحقیقت وہ ایک ایسا شریف طبیعت انسان تھا۔ کہ اس کو چور سے بھی کوئی شکوہ نہ تھا۔ جو اس وقت اس کے پلنگ کے نیچے چھپا ہوا تھا اور دل میں اس کی ذات کے متعلق ایسے وحشت انگیز ارادے کئے ہوئے تھا۔ حالانکہ اگر ہنری قزاق کے ساتھ رنجیدہ ہوتا بھی۔ تو اس میں وہ حق بجانب تھا۔ مگر قزاق تو ہنری کا واقف بھی نہ تھا۔ اس کو جانتا بھی نہ تھا۔ اس کے دل میں آیا۔ کہ وہ بآواز بلند قزاق کو مخاطب کرے۔ اور کہے: "میں ہنری لیف ٹینگ ہوں۔ جس کو تم مارنا چاہتے ہو۔ اور تم غلطی پر ہو۔ کیونکہ مجھ ایسے لوگوں کو کبھی کوئی قتل نہیں کرتا۔

ہنری نے محسوس کیا۔ کہ اس میں قزاق کا بھی دوست بننے کی صلاحیت موجود ہے۔ لوگ محض ناداری کی وجہ سے قزاق پیشہ ہو جاتے ہیں۔ ہنری کے پاس تو روپیہ بھی موجود تھا۔ پھر اسے خیال آیا۔ کہ قزاق کو مخاطب کر کے کہے۔

"سنو! میں جانتا ہوں۔ کہ تم میرے پلنگ کے نیچے ہو۔ مجھے کوئی ضرر نہ پہنچاؤ۔ اور جو کچھ میرے پاس ہے۔ میں تمہاری نذر کرنے کو تیار ہوں۔ میں تم کو اس کے علاوہ اور بھی دوں گا۔ تم نہیں جانتے۔ کہ میں کون ہوں۔ اور یہ بھی نہیں جانتے۔ کہ میں تمہارے لئے کیا کچھ کر سکتا ہوں۔ اور سنو۔ اگر جو کچھ اس وقت میرے پاس موجود ہے۔ تم اس کو کافی نہیں سمجھتے۔ تو میں تم سے وعدہ کرتا ہوں۔ کہ میں پیرس پہنچکر جتنی رقم تم مقرر کرو۔ بھیج دوں گا۔ پلنگ کے نیچے چھپنے والے میرے غریب دوست میرے دل میں تمہارے لئے ہمدردی کا سمندر موجزن ہے"۔ ہنری کی مجال نہ تھی۔ کہ قزاق کے ساتھ دل میں بھی رنج رکھے۔ مبادا قزاق کو طیش آجائے۔ ہنری نے دل میں خدا کا شکر کیا۔ کہ قزاق نے کوئی شور نہیں مچایا۔ اور صرف ایک ہاتھ ہی باہر نکالکر دیا سلائی بجھا ڈالی۔ اور اس طرح اپنی موجودگی اس پر ظاہر کر دی۔

عین اس موقعہ پر ایک واقعہ پیش آیا جسے فی الحقیقت واقعہ کہنا چاہئے۔ ہنری اس وقت اپنے خیالات میں محو تھا۔ کہ اچانک اور بے خبری کی حالت میں ایک فوری اور قدرے تند گرمجوشی اس کے دل و دماغ پر طاری ہوگئی۔ ایک جذبے نے اس کے حلق پر قابو پالیا۔ اور پھر منہ تک پہنچکر ایک سیال چیز معلوم ہونے لگا۔ اس کا دل و دماغ اس جذبے سے متاثر تھا۔ مگر ہنری بالکل بے خبر تھا۔ کہ یہ کس طرح اور کیوں پیدا ہوا۔ قریب تھا۔ کہ وہ پکار اٹھے: "او میرے خدا! میں بچ گیا"۔

ہنری نے پوری طرح کامیاب ہونے کی خواہش میں کافی وقت صرف کیا۔ اپنی ضروریات کا پورا مطالعہ کیا۔ ہنری نے وہ جگہ اچھی طرح جانچ لی۔ جہاں وہ اپنے قدم رکھیگا۔ اس نے یہاں تک سوچ لیا۔ کہ وہ اپنا بایاں پاؤں پلنگ کے پیتل کے پائے پر رکھے گا۔ تمام انتظامات درست تھے۔ اور کوئی خدشہ نہ تھا۔ لہذا ہنری اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ اور ان لوگوں کی نقل اتارنی شروع کی۔ جو خلوت میں خود بخود باتیں کرتے ہیں۔ اس نے اپنے آپ سے باتیں کرنی شروع کیں۔ مگر اس آواز اور لہجے میں کہ اگر کوئی آدمی اس کمرے میں پوشیدہ ہو۔ تو وہ اچھی طرح سن سکے۔ پھر اس نے کہا:۔

"میں بھی عجب بیوقوف ہوں۔ میں نے کنجی دروازے کے قفل میں ہی چھوڑ دی"۔ یہ کہکر وہ اٹھا۔ کوئی اس سے گلوگیر نہ ہوا۔ شاید قزاق بھی اپنے آپ کو دل میں مبارکباد کہہ رہا تھا۔ کہ وہ بھی ایک خطرے سے محفوظ ہو گیا ہے۔ کیونکہ اگر عین وقت پر کوئی دروازے کی کنجی گھما کر اندر آجاتا۔ تو پھر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہنری نے بھی پھرتی نہ کی۔ تاکہ کسی کو شکوک پیدا نہ ہوں۔ وہ دروازے کے نزدیک گیا۔ اور دروازہ کھولا۔ گویا اس کو کنجی کی بڑی فکر تھی۔

ہنری نے کس زور سے چلانا شروع کیا۔ اور اس کی آواز اس وقت کس قدر بلند تھی۔ "توبہ! دوڑو۔ بھاگو۔ قتل۔ غارت۔ فوراً پہنچو۔ جلدی کرو۔ مار ڈالا" پیشتر اس کے کہ اس کا چلانا بند۔ لوگ اس کے گرد جمع تھے۔ اس نے ذرا ضرورت سے زیادہ ہی شور مچایا تھا۔ چارپائی کے نیچے سے حضرت کو نکالا گیا۔ اس کو کھینچکر نکالنا پڑا۔ چونکہ اس نے لوگوں کے کام میں ذرا بھی ہاتھ نہ بٹایا۔ اور جوں کا توں اکڑا رہا۔ اسے کھڑا کیا گیا۔ اس کا رنگ زرد اور آنکھیں چمکیلی تھیں۔ مستورات نے اس کو چپتیانا شروع کیا۔ ہوٹل کے مالک نے اس کو پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ پولیس والوں نے ہتھکڑی لگائی۔ جب پولیس والے اس کو لے کر جیل کی طرف روانہ ہو گئے۔ تو لوگ اس وقت تک خوف سے کانپ رہے تھے۔

مترجم شیخ قمر الدین

رسا

کلامِ رسا

دن ہو یا ہو رات کسی دم چین نہیں دیوانوں کو
بھاڑ میں جائے جوشِ وحشت آگ لگے ویرانوں کو

شمع کو تنہا جلتا دیکھیں تاب کہاں پروانوں کو
اپنے بس کا روگ نہیں کیا کہئے ان دیوانوں کو

بڑھتی ہیں امواجِ حوادث جتنا انساں ڈرتا ہے
ہم نے اک بےخوف ہنسی میں غرق کیا طوفانوں کو

رہتے ہیں جو اُسکے در پر دُکھ سُکھ دونوں پاتے ہیں
قہر کا شکوہ کرنے والے بھول گیا احسانوں کو

ساغرِ مے کی اس میں گردش نشۂ مے کی اس میں رَو
ساقی کی پُرکیف نظر نے لوٹ لیا مستانوں کو

واعظ کی تقریر کا جادو رہ گیا چلتے چلتے کیا
مسجد کا رُخ کرکے میکش پھر پلٹے میخانوں کو

تیشے کی بھی مجھکو حسرت دار کا بھی ارمان مجھے
کوئی ہے جو کردے یکجا عبرت کے افسانوں کو

ہو چکے جب اجزائے عالم آپس میں مربوط رسا
فطرت نے تخریب کا منصب سونپ دیا انسانوں کو

محمد کبیر خاں رسا جالندھری

مجید ملک

مدّوجزر

آج پھر دیر میں آئے۔
ہاں ۔
کل بھی دیر میں آئے تھے
ہاں ۔
اب دو بجے ہوں گے ۔
ہاں اب دو بجے ہوں گے ۔
بلکہ تین ۔
بلکہ تین ۔
کہاں رہے ؟
اِدھر اُدھر
اتنی دیر میں کیوں آئے ؟
کچھ ایسی ہی بات تھی
میں انتظار کرتی رہی ۔
نہ کیا ہوتا ۔
اب نہیں کیا کروں گی ۔
مہربانی ۔

جو مل گیا ۔
کہاں ؟
جہاں مل گیا ۔
پوچھنا کوئی گناہ ہے ؟
ثواب بھی نہیں ۔
پہلے تو تم ایسے نہ تھے
کون ؟
تم ۔
مجھے کیا ہو گیا ہے ؟
اپنے دل سے پوچھو ۔
کیا پوچھوں ؟
اپنے دل کا حال ۔
میں تو وہی ہوں ۔
تو میں بدل گئی ہوں گی ۔
بے شک ۔

کیا خبر تھی کہ ایک دن یہ حال ہوگا ۔
کسی کو بھی خبر نہیں ہوتی ۔
میں راتوں کو تین تین بجے تک جاگا کروں ۔
کیوں جاگا کرو ؟
لیکن تمہاری سیریں ختم نہ ہوں گی ۔
سیریں کیسی ؟

کھانا کھا لیا ؟
ہاں کھا لیا ۔
کب ؟
دیر ہوئی ۔
کیا کھایا ؟

میں کیا جانوں کیسی سیریں ۔
گویا میں اب سیر سے واپس آیا ہوں ۔
اور کیا ؟
ہاں ۔ میں رات کے تین بجے تک سیر کرتا ہوں ۔ میں بہت برا ہوں ۔
نہیں تم بہت اچھے ہو ۔
نہیں ۔ میں بہت برا ہوں ۔ مجھ میں دنیا بھر کے عیب ہیں ۔
نہیں تم بہت اچھے ہو ۔ نیک اور فرض شناس ۔ میں بری ہوں ۔
نہیں تم بیچاری ۔ صابر ۔ شاکر ۔
اور تم مروت کیش ۔ بی بی بچوں کا حق پہچاننے والے ۔ کبھی کسی کا دل نہ دکھانے والے ۔
اور تم ستم زدہ ۔ راضی بہ رضا رہنے والی ۔ پلٹ کر بات نہ کرنے والی شوہر کی فرمانبردار اطاعت گزار ـــــ

مجھ سے یہ دکھ نہیں سہے جاتے ۔
کیا دکھ ؟
یہی دکھ
نہ سہو ۔
جب تک زندگی ہے سہونگی ۔
جب تک زندگی ہے میں بھی سہونگا ۔
تمہیں کیا دکھ ہے ؟
اور تمہیں کیا دکھ ہے ؟
میرے دکھ میرا خدا جانتا ہے
میرے دکھ بھی میرا خدا جانتا ہے ۔
خدا سے ڈرو ۔
میں خدا سے زیادہ تم سے ڈرتا ہوں ۔
میرے اللہ ۔ میں کہاں جاؤں ۔ مجھے موت بھی نہیں آتی ۔

. . . .
. . . .
. . . .

خدا کے لئے شور نہ مچاؤ ۔
میں شور مچاتی ہوں کہ تم ؟
میں کہتا ہوں بچہ بے آرام ہوگا ۔
تمہیں بچے کی بہت پروا ہے ۔
تم سے کم بھی نہیں ۔
خبر بھی نہیں کس حال میں ہے ۔ کس حال میں نہیں ۔
کیا خبر نہیں ؟
پروا نہیں صحت کیسی ہے ۔ کیسی نہیں ۔
صحت ۔ کیوں خیریت تو ہے ؟
تمہیں کیا ؟
میں کیا پوچھ رہا ہوں ؟
تم اپنے کھیل تماشوں میں رہو ۔
میری بات کا جواب دو ۔
کس بات کا ؟
بچہ کیسا ہے ؟
تمہیں رات کے تین بجے بچے کی محبت کیوں ستانے لگی ۔
میں پوچھتا ہوں ـــــ
جیسے بڑی محبت ہے ۔
جتنی تم کو ہے اس سے کم نہیں ۔
جبھی رات بھر سیریں کرتے ہو ۔
سیریں کہاں کرتا ہوں ؟
مجھے کیا خبر کہاں سیریں کرتے ہو ۔
میں سیریں نہیں کرتا ۔
اور رات کے تین بجے تک کیا کرتے ہو ؟

کون کہتا ہے اب تین بجے ہیں ؟
تین نہیں بجے تو اور کیا بجا ہے ؟
ابھی تو دو بھی نہیں بجے ۔
کون کہتا ہے ؟
میں کہتا ہوں ۔
جھوٹ ۔
میں جھوٹ کیوں بولتا ۔
شور نہ مچاؤ ۔ آہستہ بولو ۔
بچے کی صحت تو بالکل ٹھیک ہے نا ؟
بالکل ۔ کیوں ؟
تمہاری بات سے مجھے خدشہ سا پیدا ہوا تھا ۔
خدا کرے بچے ہی سے تمہارا پیار قائم رہے ۔
میرا پیار ہمیشہ قائم رہتا ہے ۔
بڑے آئے ثابت قدم ۔
بے شک ۔
دکھ دینے میں ثابت قدم ۔
دکھ سہنے میں ثابت قدم ۔
تمہیں کیا دکھ پہنچے ہیں ؟
کوئی بھی نہیں ۔
پھر شکایت کیسی ؟
میں نے کب شکایت کی ؟
کیا کہا ۔ شکایت نہیں کی ؟
کب کی ؟
توبہ ۔
اور تمہیں کیا دکھ پہنچے ہیں ؟
تم سن کے کیا کرو گے ۔
آخر ؟

بڑے آئے رات کے تین بجے ہمدردی جتانے والے ۔
میں کہتا ہوں تین نہیں بجے ۔
دو سہی ۔
ہاں دو ۔
بڑے آئے رات کے دو بجے ہمدردی جتانے کے لئے ۔
میں تنویر کے ساتھ تھا ۔
تنویر کے ساتھ !
ہاں ۔
جھوٹ ۔
تمہاری قسم ۔
جیسے میری بڑی پروا ہے ۔
یہ تم اپنے دل سے پوچھو ۔
کس سے پوچھوں ؟
اپنے دل سے ۔
کیا پوچھوں ؟
کہ میرے دل میں محبت ہے کہ نہیں ۔
آہستہ بولو بچے کی آنکھ نہ کھل جائے ۔
کیسی پیاری نیند سو رہا ہے ۔
ہاتھ سر کے نیچے رکھ کے ۔
ننھا سا ہاتھ ۔
اور ہونٹ لٹکا کے ۔
بال ماتھے پر گرے ہیں ۔
بالکل تمہاری طرح ۔
بالکل میری طرح
نیند میں مسکرا رہا ہے ۔
میری جان ۔
میری جان ۔

مجید ملک

مس حجاب امتیاز

حسن اور رومان کی دنیا

گرمیوں کی لمبی اور سنسان دوپہروں میں ——
جبکہ شہر کے کارخانوں کی آواز بند ہو جاتی ہے۔
مزدوروں کے ہاتھ ناتواں نظر آنے لگتے ہیں
پرندے سبز پتوں میں منہ دیئے ساکت ہو جاتے ہیں
اور عشق پیچاں کی بیلوں میں بھونرے غائب ہو جاتے ہیں،
اور جب میں صحن باغ میں نارنگی کے اک پرانے پیڑ اور نوخیز پتوں کے کانپتے ہوئے سایوں کے درمیان اک بید کی کرسی پہ بیٹھ جاتی ہوں —
تو میری نظر دور —— بہت دور نیلے نیلے گرجنے والے شاندار سمندر اور اونچے اونچے باوقار نیلے آسمان کے درمیان افق پر پڑتی ہے
اس وقت مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے بچھڑے ہوئے دنوں کی یاد۔ اس حسن اور رومان کی دنیا میں اب تک زندہ اور موجود ہے۔

پھر شام کے دھندلکے میں ——
جبکہ دنیا اک تھکے ماندے مسافر کی طرح اک جگہ بیٹھ جاتی ہے
اور درخت، شام کے سکوت میں، سحر زدہ شہزادوں کی طرح چپ چاپ کھڑے ہو جاتے ہیں،
اور جنوب کے سریلے نرم نرم جھونکوں کے زندگی بخش بوسوں سے یاسمین کی کلیاں آنکھیں کھول دیتی ہیں۔
تو میری نظر، دور، —— بہت دور، ڈوبنے والے دن، اور زمین کے درمیان کسی نامعلوم سرزمین پر پڑ جاتی ہے۔
آہ —— شاید وہی حسن اور رومان کی دنیا ہے
اس وقت مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تمہاری یاد، بلکہ تمہارا موہوم سایہ وہاں کھڑا ہے۔
جیسے کوئی خواب کی مخلوق !!

حجاب امتیاز

محمود شیرانی

پنجاب میں اردو کی سرگذشت

(ایک فراموش شدہ ورق)

بچوں کی تعلیم کے سلسلہ میں ہمارے اسلاف نے جو لٹریچر طیار کیا تھا۔ اس کا ایک شعبہ کتب نصاب کے نام سے موسوم ہے۔ نصابی لٹریچر سے مراد ایسی منظوم مگر مختصر فرہنگیں ہیں۔ جن میں ضروریات زندگی اور عام معلومات کے الفاظ اور معانی نوآموزوں کی تعلیم کی غرض سے آسان اور عام فہم زبان میں کئے جاتے ہیں۔ ان میں اختصار کا خصوصیت کے ساتھ لحاظ رکھا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک نصاب کی طوالت بالعموم دو سو اشعار تک محدود ہوا کرتی ہے۔ بلکہ یہ دو سو کی تعداد ہے۔ جس کی بنا پر اس لٹریچر کا نام بالآخر نصاب قرار پایا۔ فقہی اعتبار سے دو سو درہم وہ رقم ہے۔ جس پر حول گذر جانے کی صورت میں زکوٰۃ لازم آیا کرتی ہے۔ چنانچہ یہ رقم نصاب اور اس کا مالک صاحب نصاب کہلاتا ہے۔ ابو نصر فراہی سے جو فارسی نصابی ادب کے ابو البشر مانے جاتے ہیں۔ اپنی مشہور عالم تصنیف نصاب الصبیان کا اسی رعایت سے نصاب الصبیان نام رکھا۔ کیونکہ اس کے اشعار کی تعداد فقہی نصاب کے مساوی ہے۔ ابو نصر کے مقلدوں نے بھی عام طور پر اپنے پیش رو کی سنت پر عمل جاری رکھا۔ چنانچہ اکثر ایسی تالیفات کا نام نصاب کے لفظ سے شروع ہونے لگا۔ مثلاً نصاب خسرو۔ نصاب بدیعی۔ نصاب ضیائی نصاب کمال الدین۔ نصاب مقلوب و نصاب میراب وغیرہ حتیٰ کہ رفتہ رفتہ اس شاخ کا نام ہی نصاب ہوگیا۔

نصاب الصبیان کی تکمیل کے بعد جس کا سال تالیف ۶۱۷ھ بیان کیا جاتا ہے۔ نصابی لٹریچر نے بیحد ترقی کی ہے۔ اور کتب نصاب ایسے ممالک میں جہاں عربی مدعای تحصیل اور فارسی ذریعہ تعلیم رہی ہے بکثرت لکھی گئی ہیں۔ لیکن یہاں ان کی تاریخ و تفصیل قلمبند کرنا مقصود نہیں ہے۔ عہد مغلیہ سے پیشتر ہندوستان میں جہاں فارسی بھی عربی زبان کی طرح اکتسابی زبان رہی ہے۔ یہ نصاب حسب رواج وقت فارسی میں لکھے جاتے تھے۔ اور دیگر ممالک کے نصاب بھی شامل درس تھے لیکن عہد اکبری میں جدید تعلیمی تنظیم کے ماتحت عربی زبان سرکاری طور پر تعلیمات سے خارج کر دی گئی۔ اس کی جگہ فارسی کو دے دی گئی۔ یعنی فارسی کی تحصیل مقصد خاص مانی گئی۔ اور میں سمجھتا ہوں۔ اگرچہ وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ تاریخ اس بارہ میں خاموش ہے۔ کہ یہ کسی ایسی زبردست تحریک کا اثر ہے۔ کہ ہندوستان میں دیرینہ نصابوں کے علاوہ ایسے جدید نصاب طیار ہونے لگے۔ جن میں فارسی کے ساتھ دیسی زبانوں کو بھی ذریعہ تعلیم تسلیم کر لیا گیا۔ ان جدید نصابوں میں سب سے اقدم نصاب مطبوع الصبیان ہے۔ جو خالق باری کے نام سے مشہور ہے۔ اور جس کی تصنیف عام طور پر امیر خسرو دہلوی کی طرف منسوب کی جاتی ہے لیکن تنقیدی نقطۂ نظر سے یہ عقیدہ ناقابل قبول ہے۔ خود اس نسخہ میں جو قرائنی شہادت موجود ہے۔ وہ ہمیں دسویں صدی ہجری سے آگے نہیں بڑھاتی۔ مگر اس میں بھی شک نہیں۔ کہ خالق باری اردو کا سب سے قدیم نصاب ہے۔ جس سے ہم واقف ہیں۔ علیٰ ہذا دیگر دیسی زبانوں کے نصابوں میں بھی اسے اولیت کا فخر حاصل ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ دیسی زبانوں میں نصاب لکھے جانے کی تحریک

تقریباً ایک ہی زمانہ میں نمودار ہوتی ہے۔ سب سے پہلے یہ نصاب اردو زبان میں شروع ہوئے۔ اس کے بعد ہندوستان کے دوسرے صوبوں کی زبانوں میں لکھے جانے لگے۔ پنجاب نے اس تحریک کو بھی فروغ دیا۔ اور ایسے نصاب جن میں ذریعۂ تعلیم پنجابی تھی۔ کثرت کے ساتھ لکھے گئے۔ ان میں سب سے قدیم واحد باری ہے۔ جو ۱۰۷۹ھ یا ۱۲۸۳ بکرمی میں جو ۱۱۳۰ و ۱۱۳۴ھ کے مطابق ہے۔ تالیف ہوتی ہے۔ اللہ باری کے بعد ایک لمبا سلسلہ ان نصابوں کا چلتا ہے۔ جن میں ایسے نصابوں کے نام جن تک میری رسائی ہوئی ہے۔ حسب ذیل ہیں:-

(۱) رازق باری از اسمٰعیل۔ تالیف ۱۱۰۱ھ (۲) رازق باری از مصطفیٰ ۱۱۰۵ھ (۳) ایزد باری از کھرل ۱۱۰۵ھ (۴) اللہ باری از امید ۱۱۹۰ھ (۵) ناصر باری از مفتی شمس الدین ۱۲۰۵ھ (۶) صنعت باری از گنیش داس بڈہیرہ قانون گوئی ۱۲۲۰ھ (۷) قادر باری از مظفر ۱۲۲۳ھ (۸) واسع باری از یکدل ۱۲۳۱ھ (۹) رحمت باری از مولوی رحمت اللہ ۱۲۳۲ھ۔

(۱۰) فارسی نامہ از عبدالرحمٰن قصوری (۱۱) نصاب ضروری۔ از خدا بخش (۱۲) اللہ باری (دیگر) (۱۳) بادسھل (۱۴) اعظم باری (۱۵) صادق باری (۱۶) فارسی نامہ از شیخ محمد اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ جن کے زمانۂ تالیف سے ہم ناواقف ہیں۔

بہرحال یہ فہرست ہے ان نصاب کی جو فارسی کے اکتساب کے خیال سے بزبان پنجابی طیار کیا گیا ہے۔ اور یہ امر ظاہر ہے۔ کہ میری فہرست مکمل نہیں ہے۔ خدا وہ دن جلد لائے۔ جب اہل وطن اسلاف کے ان بقیۃ الصالحات کی تلاش اور حفاظت کے واسطے کوئی جنبش کریں۔

آمدم برسر قصہ۔ پنجابی زبان کے نصابی لٹریچر کا جائزہ لیتے وقت ہم ایک نہایت غیر متوقع صورت حال سے دوچار ہوتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ جہاں بچوں کے لئے پنجابی زبان ذریعۂ تعلیم ہے۔ وہاں اردو بھی یہی حیثیت رکھتی ہے۔ ہم یہاں ایسٹ انڈیا کمپنی کی آمد کے بعد کے زمانے کا ذکر نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ سکھا شاہی اور مغلیہ دور کا۔ یہ امر موجودہ نسل کے لئے باعث حیرت ہو۔ مگر مجھ کو اس صداقت کے اظہار میں کوئی تامل نہیں ہے۔ کہ اور صوبوں سے قطع نظر اردو زبان پنجاب میں قدیم سے ملکی زبان مان لی گئی ہے۔ ہمارے اسلاف کا رویہ اس مسئلہ کے متعلق بالکل واضح اور قطعی تھا۔ انہوں نے پنجاب میں پنجابی کے ساتھ اردو کو فراموش نہیں کیا تھا۔ گویا پنجاب میں دو زبانیں ذریعۂ تعلیم بنی رہیں۔ اس نقطۂ نظر سے انہوں نے ابتدا ہی سے بچوں کو دونوں زبانوں سے واقف کرنا ضروری سمجھا تھا۔ اور ان کی تعلیم میں دونوں قسم کے نصاب شامل کر لئے تھے۔ چنانچہ پنجابی زبان کے مشہور نصاب واحد باری اور رازق باری کے ساتھ ساتھ اردو کے نصاب خالق باری اور حمد باری بھی درس میں پڑھائے جاتے تھے۔

خالق باری پنجاب میں بے حد مقبول رہی ہے۔ اور مکتبوں میں کثرت کے ساتھ پڑھائی گئی ہے۔ چنانچہ وارث شاہ بھی اپنی تالیف "ہیر و رانجھا" میں اس کا ذکر کرتے ہیں:- ؎

اک نظم دے درس ہر کرن پڑھدے نام حق تے خالق باریاں نی
گلستاں بوستاں نال بہار دانش طوطی نامہ تے رازق باریاں نی

ہیر رانجھا ۱۱۸۰ھ میں نظم ہوتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے۔ کہ خالق باری وارث شاہ کے عہد میں پنجاب کے مکاتب میں عام طور پر پڑھائی جا رہی ہے۔ خالق باری کے متعدد نسخے نوشتہ پنجاب میری نظر سے گذرے ہیں۔ جو سوا ڈیڑھ سو سال پہلے کے نوشتہ ہیں۔ اس صوبہ میں خالق باری کی مقبولیت کی ایک دلیل یہ بھی ہے۔ کہ پنجاب کے نصابی لٹریچر پر اس کا بے حد اثر ہے۔ اس کی تقلید میں نصاب لکھے جاتے ہیں۔ بلکہ نام بھی اسی طرز کے اختیار کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ ذیل کی کتب کے نام بتقلید خالق باری رکھے گئے ہیں:-

(۱) واحد باری (۲) رازق باری (۳) ایزد باری (۴) اللہ باری (۵) ناصر باری (۶) صنعت باری (۷) قادر باری (۸) واسع باری۔ (۹) رحمت باری (۱۰) اعظم باری (۱۱) صادق باری (۱۲) اللہ باری (دیگر) (۱۳) رازق باری (دیگر)

پنجابی زبان کے سب سے پہلے نصاب یعنے واحد باری میں ایسے آثار موجود ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ کتاب خالق باری کی ممنون ہے۔ حتیٰ کہ خالق باری کے مصرع اور شعر تک اس میں داخل کر لئے گئے ہیں۔ میں ایک دو مثالیں دیتا ہوں ؛۔

خالق باری۔ ؎

آتش آگ آب ہے پانی
خاک دھول جو باد اوڈانی

واحد باری۔ ؎

عمہ پھوپھی ختوعہ نانی
آتش آگ آب ہے پانی

خالق باری۔ ؎

دیگ ہانڈی کفچہ ڈوئی بنجیطا
تابہ کز گان است کڑاہی دتوا

واحد باری۔ ؎

دیگ ہانڈی کفچہ ڈوئی بنجیطا
تاب و کز غاں ہے کڑاہی جو توا

خالق باری ؎

چالنی غربال چاکی آسیا
دیگدان چولھا و کندو کوٹھیا

واحد باری۔ ؎

چھاننی غربال چکی آسیا
چپنی سرپوش چلھا دیگیا

خالق باری کے مخطوطات میں جو نوشتۂ پنجاب ہیں۔ ایک امر اور دیکھا جاتا ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ اس کے ہندوستانی تلفظ کو پنجابی رنگ کے تلفظ میں تبدیل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جس سے ظاہر ہے۔ کہ یہ کتاب مدتہٗ دراز تک اس صوبہ میں داخل درس رہی ہے۔

خالق باری کے بعد مجھے نصاب سہ زبان عرف صمد باری یا جان پہچان کا ذکر کرنا چاہیئے۔ جو بزبان ہریانی لکھا گیا ہے۔ یہ زبان بعض امور میں اردو سے کسی قدر مختلف ہے۔ ورنہ دونوں ایک ہی ہیں۔ بلکہ جن ایام میں یہ نصاب تالیف ہوا ہے۔ اس وقت کی اردو اور ہریانی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ عبدالواسع عہد عالمگیر کے بزرگ ہیں اور کئی تالیفات مثلاً شرح بوستان و شرح زلیخا۔ رسالہ عبدالواسع، اور غرائب اللغات کے مصنف ہیں۔ ان کا نصاب پنجاب کے مکتبوں میں بڑے شوق و ذوق کے ساتھ پڑھایا جاتا تھا۔ اس نصاب کے متعدد نسخے نوشتہ پنجاب میری نظر سے گذر چکے ہیں۔ اور اس قدر مقبول ہے۔ کہ پنجابی زبان کے مجموعۂ نصاب یعنی فارسی نامہ۔ واحد باری اور اللہ باری کے ساتھ بیسیوں مرتبہ لاہور کے مطبعوں میں چھپ چکا ہے۔

اردو زبان اس صوبہ میں اس قدر مقبول رہی ہے۔ کہ خود اہل پنجاب نے اس زبان میں نصاب طیار کئے ہیں۔ ان میں سب سے قدیم مولوی اسحٰق لاہوری کا ایک ہے۔ جو بعہد شاہجہان ۱۰۴۵ھ کے قریب تالیف ہوتا ہے مولوی اسحٰق نے دو نصاب لکھے ہیں۔ اور دونوں فرح الصبیان کے نام سے موسوم ہیں۔ ان رسالوں میں اگرچہ پنجابی زبان کا چھینٹا بعض قوموں پر نظر آتا ہے۔ لیکن اردو الفاظ کی کثرت ہے۔ اور تشریحی زبان فارسی ہے میں بعض مثالیں دیتا ہوں ؛۔

جرّاح رگزن آمد مجروح بداں تو گھائل
حق راستی تبختر در ہندوی است مائل
طاؤس مور زمنک کویل سیاہ کالی
جنت بہشت سرگ است داں نخلبند مالی
برگستوان پاکھر زریں بداں سونہری
شق پارہ موش پراں در ہندوی گلہری
زاغ و کلاغ کویا گوسپند شاط بکری
چوں دیوچہ است اجی جوک عنکبوت مکڑی
خمیازہ فازہ باشد در ہندوی اوباسی
کہکہ فواق ہدکی ضحک است خندہ ہاسی

اشخار وان تو بجی حف موزہ موز کیسلا
بعرہ چہ پشک میگن مدور کلوخ ڈھیسلا
مسمار تیغ آہن ہمہ سنان برچھی؟
کفگیر کفچہ ڈوئی چوں یخطواست کرچھی؟

ذیل میں اسی تالیف سے بعض الفاظ درج کئے جاتے ہیں جن سے ناظرین اس کی زبان اور اردو و پنجابی الفاظ کا تناسب معلوم کرسکینگے

(۱) الی (۲) اٹیرن (۳) چوسی (چونری) (۴) مچیٹھ (۵) بھیڈا (مینڈھا) (۶) انکل (۷) ناد (ناقوس) (۸) گولا (۹) کولا (کوئلہ) (۱۰) انگیٹھی (۱۱) بجلی (۱۲) سونڈ (۱۳) منگنا (مانگنا) (۱۴) چھجا (۱۵) پکھا (پنکھا) (۱۶) کانجی (۱۷) پھٹکری (۱۸) ہولاں (ہولے) (۱۹) ستو (۲۰) دھوپ (۲۱) مچان (۲۲) چھکا (چھینکا) (۲۳) ٹیکا (۲۴) اوگالی (جگالی) (۲۵) کنوار (۲۶) کال کنگنی (۲۷) کوٹھی (۲۸) السی (۲۹) میتھی (۳۰) سرسوں (۳۱) ڈوئی (۳۲) ہنگ (ہینگ) (۳۳) سنگ (سینگ) (۳۴) جوار (۳۵) مسر (مسور) (۳۶) باڑی (۳۷) ملی (۳۸) نالیر (ناریل) (۳۹) پنڈ (کھجور) (۴۰) سپاری (۴۱) اکھروٹ (اخروٹ) (۴۲) ہدکی (ہچکی) (۴۳) ڈیکار (ڈکار) (۴۴) ککری (۴۵) کھیرا (۴۶) پھٹ (پھوٹ = خیار بر شکالی) (۴۷) بینگن (۴۸) توری (ترئی) (۴۹) تو ہر (تقو ہر) (۵۰) پھلسا (۵۱) کسنبہ (۵۲) جواہا (جواسا) (۵۳) گھٹلی (گٹھلی) (۵۴) سکہ (۵۵) پتیل (۵۶) نوہا (۵۷) کھان (۵۸) کھوٹا (۵۹) دیور (۶۰) منس (۶۱) بانجھ (۶۲) سالہ (۶۳) پھوپھی (۶۴) جوڑا (۶۵) ہانسی (۶۶) پالک (پلے پالک) (۶۷) سانڈھو (ساڑھو) (۶۸) سسرا (۶۹) اکھی (مکھی) (۷۰) جالی (جال) (۷۱) سوکن (۷۲) ماموں (۷۳) چاچا (چچا) (۷۴) کاچا (کچا) (۷۵) سمدھن (۷۶) گنگا (گونگا) (۷۷) دہی (۷۸) مسکہ (۷۹) مکھن (۸۰) راتی (۸۱) ملائی (۸۲) چھاچھ (۸۳) مصانی (رئی) (۸۴) سرمدانی (سرمہ دانی) (۸۵) تیل (۸۶) پلی (۸۷) کولھو (۸۸) کھل (۸۹) آٹا (۹۰) گالا (۹۱) گاڈی (گاڑی) (۹۲) بھڈیا (بھیڑیا) (۹۳) چیتیا (۹۴) سہا (خرگوش) (۹۵) مینا (۹۶) سندلیسہ (۹۷) گوہ (۹۸) کویل (۹۹) تیترا (تیتر) (۱۰۰) جوک (جونک) (۱۰۱) گھڑا (۱۰۲) نیول (نیولا) (۱۰۳) بچھو (۱۰۴) کچھو (کچھوا) (۱۰۵) چھپکلی (۱۰۶) ڈھکلی (منجنیق)

یہ کل ایک سو چھ الفاظ ہیں۔ جن میں الفاظ ذیل بہ تفاوت لہجہ پنجابی مانے جاسکے ہیں:-

(۱) بھیڈا (مینڈھا) (۲) کولا (کوئلہ) (۳) منگنا (مانگنا) (۴) پکھا (پنکھا) (۵) ہولاں (ہولا) (۶) چھکا (چھینکا) (۷) ہنگ (ہینگ) (۸) سنگ (سینگ) (۹) مسر (مسور) (۱۰) اوگالی (جگالی) (۱۱) ہدکی (ہچکی) (۱۲) پھٹ (پھوٹ) (۱۳) جواہا (جواسا) (۱۴) سانڈھو (ساڑھو) (۱۵) گنگا (گونگا) (۱۶) کچھو (کچھوا)

ان سولہ لفظوں میں اکثر ایسے ہیں جن کو صرف لہجہ کے فرق نے پنجابی بنادیا ہے مثلاً ہینگ۔ سینگ۔ پھوٹ اور گونگا وغیرہ۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ مصنف کے مقابلہ میں کاتب اس ترمیم کا زیادہ ذمہ دار ہے۔

کئی ایسے نصاب ملتے ہیں۔ جن میں آدھی اردو اور آدھی پنجابی ہے لیکن میں ان سب سے قطع نظر کرکے اللہ باری یا ذوق الصبیان کا ذکر کرتا ہوں۔ جو ۱۲۰۰ھ کی تالیف ہے۔ اس کے مصنف حافظ احسن اللہ بن حافظ ہدایت اللہ بن حافظ عنایت اللہ لاہوری ہیں۔ حافظ صاحب کا پیشہ معلمی ہے۔ اس کے ساتھ کتابت اور مہرکنی بھی کرتے ہیں۔ نہایت زود نویس ہیں۔ اور کتابیں کثرت کے ساتھ نقل کی ہیں۔ اس کے علاوہ صفحوں کی تعداد (۹۰۲) اور فی صفحہ (۱۹) سطریں ہیں۔ اس حساب سے اشعار کی تعداد سترہ ہزار کے قریب ہوگی۔ مفتاح الافواہ کی زبان فارسی ہے۔ مصنف کی توجہ عربی الفاظ کی طرف تمام تر مبذول ہے لیکن ایک دلچسپ پہلو اس تالیف کا یہ ہے۔ کہ اس میں اردو الفاظ بھی کثرت سے لائے گئے ہیں۔ مگر مفتاح الافواہ پر تبصرہ کا یہ موقعہ نہیں ہے۔ اس لئے میں اس ضخیم تالیف سے دستکش ہوکر حافظ صاحب کی دوسری تالیف ذوق الصبیان کے متعلق چند الفاظ کہنے چاہتا ہوں۔

ایک معلم سب سے زیادہ بچوں کی ضروریات سمجھنے کا اہل ہے

جب لاہور میں بیٹھ کر حافظ احسن اللہ اردو کا نصاب طیار کرتے ہیں۔ تو ہم سمجھ سکتے ہیں۔ کہ اس کی از حد ضرورت ہوگی۔ ذوق الصبیان کی تشریحی زبان اردو ہے۔ حافظ صاحب اپنے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔ کہ اس سے قبل میں نے اس مضمون پر ایک بڑی کتاب طیار کی ہے۔ لیکن وہ بچوں کیلئے دقیق و دشوار ہے۔ اس لئے نصاب ہٰذا کو آسان ہندی زبان میں طیار کیا ہے۔ سال تصنیف ۱۲۰۷ھ ہے۔ اردو زبان کے متعلق حافظ صاحب فرماتے ہیں۔ یہ ہندی زبان بہت آسان ہے۔ بچے بڑی خوشی کے ساتھ اسے پڑھتے ہیں۔ اور پسند کرتے ہیں۔ اب میں نمونۂ کلام دکھانے کے لئے ذوق الصبیان کے دیباچہ سے ایک اقتباس دیتا ہوں :-

احسن نام اک عاجز بندہ   ملاں کاتب بہر کنندہ
احسن اللہ کی ہے یہ رعایت   اس کی ہدایت اس کی عنایت
اس کا وطن لاہور نگر ہے   کمتر کہتر اور احقر ہے
اوسکی وا تا خطا کو بخشے   اوسکے ماتا پتا کو بخشے
کہیاں ہیں یہ کیتیاں بتیاں   فارسی عربی ہندی باتاں
لڑکے میرے پاس ہیں پڑھتے   لوگ ہیں مجھکو ملاں کہتے
آگے ایک کتاب لکھی ہے   اس پر محنت بہت گئی ہے
پر وہ بہت دراز و کلاں ہے   لڑکوں کی ابھی کند زباں ہے
یہ آساں اور ہندی بولی   لڑکوں کو ایک کھیل ہے کھولی
خوشی خوشی وہ پڑھتے ہیں اسکو   چشم و سر اوپر دھرتے ہیں اوسکو
ذوق الصبیان نام رکھا ہے   سال اوس در باغ کھا ہے
جو کوئی اوسکو پڑھے پڑھاوے   عیب سنوارے اور بناوے
دے اصلاح جو ہووے بھلائی   مجھ کو دے دعا و بھائی
بحر فروغ تقارب میزاں   فعلن فعلن فعلن فعلاں

ذیل کا اقتباس اصل نصاب سے دیا جاتا ہے :-

دل و جگر ہے ہیا کلیجہ   کلا سر ہے مغز ہے بھیجا
امہ کنیز ہے لونڈی باندی   جتیل نقرہ فضہ چاندی
روپا سونا سیم و زر ہے   ڈبا کوپا ظرف سپر ہے
عاشق متر ابندہ چیرا   خیمہ تنبو منزل ڈیرا
حلقہ دورہ گردہ گھیرا   گشت و گذار گذر ہے پھیرا
بھار بوجھ انبار ہے تودہ   بھیڑ انبوہی آنتر رودہ
لوہو خون سیاہی سودا   طحال سپرز تلی مخ گودا
پتہ زہرہ تلخہ صفرا   دشت و بر بیاباں صحرا
گھیا کدو گونگلو شلغم   لیس لعاب کف و جھگ بلغم
بیچ ہے اندر بیروں باہر   باگھ غضنفر شیر ہے ناہر

مصنف کا طرز بیان شگفتہ اور زبان نہایت صاف ہے بعض بعض موقعوں پر پنجابی لہجہ نظر آتا ہے۔ میں چند شعر ایک اور مقام سے نقل کرتا ہوں :-

سجن دوست ہے یار خلیل   تھوڑا اندک کم و قلیل
بہتا بیش بس و بسیار   افزوں زیادہ وافر دار
فیل اور ہیل اور گمنا ہاتھی   ہمدم ہمرہ بیلی ساتھی
سنگ و سنگت قافلہ کارواں   سوداگر تاجر بازرگاں
پتھر سنگ رتن ہے جوہر   مروارید موتی در و گوہر
مربع چورس گرد ہے گول   نرخ بہا اور قیمت مول
اجر و اجرت مزدہ مزدوری   روغن گھیو ملیدہ چوری
مرجاں بسد گلی اور مونگا   صم و بکم ہے ڈورا گونگا
غریب مسافر ماندہ تھکا   پرندہ پنکھی باد کش پنکھا
سگ ہے کتا گربہ بلی   جہاں آباد شہر ہے دلی
باگھ بگھیار شیر اسد ہے   سباع درندہ دام و دد ہے
ماہی مچھلی سیناسار نہنگ   ہندی چیتا یوز پلنگ
آہو ہرن سہا خرگوش   کھال رات جو گذری دوش
دے و پری جو گذرا کل پرسوں   کنجد تل سرشف ہے سرسوں
کل پرسوں آئندہ جو آوے   فردا اور پس فردا بھاوے

اوپر کے اقتباسوں میں آنتر (آنت) ۔ کھل (کل) ۔ گونگلو (شلغم)

گھیو رکھی، چوری (ملیدہ)، گل (موتگا)، دوڑا (بہرا) وغیرہ پنجابی زبان کے ذخیرہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ آنت جھاگ اور کل وغیرہ کا صحیح ترجمہ یہی ہو سکتا ہے۔ گونگلو آجکل پنجابی مانا جاتا ہے۔ اور اردو میں غیر مستعمل ہے لیکن مغلیہ عہد سے قبل کے اہل لغات اس لفظ سے واقف ہیں۔ اور قدیم تلفظ وہی ہے۔ جو آج پنجاب میں رائج ہے۔ چنانچہ اداۃ الفضلا تالیف ۸۲۲ھ میں چقندر کا مرادف گونگلو دیا گیا ہے۔ شرف نامۂ احمد منیری ۸۷۷ھ میں گانگلو اور مؤید الفضلا ۹۲۵ھ میں گنگلو لکھا ہے۔ خاتمہ:-

ختم مرتب پور اسارا — آخر اوڑک عجب نیارا — تنکا خس ہی پچھے پس ہے

پور اسارا قانع بس ہے — تو بھی بس اب بس کر اتن — پھر درود اور حمد ذوالمن

مانگ خدا سی یہی سامی — بخشے رب گناہ تمامی — بندہ منگتا کرے دعائیں

مولی صاحب آتا سائیں

"باغ" اس تالیف کا مادۂ تاریخ ہے جس سے ۱۲۰۷ھ برآمد ہوتا ہے۔ اور ۱۷۹۳ء کے برابر ہے۔ اس سال تیمور شاہ درانی کا انتقال ہوتا ہے۔ اور شاہ زمان تخت نشین ہوتا ہے۔ لاہور میں سکھوں کا قبضہ ہے۔ سوبھا سنگھ اور لہنا سنگھ کی حکومت ہے۔ خلاصہ یہ ہے۔ کہ پنجاب میں اردو نصابوں کا رواج نیز اردو نصابوں کی اس صوبہ میں تصنیف و تالیف ہمیں اس نظریے کو تسلیم کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ کہ پنجابی زبان کی طرح اردو زبان بھی اس صوبہ میں قدیم سے ذریعۂ تعلیم رہی ہے۔ اس میں شک نہیں۔ کہ اردو پنجاب میں بعہد شاہان مغلیہ بولی اور سمجھی جاتی رہی ہے لیکن ہم کو یہ علم نہیں تھا۔ کہ بچوں کی تعلیم میں بھی اس سے کام لیا جا رہا ہے۔ خالق باری کے بعد اردو کا سب سے قدیم نصاب فرح الصبیان پنجاب میں لکھا جاتا ہے۔ یہ امر شاید ان بزرگوں کی آنکھیں کھولے۔ جو آج پنجاب میں اردو کے استحقاق کو نظر انداز کرتے ہیں۔ اور پنجابی کے لئے اصرار کرتے ہیں۔ ہم پنجاب کے ساتھ اردو کے قدیم تعلقات کی داستان سے بالکل بے خبر ہیں۔ لیکن اس سلسلہ میں جو بعض واقعات گذشتہ چند سالوں میں روشنی میں آئے ہیں۔ ان سے یہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کہ اردو کے روابط اس صوبہ کے ساتھ نہایت قدیم اور گہرے ہیں۔ اردو اور پنجابی کی صرف و نحو ان زبانوں کے اتحاد اور قرابت کی طرف دلالت کرتی ہے۔ اردو کا سب سے قدیم فقرہ جو ہمیں معلوم ہے۔ پنجاب ہی کے ایک شیخ حضرت فرید الدین گنج شکر کی یادگار ہے۔ مسلمانوں میں سب سے اول جس شاعر نے ہندی دیوان لکھا۔ وہ لاہور کے مشہور شاعر خواجہ مسعود سعد سلمان ہیں۔ سب سے پہلے جس شخص نے دوہرہ لکھا۔ وہ یہی شیخ فرید الدین مذکورہ بالا ہیں۔

گجرات و دکن میں اگرچہ اردو تالیفات دسویں صدی ہجری سے شروع ہو جاتی ہیں لیکن شمالی ہندوستان میں دو صدی بعد تک ان کا پتہ نہیں چلتا۔ دہلی میں ابھی اردو دبستان قائم بھی نہیں ہو چکتا ہے۔ کہ پنجاب میں لوگ اردو زبان میں مثنویاں لکھنی شروع کر دیتے ہیں۔ میر پور (کشمیر) کے شیخ غلام محی الدین تصوف کی مثنوی گلزار فقر ۱۱۳۱ھ میں ختم کرتے ہیں۔ بٹالہ کے مشہور شیخ غلام قادر ۱۱۵۱ھ سے قبل مثنوی رمز العشق لکھتے ہیں۔ اسی بٹالہ کے ایک اور مصنف عاجز تخلص ہیں۔ جو سیف الملوک و بدیع الجمال کا قصہ فارسی سے اردو میں نظم کرتے ہیں۔ ایک اور بزرگ تحسین ہیں۔ جو ایک نظم موسوم بہ واردات کے مالک ہیں۔ جس میں مصنف ایک شاگرد کی دعوت پہ جو دیوان زادوں میں سے ہے۔ اپنے میر پور کے سفر راہ کی مشقت و صعوبت۔ میزبان کی بے اعتنائی۔ وہاں سے واپسی، اور گھوڑے کی مذمت و دیگر واقعات بیان کرتا ہے۔ یہ تالیفات جو اندکے از بسیارے و مشتے نمونہ خروارے کا حکم رکھتی ہیں۔ خالص پنجاب کی پیداوار ہیں۔ جن پر ہندوستان کا اثر مطلق نہیں ہے۔ یہ لوگ نہ ہندوستان گئے۔ اور نہ اردو دانوں سے تعلق میں آئے لیکن اردو میں اپنی تالیفات لکھ رہے ہیں ہمیں ستائش کرنی چاہئے ان بزرگوں کی جو دلی در کنار خود پنجاب کے دارالسلطنت لاہور سے بھی فاصلہ پر رہکر ان دور افتادہ مقامات میں جہاں اردو بولنے والا مہینوں کیا بلکہ برسوں بھی ان سے تعلق میں نہیں آسکتا ہوگا۔ اردو زبان کی تحریک کو زندہ رکھتے ہیں۔ اب تاوقتیکہ ان تالیفات کے پڑھنے والے پنجاب میں موجود نہ ہوں۔ ان کا منصۂ شہود پر آنا ممکن نہیں اسلئے اس لٹریچر کی روشنی میں ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ کہ پنجاب میں کم و بیش ہر عہد میں اردو کیلئے سرگرمی رہی ہے

(پروفیسر حافظ محمود شیرانی)

رحمٰن چغتائی

وارث

بادشاہ مایوس ہو چکا تھا۔

ملکہ چاہتی تھی کہ بادشاہ دوسری شادی کرلے۔

ان کا کوئی وارث نہ تھا۔

رعیت کا غمخوار نیک دل بادشاہ ملکہ کو دل سے چاہتا تھا۔

ایک دن بادشاہ نے بوڑھے وزیر سے کہا میں چاہتا ہوں کہ تخت کا وارث انتخاب کروں۔ سلطنت اور حکومت کو وارث کی سخت ضرورت ہے۔

دانشمند وزیر بادشاہ کا چہرہ تک رہا تھا۔ ایک آنسو اس کی آنکھوں میں چمکا اور زمین پر گر گیا۔

بادشاہ اپنے وزیر سے بڑی بڑی امیدیں رکھتا تھا۔ بہت جلد اس نے اندازہ کرلیا۔ کہ وزیر کے ذہن میں کن جذبات نے کروٹ لی ہے۔ اور وہ اپنے بادشاہ سے کس قدر محبت رکھتا ہے۔

بادشاہ نے کہا ایک جشن کیا جائیگا جس میں ملک کے تمام بچے زریں لباس پہنے قومی نشان لگا کر آئینگے۔ جشن کے روز میں اپنا ہیرے کی سی چمکتی ہوئی آنکھوں والا باز اڑاؤنگا۔ وہ جس پر جا بیٹھیگا میں اُسے اپنا جانشین تسلیم کرلونگا۔

چند لمحوں تک وزیر اور بادشاہ بالکل چپ رہے۔

وزیر کا سر جھک گیا۔ شاید اس نے بادشاہ کی تجویز کو درست تسلیم کرلیا تھا۔ یا اپنی خاموشی سے اس عقیدت کا اظہار کر رہا تھا۔ جو اسے اپنے بادشاہ سے تھی۔

آخر جشن کا دن آپہنچا۔ خوبصورت بچے زریں لباس پہنے قومی نشان لگائے ماؤں سے رخصت ہو کر اپنے بادشاہ کی آرزو پوری کرنے آئے جشن اپنی مثل آپ تھا۔ اس سے پہلے ملک نے ایسا جشن نہ دیکھا تھا اور نہ سنا تھا۔

بادشاہ اپنی ملکہ اور مصاحبوں کے ساتھ اس شاندار چبوترے پر جا بیٹھا جو بادشاہ کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ یہ جگہ قدرتی پھولوں

زریں پردوں اور قالینوں سے سجائی گئی تھی۔ جہاں بیٹھ کر بادشاہ اپنے ملک کے مستقبل کا فیصلہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ اٹھا اور اپنے باز کو جو اس کے ہاتھ پر بیٹھا ہُوا تھا فضا میں چھوڑ دیا۔ باز بلندی کی طرف اڑا اور پھر اس تیزی سے نیچے کی طرف آیا گویا کسی پر جھپٹ پڑیگا لیکن آخر کار آہستہ آہستہ اترتے ہوئے بوڑھے وزیر کے اکلوتے بیٹے کے سر پر جا بیٹھا۔

رعیت کے سامنے زندگی کا ایک نیا باب کھل گیا۔

بادشاہ نے دانشمند وزیر سے کہا اے خیر خواہ سلطنت جو کچھ ظہور میں آیا ہے۔ اگر اسی پر عمل کیا جائے تو رعیت ضرور بدظن ہو جائیگی۔ چنانچہ بہتر یہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس اہم فیصلے کے لئے ملک کو ایک اور موقع دیا جائے۔

آخر دوسرا جشن بھی آگیا۔ بادشاہ نے پھر باز چھوڑا اور وہ پہلے کی طرح پھر بوڑھے وزیر کے لڑکے پر جا بیٹھا۔

بادشاہ کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس نے کہا میں ایک بار پھر آزمائش کرونگا۔ لیکن تیسری مرتبہ بھی وہی کچھ ظہور میں آیا جو پہلے ہو چکا تھا۔

بادشاہ کا رنگ زرد پڑگیا اس کی آنکھوں میں رنج اور خوف جھلک رہے تھے۔ اس نے بہت سوچ بچار کے بعد سر اٹھایا اور کہا اس سلطنت میں اس بچے سے بڑھ کر میرا کوئی دشمن نہیں!

دانشمند وزیر خاموش رہا۔

بادشاہ کی آنکھیں شاہین کی طرح چمک اٹھیں۔ انجام کار بادشاہ کی سالگرہ کا دن آیا۔ تمام ملک خوش و خرم تھا۔ بادشاہ کی سلامتی کے گیت گائے جا رہے تھے۔

بادشاہ نے درشن جھروکے میں کھڑے ہو کر کہا میں آج آخری مرتبہ اپنا وارث منتخب کرنا چاہتا ہوں۔

اس نے ہوا میں اپنا باز چھوڑ دیا۔

ملکہ غیر معمولی طور پر خوش تھی وہ بالکل بدل چکی تھی۔ اس کی نگاہیں بار بار بادشاہ پر پڑ رہی تھیں۔

باز نیچے اتر رہا تھا۔ اس دفعہ خلاف معمول وہ ملکہ کے سر پر جا بیٹھا۔

ملکہ کے سر کے پیچھے باز کے پھیلے ہوئے پروں کے درمیان ایک روشنی چمک رہی تھی۔

بادشاہ نے ملکہ کی طرف تعجب کی نگاہوں سے دیکھا۔

ملکہ مسکرائی اور اس کا سر جھک گیا۔

رحمٰن چغتائی

محمد عبداللہ چغتائی

مسلمانوں میں مصوری کا ارتقاء

فنونِ قبلِ اسلام

قدیم روایات جدید تاریخی تحریکات اور آثار عتیقہ کے اہم انکشافات نے ہماری معلومات اور ذہنی نشو و ارتقاء میں بہت بڑا اضافہ کیا ہے۔ اور ان کو منصۂ شہود پر لانے کی غرض سے محققین اور ماہرین نے ہر قسم کے ذرائع اور آخذ کی تلاش میں کمی نہیں کی ہے جدید معلومات سے قطع نظر اگر مصوری کے صحیح آغاز کا کھوج لگایا جائے تو ہم اس کے رواج اور دریافت کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم نہیں کر سکتے بلکہ اس کی ترویج کا عہد بھی متعین کرنے سے قاصر ہیں۔ مگر موجودہ تحقیقات اور انکشافات کی روشنی میں جب اس موضوع پر نگاہ ڈالی جاتی ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ قبل ولادت مسیح تک کے آثار دریافت ہو چکے ہیں۔ **مصری** جیسا کہ حال ہی کے مصری انکشافات نے قدیم تاریخ مصر کو کافی زندہ کر دیا ہے۔ اس زمانے کے مصریوں کے اعتقادات، رسوم، عادات و اوضاع زندگی ان نقوش جداریہ سے واضح ہیں جو ان کے رسم الخط و تحریر سے ملے ہوئے ہیں۔ ان نقوش اور تحریروں سے اس نظریہ کی تصدیق ہوتی ہے کہ "مصوری ایک قسم کی تحریر ہے"۔ اور یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ یہ فن مصر میں اس وقت کس اعلیٰ پیمانہ پر تھا یعنی ان نقوش کی بدولت آج ان کی قریب قریب تمام قدیم تاریخ محفوظ ہے۔ ہمارے سامنے برٹش میوزیم کا (ROSETTA STONE) حجر رشید اس کی بہترین مثال ہے۔ جسے مصری مفتاح اللغۃ ہیرو غلیفیہ کہتے ہیں۔ اس پتھر میں ایک مصری فرمان دو طرز کی کتابت میں محفوظ ہے۔ ایک تو کتابت ہیرو غلیفیہ (قدیم مصری تحریر) ہے۔ اور دوسری کتابت یونانی زبان میں ہے جو ۱۹۵ ق م میں رائج تھی۔ یہ پتھر ۱۷۹۸ء میں مصر میں برآمد ہوا اور ۱۸۰۱ء میں انگلستان لایا گیا۔ اس پتھر سے اس امر پر پوری روشنی پڑتی ہے کہ یونانی زبان کے ذریعہ کس طرح مصری زبان کو پڑھا جا سکتا ہے۔

یونانی اگر مصوری کے متعلق یہ تحقیقات کی جائے کہ اسکا آغاز اولاً کس ملک سے ہوا اور مشرق و مغرب میں اسکی ایجاد و رواج کا سہرا اولاً کس کے سر ہے۔ اور ممالک عالم کی مختلف تہذیبوں میں کون سی تہذیب سب سے پیشتر اس کی علمبردار ہوئی ہے تو ایسے سوالات کا جواب آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ یہاں صرف یہی کہنا کافی ہوگا کہ اس کی ابتدا محض مذہبی فرائض کی بنا پر ہوئی ہے۔ فن کی حیثیت سے نہیں جیسا کہ آج وہ شمار ہوتی ہے۔ اگر اہلِ یونان سنگتراشی میں تمام دنیا پر سبقت لے گئے جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے تو یہ تمام تحریک ان کے مذہبی جذبات کی ممنون احسان ہے کیونکہ یونانیوں نے جس چیز یا شخص کو مافوق العادت دیکھا اسے قابل پرستش تسلیم کر لیا۔ یہ معبود خواہ جمادات سے ہو خواہ نباتات سے خواہ حیوانات سے۔ یہ پرستش ان میں اس قدر راسخ ہو گئی کہ مختلف معبودوں کی تمثیل کو گھڑ کر ان کی عبادت شروع کر دی۔ اور ان کی خصوصیات کے مطابق ان کے مختلف نام رکھ دیئے۔ چنانچہ محض مذہب کی بنا پر

یونانیوں نے اس فن میں تمام دنیا سے خراج تحسین وصول کیا تھا - اس فن نے سکندر اعظم کی فتوحات کے دور میں ممالک غیر پر بھی اثر ڈالا - جب سکندر اعظم ہند میں آیا تو اس کے ہمراہ بیشمار حکماء، فضلا اور صناع تھے - انہوں نے ہند کی فضا کو دیکھ کر اپنے فن کو ہندی دیوتاؤں کی خدمت گزاری کا بھی آلہ بنا دیا - اس کا سراغ ٹیکسلا و بامیان وغیرہ کے قدیم اصنام میں ملتا ہے - اس عہد کے یونانیوں کے مذہب کو جمالیاتی مذہب کے نام سے یاد کرنا بیجا نہ ہوگا جو بالخصوص فنون لطیفہ کے فروغ کا باعث ہوا - مورخین نے لکھا ہے کہ جب سکندر نے ممالک مشرق میں قدم رکھا تو اس کا درباری مصور اپیلاس بھی اس کے ہمرکاب تھا جس نے ابھی محض سکندر کی جنگوں کے مناظر کو اپنے مشاہدہ کے مطابق حوالۂ قلم و رنگ کیا تھا مگر اس کے دل میں یہ امنگ تھی کہ کبھی بزم کی ملکہ صنف نازک کے ساتھ بھی اس کی تصویر اتارے - سکندر نے اس کے مصورانہ جذبات کا اندازہ و احترام کرتے ہوئے وعدہ کیا تھا مگر ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ وہ فاتح اور جنگجو ہونے کی حیثیت سے فطرتاً مجالس نشاط اور صنفِ نازک کی صحبتوں سے چنداں دلچسپی نہیں رکھتا - چنانچہ جب ایرانیوں کو شکست فاش ہوئی تو نازنینانِ حرمِ دارا میں سے ایک کیپاسپ نامی نازنین کو انتخاب کر کے سکندر کی خدمت میں پیش کیا گیا - سکندر نے حسب وعدہ اپیلاس مصور کو اس کی تصویر بنانے کا حکم دیا اس نے نہایت مسرت سے یونانی دستور کے مطابق نازک حسین کیپاسپ کو اپنے سامنے عریاں بٹھا کر تصویر کھینچنی شروع کی - اب تک مصور کے موقلم کو جنگی مناظر کی مشغولیتوں سے کبھی فرصت نہیں ملی تھی - اس تبدیلی سے اس پر ایسی وجدانی کیفیت طاری ہوئی کہ وہ اپنے فن کے مبادیات بھول گیا جس طرح ایک ماہر موسیقی داں اپنی دلکش آواز اور ترانوں اور نغموں سے سامع کا قلب موہ لیا کرتا ہے یہی حالت اس دوشیزہ کے حسن و شباب کی مقناطیسی کشش نے غریب مصور کے دل کے ساتھ کی وہ ہزار دل و جان سے اس پر فریفتہ ہوگیا - اس کے جذبات و خیالات اس قدر مسحور ہوئے کہ وارفتگی کے عالم میں مصور خود پتھر کا نمونہ بن کر رہ گیا - سکندر اعظم یونانی النسل اور ارسطو کا تلمیذ تھا اور تسخیر اقالیم و فتح ممالک اس کی غایت تھی - حسن و عشق کے جذبات لطیف سے بالکل مستغنی تھا - وہ اپنے مصور کو مغلوب جذبات دیکھ کر کیپاسپ کو اس کی رفیقۂ حیات بنا دیتا ہے - اس سے واضح ہوتا ہے کہ فنون لطیفہ کے لحاظ سے وہ زمانہ بھی اوج کمال پر تھا -

اب دیکھنا یہ ہے کہ جب سکندر اعظم فارس میں آیا تو اس وقت وہاں کے فنونِ لطیفہ کی کیا حالت تھی - وہاں کے قدیم ایوان طیسفون - طاق بوستان - قصر شیریں وغیرہ عمارات کے نقوش جس سے ایرانیوں کے مذہب و عقائد وغیرہ پر پوری روشنی پڑنے کے علاوہ فنون لطیفہ ایران کے اعلیٰ معیار کا بھی پتہ چلتا ہے - ان کے ساتھ عراق کے جدید انکشافات ہمیں عراق و عجم کے فن میں مماثلت بتلاتے ہیں - عراق کے ورے اشور کے کھنڈرات بھی کسی حد تک یہی روایات پیش کرتے ہیں غرضکہ مشرق کے یہ تمام ممالک مع مصر جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے اپنا الگ الگ فن اپنی روایات کے مطابق رکھتے تھے -

اگر ہم یونان عراق و عجم کو مغربی و مشرقی حیثیت سے دیکھیں تو فن کی فوراً دو حیثیتیں مغربی و مشرقی ہو جاتی ہیں - جو اپنی اپنی خصوصیات میں بالکل متضاد ہیں ایک کو دوسرے پر تقدم زمانی نہیں دیا جا سکتا - بعض محققین نے لکھا ہے "کہ یونانی علوم و فنون اگرچہ مشرقی ہی ہیں - لیکن ان کی نشو و نما مشرقی روایات پر نہیں ہوئی بلکہ یورپی اور یونانی روایات پر ہوئی ہے جس کی

؎ - مشاہیر مصورین اور ان کے مطمح نظر ص ۳۷

تاریخ بھی موید ہے۔ سنہ ۵۲۱ ق م دارا اول کے عہد حکومت میں جب ایرانیوں نے یونانیوں کو تاخت و تاراج کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مصر، فلسطین، شام، ایشیائے کوچک اور قبرص تک اور بحیرۂ روم کا مشرقی ساحل ایرانیوں کے قبضہ میں آچکا تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ قدیم بازنطینی و ایرانی نقش و نگار بہت مشابہ ہیں۔ ایک قدیم کوزہ نقشین کے انکشاف نے اس مسئلہ پر کافی روشنی ڈالی ہے جو اٹلی کے ایک پرگنہ کا توزہ میں برآمد ہوا ہے جس میں کسی قدیم مصور نے دارا شاہ ایران کو یونانیوں سے خراج وصول کرتے ہوئے دکھایا ہے۔ نقاش اس وقت کی بود و باش کے مطابق دونوں قوموں کو متمیز طور پر اظہار کرنے میں کامیاب[1] ہے۔

ردمی

ایران کی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ایک قلیل عرصہ کے لئے بھی ایرانی فنون لطیفہ کی ترویج میں باوجود حوادثات زمانہ کے کوئی خلیج حائل نہیں ہوئی۔ یورپین محققین فن نے بازنطینی فن کو بہت ترجیح دی ہے لیکن یاد رہنا چاہیئے کہ ظہور اسلام کے وقت وہاں کے مدارس بند ہو گئے تھے جو دراصل وہاں کا خاتمہ تھا۔ ایرانی فن کے تسلسل کے متعلق اور شواہد بھی ملتے ہیں، جیسا کہ شعرائے اسلام نے ابتدا ہی سے اپنے کلام میں بعض جگہ اس فن کی خوبیوں کو بطور تشبیہات پیش کیا ہے۔ چنانچہ ابونواس متوفی سنہ ۱۹۵ھ نے جام شراب کی تعریف میں کہا ہے ؎

قرارتها كسرى وفي جنباتها
مهاتد ريها بالقسين الفوارس

معنی۔ اس کے پیندے میں کسریٰ کی تصویر ہے اور اس کے پہلوؤں میں نیل گائے کی تصویریں ہیں جن کے شہسوار کمانوں کے ذریعے شکار کرتے ہیں۔

بحتری متوفی سنہ ۲۸۴ھ ایوان مدائن کے متعلق کہتا ہے ؎

والمنايا مواثل وانوشر
وان يربي تحت الدرفش

معنی۔ موتیں برباد کرتی رہتی ہیں۔ حالانکہ نوشیروان درفش کاویانی کے نیچے پرورش کیا جاتا مصور کیا گیا ہے۔

متبنی متوفی سنہ ۳۵۴ھ نے جہاں سیف الدولہ کی تعریف کی ہے وہاں اس کے محلات وغیرہ کی بھی خوب مدح سرائی کی ہے اور بہت لمبے قصیدے میں وہاں کے نقوش کی تفصیل بیان کی ہے۔ جن میں سے وہ شعر ملاحظہ ہوں۔ ان سے اسی طرح معلوم ہوگا کہ شعرائے عرب کا کلام بجائے ایرانی فنون کے رومی (بازنطینی) فنون کو ضرور بیان کرتا ہے۔

نزى حيوان السر مصطلحا بها
يحارب ضد ضده يسالمه
وفي صورة الرومي والتاج ذليه
لابلج لا يتجان الاعمائمه

معنی خشکی کے حیوانات نے اس سے صلح کر لی ہے ہر مخالف جانور اپنے مخالف سے لڑتے اور صلح کرتے ہوئے مصور کئے گئے ہیں۔ اور بادشاہ روم صاحب تاج و تخت کی تصویر جو اس خیمہ پر دکھائی گئی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ روم اس سفید پیشانی والے (سیف الدولہ) کے آگے کوئی ہستی نہیں رکھتا حالانکہ سیف الدولہ کے عمامے ہی اس کے تاج کا کام دیتے ہیں۔

اسی طرح تبنی نے سیف الدولہ کے منقوش خیموں کی تعریف کی ہے جن کے لئے بہت سے ایسے ہی الفاظ تھے جیسا کہ کپڑوں کے لئے ہیں۔

کتاب البلدان ہمدانی میں وضاحت سے ملتا ہے کہ بازنطینی فن سے مقصود رومی ہے۔ مشرقی رومی سلطنت کے نہایت کارگر مصورین دنیا میں شمار ہوتے تھے۔ خلفائے عباسیہ کے زمانہ میں بغداد و دیگر شہروں میں گرجے تعمیر ہوئے جن میں رومی روایات پر مسیحی لوگوں نے کام کیا اور اسی طرح سے ان کا اثر بھی ان پر ہوا۔

PAINTING IN ISLAM P.56

[1] ایرانشہر سنہ ۱۹۲۲ء ص۱۱ جرمنی

چینی و وسط ایشیائی و ہندی

ماہرین صنائع چین و ماچین کا خیال ہے کہ چینی مصوری کے ماخذ چینی رسم الخط کے ساتھ ہی ملے ہوئے ہیں جو دراصل تصاویر و نقوش سے اخذ کیا گیا ہے یعنی قدیم نقوش کی شکل اختیار کر لی ہے باوجودیکہ اس کے بہت قدیم سے نشان ملتے ہیں مگر صحیح معنوں میں قدیم چینی مصوری کے ضمن میں ختن کے انکشافات دیواری مصوری قدیم بدھ مذہب نے بہت مدد کی ہے جس پر ڈاکٹر سرارل شائین نے اپنی انتھک مساعی جمیلہ سے روشنی ڈالی ہے اور ایک ضخیم کتاب "ہزار بدھ" کے نام سے شائع کی ہے جس کو تیسری صدی عیسوی سے لیکر آٹھویں صدی تک منسوب کیا جاتا ہے۔ ختن کے متعلق بھی قدیم حالات مشہور بدھ مذہب کے چینی سیاح فاہین کی اپنی تحریر میں ملتے ہیں جو سنہ ۳۹۹ - ۴۱۴ء میں براستہ مغربی ختن سفر کر کے ہندوستان میں داخل ہوا اور مگدھ کا سفر کر کے براستہ لنکا اپنے ملک کو روانہ ہوا اور یہی راستہ تھا جس سے بدھ مذہب نے چین تک رسائی کی۔[۱] آثارِ ختن سے قدیم فن بلادِ ترکستان پر خاصی روشنی پڑتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ آج بھی یورپ اپنے اعلٰے مصوری کے نمونے پیش کرنے سے قاصر ہے۔ ان میں بدھ مت کی مکمل سرگزشت معہ رسومات و اعتقادات کے رنگین نقوش میں دیکھی جا سکتی ہے۔ یاقوت حموی ختن کے متعلق معجم البلدان میں لکھتا ہے۔ "کاشغر سے الگ یارکند کے عقب میں بلاد ترکستان کا حصہ وادی جبال کے درمیان بلاد ترک کے وسط میں واقع ہے۔ سلیمان بن داؤد بن سلیمان ابو داؤد المعروف بحجاج الختنی کے نام سے مشہور ہے۔ مقام بامیان کے ذکر کے علاوہ وہاں دو عظیم بتوں سرخیڈ و خنگبڈ کا بھی ذکر ملتا ہے۔ جہاں تمام پرندوں کی تصاویر منقوش تھیں جو اللہ نے زمین پر پیدا کئے" (یاقوت ۴۸۱/۲) اسی طرح اجنٹا و دیگر ہندوستانی غاروں کا ذکر بھی لازمی معلوم ہوتا ہے جن کی تاریخ بھی قریب یہی بتائی جاتی ہے اور جو دنیا بھر میں شہرت بھی حاصل کر چکے ہیں۔ مگر قدیم کتب تاریخ میں ہمیں اجنٹا کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ یہ حال کی دریافت ہے جبکہ انگریز اس ملک میں آئے۔ البتہ غارہائے الورہ کا ذکر علاؤالدین خلجی اور اورنگ زیب کے کارناموں میں ملتا ہے۔ ان کے متعلق آئندہ آگے چل کر مفصل عرض کرنا ہوگا۔

عرب قریب اسلام

عربوں کی کمال خوشی کا معیار اس میں ہے کہ تیز رفتار عمدہ بدن گھوڑا ہو۔ حسین خیمہ نشین عورت ہو۔ عمدہ آبدار دھار والی تلوار ہو سنہری انگوری شراب کا جام ہو۔ خصوصیت سے جبکہ فلک پر کالی گھٹا چھائی ہو۔ ان کی یہ سب خاصیتیں ان کے شاہکار سبع معلقات سے عیاں ہیں۔ جن کا ایک ایک لفظ ان کے فنون لطیفہ کا صحیح آئینہ ہے اور ان کی طبع موزون۔ ملکۂ منظومیت۔ شاعری کا فیضان اتم درجہ ان سے واضح ہے۔

موسیو لیبان نے تمدن عرب میں تحریر کیا ہے کہ فنون لطیفہ میں عموماً مصوری، بت تراشی، تعمیرات اور موسیقی شامل ہیں۔ چنانچہ اگر ہم عربوں کے قدیم فنون کو بغور دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یمن میں قدیم زمانہ ہی سے قریباً تمام فنون مذہبی طور پر ادا کئے جاتے تھے کیونکہ ابھی تک وہاں ایسے دیواری نقوش ملتے ہیں جو قدیم عرب باشندوں کے اعتقادات، عادات اور دیگر واقعات پیش کرتے ہیں۔ قرآن کریم میں آیا ہے :-

وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَلَا سُوَاعًا ۙ وَلَا
يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا ۚ وَقَدْ أَضَلُّوا كَثِيرًا ۖ (نوح)

ترجمہ۔ انہوں نے کہا اپنے معبودوں کو مت چھوڑو اور نہ (بت) ود نہ سواع، نہ یغوث، نہ یعوق، نہ نسر حالانکہ انہوں نے بہتوں کو گمراہ کر ڈالا۔

اس کی تفسیر میں مفسرین لکھتے ہیں کہ مختلف قبائل کے مختلف اصنام مختلف مقام پر تھے جن کی وہ پرستش کرتے تھے۔ سب قبائل مل کر سال بھر میں ایک دفعہ بیت اللہ شریف کا حج کرتے جس کے

[۱] سمتھ قدیم تاریخ ہند

طوات میں رقص و موسیقی کو دخل دیتے جیسا کہ قرآن کریم میں آیا ہے

وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاءً وَتَصْدِيَةً

ترجمہ - ان کی نماز خانہ کعبہ کے پاس صرف تالی اور سیٹی بجانا ہوتا تھا۔

پھر یہ بھی کہا گیا۔ " وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا

یہ مسلمانوں سے خطاب حج کے موقعہ پر ہے کہ اللہ کی اس طرح عبادت کرو جس طرح قدیم زمانے میں تم اپنے آباؤ اجداد کا ذکر کیا کرتے تھے یہ ان کی شاعری کی طرف اشارہ ہے جو اپنے آباؤ اجداد کے ذکر میں فخریہ قصائد پڑھا کرتے تھے۔ یہ سب چیزیں مذہب کی بنا پر تھیں آج ان کے آثار نہ ملنے کی وجہ محض اسلام ہے۔ جس نے ان کے فروغ کو ایک دم روک دیا اور مرور ایام سے وہ خود بخود ہی مٹ گئے۔

اسلام کے ابتدائی زمانہ میں یہ معبد ۳۶۰ بتوں سے معمور تھا۔ کعبہ کی دیواروں پر حضرت ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ، عیسٰیؑ اور مریمؑ کی رنگین تصاویر تھیں جو فتح مکہ کے موقعہ پر صاف کی گئیں اور بتوں کو توڑ دیا گیا اور ان کی بیع و شراء کو حرام قرار دیا گیا۔ آنحضرت صلعم نے اس پر خطبہ بھی دیا۔ بعض بعض موقعوں پر بعض علمبرداران اسلام کو بعض قبائل کے اصنام شکنی کے لئے بھیجا گیا۔ امراُ القیس کا یہ شعر ملاحظہ ہو

كَأَنَّ دُمًى سَقْفٍ عَلَى ظَهْرِ مَرْمَرٍ

كَسَا مُزْبِدَ السَّاجُومِ وَشْيًا مُصَوَّرًا

ترجمہ - گویا مقام سقف کے بت سنگ مرمر کے سٹینڈ پر ہیں جن پر وادی ساجوم کے نقش کئے ہوئے کپڑے ہیں۔

اگر KEATS نے (ODE TO GRECIAN URN) لکھ کر غیر فانی شہرت حاصل کی ہے تو یہ ایک شعر اس کے سامنے کسی صورت میں بھی کم نہیں ہے جس میں امراءالقیس نے یہ زیادتی کی ہے کہ اس آرٹ کے نمونہ کو پھر ایک ایسی آرٹ کی چیز یعنی منقش کپڑے سے ڈھانپ کر اس کو مزید مقتدر اس صورت میں بنا دیا ہے کہ دیکھنے والی آنکھ کو ہمیشہ کے لئے اس حسین نمونہ فن کو دیکھنے کی غرض سے آرزومند کر دیا ہے جو اس کے غایت الفاظ سے ظاہر ہے

امراءالقیس کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو:-

خرجتُ بها تمشي تجر وراءنا

على اثرينا ذيل مرطٍ مرحلِ

ترجمہ - مرط مرحّل یعنی ایسی چادر جس پر محمل کی تصاویر بنی ہوں اگر مرحل کو مرجّل پڑھا جائے تو معنے ہونگے کہ اس پر آدمیوں کی تصاویر منقوش تھیں

خود آنحضرت صلعم کا ایسی چادر کا استعمال کرنا بعض احادیث سے ثابت ہے :-

۱ - ان رسول اللہ صلعم خَرَج ذات غداۃ وَعلیہ مرط مرحلٌ

۲- کانَ یصلی وعلیہ من ھذہ المرحلات (المروط)

اسی طرح جب کسی کپڑے پر تیروں کے نقوش ہوتے اسے مسہّم کہتے تھے جن پر پرندوں کی تصاویر ہوتی تھیں انہیں مطیّر جن پر گھوڑے کی تصاویر تھیں مخیّل جن پر درخت منقوش ہوتے انہیں مشجّر کہتے تھے۔ غرضکہ بہت سے ایسے نام وضع کئے جاتے تھے۔ مثلاً مسیّف، مکعّب، معرّض، مسعد معصد، جن پر انگوٹھیاں ہوتیں اسے سجلاط۔

میں نے ظہور اسلام کے پہلے جو حالت فنون لطیفہ کی تھی کسی حد تک اس غرض سے پیش کر دی ہے کہ اس مختصر سی کیفیت سے کم سے کم یہ ضرور اندازہ ہو جائے کہ ان قدما کی فنون لطیفہ سے کیا اغراض وابستہ تھیں۔ جو محض مذہب تھا۔ اور اسی جذبہ میں سب کچھ کیا گیا۔ جو بعد میں جا کر بہت بڑا جزو فنون لطیفہ کا بن گیا۔ اسلام نے جو کچھ اس ضمن میں پیش کیا وہ بالکل اس کے برعکس تھا۔ جس نے قبائل کی تمام روایات کو ایک ایسے عقیدے سے توڑ دیا اور ایسے طریق زندگی کی طرف مائل کیا جو ان کے لئے بالکل بیگانہ تھا یعنی تمدن عرب قبل بعثت آنحضرت صلعم اور بعد بعثت بالکل متضاد تھے۔ ان

میں کوئی مماثلت قائم نہیں ہو سکتی۔ مگر وہ فنون جو متمیز اسلامی فنون کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں سب کے سب فتوحات اسلامیہ کی پیداوار ہیں۔ ان کو دراصل غایت مذہب سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ وہ محض ایسے متذکرہ بالا ماحول میں مسلمانوں کی منفرد طبع کی وجہ سے پیدا ہوئے اور انہوں نے اپنے اپنے ماحول میں رہ کر خاص متمیز صورت اختیار کی جو اسلامی کہلائی۔ ڈاکٹر مارٹن، ہابین، کونل، سٹری زگوسکی کا خیال ہے کہ مسلمانوں نے مذہبی فن تصویر کشی پیدا کئے۔ مگر سر آرنلڈ مؤید ہیں کہ اسلام نے کبھی کوئی اپنا خاص مذہبی فن مصوری پیدا نہیں کیا جن سے مذہبی شعار و اطوار نظر آئیں۔

آغازِ اسلام

یہ قدرت کا تقاضا رہا ہے کہ جب کبھی دنیا میں انحطاط اپنی غایت کو پہنچ جاتا ہے تو ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ کسی مصلح یا مجدّد کو بھیج کر اپنی نیابت کا کام لے یا دوسرے الفاظ میں بہت بڑی تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ حضرت عیسےٰؑ، اور آنحضرت صلعم کے درمیان (فترۃ) کا ایسا زمانہ تھا کہ لوگ لہو و لعب اور فسق و فجور کے دلدادہ اور یاد الٰہی سے بیگانہ ہو چکے تھے۔ دنیا میں کوئی مذہب نہ تھا۔ فنون لطیفہ جذبات کو برانگیختہ کرنے والے تھے اور مذہب حسن و عشق تصور کیا جاتا تھا۔ بازنطینی فنون لطیفہ نے تمام دنیا پر تسلط کر رکھا تھا اور عوام اندھا دھند اس کے مطیع ہو رہے تھے۔ اصنام پرستی نہیں بلکہ اصنام تراشی اعلیٰ عبادت و فن شمار ہوتے تھے۔ آنحضرت صلعم کی بعثت جو توحید الٰہی کا کھلم کھلا اعلان تھا اور تمام غیر اللہ معبدوں کے عابدوں کو چیلنج تھا جس کا یہاں تک اثر ہوا کہ جسٹنین شاہ روم جیسے مدبر نے ایتھنز کے مدارس بند کر کے صناع و فضلا کو سلطنت سے نکال دیا۔ یہ خاص کر وہ ایام تھے جبکہ گریگری پادری اعظم نے فلسطین کا کتب خانہ جلا دیا تھا اور شاہ خسرو نوشیروان ایران نے ان تمام جلا وطن لوگوں کو پناہ دی تھی[1]۔ مگر ایران میں بذاتِ خود ان کی آگ جو صدیوں سے شعلہ زن تھی ٹھنڈی ہو گئی۔ غرضکہ دنیا میں بہت سے ایسے عجیب و غریب واقعات پیش آئے اور سب کائنات آفتاب رسالت کے استقبال کے لئے منتظر تھی۔ اور قدرت کا کافتہ الناس کے قلوب کو ضلالت و گمراہی سے نجات دلانا مقصد وحید تھا۔ چنانچہ طرفۃ العین میں ان نور کی شعاعوں نے بجلی کی رو کی طرح اثر کیا۔ لوگ جوق در جوق دائرہ اسلام میں داخل ہونے شروع ہوئے اور ان کو لہو و لعب، فسق و فجور جو ان کے ہاں فنون لطیفہ شمار ہوتے تھے اور جن سے جذبات مشتعل ہوتے تھے۔ یکلخت ان کا قلع قمع کر دیا گیا۔ بلکہ ان کو حرام و واجب الترک گردانا گیا۔ اگرچہ ان سے ایک دم روک تھام مشکل کام تھا۔ کیونکہ یہ وہ وقت تھا کہ امرأ القیس اور لبید وغیرہ کے قصائد ان کی نوک زبان تھے۔

جب لبیدؓ مشرف باسلام ہوئے اور وفد بنی کلاب میں آنحضرت صلعم کے سامنے آئے تو یہ شعر پڑھا :۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ اذ لم یاتنی اجلی
حتیٰ کسانی من الاسلام سربالا[2]

ترجمہ۔ خدا کا شکر ہے کہ مجھے اس وقت موت نہیں آئی جب تک میں نے اللہ کے فضل سے اسلام کا جامہ نہیں پہن لیا۔

حضرت عمرؓ نے مزید شعر سننے کی درخواست کی تو سورہ بقر پڑھ کر سنائی اور کہا جب میں نے سورہ بقر سیکھ لی ہے تو کیا ضرورت ہے جس پر حضرت عمرؓ نے آپ کو پانسو۵۰۰ درہم عطا کئے۔ لبیدؓ کے اس شعر میں تمام فلسفہ اسلام پنہاں ہے اور اس سے بہت سے امور پر روشنی پڑتی ہے کہ اسلام نے سب جذبات بڑھانے والی باتوں سے ایک دم روک دیا تھا۔ کیونکہ اسلام کافتہ الناس کے لئے آیا تھا نہ محض خطۂ عرب کے لئے۔ چنانچہ اسلام نے بہت تھوڑی مدت میں شرق و غرب میں وہ مقبولیت حاصل کی جو صدیوں میں کسی اور مذہب کو حاصل نہیں ہوئی تھی یہ سب کچھ منجانب اللہ اور اسلام کی سیدھی سادی تعلیم کا اثر تھا۔ جو مساویانہ اصول پر قائم تھی۔

[1] ۔ تاریخ فنون لطیفہ قرون وسطیٰ صد ۲۳۲ مصنفہ علی قاری

[2] ۔ شعر و الشعرا ابن قتیبہ صنہ ۔ مطبوعہ مصر

فنون لطیفہ نے ہمیشہ اپنا الگ اور محدود ماحول قائم کیا ہے جو ان مقاصد اور اصولوں کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی ہمہ گیری ان امور کی طرف نہیں آتی۔ توراہ کے مطالعہ سے متعدد مقامات پر معلوم ہوتا ہے کہ محض تصاویر کی وجہ سے بعض اقوام پر غضب الٰہی نازل ہوا۔ چنانچہ جب حضرت سلیمانؑ نے ایوان بیت المقدس کی تعمیر کرائی تو دروازوں اور دیگر مقامات پر نقوش تھے[1] اس واقعہ کی قرآن کریم میں یوں تفصیل آئی ہے :-

"یعملون لہ ما یشاء من محاریب و تماثیل"

(۱۳:۱) سورہ سبا

باوجود اس کے انجیل میں تصاویر یا مجسموں کے لئے کوئی امتناعی حکم نہیں ہے۔ جب مسلمانوں نے حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں جہاد کیا تو اولین فاتحین شام و مصر اپنے آپ کو بازنطینی یا قبطی معبدوں میں مسند نشین کیا۔ جن پر وہ اپنی فتوحات پر قابض ہوئے اور ان کو ان کی حالت پر بمعاہدہ حضرت ابو عبیدہ بن الجراحؓ رہنے دیا۔ کسی قسم کا کوئی تخلل واقع نہیں کیا۔ اپنی الگ قیامگاہیں اور مسجدیں قائم کیں۔ یہ قدیم نشانات آج برآمد ہو رہے ہیں اور ان اطراف میں قدیم صناعی کا پتہ دیتے ہیں۔ یہ عرب صحرانشین افریقہ، اندلس، فارس وغیرہ کے میدانوں کو عبور کر کے آگے بڑھتے چلے گئے۔

یہ مسلمانوں کا خاصہ رہا ہے کہ جہاں بھی رہے تنہا بغیر شرکت غیرے اپنی جدت طبع سے ہر امر میں خاص تنوع پیدا کیا۔ مصر میں قبطی، اندلس میں بربر، فارس میں ایرانی، ہند میں ہندی تھے مگر اسلام نے ان نو وارد دین اسلام کو اپنی فطرت کے مطابق ایک نئے جذبہ کی اجازت دی۔ جسے شارع اسلامؑ خوب جانتا تھا کہ ان میں کس طرح سرایت کر سکتی ہے۔ غرضکہ اسلام جہاں بھی گیا لوگوں کے قلوب پر حاوی رہا لہٰذا اش... نے فنون لطیفہ میں ایک خاص تغیر پیدا کیا جو اوائل زمانے ... میں زیادہ تر نظر آتا ہے جس میں ایک خاص ہی نوعیت ... چنانچہ آنحضرت صلعم سے

لے کر عمرؓ بن عبدالعزیز کے زمانہ تک بارہا مسجد نبوی کی تعمیر ہوئی مگر حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز اموی کے زمانے میں جب مسجد نبوی کی تعمیر کی تجدید ہوئی تو روما وغیرہ کے معمار بلائے گئے ایک رومی معمار نے اپنے حسب عادت مسجد کی عقبی دیوار پر بجائے نقش و نگار کرنے کے خنزیر کی تصویر بنا دی جسے خلیفہ کے حکم سے قتل کیا گیا[2]۔ اور دیگر معماروں نے یہود و نصاریٰ کے معبد کی طرح تعمیر کرنے سے گریز کیا اور خلیفہ کے فرمان کے مطابق تعمیر کی جس سے بہت سے امور پر روشنی پڑتی ہے۔ اول ابتدا میں مسلمانوں نے واقعی غیر مسلم صناعوں سے اپنی تعمیرات میں مدد لی جس کی اور بیشمار مثالیں ملتی ہیں۔ دوم مسلمان ایک خاص امتیازی طرز اپنے سامنے رکھتے تھے۔ سوم۔ جاندار نقوش سے اعراض کر کے مسلمانوں نے ان نقوش و بیل بوٹوں کا اختراع کیا جو اس سے قبل رائج نہ تھے ان کے دیکھنے سے ایک مسرت ہوتی ہے اور یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کہاں سے شروع ہوتے ہیں اور کہاں ختم ہوتے ہیں جن پر آنکھ تک نہیں ٹھہر سکتی اور ان میں وہ توازن و تناسب (SYMMETRY) قائم کیا جو واقعی اس سے قبل نہیں تھا اس سے ان کے توازن ذہن اور اعلےٰ مذاق و کمال علم ہندسہ کا ثبوت ملتا ہے۔ جو اصول علم ہندسہ پر مبنی ہے۔ یہ ان جاندار نقوش کا بدل تھا جو ان صحرانشینوں نے اختیار کیا۔ اور یہی آج دنیائے فن تعمیر میں متمیز نظر آتا ہے۔ انہوں نے قرآن کی آیات و احادیث کو اس کمال سے نقش کیا جس کی وجہ سے الگ الگ رسم الخط کی بنا رکھی گئی اور ان کے مختلف نام پڑ گئے۔ جو آج کوفی، نسخ، طغرا تعلیق وغیرہ وغیرہ سے یاد کئے جاتے ہیں۔ اسلامی نقطہ نگاہ سے فنون کی تقسیم میں بت تراشی کی بجائے خطاطی کو دخل دینا ہوگا۔ بعض معترضین ہم سے سوال کریںگے کہ باوجود شارع اسلامؑ نے تصاویر کو اپنے کلمات طیبات میں سراسر ممنوع قرار دیا ہے بعد میں کیوں تصویر کشی کو اختیار کیا۔

[1] باب ۷-۸

لہ۔ کنز

[2] وفاء الوفا مطبوعہ مصری بیان تعمیر مسجد نبوی

قال رسول اللہ صلعم ان اشد الناس عذابا یوم القیامۃ المصوّرون (بخاری)

قریب قریب تمام کتب احادیث میں یہ حدیث مختلف طریق سے متداول ہے اور مطلب سب کا ایک ہی ہے بلکہ یہاں تک کہ دیا کہ جس گھر میں تصویر ہو اس میں فرشتے داخل نہیں ہوتے بعض روایات میں آیا ہے کہ غیر ذی روح کی تصویر منع نہیں ہے پھر بعد میں کیوں اس سے تجاوز کیا گیا۔ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ حضور سرورِ عالم کا فرمان اسی طرح اٹل ہے لیکن ماہرین نے ان کو کسی حد تک ان مضرات سے پاک پایا جو قرون اولیٰ یا اس کے قریب زمانہ میں سمجھے گئے تھے اور وہ محض مذہبی حالت ملک اور ابتدائے اسلام کے امتیاز سے تھے۔ ان کے قلع قمع کرنے کا مقصد محض شرک سے روکنا اور جذبات کو اعتدال میں رکھنا تھا کیونکہ ملک کی فضا شرک سے لبریز تھی اور فنون لطیفہ سے جذبات کے مشتعل ہونے کا اندیشہ تھا۔ بہت سے فقہا نے بھی یہی مطلب اخذ کیا ہے چنانچہ علامہ بدرالدین عینی نے شرح بخاری میں اس حدیث کے تحت میں کسی حد تک ایسی ہی شرح کی ہے اور امام طحاویؒ نے شرح معانی الآثار میں بھی اس کی تائید کی ہے آنحضرت صلعم جب غزوۂ تبوک سے واپس تشریف لائے۔ تو آپ نے گھر میں چند گڑیاں دیکھیں جن سے حضرت عائشہؓ اپنی سہیلیوں سے کھیلا کرتی تھیں ان میں سے ایک گھوڑا بھی تھا آپ نے دریافت کیا اے عائشہ یہ کیا ہے جواب دیا یا رسول اللہ گھوڑا ہے۔ آپ نے پھر پوچھا کہ گھوڑے کے پر بھی ہوتے ہیں۔ عرض کی یا رسول اللہ آپ نے سنا نہیں کہ حضرت سلیمانؑ کے گھوڑے کے پر تھے۔ آپ نے مسکرا دیا۔ یہ واقعہ ۸ یا ۹ ہجری کا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تصاویر غیر مشرکانہ کا آغاز آنحضرت صلعم کے زمانہ سے ہی ہو گیا تھا جس پر فقہا نے گڑیوں کو جائز کہا ہے جو پرستش کی صورت میں نہیں آ سکتیں۔ آپ نے مصورین کے لئے اشد عذاب کی قید اس لئے لگائی تھی کہ وہ پرستش کے لئے تصاویر یا مجسمے بناتے تھے۔ مگر مرورِ ایام نے آہستہ آہستہ ان کے قلوب کو ان مضرات سے محفوظ کر دیا اور شرک کا اندیشہ جاتا رہا۔ سعید بن عامر روایت کرتے ہیں کہ عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ہمارے پاس ایک کپڑا تھا جن پر تصاویر تھیں ان کو میں نے آنحضرت صلعم کے سامنے لٹکا دیا۔ آپ نماز پڑھ رہے تھے۔ آپ نے مجھے منع کیا اور کراہت کا اظہار کیا۔ میں نے اس کے دو تکیئے بنا دئیے[۱] عرب میں اس طرح کپڑے کو پردے کے طور پر لٹکانے کو حانط کہتے ہیں۔ صاحب نفح الطیب نے ان کی بہت سی اقسام مع نقوش بیان کی ہیں میرا خیال ہے کہ اب جو یورپ میں پردے آویزاں کرنے کا دستور ہے وہ ہسپانی عربوں کے ذریعہ وہاں پہنچا ہے۔ یہاں یہ کہنا مناسب ہوگا کہ حرمت خمر کے وقت ان برتنوں کے استعمال سے بھی روکا گیا جن میں شراب بنائی جاتی تھی اور ان کے مختلف نام بھی تھے۔ جب مسلمان اس سے رک گئے تو ان برتنوں کے استعمال کی اجازت دی گئی۔ اسی طرح زیارت قبور سے بھی ابتدا میں روکا گیا جو عرب میں اصنام پرستی کے مشابہ تھا لیکن جب آپ کو ان خطرات کا اندیشہ جاتا رہا اور لوگ بھی سمجھ گئے تو آپ نے بعد میں اجازت دی اور فضائل زیارت قبور بھی بیان فرمائے۔ یہی بات سونے چاندی کے زیورات سے متعلق ہے۔ غرضکہ بہت سے ایسے امور ہیں جن میں ایسا ہوا۔ انہی دلائل کو مدنظر رکھ کر محققین آج کل کے مفہوم تصاویر سے متاثر ہو کر فوٹو وغیرہ کے جواز میں فتوے بھی دیئے ہیں۔ خیر ہمیں ان سے کوئی سروکار نہیں ایسے امور میں تو غایت فن اور غایت مقصد کو ضرور دخل ہے [illegible] سب اور چیز ہے۔ جب مسلمانوں نے حضرت عمرؓ کے زمانہ [illegible] ایران کو فتح کیا اور جب آپ ایوان میں داخل ہوئے تو جا[illegible] [illegible]صاویر نظر پڑیں۔ ان کو

[۱] تذکرۃ الحفاظ صفحہ ۳۲

۱۔ معارف اعظم گڈھ۔ مضمون سید سلیمان ندوی صاحب

دیکھ کر کسی قسم کا ایذا نہیں پہنچایا بلکہ نماز شکرانہ وہیں ادا کی[1] اس کے برعکس جب فتح شام کے موقع پر عیسائیوں نے آپ کو اپنے کنیسہ میں دعوت دی تو بوجہ تصاویر کنیسہ میں داخل ہونے سے انکار کر دیا جس سے استدلال ہوتا ہے کہ ایک طرف تو تصاویر مشرکانہ حیثیت رکھتی تھیں اور دوسری طرف اس کے خلاف جہاں تسامح اختیار کیا گیا۔ اس سے ہماری تائید ہوتی ہے کہ نیت کو ضرور دخل ہے[2]۔ ابن سعد نے اپنی طبقات میں قبیصہ بن ذویب رح کے تحت میں درج کیا ہے کہ حضرت عثمان رض کے زمانہ میں مدینہ منورہ میں تاجرین کے محلہ میں نقاشوں کے کوچہ میں رہتے تھے۔ اگرچہ مدینہ منورہ آنحضرت صلعم کے زمانہ میں زیادہ تر آباد ہوا مگر اس سے صاف پتہ ملتا ہے کہ یہ فن بالکل مفقود نہ تھا۔

خلفا کا زمانہ

اموی خلفا جو خلفائے اربعہ راشدین رض کے بعد آئے اور ان کے بعد خلفائے عباسیہ جنہوں نے بغداد کو دارالخلافہ قرار دیا ان سب نے بہت جلد محسوس کیا کہ اسلام کا یہ صحرائے نشوو اس عزلت میں نہیں سمائیگا ایک وسیع سلطنت ایک خانہ بدوش خاندان کی طرح سنبھالی نہیں جا سکتی۔ خلیفہ اپنا گھر اونٹ کی کھال کے خیمہ میں قائم نہیں رکھ سکتا اس کے لئے ضروری تھا کہ علوم و فنون پیدا کئے جائیں جس سے حضارت کو فروغ ہو تاکہ قرآن حکیم اور پیغام رسول کے ارشادات کو دنیا میں پھیلا دیا جائے۔ چنانچہ ایسے فاضل لوگ پیدا ہوئے جن کو دربار خلافت سے تعلق تھا۔ اور فنون و علوم جو آج اسلامی فنون و علوم کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں وہ اسی طبقہ کے منت پذیر ہیں۔

ملوک و دہیر

خلفائے بنی امیہ کا زمانہ زیادہ تر بیرونی فتوحات میں گذرا ہے۔ اس لئے ان کی توجہ نشر و اشاعت علوم کی طرف کم نظر آتی ہے۔ لیکن عبدالملک نے اپنے زمانہ میں عمارات کو بہت فروغ دیا اور اس کے علاوہ اس نے اسلامی سکہ کی بنا رکھی اور سکہ رائج الوقت جو زیادہ تر ایرانی و بازنطینی تھا۔ اس کی تقلید میں ابتداءً ایسا سکہ جاری کیا جس پر اس کی خود اپنی تصویر ہوا کرتی تھی۔ یہ سکہ برآمد ہو چکا ہے۔ سیف الدولہ کے متعلق بھی ملتا ہے کہ جو اس نے دینار مسکوک کرایا اس پر اس کا نام اور اس کی تصویر تھی۔ سلطان بیبرس نے اپنے سکہ پر شیر کی تصویر منقوش کرائی تھی۔ اسی طرح مسلمانوں کے ہاں دیوان میں مہر بھی تحریر وغیرہ کو ثبت کرنے کے لئے استعمال ہوتی تھی۔ قاضی شریح کی شخصیت دنیائے اسلام میں حضرت علی رض کے خلاف فیصلہ صادر کرنے کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔ طبقات ابن سعد میں ہے کہ آپ کی مہر میں دو شیر اور درمیان میں ایک درخت تھا۔ غرضکہ آج جو شیلڈ وغیرہ کا تصور ہے قدیم زمانہ میں بھی تھا[3]۔ مگر متذکرہ بالا سکہ عبدالملک کے متعلق عرض ہے کہ وقتی مصلحت کے لحاظ سے جاری کیا گیا تھا۔ جب لوگ سکہ کے عادی ہو گئے تھے تو خالص اسلامی سکہ سنہ ۷۶ھ میں جاری کیا گیا[4]۔

لیکن بنی عباس کا زمانہ ایسا ہے جبکہ فنون و علوم کی طرف زیادہ توجہ ہوئی جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کے تعلقات دنیائے دیگر ممالک اور سلطنتوں سے قائم ہو چکے تھے خصوصیت سے قابل ذکر ان کا تعلق اہل فارس سے جو ہے ان کے ہاں برامکہ کے ذریعہ سے ہوا پھر اہل یونان سے بھی ہوا جو ان کے دربار میں اہل علم کی صورت میں آئے۔ غرضکہ یہی دور اسلام میں ہے جب سے یہ فنون متمیز طور پر سامنے آئے اور ان کو فنون اسلامی کے طور پر فروغ شروع ہوا۔ اور بطور فنون لطیفہ اسلامیہ ان کا شمار ہوا۔ اسی لئے مصوری کو مدنظر رکھ کر اختصاراً ان شعبوں کو بیان کیا گیا ہے جن میں مصوری کو ضرور دخل ہے۔

ظروف نقاشی

قدیم زمانے سے فن ظروف سازی مصر، عراق اور عجم میں مروج تھا۔ جسے ظہور اسلام ہی سے مسلمانوں نے ضرور اپنی روایات کے مطابق سنبھالا اور بغیر نقش و نگار کے یہ کام قدرے کم حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ ہزاروں نمونے ایسے یورپ کے عجائب خانوں میں

[1] طبری ص ۲۴۴۳ ۲ [2] کتاب الامم۔ طبقات ابن سعد ترجمہ قبیصہ بن ذویب [3] ابن سعد ص ۹۶ [4] فتوح البلدان ص ۴۶۲ مصری

دیکھنے میں آسکے ہیں۔ جن کے نقش ونگار بالکل اسلامی ہیں۔ اور بہت قدیم ہیں۔ اس سے ایک امر پر ضرور روشنی پڑتی ہے کہ ابتدا ہی سے مسلمانوں کا مذاق ہر ضروری اشیا میں ایک متمیز صورت رکھتا تھا اور ان پر نقش ونگار بعض اوقات حسب واقعات وحالات ہوتے تھے کبھی کوئی فوجی سوار یا نقارہ یا کوئی پالتو جانور کبھی قرآنی آیات یا اشعار ان پر منقش ہوتے تھے۔ اور یہ فن ایک ایسی الگ حیثیت رکھتا ہے کہ بیشمار کتب بالخصوص اسلامی ظروف، ظروف سازی یا کاشی کاری وغیرہ پر تصنیف ہو چکی ہیں جو اسلامی مصوری کے ارتقا میں ضرور دخل رکھتی ہیں۔ بعض اہم قدیم نمونے برٹش موزیم میں سامرہ اور مصر کے ملتے ہیں۔ جو غالباً خلیفہ معتصم (۲۲۷ھ) کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان پر نقوش اور جانوروں کی تصاویر[1] بھی ملتی ہیں۔ بغداد کے بھی بہترین نمونے ملتے ہیں۔ ایک طشت پر براق کی تصویر ایک طائر نما گھوڑے کی صورت میں ہے۔ اس کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے اس فن میں بھی رسمی نقش ونگار کو دخل دیا۔[2] سامرہ کے بعد فوراً رے، رقہ اور سمرقند وغیرہ میں یہ فن نظر آتا ہے جہاں وہ ترقی ہوئی ہے کہ ایک نمایاں پہلو اختیار کر لیا۔ مگر رقہ تو بعض حالات میں سامرہ سے بھی سبقت رکھتا ہے موسیو مجیبون نے ایک نمونہ دیا ہے جو تیسری صدی ہجری کا ہے اس میں عربی تحریر بھی ہے اور درمیان میں ایک آدمی بھی بیٹھا ہوا ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ یہ فن ایران میں پہلے ہی اعلیٰ معراج پر تھا۔ اور اس وجہ سے ان کو اسلامی روایات نقش ونگاری اختیار کرنا کوئی مشکل نہ تھا۔ خصوصیت سے ان میں سے ایک مرتبان قابل ذکر ہے جس پر حلقوں میں عربی تحریر اور تصاویر انسانی ہیں جو اس وقت کے اعلیٰ معیار فن اسلامی کا پتہ دیتی ہیں۔ اس کی تاریخ ۵۰۵ھ ہے۔ مگر اس پر سامرہ کا اثر ضرور ہے۔ چونکہ یہاں محض ارتقا مصوری کے ضمن میں بیان کرنا مقصود ہے اسلئے اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ ورنہ ہزاروں نمونے بطور مثال پیش کئے جا سکتے ہیں۔ علاوہ ظروف کے اینٹیں وغیرہ سامرہ کی بیشمار چمکدار رنگوں سے مزین دیکھی جا سکتی ہیں۔ مگر جو نمونہ قدیم ظاہرا طور پر ملتا ہے جس پر تاریخ ہے وہ واشنگٹن میں فریر کے مجموعہ میں ۳۳۲ھ کا ہے اور قیروان، بغداد، رے وغیرہ سے قدیم نمونے بھی مل سکتے ہیں۔ اور بہت سے نمونے ایسے ملتے ہیں جن پر تصاویر ہیں اور تحریریں بھی ہیں۔ بعض یورپین محققین نے ظروف پر نقاشی کا کام کرنے والوں کے ابتدائی نام جمع کئے ہیں جن کے دستخطوں کو میں نے بھی دیکھا ہے:۔

عمل عمر، عمل عبید، عمل ذکری، صنعہ عیسیٰ،
عمل الاحمر، عمل ابی خالد، عمل کثیر بن عبد اللہ
عمل مالق بن العباس[3]، عمل الاستاذ، عمل الهرمز
بن علمر، عمل الشامی[4]

فن ظروف سازی کے رنگین نقش ونگار کے بعد ایک خاص فن دیواری مصوری کا نظر آتا ہے۔

دیواری نقوش

اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ قدیم زمانہ ہی سے مصر، شام، عراق، اور ایران میں دیواری نقوش اسلام سے پہلے موجود تھے۔ لیکن جب خلیفہ ہشام اموی (۱۲۵ھ) کے زمانہ میں حر بن یوسف الثقفی والئ موصل نے ایک مدرسہ، سرائے اور ایک محل تیار کروایا ابن الاثیر کے بیان کے مطابق یہ محل منزین سازوں کے بازار میں تھا جو اب ویران ہو چکا ہے اور سفید سنگ جراحت سے بنایا گیا تھا۔ دیواروں پر پچی کاری کی گئی تھی۔ اس محل کو اس کی خوبیوں کے سبب سے منقوشہ کہا جاتا تھا۔ بعد میں یہی قطع حر کے نام سے مشہور ہو گیا۔[5] ان نقوش دیواری کے متعلق متعدد شعرائے عرب کے کلام میں بھی شہادتیں ملتی ہیں۔ مثلاً ابن احمدیس، ابوالصلت۔ بحتری۔ متنبی۔ ضحاک، ابونواس وغیرہ وغیرہ

سامرہ

جب خلیفہ معتصم نے سامرہ کی بنیا ڈالی تو وہاں اپنی رہائش

[1] برٹش موزیم مسلم پوٹری گائڈ پلیٹ ۱۲ ص۱۲ [2] برٹش موزیم گائڈ پلیٹ ۵ [3] سامرہ از ساری، ہوبسن برٹش میوزیم پوٹری گائڈ وغیرہ
[5] [illegible] الاثیر ج۱۰ ص۵ ، معجم البلدان، ص۲۳۹ ، وامر علی، تاریخ سامرہ، ص۱۳۹

کے لئے قصر تعمیر کروایا جس کی دیواروں پر نقاشی تھی۔ ۲۲۲ھ
میں خلیفہ کے حکم سے وزیر احمد بن خالد نے اپنی مساعی جمیلہ سے
اس کام کو سرانجام دیا۔ یہ دیواری نقوش ظاہر کرتے ہیں کہ وہاں
نہ محض بیل بوٹے ہی تھے بلکہ جانوروں کی تصاویر بھی تھیں۔ در
یہ نقوشی مصوری کا وہ جذبہ اور اعلیٰ معیار پیش کرتے ہیں کہ
آج بھی اس سے عمدہ موجودہ فن مصوری پیش کرنے سے قاصر
ہے۔ ڈاکٹر ہرز فیلڈ کی کتاب سامرہ تین جلدوں میں ہے۔
اس میں چند نمونے مختلف عجائب خانوں سے اکٹھے کرکے دئیے
گئے ہیں۔ خصوصیت سے شیر کی شبیہ آجکل کی شیلڈ کا تصور دیتی
ہے۔ دیگر نمونہ جات نقاشی بھی خاصی روشنی ڈالتے ہیں اور ان
سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نقوش بجائے اس کے کہ تمثیلی ہوں۔
بلکہ تخیلی اور سہی طور پر بنائے گئے ہیں۔ عربوں نے مصوری میں
یہ ایک جدید نظریہ پیدا کیا تھا۔ ایک جگہ آپ دیکھیں گے کہ کس طرح
کتوں سے گورخر کا شکار اور عقاب سے پرندوں کا شکار کیا
جاتا تھا۔ اور ساتھ ساتھ آرام کی زندگی کا ماحول کیا ہوتا تھا
اگر ان کا اجنٹا کی جملہ دیواری مصوری سے مقابلہ کیا جائے تو
اس سے بالکل مختلف کام مختلف طریقہ فن مختلف جذبات مختلف
ماحول نظر آئیگا۔ فریڈرک موزیم برلن میں ایک ٹکڑا استرکاری
سامرہ پر احمدؐ بن موسیٰ کاریگر کا نام ملتا ہے۔ اس کتاب سے
مسلمانوں کے دیگر حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ کس طرح وہ اپنے
مکانات کو آراستہ کرتے تھے اور اگر ان کا پوری طرح مطالعہ کیا
جائے تو مسلمانوں کی پوری تہذیب کا نقشہ عیاں ہوجائیگا۔

ان محلات میں ایک حمام بھی ہے۔ اس کے ایک دروازہ
پر ابھی تک ایک کتبہ محفوظ ہے:۔

"بسم اللہ امر بناھذ الحمام احمد بن محمد المعتصم
باللہ امیر المومنین ادام اللہ التائید والسعادۃ وعافیۃ
من اللہ ورحمۃ"

ان نقوش میں بعض جگہ کرامٹا کی بھی تصاویر ملتی ہیں جس سے معلوم
ہوتا ہے کہ سامرہ اور اس کے گردونواح میں مسلمانوں نے بعد میں
بھی مختلف عمارتیں بنائیں۔ یاقوت نے چند اشعار خوب نقل کئے ہیں:۔

وَمَا زالت اسمع ان الملوک
یبنی علیٰ قدر اقدارھا
وَاعلم ان عقول الرجال
تقضی علیھا باثارھا

"یعنی ہر خلیفہ اپنے اپنے اقتدار کے مطابق تعمیرات میں زیادتی کرتا
رہا۔"

اسی گردونواح میں ایک قدیم حمام الفار کا ذکر ملتا۔ جس کو بہت
چھوٹا ہونے کی وجہ سے الفار (چوہا) کہتے تھے۔ کیونکہ روم
میں حمام بہت زیادہ وسیع بنائے جاتے تھے۔ ان کے اندر تین طبقے
ہوتے تھے۔ ایک سے دوسرے میں جانے کے لئے راستہ بھی
ہوتا تھا۔ یہ حمام الفار اول ان حماموں میں سے ہے جو اسلام
میں اول تیار ہوا۔ جب اسکو عمرو بن العاص نے تعمیر کرایا تو رومیوں
نے اپنی عادت کے خلاف دیکھ کر اس کو بنظر حقارت دیکھا اور
کہا کہ یہ تو چوہوں کے لئے تعمیر ہوا ہے۔ چنانچہ اس کا نام اسی
دن سے حمام الفار مشہور ہوگیا۔ حمام کے سلسلہ میں اس کی بناوٹ
پر بھی بحث ملتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کو بھی خوب
سمجھتے تھے۔ چنانچہ سب سے بہتر حمام وہ ہوتا ہے جو قدیم ہو
چکا ہو۔ اس لئے کہ جو حمام جدید تعمیر ہوگا اس میں یہ خرابی ہے
کہ اس کی دیواریں ابھی تک تر ہونگی۔ اس لئے اس میں غسل
کرنے سے نقصان ہوگا۔ اور بخارات پیدا ہونگے۔ حمام نو تعمیر
شدہ کے لئے۔ بعض شارح فرماتے ہیں کہ اس قسم کے حمام سے
یہ نقصان ہے کہ اس کی دیواروں میں جو تری اور نمی ہوگی وہ
چونہ گچ اور تارکول کے ساتھ تحلیل ہوجائیگی۔ اب حرارت حمام
کی وجہ سے اس میں سے بخارات اٹھینگے۔ جس کا انسان کے بدن

کے اندر جانا روح اور نفس کے لئے بہت مضر ہے اس لئے کہ ان کا اثر قلب پر بھی پڑیگا۔ حمام ہائے قدیم جو مصر میں باقی رہ گئے ہیں وہ سب خراب ہو گئے ہیں۔ صرف ان کے کچھ نشانات باقی ہیں۔

مصر

مقریزی کے مصر کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں تصویر کشی اعلےٰ معیار پر تھی کیونکہ عرب مصورین اصول مناظر اور قرب و بعد کے اثر سے بخوبی واقف تھے۔ وہ بعض صناعوں کے اسمار بھی نقل کرتا ہے۔ مثلاً ابوبکر بن حسن متوفی ۳۶۵ھ۔ استاد احمد بن یوسف، محمدؒ بن محمدؒ۔ مستنصر کے زمانہ کا مشہور واقعہ ہے کہ اس کے وزیر الحسن بن علی الیا زوری نے ابن عزیز مصور کو عراق سے اور قاہر کو بصرہ سے بلوا کر ان کی نقاشی کا مقابلہ کروایا۔ دونو مصوروں کو ایک رقاصہ کی تصویر محل کے جھروکے پر بنانے کے لئے کہا گیا جو خود یازوری کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ قاہر نے رقاصہ کو سفید لباس میں سیاہ پردے پر اس طرح ظاہر کیا گویا وہ حاضرین سے رخصت ہو رہی ہے اور ادھر ابن عزیز نے اس کو زرد پردے پر سرخ نقاب میں اس طرح مصور کیا گویا وہ نقاب سے باہر آرہی ہے،

طولون

بنی طولون کا زمانہ ۲۵۴ھ سے شروع ہوتا ہے جس کا بانی احمد بن طولون ہے جس نے دنیا میں اپنی مذہبی تحریکات سے ہلچل پیدا کر دی تھی اور فنون کے سلسلہ میں مصر کی سرزمین کو مالامال کر دیا۔ اور خاص کر محکمہ تعمیر کو بہت فروغ ہوا۔ متعدد مساجد، مدارس و محلات تعمیر کئے گئے۔ بلکہ تاریخ فن تعمیر اسلامی میں طرز بنی طولون کا خاص ذکر ہے۔ محلات الفخیمہ جن کے اردگرد حدائق الغنا تعمیر کئے۔ اس نے پہاڑ پر بہت ہی خوبصورت مسجد ۲۶۳ھ میں تعمیر کرائی جس کا نام جامع ابن طولون رکھا گیا جس کے آثار آج تک اس کی شان و شوکت کا پتہ دیتے ہیں اس کے قرب میں خمارویہ بن احمدؒ ۲۸۲ تا ۲۷۰ھ نے اپنے محل میں ایک بڑا صحن قائم کیا جسے شہری نقش و نگار سے مزین کیا گیا۔ جس میں اس کی بیوی اور اس کے درباری شعرا کے مجسمے قائم کئے گئے جن کا آج نشان نہیں ملتا۔ ابن طولون کی قبر کے تعویذ پر وہ نقوش کندہ ہیں جو اس کی مسجد وغیرہ کے دروازہ پر ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ صناعوں نے اسے مناسب سمجھا کہ بجائے اس کے اس کی تعمیرات کے ذکر کو کتبہ میں اس کی قبر کے تعویذ پر ثبت کریں انھوں نے اس پر ان تمام عمارات کو نقوش میں کندہ کر دیا جو اس نے تعمیر کی تھیں۔ اس سے عیاں ہوتا ہے کہ نقش و نگار کو مصر میں تحریر کے طور پر ابھی تک استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ جو اصل غایت فن ہے[1]۔

خلفائے فاطمیین

خلفائے فاطمیین مصر فنون لطیفہٗ اسلامی کے ضمن میں بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کی ابتدا ۳۵۸ھ سے ہوتی ہے۔ جن کی حکومت میں شیعہ مذہب کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ اور ان کی وجہ سے قبطیوں کو پھر موقع ملا کہ وہ اپنے قدیم جذبۂ فنون جمیلہ کو عوام میں آزادی سے پیش کر سکیں اور اپنی مردہ روایات کو پھر زندہ کریں۔ چنانچہ بہت آزادی سے فنون کی طرف توجہ کی گئی۔ مستنصر باللہ ۴۸۷-۴۲۷ھ کے خزائن کے حالات کے سامنے الف لیلہ کے قصے بھی ماند پڑ جاتے ہیں۔

ناصر خسرو علوی اپنے سفر نامہ میں لکھتا ہے۔ کہ جب میں مصر میں ۴۴۰ھ میں گیا تو سلطان کے ہاں دعوت میں بلایا گیا اور وہ خصوصیت سے سلطان کے تخت کے ذکر میں گویا ہے کہ چار گز بلند تھا اس کے تینوں طرف شکارگاہ و میدان وغیرہ کی تصاویر تھیں اور نہایت پاکیزہ خط میں کتبے لکھے ہوئے تھے[2]۔ پھر لکھتا ہے قصر فاطمیین میں خلیفہ مستنصر کا ایک آفتابہ تھا جو خالص سونے چاندی کا تھا۔ اس پر ندوں اور شکاریوں کی نہایت عمدہ تصاویر منقوش تھیں۔ اور نیز دیگر تصاویر کا ذکر کرتا ہے جو لکڑی پر کندہ تھیں۔ فاطمی خلیفہ امر باحکام اللہ نے اپنے قصر میں تمام شعرا کی تصاویر دیواروں پر بنوائیں اور ہر شاعر کا ایک شعر اس منظر کی تعریف میں لکھوا کر درج کر دیا۔ اور ہر تصویر کے پاس

[1] الحکومۃ المصریہ صہ ۱۹ علی بہجت [2] سفرنامہ صہ ۴۵ مطبوعہ بمبئی

طاق میں ایک ایک تھیلی ایک سو پچاس اشرفیوں کی سربمہر رکھوا دی۔ ہر شاعر آتا تھا اور اپنے حصہ کی تھیلی طاق سے اٹھا کر لیجاتا جب اشرف الخلیل قلعۃ الجبل پر قابض ہوا تو اس نے اس کو بلند کرایا سپید رنگوایا۔ دیواروں پر تمام امرائے دولت کی تصاویر بنوائیں اور قبہ کو نہایت نفیس نقش ونگار سے آراستہ کیا۔ مصر کے عجائب خانہ میں فاطمی خلفا کے ہزاروں آثار موجود ہیں جن میں ایک ٹکڑا مرمر کا ہے جس پر ایک کتبہ خط کوفی میں ہے دراصل مشہد سے متعلق ہے اس پر لکھا ہے" بسم اللہ الخ
بعمله عبد الله وليه ابى الميمون عبد الله الخ

ایوبی ۵۶۷ھ میں خلفائے فاطمین کے بعد مصر میں ایوبیوں کا دور دورہ ہوا جن کا زمانہ زیادہ تر جنگی مہمات میں گذرا اور فاطمی عہد کے صناع مصر کو چھوڑ کر شام، ایشیائے کوچک، عراق، عرب، ایران، صقلیہ اور اندلس میں پھیل گئے اور ان مقامات میں اپنے فن کو فروغ دیا۔ جو اس وقت کی تاریخ میں نمایاں ملتا ہے۔ دور ایوبیہ میں مسلمانوں کو بہت بڑی فتوحات حاصل ہوئیں ان میں۔ خاص طور پر قابل ذکر فتح بیت المقدس ہے۔ جسے مسلمان عرصہ تک حاصل کرنے کی کوشش کر چکے تھے۔ گو اس دور میں فنون کی طرف توجہ کم ہوئی تھی لیکن جو کچھ بھی ہوا اپنی نوعیت میں آیندہ نسلوں کے لئے راہ عمل تھا زیادہ تر جنگی عمارات وسامان حرب کی طرف توجہ مبذول رہی۔ فاطمین کے قصر کو قلعۃ الجبل کے نام سے بدل دیا اس میں وہ بات رکھی کہ اس میں مدخل ومخرج کا خوب انتظام کیا اور ایک خندق اس کے گرد محصورین کے بچاؤ کے لئے بنائی اور اس میں خاص قسم کے جنگی گنبد قائم کئے جن سے باہر کا اچھی طرح سے مشاہدہ کیا جا سکتا تھا معلوم ہوتا ہے کہ سلطان صلاح الدین ایوبی کو قدرت نے اس صنعت کے رائج کرنے کا خاص ملکہ عطا کیا تھا۔ جو بعد میں جا کر دنیا کے لئے ایک جنگی قلعہ جات کا خاص فن بن گیا۔ اس زمانہ کی بعض عمارات کے منقش ٹکڑے ملتے ہیں جو یورپ کے عجائب خانوں میں محفوظ ہیں اور سامان حرب کے تو بیشمار نمونے نظر آتے ہیں۔ مجرا رزق کا ایک منقوش ٹکڑا املاً جو بقلم نسخ ۵۸۹ھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں قندیل وغیرہ کی شکلیں ہیں اور نقاش کا نام عبدالرحمن وابن اخیہ لکھا ہوا ہے[۱]۔

غزنویہ محمود غزنوی کے زمانے سے یہ ہرگز مترشح نہیں ہوتا کہ اس میں کبھی ان فنون کی طرف توجہ کی گئی ہو۔ کیونکہ ہمیں لے دے کے یہی یاد ہے کہ اس نے ہندوستان پر سترہ حملے کئے۔ لیکن اس کی سپاہیانہ زندگی کے علاوہ علوم کی سرپرستی کی طرف دیکھا جائے تو مجالس شعرائے فارس کے قیام کا سہرا اس کے ہی سر نظر آئیگا۔ اس کے عہد میں فرخی، عنصری، فردوسی جیسے شعرا ہوئے۔ فردوسی نے شاہنامہ لکھ کر دنیا کے سامنے پیش کیا۔ شاہنامہ کے عنوان کے تحت میں یہاں اتنا لکھنا کافی ہوگا کہ اس کے بعض بیانات محض قدیم نقش ونگار دیوارہائے فارس کا پتہ نہیں دیتے بلکہ آیندہ آنے والی تخییلی مصوری کا راستہ کھولتے ہیں۔ مصورین نے شاہنامہ کے اشعار کو اپنے ادراک کے مطابق مصور کیا۔ انھوں نے تمثیلی (REALISTIC) حدود سے نکل کر رسمی اور تخییلی (CONVENTIONAL AND IDEALISTIC) مصوری کی طرف رجوع کیا جو دراصل مسلمانوں میں مصوری ونقاشی کا نصب العین رہا ہے۔ سلطان محمود غزنوی نے ایک باغ بڑے ساز و سامان سے تیار کرایا تھا۔ گلہائے رنگا رنگ کے تختے جابجا جدولیں دو طرفہ سرو وشمشاد ایک طرف مصنوعی خوشنما جھیل اس میں رنگ رنگ کی مچھلیاں کانوں میں موتی کے آویزے پہنے ہوئے پھرتی تھیں۔ تصاویر میں محمود کو کہیں برچھا لئے شکار میں مصروف کہیں بزم عیش میں بیٹھا دکھایا ہے۔ فرخی نے اس باغ کا نقشہ چند اشعار میں پیش کیا ہے۔
مورخ بیہقی نے اپنی تاریخ میں سلطان مسعود غزنوی کے محلات

۱۔ تاریخ حکومۃ المصریہ مجنہ حفظ الآثار العربیہ ص۸۔

2. JOURNAL, ARCHITECT OCT 1925

کی جو تفصیل دی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دیوار وسقف نقش و نگار سے مزین تھیں۔ اور خاص کر انفیہ وشلفیہ کے الفاظ سے بیان کیا ہے جو خاص کر ان سلاطین کی فارغ البالی کا پتہ دیتی ہیں[1] بعض متعصب واقعہ نگاروں نے بیان کیا ہے کہ محمود غزنوی نے ہند کے مندروں وغیرہ کو برباد کرکے بہت سا سامان یہاں سے لیجاکر اپنے محلات ومساجد بنائے مسٹر فرگسن تاریخ فن تعمیر ہند میں لکھتا ہے کہ غزنوی کی عمارات کو دیکھ کر اس امر کا شائبہ بھی نہیں ہوتا کہ ان میں کسی طرح بھی ہندی سامان سے مدد لی گئی ہو۔ مسجد کے صندلی ستونوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ سومنات کے مندر سے لائے گئے ہیں۔ لیکن غزنی کی مقامی لکڑی ایسی ہی ہوتی ہے۔ انہیں سومنات سے کوئی مشابہت نہیں[2]۔ غزنی کا طرز تعمیر زیادہ تر بنی طولون کی عمارات سے مشابہ ہے۔ اور اس دور کے شعرا نے بیشمار قصائد سلاطین غزنی کی مدح میں لکھے ہیں۔ جن میں ان کے محلات ومساکن کی پوری پوری تفصیلات اور اس وقت کی مصوری کا پتہ ملتا ہے۔

اندلس — اندلس جو اسلامی تہذیب وتمدن کا ابتدائی گہوارہ رہ چکا ہے اس کی یادگاریں اب تک دنیا کے لئے عبرت کا سبق ہیں۔ وہاں جن اسلامی علوم وفنون کی ترویج اور ترقی ہوئی وہ اظہر من الشمس ہیں۔ اگر تحقیق کی جائے تو بیشمار اسلامی اثرات جو یہاں کی پیداوار ہیں یورپ پر ثابت ہونگے۔ قدیم یادگاروں میں مسجد قرطبہ جس کی بنیاد سنہ ۱۵۲ھ میں رکھی گئی نہایت بے نظیر ہے۔ اس عمارت میں علاوہ کمال فن تعمیر کے نقاشی کو بھی خاص حد تک دخل ہے جس کے دیکھنے سے عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ باوجود حوادثات زمانہ کے اپنی اصلی حالت میں نظر آتے ہیں۔ اس کے بعد اندلس میں سینکڑوں دیگر عمارات تعمیر ہوئیں جن میں یہی کمال فن پنہاں ہے۔ خصوصیت سے علم ہندسہ کو جسے مسلمانوں کی نقاشی میں خصوصیت عظیمہ حاصل ہے یہاں مطالعہ کرنے کا بہت بڑا موقعہ ملتا ہے۔ دیگر دیواری نقش ونگار کو بھی بہت فروغ ہوا جن میں کوئی جاندار نقش نظر نہیں آتا۔ سنہ ۶۲۵ھ میں غرناطہ میں الحمرا کی بنیاد رکھی گئی اور اس قصر کی عمارت کے مختلف حصے مختلف مطالب کے لئے مخصوص کئے گئے۔ خاص کر ان میں بیت الشریعت کی چھت جس میں مختلف قسم کی تصاویر بنی ہوئی ہیں خصوصیت سے امرا عرب کی مجلس شوریٰ جو مدبرین سلطنت کی شبیہات پر مشتمل ہے اس کے علاوہ اور بھی نقوش ہیں۔ ان سے اندلسی مسلمانوں کی وضع قطع پر پوری روشنی پڑتی ہے۔ یہاں کے صناعوں نے شبکہ کاری میں ایک خاص تنوع پیدا کیا تھا جو دنیا میں آج اولین ماخذوں میں شمار ہوتا ہے۔ یہاں کی ایک ایک اینٹ کے فنی خصوصیات بیان کرنے کے لئے ایک مستقل کتاب درکار ہے مگر پھر بھی وہ اصل بات احاطۂ تحریر میں نہیں آسکتی جو کیفیت ان آثار کو دیکھ کر طاری ہوتی ہے۔

سلجوقی — سنہ ۴۵۰ھ کا ایسا زمانہ تھا کہ خلفائے مصر، سلاطین سلجوق اور خلفائے بغداد میں جنگ شروع تھی۔ خلیفہ القائم بامر اللہ بغداد کو متواتر ایک مہینہ کے لئے غار میں قید کر دیا گیا تھا۔ اسی اثنا میں طغرل بیگ نے اپنے بھائی پر فتح پائی تو والی غار کو لکھ کر خلیفہ کو رہا کر دیا اور بعزت تمام دار الخلافہ میں پہنچا دیا گیا۔ خلیفہ کا قصر جو لوٹا جا چکا تھا اور جو کچھ کسی نے لوٹا تھا واپس نہیں کیا۔ ان میں ہزارہا ٹکڑے مشجر کے تھے جن پر خلفائے عرب اور ان کے جنگجو ارکان سلطنت کی تصاویر تھیں۔ ان کے علاوہ اور بہت سا ایسا سامان تھا جو حیوانی اور انسانی تصاویر سے مزین تھا[3]۔

سلاجقہ کے متعلق عرض ہے کہ انھوں نے زیادہ تر فن تعمیر میں حصہ لیا تھا۔ لیکن شہزادہ طغرل بن ارسلان شاہ سنہ ۱۱۹۴-۱۱۷۷ء نے اپنے ہاں ایک مصور جمال اصفہانی کو ملازم رکھا تھا تاکہ ان تمام شعرا کی تصاویر بنوائے جنہیں زین الدین الراوندی نے اپنے مجموعہ کلام میں بیان کیا ہے۔ اس نے کتاب کو اپنے ہاتھ سے نقل کیا تھا اور ہر ایک تصویر کے نیچے ان شعرا کے اشعار بھی

[1] تاریخ بیہقی ص۱۳۵ کلکتہ   [2] تاریخ فن تعمیر ص۱۹۳/۲ ش ا۔   [3] تاریخ الخلفا سیوطی ص۱۶۰ مقریزی

قلمبند کئے تھے - یہ اسی طرح سے ہے جس طرح متذکرہ بالا خلیفہ الامر باحکام اللہ نے اپنے درباری شعرا کی تصاویر بنوائی تھیں[1]

علاء الدین بن عبداللہ البہائی الغزولی الدمشقی متوفی ۸۱۵ھ نے اپنی کتاب[2] مطالع البدور فی منازل السرور میں حمام نافع کے تحت میں ان دیواری نقوش کے فلسفیانہ پہلو پر مفصل لکھا ہے جو اس ضمن میں مشرق و مغرب میں پہلی تحریر معلوم ہوتی ہے -

اس حمام کے اندر نہایت پر صنعت و حرفت اور نازک تصاویر مثلاً عاشق و معشوق، باغ و گل، غنچہ، صفوف اسپ و دیگر وحوش کی ہوتی تھیں اور علت اس کی یہ تھی کہ اس قسم کی تصاویر سے بدن کے ہر سہ قویٰ حیوانیہ، بدنیہ، نفسانیہ کو بہت زیادہ تقویت حاصل ہوتی ہے۔ حکیم بدرالدین بن مظفر قاضی بعلبک اپنی کتاب مفرح النفس میں رقمطراز ہیں کہ تمام اطباء، حکماء و فضلائے عصر کا اتفاق ہے کہ خوبصورت اور نازک صور کے دیکھنے سے نفس کو ایک گونہ فرحت و مسرت حاصل ہوتی ہے۔ ان کی وجہ سے امراض سوداویہ اور پریشان کن افکار دور ہو جاتے ہیں۔ ان افکار کے ازالہ کی وجہ سے قلب کو بہت زیادہ قوت حاصل ہوتی ہے حکما کا قول ہے کہ اگر خوبصورت صورتیں کسی وجہ سے زیر نظارگی نہ آسکیں تو انسان کو چاہیئے کہ پھر وہ ایسی صور ہیاکل دیکھے جو بصورت فریم بڑے بڑے محلات میں آویزاں ہوتی ہیں -

یہ رائے حکیم محمدؐ بن زکریا رازی نے لکھی اور ذکر کی ہے حتیٰ کہ وہ اس شخص کے لئے جس کا قلب بیہودہ خیالات اور پریشان کن وساوس کا آماجگاہ بنا ہوا ہو اس لئے یہ عمل یعنی نظارگی صور جمیلہ کو فرض و لازم قرار دیتے ہیں۔ وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ اگر اشکال میں تناسب مقدار کو ملحوظ رکھ کر دیدہ زیب رنگ مثلاً سرخ، سبز، زرد اور سفید کے ساتھ کسی تصویر کو کھینچا جائے تو بالیقین اخلاط سوداویہ کے ازالہ میں نافع ہوں گی اور وہ تمام ہموم و غموم جو ہر وقت اس پر طاری رہتے ہیں زائل کر دیگی۔ روح سے تمام کدورتوں کو نکال کر انبساط و خوشی کا سامان پیدا کریگی۔ اسی لئے کہ جب نفس اس قسم کے صور حسینہ کو دیکھ کر بہرہ اندوز ہوتا ہے - اس کی تمام کدورت رفع ہو جاتی ہے اس کے بعد کہتے ہیں کہ جب حکمائے متقدمین نے حمام کو ترویج دی تو انہوں نے اپنی صائب عقل سے یہ معلوم کر لیا کہ انسان جب حمام میں داخل ہوتا ہے تو اس کی قوت میں بہت کچھ کمی پیدا ہو جاتی ہے لہذا انہوں نے اپنی عقل و حکمت سے استمداد کر کے اختراع کیا کہ حماموں کے اندر بہترین صور حسین و شیریں و دیدہ زیب رنگوں میں منقش کی جائیں تاکہ وہ قوت جو زائل ہوئی ہے انہیں دیکھ کر عود کر آئے - ان تصاویر کی انہوں نے تین قسمیں کی ہیں - اس لئے کہ ارواح بدن تین قسم کی ہیں - حیوانیہ، نفسانیہ، طبیعہ - لہذا انہوں نے ہر قسم کی جدا تصویر کو ایک الگ قوت کی تقویت کا سبب بتایا ہے۔ مثلاً قوت حیوانیہ کو زیادہ کرنے کے لئے جنگ، قتال و شکار وحوش اور گھوڑوں کی دوڑ کے نقشے بنائے - نفسانیہ کی زیادتی کے لئے وہ مجسمے بنائے جن سے عشق و تفکر کی معیت مستنبط ہوتی ہو یا مثلاً عاشق و معشوق کے وصال یا فراق کی تصویر کھینچی ہو اور قوت طبیعہ کی زیادتی کے لئے باغ و گل، غنچہ، عمدہ عمدہ خوش منظر اشجار اور دیدہ زیب ایوان کی تصاویر بنائیں - یہ تمام اقسام تصاویر ایک عمدہ حمام کے لوازمات و اجزا میں قرار دئے گئے -

بعض نے اس خلوت خانہ میں یہ عجیب بات دیکھی کہ اس کی چہار دیواری اس طرح صیقل شدہ اور چمکتی تھی کہ اس میں اور آئینہ نسوانی[3] میں کوئی فرق باقی نہ رہا - انسان جس طرح کی دیوار میں چاہیے اپنے تمام بدن کو بخوبی دیکھ سکتا تھا - نیز میں نے دیکھا کہ اس کا فرش مُذہّب تھا - اس میں سرخ، زرد، سبز رنگ کے نگینے جو تمام بلور کے بنے ہوئے تھے جڑے تھے - ان کے متعلق مشہور ہے - کہ یہ ایک قسم کا پتھر تھا جو روم سے آتا تھا - مُذہّب کی یہ صورت ہوتی تھی کہ وہ ایک قسم کا شیشہ ہوتا تھا جس پر آب زر سے نہایت عمدہ دلکش تصاویر کھینچی جاتی تھیں - اس کے بعد رافعی کا قول نقل کر کے استنباط کیا ہے کہ اگر تصویر وغیرہ رہ گذر یا حمام میں ہوں تو کوئی

[1] - ملاحظہ راحت الصدور مرتبہ پروفیسر اقبال ۔ [2] - وائنا کتب خانہ نمبر ۳۹۷ [3] آئینہ نسوانی عربوں کے نزدیک بطور ضرب المثل کے مشہور ہے - کیونکہ عورتیں اپنی ٹیپ ٹاپ کو ٹھیک رکھنے کے لئے ہر وقت پاس رکھتیں جس کی وجہ سے یہ عام مشہور ہوگیا یا ممکن ہے کچھ اور مطلب ہو -

مضائقہ نہیں اور اگر مجلس میں ہوں جہاں وہ عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں تو وہاں داخل ہونا حرام یا مکروہ ہے۔

ی اشیا — مسعودی بیان کرتا ہے کہ جزیرۃ العرب میں بہت سے مقام پر چینی تاجر مقیم تھے جن سے عرب رؤسا بہت سی چینی اشیا منقش و مصور لے کر اپنی شادیوں کے موقعے پر بطور تحفہ تحائف دیا کرتے تھے اور یہ چینی ان کے نزدیک اعلےٰ صناع شمار ہوتے تھے۔ جو دنیا بھر کے دیگر صناعوں پر بھی سبقت رکھتے تھے۔ اس نے ایک عجیب قصہ بیان کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ چینی تاجر کس قسم کی اشیا عام بازاروں میں فروخت کرتے تھے۔ ایک چینی مصور نے ایک پرندہ کی تصویر ایک تنکے پر بیٹھے ہوئے بنائی۔ وہ بازار میں پڑی ہوئی تھی جسے بہت سے لوگ عجیب و غریب سمجھے آخر ایک شخص نے اس پر علانیہ نکتہ چینی کی۔ وہ تاجر اسے سلطان کے پاس لے گیا وہاں تصویر کا نقص دریافت کیا تو بیان ہوا کہ پرندہ تنکے پر اس طرح بیٹھ نہیں سکتا۔ معترض کا اعتراض مصور کو برا معلوم ہوا۔ قدیم شعرائے فارس کے کلام میں چینی صنعت کی بہت تعریف ملتی ہے۔ مگر اس کے برعکس تیسری صدی ہجری کے آخر میں ایک عرب ابن وہاب بصری نے بادشاہ چین کے دربار میں ایک مرقع تصاویر انبیا پیش کیا تھا جن میں آنحضرت صلعم کی بھی تصویر تھی۔ سر آرنلڈ کا خیال ہے کہ اسلامی مصوری نے دور دراز تک سفر کیا۔ اگرچہ مذہبی تصورات کے برعکس تھی[1]۔

پ / ری — اوپر کسی حد تک بیان ہو چکا ہے کہ عربوں کے ہاں کپڑوں کے خاص نام ان کے خاص نقوش کی وجہ سے مقرر تھے جو عام طور پر وہ لوگ استعمال کرتے تھے۔ سنہ ۲۱۲ھ میں صقلیہ (Sicily) جہاں مسلمانوں کی حکومت زیادۃ الدولۃ اغلب کی فتح سے شروع ہوتی ہے۔ وہاں ابھی تک بہت سے اسلامی آثار حقیقہ علاوہ عمارات کے مل جاتے ہیں۔ وہاں ایک عجائب خانہ ہے جس میں خالص اسلامی اشیا زیادہ تر قالین و ریشمی کپڑوں وغیرہ کی قسم رکھی ہوئی ہیں۔ جن پر جانوروں کے نقوش اور تصاویر ملتی ہیں۔ جن سے اس وقت کی عربی شان و شوکت مترشح ہوتی ہے۔ ان پر اساتذہ فن نے نہایت جانفشانی اور کمال دکھایا ہے اور بعض میں ان کے اسما بھی ثبت ہیں۔ چنانچہ بعض پر استاد عبد العزیز کا نام ملتا ہے۔ جن کے کارخانے میں یہ اشیا تیار ہوئی تھیں اور بعض پر عربی عبارتیں "العز والنصر والاقبال" کے الفاظ بھی ملتے ہیں[2]۔ اسی طرح کی سینکڑوں قدیم چیزیں یورپ کے تمام عجائب خانوں میں نظر آئیں گی۔ خصوصیت سے وینس کے عجائب خانہ مشرقی اور ویٹیکن میں یہ آثار کثرت سے ملتے ہیں ان میں بعض مسلمان سپاہیوں کے لباس وغیرہ ہیں۔ ان کی آستینوں اور سینوں پر ابھی تک خون کے نشان موجود ہیں بعض پر یہ آیات ملتی ہیں۔ "نصرٌ من اللہ وفتح قریب وبشر المومنین" صلاح الدین ایوبی کے زمانے کے جھنڈے ملتے ہیں۔ خطیب بغدادی نے اپنی کتاب تاریخ بغداد میں خلیفہ المنتصر باللہ سنہ ۲۴۷ھ کے تحت میں بدائع من المنصور ایک باب قائم کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ خلیفہ المنتصر مجلس میں بیٹھا تھا۔ اس نے حکم دیا کہ دیباج کا فرش بچھا دیا جائے۔ بعض میں بہت بڑے بڑے دائرے تھے۔ ان میں گھوڑوں کی تصاویر تھیں اور ان پر سوار تھے جن کے سروں پر تاج تھے دائرہ کے گرد کچھ فارسی میں لکھا تھا جب منتصر اور اس کے ندما بیٹھے تھے تو غلاموں اور بڑے بڑے لوگوں کے چہرے آپ کی طرف متوجہ تھے تو اس نے اس دائرہ کی طرف دیکھا جس کے گرد کچھ لکھا ہوا تھا۔ تو اس نے وزیر سے دریافت کیا کہ کیا لکھا ہے۔ اس نے عذر کیا کہ میں نہیں جانتا۔ پھر اس نے حاضرین سے سوال کیا مگر کسی نے پڑھنے سے وفا نہیں کی پھر اس نے وصیف کی طرف التفات کیا۔ اس کو کہا کہ کوئی آدمی لاؤ۔ جو اسے پڑھ دے۔ ایک شخص پیش کیا گیا وہ اس تحریر

۱۔ اسلامک ص۳ ۔ ۲۔ میگزین آف آرٹ ۱۹۰۶ء

کو پڑھ کر پریشان ہوا۔ منتصر نے کہا یہ کیا ہے۔ اس نے کہا۔ اے امیر المومنین یہ کوئی ایرانی بیوقوف ہے پھر اصرار کیا کہ مجھے مطلع کرو۔ پھر اس نے کہا کہ اے امیر المومنین اس کے کچھ معنی نہیں ہیں۔ اس پر وہ بہت جھنجھلایا اور غضبناک ہوا۔ اس نے کہا یہ لکھا ہے کہ میں شیرویہ بن کسریٰ بن ہرمز ہوں۔ میں نے اپنے باپ کو قتل کر دیا ہے پھر کہتا ہے کہ میں نے محض چھ مہینے سلطنت کی۔ منتصر کا چہرہ سن کر متغیر ہو گیا۔ مجلس سے اٹھ کر حرم میں چلا گیا محض چھ مہینے سلطنت کی اور اس کا انتقال ہفتہ کے روز ۵ شہر ربیع الاول ۲۴۸ھ میں ہوا۔ وہ لوگ تصاویر کو بالکل واقعات پر منطبق کر کے بناتے تھے اور پھر اس پر تحریریں ثبت کرتے تھے۔ اس واقعہ سے ہم یہ بھی استنباط کر سکتے ہیں کہ ایرانی فن اس وقت عرب میں شیر و شکر ہو چکا تھا مسعودی نے بھی اس قالین کا ذکر کیا ہے اس نے لکھا ہے اس میں یزید بن الولید بن عبد الملک تا ایک کی بھی تصویریں ہیں اور مسعودی نے ایک اور ایسے قالین کی تفصیل ہم پہنچائی ہے جو ام المستعین کی ملک میں تھا جس میں ایسی مرصع صورتیں دکھائی گئی تھیں جس سے مسلمانوں کی زندگی کے واقعات و عادات کا پتہ ملتا ہے

مجھے برٹش موزیم میں ایک ہندوستانی مسٹر گورڈن جو ۲۰ سال سے برٹش میں مقیم ہے ملنے کا اتفاق ہوا۔ وہ کاغذ کی تاریخ لکھ رہا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ عرب میں قبل بعثت آنحضرت صلعم کاغذ موجود تھا۔ جب میں نے اس کے سامنے قرآن کریم کی آیت پیش کی جس میں لفظ قرطاس آتا ہے اور پھر احادیث بھی بتائیں تو اس نے ان کو سن کر مجھے بعض نمونے دکھائے۔ علاوہ ازیں یہ امر تاریخ میں آ چکا ہے کہ اولاً کاغذ کی ابتدا چین میں ہوئی اور وہیں سے گرد و نواح کے شہروں میں لایا گیا اور یہ بھی علم ہے کہ ظہور اسلام کے وقت سمرقند میں بنتا تھا۔ جب عربی امیر زیاد بن صالح نے سمرقند کو ۱۳۴ھ میں فتح کیا تو اس لڑائی میں بہت سے چینی قیدی بھی ہاتھ آئے ان میں سے بعض کاغذ بنانا جانتے تھے۔ یوسف بن عمرو عرب نے ان سے کاغذ بنانے کا طریقہ سیکھا اور مکہ معظمہ میں آ کر اور لوگوں کو بھی سکھایا تو کاغذ مکہ میں آ کر قرطاس کہلایا ۱۳۸ھ میں مکہ میں پہلی مرتبہ کاغذ تیار ہوا۔ غرضیکہ یہ امر یقینی ہے کہ چینیوں کے بعد مسلمانوں نے ہی کاغذ تیار کیا اور اپنے مسودات ان پر لکھے جو آج تک محفوظ ہیں۔[۳]

ابن ندیم نے جہاں ابتدائی اسماء الکتاب المصاحف شریف بیان کئے ہیں وہاں اسماء المذہبین للمصاحف شریف بھی دیئے ہیں جن کا کام محض قرآن کے اوراق کی مطلا کاری کرنا تھا۔ تذہیب نگاری و زرافشانی مسلمانوں کے خاص فن شمار ہوئے ہیں مثلاً الیقطینی، ابراہیم الصغیر، ابوموسیٰ بن عمار، السقلی، محمد بن محمد ابو عبداللہ الخزاعی اور اس کا لڑکا۔ یہ وہ اسماء ہیں جو ابن ندیم متوفی ۳۸۵ھ تک مشاہیر میں سے تھے۔[۴] ان کے بعض نمونے اب تک مصر، قسطنطنیہ، وائنا اور یورپ کے کتبخانوں میں موجود ہیں۔ جو مسلمانوں کے خاص کے خاص ملکہ نقاشی کا پتہ دیتے ہیں۔ مسلمان صناع اس کام سے روزی کماتے تھے۔ وہ حافظ قرآن ہوتے تھے اور اسی کو لکھنا، مطلا کرنا توشہ آخرت تصور کرتے تھے۔ اور اپنے دل و دماغ سے اس کی تزئین میں حصہ لیتے تھے۔ یہ فن مسلمانوں میں اخیر تک ہر اسلامی سلطنت میں نہایت شان و شوکت پر رہا ہے۔

ایران کی جد و جہد کو مدنظر رکھ کر اور ایرانی کتابی تصاویر کی طرف توجہ کریں تو پہلے مانی کے مذہب پر ضرور روشنی ڈالنی چاہیئے جس نے ایران کی ذہنیات پر ایک عرصہ تک تسلط رکھا تھا۔ آرنلڈ کی مساعی جمیلہ سے ایک قدیم مخطوطہ سنہ ۹۰۰-۶۰۰ء متعلقہ مذہب مانی کے چند اوراق کا ایڈن برا یونیورسٹی سے پتہ لگا ہے۔ اور ان سے کاغذ پر تصاویر کا قدیم ترین ہونا معلوم ہوتا ہے۔ لی توق کا خیال ہے کہ قریب قریب تمام اسلامی کتابی مصوری کی بنا مانوی مذہب کی کتابی تصاویر پر ہے اور آگے چل کر کہتا ہے اگر کوئی مقابلہ ممکن ہو سکتا ہے تو مجھے کتابی مصوری اور دیواری مصوری بدھ مت اور ایرانی مانوی ترکستان وسط ایشیا کی طرف توجہ دلانی چاہیئے جو بلا شک و شبہ اس کتابت سے بالکل مختلف ہے جو ان کی تھی۔ ان فنون کو غالباً مصر میں لایا گیا۔ یہ نظریہ قائم نہیں ہو سکتا۔[۵]

اس ضمن میں پروفیسر گروہ مان ایک تجویز پیش کرتا ہے کہ مانوی

۱۔ تاریخ ادب عربی جورجی زیدان ص ۲۶ ۲۔ اورنٹل کالج میگزین از مضمون ڈاکٹر عنایت اللہ ۳۔ ابن ندیم ص ۴۔ اسلامک آرٹ ص ۱۲

دبستان مصوری کا زبردست اثر یقینی طور پر قدیم مسلم نمونہ جات مصوری سے واضح ہے اگرچہ وہ زوال پذیر ہے۔ میں اس قدر دور نہیں جاتا جس قدر کہ لی تاق گیا ہے کہ مانوی دبستان مصوری اسلامی کتابی مصوری کی بنیاد ہے کیونکہ اوائل زمانہ کے مسلم مصور یا نقاش زیادہ تر فلسطین اور عراق کے مابین نظر آتے ہیں۔ کسی حد تک ان کے طریق فن سے مانوی طرز ضرور مترشح ہے جس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ مانوی دبستان مصوری سے مسلمان مصورین باخبر ضرور تھے۔ مگر میرا خیال ہے کہ اگر ہر ملک کے طریق فن کو بغور دیکھیں تو ان میں ضرور بعض بعض ایسے نکات نظر آئینگے جو دوسرے میں بھی پائے جائینگے۔ اس سے کسی فن کا دوسرے فن پر اثر وغیرہ ثابت کرنا عقل پر دلالت نہیں کرتا کیونکہ ہر ملک کا فن یا طریق فن اپنے خاص طرز اور ماحول پر مبنی ہے۔

تصاویر سرآرنلڈ کا خیال ہے کہ مسلمانوں نے دراصل کوئی مذہبی فن پیدا نہیں کیا جو ان کا اپنا مذہبی فن کہا جا سکے۔ اس کا خیال ہے کہ ابتدا میں اس ضمن میں بہت کچھ غیر مسلم صناعوں سے لیا گیا ہے۔ ہمیں اس نظریہ کے قبول کرنے میں کوئی تامل نہیں ہے کیونکہ بہت جلد ہی مسلمان اس قابل ہو گئے تھے کہ وہ سب کام خود اپنے خاص طرز پر کر سکیں جس کو دوسرے لوگ بغیر ہدایت کے ہرگز نہیں کر سکے۔ جیسا کہ مثالاً اوپر عرض کر چکا ہوں۔ کیونکہ آرنلڈ نے فلورنس کی لارسٹین کے کتبخانہ کا نسخہ کتاب مقدس (انجیل) عربی کو پیش کیا ہے جو ١٢٩٩ء کا مکتوبہ ہے اور عراق کے شمال مغرب میں تیار ہوا[1]۔ اس میں چھوٹی چھوٹی سیاہ قلم میں تصاویر ہیں جو کسی عمدگی فن کو پیش نہیں کرتیں مگر اس کے برعکس موسیو بلوشے رقمطراز ہے[2] کہ آٹھویں صدی عیسوی تک لاطینی مخطوطوں میں جاندار یا انسانی نقوش نظر نہیں آتے تھے بلکہ کوئی ایسی تصویر بھی نہیں جو کسی قسم کے متذکرہ ماحول کو ظاہر کرتی ہو ان قدیم زمانوں کے صناع نے مطلا کار و مذہب کرنے والوں کی طرح دسویں صدی عیسوی کے آخر تک اپنے آپ کو زیبائش کی ترقی تک مطمئن رکھا جس کی تکمیل علم ہندسہ کے خطوط میں کی جو جاندار مناظر کے اظہار سے بہت ہی آسان تھی۔ اس میں ان کو نتیجہ تک پہنچنے کے لئے کم محنت درکار ہوتی تھی اور یہ اس نتیجہ سے بہت ہی ارفع تھا جو رومی اور بازنطینی مصوری کے مکمل کام کی نقل کرکے پیدا کیا جاتا جس کو انہوں نے شروع کیا تھا اس روایت کو جیسا کہ ہم انجیل چارلس ثانی میں زیبائش کو دیکھ سکتے ہیں اور ابھی تک موجود تھی اور دیر تک محفوظ رہی۔ مسلمانوں نے اس وقت تک جاندار کا اظہار نقوش میں کرنے سے اعراض کیا تھا یعنی متذکرہ بالا قرآن کریم کے مذہب و مطلا کار مسلمان ہی تھے جنہوں نے ابتدا میں خواہ کسی سے کام کو سیکھ کر ہی ان کاموں کو سنبھالا۔ جیسا کہ موسیو بلوشے کے بیان سے واضح ہے کہ عرب مطلا کار ضرور تھے۔ مگر سرآرنلڈ نے جس زمانے کا انجیل کا عربی مخطوطۂ فلورنس پیش کیا ہے اس سے قبل زمانہ کے خالص مسلمان صناع کے کام کے مخطوطے برآمد ہو چکے ہیں۔ چنانچہ ١٩٣١ء کی نمائش ایرانی فن میں اوراق منافی کی کتاب الحیوان از مجموعہ مورگن کتبخانہ اور اوراق شاہنامہ مسٹر بیٹی، مسز گوش کلکتہ وغیرہ وغیرہ سے کافی روشنی پڑی ہے کہ مسلمانوں کی ابھی تک یہ اشیا محفوظ ہیں اگرچہ ان کو روح مذہب اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

بعضوں نے ارنلڈ کے اس نظریہ کی تردید کی ہے اور بہت سی امثلہ اس کے برعکس اپنی تائید میں پیش کی ہیں اور بعضوں نے اس مذہبی مصوری سے یہ تصور کیا ہے کہ محض مذہبی مضامین کو دخل دیا ہو۔ ان کی تسلی کے لئے عرض ہے کہ یہ ضرور نظر آئیگا کہ بعض نے ایسی تصاویر بنائیں جو خالصاً ظاہری صورت میں مذہبی کہی جا سکتی ہیں مگر غایت فن کے اعتبار سے ان کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں جس طرح دیگر مذاہب مثلاً بدھ مت اور عیسائیت نے تصاویر سے لیا ہے[3]، مسلمانوں کے ہاں کبھی ان کے گھروں یا مساجد میں کوئی ایسی تصویر نظر نہیں آئیگی جو ان کے کسی مسئلہ مذہب یا کسی ایسے اصول مذہب پر روشنی ڈالے جس طرح اس کے برعکس دیگر مذاہب میں علیحدہ اور پھر وہ نقوش خواہ رنگ میں خواہ حجر میں باعث عبادت بھی ہوئے مسلمانوں نے مصوری کو محض ایرانی روایات کے ماتحت روحانیت

[1] اسلامک بک ص ١٢-١ [2] مسلمان پینٹنگ از بلوشے [3] حال ہی میں مسٹر انند نے ایک کتاب (HINDU VIEW OF ART) لکھی ہے اس میں یہ بیان کرنے کی کوشش کی ہے کہ بدھ مت کی تعلیم میں مصوری ممنوع ہے۔

اور شعریت کو مد نظر رکھ کر اختیار کیا جس کو مذہبیات سے کوئی تعلق نہیں بلکہ مذہب سے کوسوں دور اور خالصاً جمالیاتی صورت ہے اور اسی سے انھوں نے مصوری کو تمثیلی قیود سے آزاد کر کے تخیلی صورت دی اور معنوی طور پر بعض حالات کے تحت تصاویر بھی بنائیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ بعض مذاہب کی تمام تعلیم ہی نقوش اور بت تراشی کے نمونوں میں ہی پنہاں ہے اگر آج وہ مٹ جائیں تو ان کے مذہب کی تمام روایات کا خاتمہ ہو جاتا ہے جو مذہب اسلام کے بالکل برعکس ہے کیونکہ ہماری تمام تعلیم ہماری کتب مقدسہ میں محفوظ ہے جو اس قسم کے تصویری اظہار سے بلند و ارفع ہے۔ اس کے متعلق مزید وضاحت سے بہزاد کے زمانہ کے تحت ہی آگے چل کر بیان کیا جائیگا۔

خلفاء بنو عباس نے جب تدوین علوم کی طرف توجہ کی تو دور دور سے فضلا، علما، حکما و ماہرین فن کو دربار میں جگہ دی گئی جنہوں نے علاوہ تصانیف کے اپنی کتب کو مناسب و ضروری نقوش سے آراستہ کیا جو زیادہ تر جغرافیہ، طب، ادب، علم الہیئت، ہندسہ، علم القراۃ اور موسیقی میں تھیں۔

طب علوم طبیعات میں دیکھا جائے تو سب سے پہلے حنین بن اسحاق متوفی ۲۹۸ھ کی کتاب العین کا پتہ ملتا ہے جس نے آنکھ کی پتلی کی تصویر اپنی کتاب میں ایسی خوبصورتی سے کھینچی کہ آجکل کے ڈاکٹر بھی اپنی کتاب میں ایسا صحیح اور واضح نقشہ کھینچنے سے قاصر ہیں۔ عیون الانبا میں رشید الدین ابن الصوری کی نادر تصنیف کا ذکر ملتا ہے۔ اس کی تیاری میں مؤلف خود ان مقامات پر گیا ہے جہاں پودے اگتے تھے اور ساتھ ایک مصور ہوتا تھا۔ پودے کے رنگ، پھول، پھل، پتیوں کی تعداد شاخوں کی حالت کو دیکھ کر کاغذ پر کھینچا جاتا تھا۔ اور مختلف اوقات پر مختلف حالتوں کی تصویر لی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ پودے کا نشو و نما ہو جاتا تھا۔ میونک (جرمنی) کی اسلامی نمائش منعقدہ ۱۹۱۴ء میں ایک ورق از کتاب طب آیا جس کے مصنف کا نام یا کتاب کا نام معلوم نہیں لیکن مصور کا نام عبداللہ بن الفضل مورخہ ۶۱۹ھ لکھا ہے۔ ابوبکر رازی مشہور کیمیاگر کی تصنیفات ملتی ہیں جن میں رازی کو اس کے معمل میں تجربوں میں مصروف دکھایا گیا ہے۔ قاہرہ کے دارالآثار میں ایک برتن ہے جس پر پرندوں وغیرہ کے نقوش اور اس کے بنانے والے کا نام محمدؐ بن فضل اللہ ہے۔

قراۃ علم القراۃ میں کئی کتابیں مصور تیار ہوئیں جن میں حروف کے مخارج کو ظاہر کرنے کے لئے حلق منہ اور زبان کی تصویریں بنائی گئی ہیں اور بعض میں پورا چہرہ بھی دکھایا گیا ہے جو آج یورپ میں علم الصوت کے نام سے رائج ہے۔ اور اہم تصور کیا گیا ہے۔

ریاضی امام ابوالحسان نیشاپوری کی کتاب "علم الاصطرلاب" کا حصہ اول مکتوبہ ۵۲۲ھ تیار کردہ احمدؐ البیہقی جن میں ایک سو تین شکلیں ہیں میں نے اُسے دیکھا ہے اور یہ ایرانی نمائش لنڈن ۱۹۳۱ء میں آئی تھی۔ اس سے ایک امر پر ضرور روشنی پڑتی ہے کہ احمد البیہقی علاوہ واقف حساب اسطرلاب کی شکلوں کو صحیح کھینچنے کی بھی مہارت رکھتا تھا جو بہت ہی صاف اور عمدگی سے تیار ہوئی ہیں۔ یہ نسخہ چیسٹر بیٹی کے مجموعہ میں ہے[1]

اسی طرح عطارد بن محمدؐ الحاسب کا رسالہ منافع الاحجار جو ۴۱۷ھ کا تیار شدہ ہے یہ بھی لنڈن کی نمائش میں ۱۹۳۱ء میں آیا ہے اور یہ گذور بمبئی نے ارسال کیا تھا۔ ابن ندیم نے اپنی فہرست میں عطارد کی دیگر تصانیف کو لکھا ہے مگر اسے درج نہیں کیا یعنی بالکل نئی چیز تھی اس میں بہت سی شکلیں بنائی ہوئی ہیں۔ عطارد بہت بڑا ریاضی دان تھا[2]

جغرافیہ جغرافیہ میں سب سے پہلی کتاب الاقالیم از ابو اسحاق الفارسی اصطخری کی ہے جس میں نقشہ جات ممالک بھی دئے گئے جو اس کی دوسری جلد سے عیاں ہیں۔ ادریسی نے بھی اپنے جغرافیہ کو دنیا کے نقشہ سے مزین کیا۔ مقدسی کی احسن التقاسیم اسی طرح تیار ہوئی تھی کہ ہر ملک کے شہر اور قصبات مع ان کے حدود کے علیحدہ علیحدہ دکھائے گئے تھے راستے سرخ خطوط سے، ریگستان زرد رنگ، سمندر سبز رنگ سے

[1] پرشین میناچور ص۱۸

[2] ابن ندیم ص۳۸۷ مصری و پرشین میناچور ص۱۸

دریا نیلگوں اور پہاڑ سیاہ رنگ سے نمایاں کئے گئے تھے۔ بعد میں معجم البلدان از یاقوت حموی و آثار البلاد از قزوینی جیسی کتب بھی جغرافیہ عالم میں لکھی گئیں۔ اور ان کو نقشہ جات دنیا سے مزین کیا گیا۔[1]

محمد بن موسیٰ المعروف بہ خوارزمی جو مامون کا درباری منجم تھا اس کی کتب میں نجوم کی تصاویر تھیں۔ ایک رسالہ علم نجوم میں ملتا ہے جسے نصیر الدین محمدؒ نے تیار کر کے سلطان غیاث الدین کیخسرو (۶۶۶-۶۸۲ھ) کی خدمت میں پیش کیا تھا۔

علم جرثقیل میں بعض مصنفین نے محسوس کیا کہ اپنی تصنیفات کو مصور کیا جائے۔ کیونکہ انہوں نے ان نقشہ جات کو مفہوم مطالب کے لئے تفہیم کا ذریعہ سمجھ لیا تھا۔ جس سے انہوں نے مدد لی۔ جزری کی کتاب فی معرفۃ الحیل الہندسہ جو سنٹ صوفیہ قسطنطنیہ کے کتبخانہ میں ہے[2] اس کے چند اوراق پریشان بدقسمتی سے بوسٹن (امریکہ) کے موزیم میں بھی چلے گئے ہیں۔ جو غالباً سنہ ۶۰۸ھ میں سلطان محمود کے لئے لکھی گئی تھی جس میں ان اوراق سے کسی خاص تاریخ وغیرہ کا پتہ نہیں چلتا سوا اس کے کہ ان پر الملک الصالح الاعلی الدنیا والدین لکھا ہوا ملتا ہے جس سے سلطان محمود کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ ایک اور نسخہ مرقومہ سنہ ۶۹۲ھ کا منقول ملتا ہے۔ اگرچہ قسطنطنیہ کا مصور نسخہ جسے مصنف نے سلطان کے لئے تیار کیا تھا اس میں خاص قابلیت کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ ظاہر کرتا ہے کہ جزری کی کتاب جو پانچ حصوں پر مشتمل ہے اس کے اول حصہ میں دس گھڑیوں کا ذکر ہے جس میں اول کا نقشہ یہاں دیا گیا ہے۔ جو ایک آبی گھڑی کہلاتی ہے اور یہ اپنے سلسلہ میں اول ہے جس کی جرثقیل کے متعلق بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس میں ایک محل محراب دار دکھایا گیا ہے جس میں بارہ برجوں کے نشان دئے گئے ہیں ان کے اندر ان کے علاوہ اور ہم مرکز دوائر ہیں جن میں آفتاب و قمر کے حلقے دئے گئے ہیں۔ اس کے نیچے دو قطاریں بارہ بارہ دروازوں کی ہیں اوپر کی قطار میں دروازے بند ہیں اور نیچے کی کھلی ہیں۔ ایک سوئی بائیں طرف سے دائیں طرف کو سفر کرتی ہے جو نیچے کے دروازوں سے لگا دی گئی ہے اس کے نیچے دائیں و بائیں دو عقاب کی تصاویر ہیں اور ان کے نیچے دو برتن ہیں جن پر نقارے ہیں۔ محراب میں پھر بارہ شیشوں کے دائرے دکھائے ہیں اور اس کے نیچے محراب میں دو شخص ڈھول پیٹ رہے ہیں اور دو نفیریاں بجا رہے ہیں اور درمیان میں ایک نقارچی نقارہ بجا رہا ہے اس گھڑی میں وقت اس طرح سے دیکھا جا سکتا ہے کہ جب ایک گھنٹہ گذر جاتا ہے تو سوئی بائیں طرف سے دائیں طرف کو سفر کرتی ہے تو ایک دروازہ سے گذر کر دوسرے میں کھڑی ہو جاتی ہے۔ تب پہلا دروازہ اوپر کی قطار میں کھلتا ہے اور کسی شخص کی تصویر نمودار ہوتی ہے تو نیچے کی قطار کے دروازے میں مختلف رنگ ظاہر ہو جاتا ہے تا کہ معلوم ہو جائے کہ بارہ میں سے ایک گھنٹہ گذر گیا ہے۔ دونوں عقاب ان نقاروں پر جھک کر ان کو پیٹتے ہیں تو ہر ایک گھنٹہ کے بعد اس طرح اس میں آواز پیدا ہوتی ہے۔ ہر ایک تین، چھ، نو، بارہ گھنٹوں کے بعد ڈھول پیٹنے والے اور نفیریاں بجانے والے اپنا عمل کرتے ہیں۔ اور نقارچی اپنا نقارہ بجاتا ہے۔ رات کے وقت محراب میں جو بارہ مختلف شیشے لگے ہوئے ہیں۔ اور اسے رنگ سے دیکھنے والے کو اپنی حرکت کا پتہ دیتے رہتے ہیں جب گھنٹہ شروع ہوتا ہے۔ تو روشنی مدھم ہو جاتی ہے۔ جب ختم ہو جاتا ہے تو شوخ ہو جاتی ہے، آفتاب و قمر کے دوائر روزانہ ان کی اصلی حالت کو ظاہر کرتے رہتے ہیں۔ اگر مصنف اپنی کتاب میں یہ نقشہ ضبط نہ کرتا تو اس کی تفہیم قارئین کے لئے ناممکن تھی۔ جس کی ضرورت کو محسوس کر کے اس نے نقشہ کشی سے کام لیا۔ جزری کی اس کتاب کے اوراق میں بعض ایسی اشیا بھی دکھائی گئی ہیں جن میں ایک ایسی مشین دکھائی ہے جس سے مائعات کا وزن نہایت خوبی سے ٹھیک ٹھیک ہو سکتا ہے۔

[1] تمدن عرب، جرجی زیدان تاریخ ادب عربیہ [2] فہرست کتبخانہ عـ ۳۶۰۶

حیوانات

کتاب الحیوان کے نام سے بہت سے عرب مصنفین نے تصنیفات کی ہیں جن میں سے جاحظ ' دمیری ' اور منافی کی کتب کا پتہ ملتا ہے اور ان میں منافی کی کتاب فارسی میں ہے ۔ جسے ابن بختیشو نے مصور کیا تھا ۔ برٹش موزیم میں ابتک موجود ہے ۔ جو اس بات پر بھی روشنی ڈالتی ہے کہ عربوں میں علوم کس پایہ تک پہنچ چکے تھے ۔ اور شاذ و نادر ہی کوئی ایسا علم رہ گیا تھا جس میں تصنیف نہیں ہوئی تھی ۔ اس میں بعض خاص خاص حیوان کی تصاویر بھی بنائی گئی تھیں ۔ ان میں ایک آبی بھینسہ بھی ہے ۔ کتاب کا خط نسخ ہے ۔ اور عنوان کوفی خط میں ہیں ۔ نیو یارک مورگن کے کتبخانہ میں ایک اور نسخہ متذکرہ بالا بھی ہے جو اسی منافی کی کتاب الحیوان کے اوراق پارینہ معلوم ہوتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ چھٹی صدی ہجری کا لکھا ہوا ہے ۔ جس سے اس قدر واضح تصاویر دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ وہ محض ظاہری انسانی یا دیگر نقوش کا خاکہ کھینچنے میں کامیاب ہی نہ تھے بلکہ حیوان وغیرہ کے نقوش ان کے عادات و خاصیات کے مطابق تیار کرتے تھے ۔

ادب و قصص

خلفائے بنی عباس کا زمانہ جس کو خاص کر احیاء علوم و فنون کا زمانہ کہنا بجا ہوگا ۔ جہاں قریباً تمام فنون کو فروغ ہوا اور تمام دیگر ممالک پر بھی فنون اسلامی کا یہیں سے اثر ہوا ۔ حدوث زمانہ کی وجہ سے یہ چیز اب بالکل کالعدم ہو چکی ہے ۔ خلیفہ ہارون الرشید کا زمانہ الف لیلہ کے پڑھنے والوں میں ہمیشہ کے لئے اپنی یاد تازہ رکھے گا جو زیادہ تر آپ کے عہد کے واقعات پر مشتمل ہے اور جس کے بہت سے نسخے بھی تیار کئے گئے ۔ میونک جرمنی کی نمائش سنہ ۱۹۱۴ء میں چند اوراق الف لیلہ آئے جن میں سے ایک پر اس مشین کا نقشہ تھا جسے ہارون الرشید نے چارلس ہیم کو تحفہ دیا تھا ۔ اس بادشاہ چارلس نے عربوں سے سپین میں جنگ کی تھی اور بعض اوراق میں مصر کے بازاروں کے مناظر تھے اور بعض ماہرین موسیقی کی تصاویر بھی تھیں جو اپنے اپنے ساز پر طبع آزمائی کرتے ہوئے دکھائے گئے تھے ۔ دیواروں پر شاہی اسلحہ سنہری عقاب سرخ سطح پر اور ایک سنہری پیالہ نیلی سطح پر دکھائے گئے تھے ۔ بعض محققین کی رائے ہے کہ یہ اوراق ساتویں صدی ہجری کے تیار شدہ تھے ۔ لیکن یہ اس سے بھی قدیم معلوم ہوتے ہیں[۵] ۔

کلیلہ دمنہ کا ماخذ پنچو پدیش بتائی جاتی ہے اور اس کا ترجمہ عبداللہ بن مقفع نے مامون کے حکم سے کیا تھا جس کے بے شمار نسخے ملتے ہیں ۔ اس کا ایک مصور نسخہ پیرس میں قدیم ایرانی تصاویر کی نمائش منعقدہ سنہ ۱۹۱۴ء میں آیا جو سنہ ۶۳۳ھ کا لکھا ہوا تھا ۔ جس میں تصاویر بھی تھیں ایک اور نامکمل نسخہ کے بھی چند اوراق تھے جو بہت ہی اعلیٰ تصاویر رکھتا تھا ۔ پیرس کے کتبخانہ ملی کا نسخہ سنہ ۶۰۶ھ کا لکھا ہوا ہے اور یہ خاص کر غزنوی کے کتبخانہ قدیم سے تعلق رکھتا ہے جو دراصل فرانس کے موسیو ڈائسن پیرن کا ہے اس میں جانوروں کی بھی تصاویر ہیں جو اور کتب کی تصاویر سے بالکل مختلف ہیں ۔ غرضیکہ ان کا طریقہ ہی الگ ہے اور دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی چینی مصور نے ان کو سلطان غزنوی کے لئے تیار کیا تھا ۔

مجھے باڈلیس لائبریری آکسفورڈ میں دو بہت اہم قدیم مصور نسخے دیکھنے کا اتفاق ہوا ۔ ایک تو کتاب الجامع بین العلم والعمل النافع فی صناعۃ الحیل علامہ بدیع الزمان ابی العز اسمٰعیل کا سنہ ۵۶۶ھ کا لکھا ہوا ہے ۔ اس میں عمارات و دیگر شہری تصاویر ہیں جن سے پورا تفہیم مطالب کا کام لیا ہے ۔ دوسرا نسخہ کلیلہ دمنہ کا ہے جو سنہ ۵۵۷ھ کا لکھا ہوا محمد بن احمد صفی بن قاسم بن عبدالرحمٰن کا لکھا ہوا اور مصور شدہ ہے اس میں بہت سی تصاویر ہیں ۔

محققین کی رائے ہے کہ سب سے قدیم ادبی کتاب کا مصو

۵ ۔ برلنگٹن میگزین اکتوبر سنہ ۱۹۱۴ء

نسخہ قسطنطنیہ کے کتبخانہ میں ہے جس میں سلطان نورالدین محمدؒ متوفی ۱۱۵۵ھ کا نام لکھا ہے۔ ایک اور ورق پر صلاح الدین کا نام لکھا ہوا ہے۔ چونکہ یہ ایسا زمانہ تھا جبکہ مدارس اسلامیہ میں باقاعدہ عربی تعلیم دی جاتی تھی اور ادب میں مقاماتِ حریری مقامات بدیع الزمان ہمدانی کی جگہ لے چکی تھی، جو تمام مدارس میں پڑھائی جاتی تھی اور یہ کتاب اپنی طرزِ بیان میں کسی قدر سریع الفہم تھی کیونکہ واقعات مندرجہ فوراً آنکھوں کے سامنے عملی صورت میں آجاتے تھے اور اس امر کے مقتضی تھے کہ ان کو ضرور مصور کیا جائے۔ چنانچہ بے شمار نسخے مصور کئے گئے۔ اس کے اہم نسخے اس وقت بھی فرانس وانگلستان لنڈن میں ہیں۔ پیرس کے کتبخانہ ملی کے نسخہ میں ایک سو تصاویر ہیں جن کا مصور یحییٰ بن محمود بن یحییٰ بن ابی الحسن بن الواسطی ہے جس نے اس کو ماہ رمضان ۶۳۴ھ میں مصور کیا ہے۔ میں نے اسے اصل دیکھا ہے۔ برٹش موزیم لنڈن کا نسخہ ۷۲۳ھ کا لکھا ہوا ہے اور ابوالفضل بن ابی اسحٰق مصور نے اس کی تصاویر بنائی ہیں[1]۔ یہ تینوں نسخے قدیم ترین تصویر شدہ اسلامی مصوری میں شمار ہوتے ہیں۔ خالصاً عراقی کام ہے ان پر کسی قسم کا ایرانی یا چینی اثر نہیں ہے۔ ان سے مصور کتب کے مدارس میں استعمال اور ان کے طریقہ تعلیم پر روشنی پڑتی ہے۔ بعض ایسے ہی نسخے ابھی تک ملان، وینس، فلورنس، روم وغیرہ کے عجائب خانوں میں مسلمانوں کے موجود ہیں۔ جو ابھی تک عوام کے دیکھنے میں نہیں آئے۔ ایک نسخہ مجمع التواریخ رشیدالدین ایڈنبرا یونیورسٹی کے کتبخانہ میں ہے اور یہ ۷۰۶ھ کا لکھا ہوا ہے۔

موسیقی

اس میں کافی تصاویر ہیں۔ خصوصیت سے اس میں محمود غزنوی اور علاؤالدین خلجی کے حملوں کو مصور کیا گیا اور محمود غزنوی کی فوج کو لڑتے دکھایا ہے۔ ان سے خصوصیت سے اس وقت کے تمدن پر بہت روشنی پڑتی ہے۔ چنانچہ جھنڈوں منجنیق، تیر و کمان اور دیگر سامانِ حرب اچھی طرح دکھائے ہیں۔ ایک اور ایسا ہی ترجمہ اسی زمانہ کا نسخہ مجمع التواریخ لنڈن میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں ہے۔ یہ دونوں نسخے دراصل ایک ہی نسخے کے حصص ہیں۔

لنڈن میں مجھے میرے کرم دوست مسٹر سید حسینی فلسطینی نے بتایا کہ کتبخانہ خدیویہ مصر[2] میں ایک قدیم نسخہ کتاب الاغانی ابوالفرج اصفہانی متوفی ۳۵۶ھ کا ہے جس میں بیشمار تصاویر ہیں اور قدیم لکھا ہوا ہے۔ اس کے متعلق مفصل معلومات سر آرنلڈ نے حاصل کی تھیں۔ یہ دنیا کا اول ترین علمی کارنامہ عربی علم موسیقی و شاعری کا ہے جو بنو عباس کے عہد میں تمام مخارج اصول علم موسیقی، آلات موسیقی پر اس زمانہ کے مشاہیر عربی شعرا اور ان کے پڑھنے والوں کے متعلق مفصل بیس ضخیم جلدوں پر تنقید و تبصرہ ہے یعنی دراصل بقول حضرت عمرؓ الشعر من دیوان العرب عربوں کی ثقافت کے حصہ اکثر کا آئینہ ہے۔

ان تمام مصور نسخوں کے ذکر کرنے کے بعد یہ امر قابل وضاحت معلوم ہوتا ہے کہ ساتویں صدی تک لوگ اپنے اپنے ماحول میں اپنی قدیم روایات پر کام کرنے لگے تھے۔ جو نسخے عراق میں تیار ہوئے ان میں وہی ماحول ہے جو وسط ایشیا میں چینی اثر سے اثر پذیر ہوا تھا۔

شبیہ کشی

شبیہ کشی کے ضمن میں اوپر بیشمار مثالیں گذر چکی ہیں کہ ابتدا ہی میں سکوں، تمغوں، محلات کی دیواروں پر بعض خلفاء و سلاطین کی شبیہات بنائی گئیں مگر یہ وہ زمانہ تھا جبکہ شبیہ کشی بت پرستی کی قیود سے آزاد ہو چکی تھی اور اس سے دیگر اغراض وابستہ تھیں۔ بعض اوقات سکہ جاری کر کے خلیفہ یا سلطان کی حیات کا ثبوت اور سلطنت کے طول و عرض میں تشبیہہ صورت خلیفہ یا سلطان ہوتی تھی یا اس سکہ کو موثق بنانے کا ذریعہ ذہن میں ہوتا تھا۔ اکثر خلفاء و سلاطین نے اعلےٰ کارناموں کے صلے میں تمغوں کو رواج دیا جن پر خود کی تصاویر ہوتی تھیں۔ تاریخ کی ورق گردانی عجیب و غریب واقعات شبیہ کشی سے متعلق پیش کرے گی۔ مسعودی کا بیان ہے کہ اس نے اصطخر میں ۳۰۳ھ میں ایک مخطوطہ دیکھا جس میں ستائیس ساسانی بادشاہوں کی تصاویر

[1] کتبخانہ ملی پیرس عربی حصہ ع ۳۹۲۹ [2] جسے آجکل دارالکتب مصریہ کہتے ہیں۔

تھیں جو کاغذ یا کپڑے پر تھیں اس کا ذکر حمزہ اصفہانی متوفی قریب ۳۶۰ھ نے اپنی کتاب سنین ملوک الارض میں ساسانی بادشاہوں کے تحت میں بیان کیا ہے اور اس کی مفصل کیفیت بھی دی ہے۔ لیکن اس شبیہ کشی کے ذریعہ بعض اوقات تاریخ اسلامی میں محکمہ جاسوسی میں بھی کام لیا گیا ہے۔ چنانچہ محمود غزنوی (۳۸۸ھ-۴۲۱ھ) کے زمانہ میں معلوم ہوتا ہے کہ مصوری بالخصوص شبیہ کشی اعلےٰ معیار پر تھی۔ مشہور فلسفی اور حکیم بو علی سینا محمود غزنوی کی ملازمت کو منظور نہیں کرتا تھا بلکہ گورگان بھاگ گیا تھا۔ سلطان نے اس کے مکان و محل کا پتہ لگانے کی غرض سے مصور ابو نصر ابن عراق ریاضی دان اور منجم کو ابن سینا کی شبیہ بنانے کی غرض سے مقرر کیا۔ کہ اس کی تصاویر کو کاغذ پر بنا کر گرد و نواح میں منتشر کیا جائے جو اس کو اس کے مطابق دیکھ پائے مطلع کرے

اسی طرح سے بیشمار مثالیں تلاش سے مل سکتی ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر مارٹن نے اپنی کتاب میں صلاح الدین ایوبی کی ایک تصویر دی ہے جو غالباً معاصرانہ حیثیت رکھتی ہے۔ مصور نے سلطان کو سنہری تخت پر دکھایا ہے لباس سرخ سر پر عمامہ سیاہی مائل ہے۔ چار زانو ہو کر بیٹھا ہے۔ آستینوں پر حاشیہ ہے جسے طراز کہا جاتا ہے۔ سلطان کے سر کے گرد ایک سنہری ہالہ بھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسم متقدمین سے چلی آتی ہے کہ بادشاہوں کو یہ خصوصیت دی جاتی تھی دوسرے الفاظ میں "السلطان ظل اللہ" کا خطوط میں اظہار ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کی تجلیات و انوار نازل ہوتی تھیں۔ اگرچہ قدیم تصاویر حضرت مسیح میں بھی یہ ہالہ ملتا ہے مگر یہ تصویر اپنی نوعیت میں اول ہے جس میں کسی مسلمان مصور نے یہ ہالہ دکھایا ہے۔ حالانکہ چینی مصورین یا قدیم ایرانی مصورین سے نہ جانے ہالہ کے شعلہ نما بادل کے ٹکڑے سے دکھائے ہیں اور بعد میں سب نے اس ہالہ کی تقلید کی ہے۔ اس سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ واقعی صلاح الدین کی اصل تصویر ہے۔ مسٹر مارٹن نے اس تصویر کے ساتھ مراقش کے ایک حال ہی کے بزرگ ملا حفیظ کی تصویر بھی محض مقابلہ کی غرض سے دی ہے جس سے یہ ثابت کیا ہے کہ باوجود ان دونوں تصاویر میں آٹھ سو سال کا فاصلہ ہونے کے بھی اور مراقش و عرب کے ابین بحیرہ روم حائل ہونے کے بھی اپنے ظاہری لباس و اطوار میں ایسی معلوم ہوتی ہیں کہ دونوں کو مصور نے ایک ہی وقت میں بنایا ہے لیکن میرے نقطہ نگاہ سے یہ ہے کہ ابھی تک ہماری بود و باش انہیں روایات پر قائم ہے سلطان صلاح الدین ایوبی کی اور تصاویر بھی ملتی ہیں لیکن وہ اصلی نہیں ہیں۔ اس تصویر سے سلاطین کا سریر سلطنت پر بیٹھنے کا طریق بھی معلوم ہوتا ہے۔ بعض دفعہ بعض ساسانی سلاطین بھی بعض نقوش میں اسی طرح نظر آتے ہیں مگر یہ امر مسلمہ ہے کہ عربی صناعوں پر ایرانی اور بازنطینی اثر ہوا۔ اور عربوں نے جو کچھ پیدا کیا وہ خالصاً جدت لئے ہوئے ان سے متاثر شدہ تھا۔

ان کی قوت مدرکہ کو بالکل مفقود ہی نہیں سمجھنا چاہیئے۔ جتنے وہ جنگجو تھے اتنے ہی فنون میں بھی ماہر تھے۔ جیسا کہ انہوں نے اپنی بہادری سے دنیا پر تسلط حاصل کیا تھا۔ اسی طرح انھوں نے فنون میں بھی سبقت پائی تھی۔ اس کے لئے کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوئی کہ شواہد تلاش کئے جائیں اسے محض نقادان فن ہی اندازہ کر سکتے ہیں۔ خاصکر صلاح الدین کی اس تصویر میں کس قدر اعلےٰ معیار شبیہ نگاری ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ مشرقی مصور آج کل کے یورپین مصورین کی طرح نہیں کرتے تھے کہ گھنٹوں روزانہ اپنے پیش نظر ایک شخص کو بٹھا کر تصویر بنائی جائے وہ اپنی یادداشت کی بنا پر اس کا خاکہ خطوں میں اتارتے تھے۔ جن میں وہ جذبات و کیفیات و عادات مصور شدہ شخص کے پنہاں کر دیتے تھے کیونکہ وہ اسے اسی نگاہ سے خط لگاتے وقت دیکھتے تھے جس طرح وہ ان سے اپنی روزانہ زندگی میں پیش آتا تھا۔ اور یہی بڑی خصوصیت مشرقی فن کی ہے جسے آج تک یورپ پیدا نہیں کر سکا۔ اگر کسی سلطان کی تصویر بنائی جائے تو اسے

یہی کرنا چاہئے کہ اس کے خد وخال کو قلمبند کرکے اس کے اصلی جذبات وحسیات کو ظاہر کیا جائے جو اس پر ہر وقت اپنا اثر رکھتے ہیں۔ اور اس کے چہرے سے مترشح ہوتے ہیں جس سے اس کی اصلی حقیقت کا پتہ چل سکے اور یہی ایک مصوری کا مقصد وحید ہے جس سے بعض ماہرین تصاویر یا علم النفس شبیہ کو دیکھ کر لوگوں کی عادات و مزاج کا پتہ لگا لیتے ہیں جو اکثر اوقات ٹھیک ہوتا ہے اس لئے مصور نہایت ہی کامیاب ہے۔ کہ اس نے سلطان صلاح الدین ایوبی کی تصویر کو ایسی حالت میں بنایا ہے اور یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ مشرقی تصاویر بہ نسبت مغربی تصاویر کے زیادہ جامع اور مانع ہوتی ہیں۔ تاہم یہ تصویر اپنے آپ میں ایک وسیع تخیل رکھتی ہے حالانکہ مصور نے چند لمحات میں نہایت استغراق کی حالت میں بنائی ہے۔

لیکن مسلمان قریب زوال دولت عباسیہ اپنے ہاں خاص اسلامی طرز فنون پیدا کر چکے تھے جن کو اسلامی کہا جا سکتا ہے۔ اور ان میں کسی قسم کا بازنطینی یا چینی اثر وغیرہ نہیں رہا۔ یہ بات نہایت وضاحت سے ۱۹۳۱ء کی نمائش فنون ایران لنڈن نے قائم کر دی ہے۔ بلکہ بہت سے متذکرہ بالا ایشیائی فنون کے دیکھنے سے بھی یہ بات واضح نظر آتی ہے۔ بلاذری نے بیان کیا ہے کہ محمد بن قاسم کے سپاہیوں میں سے بنی کلاب کے کسی فرد نے داہر راجہ ملتان کو قتل کیا تو ان دونوں کو برہمن میں اسی حالت میں مصور کیا گیا اور بدیل بن طہفہ کو قند بیل میں مصور کیا۔ جب محمد بن قاسم کا انتقال ہوا تو اہل ہند روئے اور کیرج میں آپ کا مجسمہ[1] بنایا۔

محمد عبداللہ چغتائی

---

[1] ۔ فتوح البلدان مصری ص۴۴۴ — ۱۹۶۱ء

مجید ملک

گورکھ دھندا

(ایک ایکٹ کا ڈراما)

افراد

مسز خان - ایک خوبصورت عورت جو اس نام سے مشہور ہے۔
مسٹر حیدر - ایک نوجوان آدمی جس سے مسز خان محبت کرتی ہے۔
مسٹر صغیر ہاشمی - مسز حیدر کی بیوی کا بڑا بھائی
مسٹر احمد - مسز خان کا ایک ملاقاتی
ملازم -

منظر ــــــ ڈرائنگ روم - مغربی انداز میں مزین - فرنیچر میں "کیوبزم" کی جھلک ہے۔ دروازوں کے سامنے دبیز پردے بل کھا کھا کے لٹک رہے ہیں۔ دیواروں پر میزانی کی "نہانے والے" - پکاسو کی "بے جان زندگی" اور لیونارڈو ڈونچی کی "مونا لیزا" مسند لباں - گلدان جن میں پینیزی - وربینا اور مارشل نیل کے پھول ہیں - سگار بکس - ہاتھی دانت اور پتھر کے مجسمے اور صراحیاں فوٹو البم - پیانو - سگرٹ کے ڈبے - راکھ گرانے کی طشتریاں - لیکن اس مغربی وضع کے کمرے میں مشرقی طرز زندگی کی ضروریات بھی موجود ہیں مثلاً ایک طرف ایک تخت رکھا ہے جس پر اطلس کی مسند اور اطلس کا گاؤ تکیہ ہے اور جابجا چاندی کے اگالدان رکھے ہیں -

شمالی دروازے کا دبیز اور بل کھایا ہوا پردہ ہلتا ہے اور ایک لمحے کے بعد ایک عورت داخل ہوتی ہے - چھریرا بدن - سفید رنگت ـــــ لیکن رنگت کی سفیدی میں اضافہ کرنے کے لئے پوڈر استعمال کیا گیا ہے ـــــ کشیدہ قد اور عمر کوئی ستائیس اٹھائیس سال - کچھ گا رہی ہے - لیکن الفاظ سمجھ میں نہیں آتے - آتش دان پر جو چیزیں رکھی ہیں ان کی ترتیب بدلتی ہے - پھر گلدانوں کے پھولوں سے چھیڑ چھاڑ کرتی ہے -

نوکر (خدمتگاروں کی سی سفید وردی میں) داخل ہوتا ہے اور طشتری میں ایک ملاقاتی کا کارڈ پیش کرتا ہے - مسز خان (ایک خوبصورت کشیدہ قامت عورت اسی نام سے پکاری جاتی ہے) - کارڈ کو دیکھ کر طشتری میں پھینک دیتی ہے -

مسز خان ——— احمد صاحب سے کہ دو کہ میں اس وقت مشغول ہوں۔ پھر کسی وقت تشریف لائیں۔

ذکر چلا جاتا ہے۔ مسز خان پھر پھولوں کو آراستہ کرنے میں مشغول ہو جاتی ہے۔ لیکن خدا جانے کیوں اب اس کی طبیعت اداس سی ہو گئی ہے۔ دھیمی آواز میں کچھ گا رہی ہے۔ [illegible] دردناک سی طرز ہے۔ غالباً بہاگ میں ہے۔ جس گلدان میں پھول سجا رہی ہے۔ اس کے پاس ہی پیانو رکھا ہے۔ جیسے کھول کے بجانا شروع کر دیتی ہے۔ پہلے تو یونہی آہستہ آہستہ لیکن تھوڑی دیر کے بعد بلند آواز میں گانا شروع کر دیتی ہے۔

[illegible] خدا کی بارگہ میں التجا کرتا تھا رو رو کر
[illegible] مجھے حوروں کی عفت [illegible] ستاروں کی بلندی دے
[illegible] تو معصومیت [illegible] کی بھیں فضاؤں میں
[illegible] اس قدر مجھ کو
[illegible] خوشنما [illegible] چاندی [illegible]
[illegible] ملیح [illegible] دور اندیشی - ریا کاری
[illegible] غرض [illegible] عیش کی باتیں
[illegible] نے [illegible] کر دیا ہے [illegible] مجھ کو

[illegible] اور طشتری میں ایک کارڈ پیش کرتا ہے۔

[illegible] مسٹر صغیر ہاشمی! ... ! ایسے آیئے! کہو تشریف لے آئیں۔

[illegible] پھولوں کو آراستہ کرنے لگتی ہے۔ مناسب وقفے کے بعد ایک آدمی کمرے میں داخل ہوتا ہے

[illegible] مناسب میں۔

صغیر ہاشمی ——— [illegible] مجھے [illegible] واقف نہیں ہیں ———

مسز خان ——— [illegible] اچھی طرح جانتی ہوں۔ بہت اچھی طرح۔ آپ کو کون نہیں جانتا۔ جاگیردار سپیشل مجسٹریٹ

صغیر ہاشمی ——— [illegible] ———

صغیر ہاشمی ——— [illegible] شاید آپ کو یہ علم نہیں کہ ———

مسز خان ——— [illegible] مجھے معلوم ہے کہ آپ مسز حیدر کے بھائی ہیں۔

صغیر ہاشمی ——— [illegible] مسز حیدر کا بھائی ہوں۔ غمزدہ - آفت رسیدہ [illegible]

مسز خان ——— کیوں کیوں خیریت تو ہے۔

صغیر ہاشمی ——— میں اسی کے متعلق آپ سے گفتگو کرنے کے لئے حاضر ہوا ہوں میری سمجھ میں نہیں آتا میں بات کس طرح شروع کروں - میرا کام بہت مشکل ہے۔ آپ میری مدد کیجئے۔

مسز خان ——— کہیئے۔ کہیے۔ میں غور سے سن رہی ہوں۔

صغیر ہاشمی ۔ آپ وعدہ کیجیے کہ آپ مجھے معاف کر دینگی ۔ ممکن ہے مجھے چند ایسی باتیں کہنی پڑیں جن سے آپ کو تکلیف ہو ۔ چبھنے والی ۔ دل دکھانے والی باتیں ۔ لیکن خدا کے لئے آپ مجھے معاف کر دیجیے گا ۔ میں سچ کہتا ہوں میرا مقصد یہ نہیں کہ آپ کو اذیت پہنچے لیکن جس موضوع پر میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں ۔ اس کی نوعیت ہی کچھ ایسی ہے ۔ میں ادب کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہتا لیکن میں مجبور ہوں ۔ میں قطعاً مجبور ہوں ۔

مسز خان —— (چہرے پر گھبراہٹ کے آثار ہیں لیکن مسکرانے کی کوشش کر رہی ہے) آپ مطمئن رہیں میں آپ کی بے ادبیوں کو آپ کی کم عمری پر محمول کر دونگی

صغیر ہاشمی —— مسز خان آپ اس قسم کی فقرہ بازی سے موضوع گفتگو کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش نہ کیجیے ۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنی تعلیم کو ۔ روشن خیالی کو اور ان تکلفات کو جو عمل فرداں کا لازمی نتیجہ ہوتے ہیں ۔ تا اختتام گفتگو علیحدہ رکھ دیں ۔ بھول جائیں ۔ میرا یہاں آنا بجائے خود اس بات کا ثبوت ہے کہ میں نے تکلفات کا لباس اتار دیا ہے ۔ جس طرح سانپ اپنی کینچلی اتار دیتا ہے ۔ میری کینچلی باہر سڑک پر ہے ۔ میں اس کمرے سے نکلوں گا تو پھر اسے پہن لونگا ۔ یہاں اس کمرے میں نہیں ۔ اگر آپ نے تکلفات کی کینچلی نہ اتاری تو میری اور آپ کی گفتگو ایک قدم بھی نہیں چل سکتی ۔

مسز خان —— فرمائیے ۔ میں سب کچھ سننے کے لئے تیار ہوں ۔ میں نے (ایک کھوکھلی ہنسی کے ساتھ) اپنی کینچلی اتار دی ہے

صغیر ہاشمی —— مسز خان ۔ میں آپ سے رحم مانگنے کے لئے آیا ہوں ۔ آپ میری بہن پر رحم کیجیے ۔ میری ننھی سی بہن پر جو راتوں کو سو نہیں سکتی ۔ جو دن رو رو کے گزارتی ہے ۔ جس کی زندگی سے آرام اور اطمینان مفقود ہو گیا ہے ۔ جس کے دماغ پر حزن و یاس مسلط ہو گئے ہیں ۔ جو گویا زندہ درگور ہے ۔ آپ اس پر رحم کیجیے ۔

مسز خان —— کس طرح ؟

صغیر ہاشمی —— آپ جانتی ہیں کس طرح ۔

مسز خان —— مسٹر ہاشمی ۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے کینچلی نہیں اتاری

صغیر ہاشمی —— کیوں ؟

مسز خان —— اگر واقعی آپ کینچلی اتار چکے ہیں تو صاف صاف الفاظ میں کہئے نا کہ آپ کیا چاہتے ہیں ۔

صغیر ہاشمی —— بہت اچھا ۔ مسز خان میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ مسٹر حیدر سے اپنے تعلقات منقطع کر لیں ۔ اور میری بہن کو اس کا جائز حق دے دیں ۔

مسز خان —— بس آپ کہہ چکے ؟

صغیر ہاشمی —— جی ہاں ۔

مسز خان —— آپ کچھ اور تو نہیں کہنا چاہتے ؟

صغیر ہاشمی —— نہیں ۔

مسز خان —— تو میرا جواب سن لیجے ۔ میں مسٹر حیدر سے "تعلقات منقطع کرنے" سے انکار کرتی ہوں ۔

صغیر ہاشمی ——— یہ نہ کہئے مسز خان۔ کیا آپ کے دل میں ایک دکھیا۔ ستم زدہ ننھی سی بچی کے لئے کوئی رحم نہیں۔ ثریا جس نے اتنی عمر میں کوئی غم۔ کوئی رنج۔ کوئی کلفت نہ دیکھی تھی۔ جو مصائب و آلام کی زندگی سے قطعی ناواقف تھی۔ آج وہ تڑپ رہی ہے۔ اس کی رنگت زرد ہے۔ مضمحل ہوئی جاتی ہے۔ اور مجھے خوف ہے کہ مر نہ جائے۔ آپ اس پر رحم کیجئے۔

مسز خان ——— مسٹر ہاشمی میرے لئے کس قدر آسان تھا کہ میں مسٹر حیدر کے اور اپنے تعلقات سے منکر ہو جاؤں۔ لیکن میں نے انکار نہیں کیا۔ مجھے انکار کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آئی۔ آپ کی بہن سے مجھے ہمدردی ضرور ہے۔ لیکن مجھے اپنی ذات کے ساتھ نسبتاً زیادہ ہمدردی ہے۔ یہ تھوڑی سی خود غرضی تو آپ کے نزدیک بھی جائز ہوگی۔ آخر میں آپ کی بہن کی خاطر قربانی کیوں کروں۔ اپنے آپ کو تکلیف میں کیوں ڈالوں۔ اور سنیئے۔ آپ اپنی بہن کی صحت کے متعلق متفکر نہ ہوں۔ آپ مرد لوگ ہم لوگوں کی سخت جانی کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔

صغیر ہاشمی ——— آپ اس کی تکلیف کا اندازہ نہیں لگا سکتیں۔

مسز خان ——— آپ کی برادرانہ محبت قابل ستائش ہے۔ لیکن یاد رکھئے۔ میرا بھی ایک بھائی ہے۔ مجھ سے بہت دور ہے۔ میرے اور اس کے درمیان ایک دنیا حائل ہے۔ لیکن اگر مجھے کوئی تکلیف پہنچے تو اسے اسی قدر تکلیف ہوتی ہے جتنی آپ کو اب ہو رہی ہے۔ اگر میرا بھائی آپ کی بہن کے پاس جا کر وہی کچھ کہے جو آپ نے مجھ سے کہا ہے۔ تو؟ اگر وہ کہے کہ میری بہن کی آسائش اور اس کے آرام کے لئے یہ ضروری ہے کہ آپ کی بہن اپنے شوہر سے علیحدہ ہو جائیں تو؟ مجھے ان دونوں باتوں میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ مسز حیدر پر آپ لوگوں نے دنیا کی محبت نچھاور کی ہے۔ مجھ پر بھی باپ اور ماں اور بھائی نے محبت نچھاور کی تھی۔ میں بھی نازونعم میں پلی تھی۔ میں بھی جذبات رکھتی ہوں۔ مجھے بھی کسی کی یاد ستا سکتی ہے۔ مجھے بھی جدائی سے تکلیف ہوتی ہے۔ میرے سینے میں بھی دل ہے۔ غم کھانے والا۔ رشک کرنے والا۔ رنج و اندوہ سے زخمی ہو جانے والا دل۔

صغیر ہاشمی ——— دیکھئے آپ نے کینچلی پھر پہن لی۔ یا شاید آپ اپنے آپ کو دھوکا دے رہی ہیں۔ میرا مقصد اذیت پہنچانا نہیں۔ لیکن واقعات کیا ہیں۔ میری بہن مسٹر حیدر کی منکوحہ بیوی ہے۔ اور اپنے دل کی ان اتھاہ گہرائیوں سے اپنے شوہر کے ساتھ محبت کرتی ہے جن سے فقط ایک نیک بی بی ہی کر سکتی ہے۔ میری بہن کی امیدوں کا مرکز۔ اس کے تخیلات کا منتہیٰ۔ اس کے جذبات کا ملجا و ماویٰ اس کا شوہر ہے۔ آپ کو بھی مسٹر حیدر کے ساتھ ایک خاص قسم کی۔ ایک خاص حد تک محبت ہوگی۔ لیکن گستاخی معاف۔ خدا شاہد ہے میرا مقصد اذیت پہنچانا نہیں۔ آخر آپ کے تعلقات کی بنیاد تجارتی قسم کی ہے۔

مسز خان کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آخری جملے سے اسے سخت تکلیف پہنچی ہے۔ لیکن وہ ضبط کئے ہوئے ہے۔

مسز خان ——— کیا مطلب؟

صغیر ہاشمی ——— میرا مطلب یہ ہے کہ آخر ——— میری جسارت کو ضرور معاف کر دیجئے ——— آپ اپنی محبت کو بیچتی ہیں۔ اس کی قیمت وصول کرتی ہیں۔ مسٹر حیدر بھی ان دو یا تین یا چار یا پانچ آدمیوں میں سے ہیں جو ——— (معاً ڈرامیٹک طریقے سے)

اور میں اسی وقت دس ہزار روپے اس بات کے معاوضے میں دینے کے لئے تیار ہوں کہ آپ مسٹر حیدر کو چھوڑ دیں۔

مسز خان کا رنگ سرخ اور نیلا اور آخر زرد ہوگیا ہے۔ لیکن پھر اس نے اپنے آپ پر قابو پالیا ہے۔

مسز خان —— یہ بات قطعی طور پر غلط ہے۔ میرے اور مسٹر حیدر کے تعلقات میں کسی قسم کا تجارتی پن نہیں۔ میں نے اپنی محبت کو کم از کم مسٹر حیدر کے پاس کبھی نہیں بیچا۔ یہ گناہ فقط آپ کی بہن کرتی ہیں۔

صغیر ہاشمی —— کیا مطلب؟

مسز خان —— آپ کی بہن مسز حیدر کی منکوحہ بیوی ہیں۔ منکوحہ بیوی کسے کہتے ہیں؟ جو چند آدمیوں کے سامنے اپنی محبت اور اپنے جسم کو چند سو یا چند ہزار روپے کے عوض میں بیچ دے۔ آپ کی بہن کی پوزیشن یہی ہے۔ وہ اپنے شوہر کے پاس چند ہزار روپے میں اور چند ہزار روپے کے زیور کپڑے میں بک چکی ہیں۔ آپ لوگوں نے انہیں بیچا۔ انہوں نے بکنا قبول کیا۔ ان کا مہر کیا تھا۔ پچیس ہزار؟ تیس ہزار؟ تو آپ ہی بتلایئے کیا آپ کی بہن نے تیس ہزار روپے کے عوض اپنی محبت اور اپنے جسم کو مسٹر حیدر کے پاس نہیں بیچا۔ تجارتی پن آپ کی بہن اور مسٹر حیدر کے تعلقات میں ہے۔ میرے اور مسٹر حیدر کے تعلقات میں نہیں۔ میں مسٹر حیدر سے محبت کرتی ہوں۔ میں ان کے پاس نہیں رہتی۔ وہ میرے اخراجات کے کفیل نہیں۔ مجھے کوئی ماہانہ رقم ان سے نہیں ملتی۔ میرے کپڑوں کے بل وہ ادا نہیں کرتے۔ میرے نوکروں کو وہ تنخواہیں نہیں دیتے۔ میں خود اپنی مالک ہوں۔ میں اپنی محبت بیچتی نہیں۔ مفت ان کے قدموں میں پھینکتی ہوں۔ اندریں حالات تجارتی پن کن کے تعلقات میں ہے۔ میرے تعلقات میں یا آپ کی بہن کے تعلقات میں؟ کیا آپ کی بہن نے مسٹر حیدر کو دیکھ کر۔ ان کے لئے اپنے دل میں محبت محسوس کر کے۔ ان سے شادی کی تھی۔ یا بغیر دیکھے؟ محض اس لئے کہ بزرگوں کا فیصلہ یہی تھا اور بزرگ؟ ظاہر ہے کہ بزرگوں کا فیصلہ محض۔ اسی بات پر مبنی تھا کہ ان کے نزدیک مسٹر حیدر مس ہاشمی کی اچھی قیمت ڈال سکتے تھے۔ میرے دل میں مسٹر حیدر کی محبت ہے۔ میں نے انہیں دیکھ کے۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ کے۔ اچھی طرح دیکھ کے۔ ان سے محبت کی ہے۔ میرے تعلقات تجارتی نہیں۔ تجارتی تعلقات آپ کی بہن کے ہیں ——

صغیر ہاشمی —— میں اس قسم کی گفتگو نہیں سن سکتا۔

مسز خان —— آپ کو سننی ہوگی۔ میں آپ کو سناؤنگی۔ آپ کو یہ حق کہاں سے حاصل ہوگیا۔ کہ جو کچھ آپ کے جی میں آئے آپ کہ دیں لیکن جو کچھ آپ کو سننا چاہیئے وہ نہ سنیں۔ آپ کی بہن کی قیمت ہے۔ اس کی قیمت تیس ہزار روپے ہے۔ اور میں اسی وقت تیس ہزار روپے دینے کے لئے تیار ہوں۔ (ایک میز کے پاس جا کر دراز میں سے چک بک نکالتی ہے) آپ مسز حیدر سے کہئے کہ وہ مسٹر حیدر کو رہا کر دیں۔ مہر لے لیں۔ اپنی قیمت وصول کرلیں۔

صغیر ہاشمی —— خاموش گستاخ عورت۔

معلوم ہوتا ہے کہ صغیر ہاشمی یکدم آپے سے باہر ہوگیا ہے۔ وہ لپک کر مسز خان کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں پستول ہے۔ مسز خان ابھی تک میز کے پاس کھڑی ہے۔ اس کے چہرے پر تعجب اور سراسیمگی اور خوف ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اس حرکت کے لئے تیار نہ تھی۔

صغیر ہاشمی —— میں جان دینے سے نہیں ڈرتا اور جو جان دینے سے نہیں ڈرتا وہ جان لینے سے کیونکر ڈر سکتا ہے۔ میں اپنی ننھی بہن کی خاطر تمہاری جان لے کر اپنی جان قربان کر دونگا۔ میں نے تمہیں ہر طرح سمجھایا ہے۔ تمہارے جذبۂ شرافت کو اکسانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ چیز تمہارے پاس کہاں۔ میں نے تمہیں وہ شے بھی دینے پر آمادگی ظاہر کی ہے جس کو تم اور تمہاری قماش کے لوگ سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ لیکن میرے پاس اپنی خواہش پورا کرنے کا ایک ایسا طریقہ بھی ہے جو مجھے تم سے بے نیاز کرتا ہے۔ یاد رکھو اگر تم نے مسٹر حیدر کا پیچھا نہ چھوڑا تو ——

مسز خان —— تو ——

صغیر ہاشمی —— تو میں ابھی تمہیں ڈھیر کر دونگا۔

مسز خان —— یہ قطعی بات ہے؟

صغیر ہاشمی —— قطعی

مسز خان —— (کامل اطمینان اور دلجمعی کے ساتھ) تو مسٹر ہاشمی آپ گولی چلائیے۔

مسز خان نے اطمینان سے میز پر ہاتھ ٹیک دئیے ہیں اور ایک عجیب بے پروائی کے انداز سے سینہ سپر کر دیا ہے۔
صغیر ہاشمی کا رنگ فق ہوگیا ہے۔ وہ بالکل گھبرا گیا ہے۔ حیرت سے مسز خان کا منہ تک رہا ہے۔

مسز خان —— مسٹر ہاشمی آپ فائر کیجیے میں تیار ہوں۔ (آنکھیں بند کر لیتی ہے۔ پھر تھوڑے سے وقفے کے بعد) آپ فائر کیوں نہیں کرتے۔ کیا دیر ہے؟

صغیر ہاشمی —— میں۔ میں ——

مسز خان —— ہاں آپ کیا۔ فائر کیجیے نا۔ کیوں نہیں کرتے؟ آپ کی بہن اور اس کے شوہر کے درمیان میں دیوار کی طرح حائل ہوں۔ آپ اس دیوار کو ہٹانے میں تاخیر نہ کیجیے۔ کیا آپ کو اپنی بہن سے محبت نہیں؟ فائر کیجیے مسٹر ہاشمی۔

صغیر ہاشمی —— میں فائر نہیں کرونگا۔

مسز خان —— (آنکھیں کھول دیتی ہے۔ اطمینان کا ایک لمبا سانس لیتی ہے۔ اب وہ مسکرا رہی ہے) مسٹر ہاشمی مجھے معلوم تھا آپ فائر نہیں کرینگے قطعی اور یقینی طور پر معلوم تھا۔ قاتلوں کی صورت آپ کی سی نہیں ہوتی۔ آپ جان دے سکتے ہیں۔ لیکن آپ جان لے نہیں سکتے۔ اس کے متعلق مجھے اسی وقت یقین ہوگیا تھا جب آپ مجھے لمبی لمبی دھمکیاں دے رہے تھے —— ورنہ غالباً

یں اتنی دلیری کے ساتھ آپ کے سامنے سینہ تان کے کھڑی نہ ہو سکتی ۔

مسٹر ہاشمی —— میں معافی مانگتا ہوں ۔

مسز خان —— میں معافی دیتی ہوں لیکن معافی مانگنا اور اس لئے معافی دینا غیر ضروری ہے ۔ مسٹر ہاشمی ! میں آپ سے ایک سوال کرنا چاہتی ہوں ۔ اگر میرا بھائی آپ کی بہن کے پاس جاتا ۔ ریوالور لے کر اس کے سامنے کھڑا ہو جاتا تو کیا آپ کی بہن بھی اپنی محبت کی خاطر اسی قدر دلیری سے مرنے کے لئے تیار ہو جاتی ؟ میں مانتی ہوں مجھے قریب قریب یقین تھا کہ آپ میں انسانی جان لینے کی اہلیت نہیں ۔ لیکن اس کے باوجود —— آخر آپ ریوالور لئے میرے سامنے کھڑے تھے ۔ کیا آپ کی بہن انہی حالات میں اسی قدر ثابت قدم رہتی جس قدر میں رہی ۔ اس سوال کا جواب مجھے نہ دیجئے ۔ ایمانداری سے اپنے آپ کو دیجئے اور پھر فیصلہ کیجئے کہ مسٹر حیدر کی محبت کا حقدار کون ہے ——

خدا جانے یہ گفتگو کیا کیا پہلو اختیار کرتی لیکن معاً مشرقی دروازے کے باہر آدمیوں کے بولنے کی آوازیں آتی ہیں ۔ پھر آہستہ سے کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے ۔ دبیز اور بل کھایا ہوا پردہ ہلتا ہے اور مسٹر حیدر داخل ہوتا ہے ۔

مسٹر حیدر —— اوہو ۔ ہاشمی بھیا ۔ آپ دنیا کے اس حصے میں کیونکر تشریف لے آئے ؟

ظاہر ہے کہ مسٹر حیدر اس وقت اتفاقیہ طور پر آ گیا ہے ۔ اور اسے یہاں کے بحث مباحثے کی کچھ خبر نہیں ۔ وہ مسٹر ہاشمی کی طرف دیکھتا ہے ۔ پھر مسز خان کی طرف ۔ دونوں کے چہرے سے عیاں ہے کہ کوئی غیر معمولی بات درپیش ہے ۔ اس کی مسکراہٹ زیرلب ہی ختم ہو جاتی ہے ۔ اور وہ گھبرا کے مسز خان کی طرف بڑھتا ہے ۔ مسٹر ہاشمی مسز خان کی طرف دیکھتا ہے ۔ اس کی آنکھیں رحم کی درخواست کر رہی ہیں ۔ مسز خان اس درخواست کو دیکھتی ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اسے جو کچھ فیصلہ کرنا تھا کر چکی ہے ۔

مسٹر حیدر —— مسز خان خیریت تو ہے ؟

مسز خان —— نہیں ۔

مسٹر حیدر —— (انتہائی گھبراہٹ سے) کیوں ۔ کیوں کیا ہوا ؟

مسز خان —— ان سے پوچھئے ۔

مسٹر ہاشمی —— اگر میری ذلت کی داستان بہرحال سنائی جائیگی تو آپ ہی سنائیے نا ۔ میں تو شاید اپنی رعایت کر دوں ۔

مسز خان —— مسٹر ہاشمی چاہتے ہیں کہ میں ان کی بہن کی خاطر آپ سے ملنا چھوڑ دوں ۔ ان کی بہن کا دل نازک سا ہے اس لئے وہ آپ کی جدائی برداشت نہیں کر سکتیں ۔ اور میرا دل پتھر کا ہے اس ۔ لئے میں کر سکتی ہوں ۔

مسٹر حیدر تعجب اور کبیدگی سے مسٹر ہاشمی کی طرف دیکھتا ہے گویا فقط نگاہوں سے اس کی جسارت بلکہ حماقت پر تبصرہ کر رہا ہے۔
مسز خان خاموش ہے۔ شاید وہ چاہتی ہے کہ مسٹر حیدر ایک جملے سے کما حقہ' متاثر ہو لے۔ پھر آگے چلے۔

مسز خان ـــــ مسٹر ہاشمی کا خیال ہے کہ میں آپ کے پاس اپنی محبت بیچتی ہوں۔ یہ کہتے ہیں کہ آپ ان دو یا تین یا چار یا پانچ آدمیوں میں سے ایک ہیں جو میرے اخراجات کے کفیل ہیں۔ انہوں نے اپنا جملہ مکمل نہیں کیا تھا۔ لیکن ان کا مطلب یہی تھا۔ ٹھیک ہے نا مسٹر ہاشمی؟ دو یا تین یا چار یا پانچ آدمیوں میں سے ایک جو ـــــ جو کیا۔ جو میرے اخراجات کے کفیل ہیں۔ یہی مطلب تھا نا؟ یقیناً یہی مطلب تھا ورنہ آخر آپ مجھے دس ہزار روپے" اسی وقت "اس امر کے معاوضے میں دینے کے لئے کیوں تیار ہو جاتے کہ میں مسٹر حیدر کو چھوڑ دوں۔

مسٹر حیدر صغیر ہاشمی کو حقارت کی نگاہ سے دیکھ رہا ہے۔ اور کچھ کہنا چاہتا ہے۔ لیکن صغیر ہاشمی۔ رنگ زرد۔ پیشانی پسینے میں تربتر۔ سر نیچا کئے۔ نگاہیں زمین پر گاڑے بے حس و حرکت کھڑا ہے۔ مسز خان جملہ ختم کرنے کے بعد پھر خاموش ہے۔ اور غالباً اندازہ لگا رہی ہے کہ اس گفتگو سے مسٹر حیدر کس حد تک متاثر ہوا ہے۔

مسز خان ـــــ اور جب میں نے انکار کر دیا۔ اور یہ مایوس ہو گئے۔ اور چونکہ یہ جان دینے سے نہیں ڈرتے اور ان کے نزدیک جو جان دینے سے نہیں ڈرتا وہ جان لینے سے بھی نہیں ڈرتا۔ اس لئے یہ ریوالور نکال کر میرے سامنے کھڑے ہو گئے۔ اگر میں غلطی نہیں کرتی تو اس وقت وہ ریوالور ان کے کوٹ کی دائیں جیب میں ہے۔ دائیں میں ہے مسٹر ہاشمی کہ بائیں میں؟ غالباً دائیں میں ہے۔ تو یہ ریوالور نکال کر میرے سامنے کھڑے ہو گئے۔ اور انہوں نے فرمایا کہ اگر تم میری بہن کے رستے میں حائل ہونے سے باز نہ آئیں تو ـــــ " تو میں ابھی تمہیں ڈھیر کر دونگا"۔ لیکن انھوں نے مجھے ڈھیر نہ کیا۔ حالانکہ میں بار بار ان سے کہتی رہی کہ آپ گولی چلائیں ـــــ یہ بےحس و حرکت کھڑے رہے۔ اُس وقت سے اِس وقت تک کھڑے ہیں۔ اوہو۔ میں کس قدر بدتمیز ہوں۔ مسٹر ہاشمی آپ تشریف رکھئے نا۔

صغیر ہاشمی بالکل کھویا ہُوا۔ مبہوت کھڑا ہے جیسے کوئی سکتے کے عالم میں ہو۔ اسے کرسی پر بیٹھنے کو کہا جاتا ہے وہ بیٹھ جاتا ہے۔ اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد مہر سکوت بھی توڑتا ہے۔ لیکن اس کی نگاہیں زمین سے نہیں اٹھتیں۔

صغیر ہاشمی ـــــ مجھے معاف کر دیجے۔ میں کیا سمجھ رہا تھا اور کیا ہو گیا۔
مسٹر حیدر ـــــ مجھے آپ سے یہ توقع نہ تھی۔
مسٹر ہاشمی ـــــ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔

مسٹر حیدر —— خیر جو آپ نے مناسب سمجھا آپ نے کرلیا۔ اب جو میں مناسب سمجھونگا میں کرونگا۔

مسٹر ہاشمی —— آپ کیا کرینگے ؟

مسٹر حیدر —— جو میرے جی میں آئیگا۔

مسٹر ہاشمی —— (مضطرب ہوکر) آپ میرے گناہ کی سزا ثریا کو تو نہیں دینگے ؟

مسٹر حیدر —— میں کسی کے گناہ کی سزا کسی کو نہیں دینا چاہتا۔

صغیر ہاشمی —— پھر آپ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ خدا کے لئے مجھے بتا دیجے۔ مجھ پر رحم کیجے۔

مسٹر حیدر —— کچھ بھی نہیں۔ میں وہی کرونگا۔ جس کا میں آج سے بہت پہلے فیصلہ کرچکا ہوں۔ میں ثریا سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوجاؤنگا۔

صغیر ہاشمی —— (انتہائی کرب سے) نہیں۔ نہیں آخر اس کا قصور کیا ہے ؟

مسٹر حیدر —— (مسز خان کی طرف اشارہ کرکے) اور ان کا کیا قصور تھا ؟

صغیر ہاشمی —— مجھے معاف کر دیجے۔ قصور صرف میرا ہے۔ مجرم صرف میں ہوں۔

مسٹر حیدر —— اس گفتگو کو جاری رکھنے سے کچھ حاصل نہیں۔

صغیر ہاشمی —— بہت اچھا میں جاتا ہوں۔ (یکدم جوش سے) لیکن یاد رکھئے میں نے جو کچھ کیا محبت کی وجہ سے کیا اور محبت ایک ایسا جرم ہے جو مرتے دم تک مجھ سے سرزد ہوگا۔ میں نے جو کچھ کیا اس لئے کیا کہ مجھے اپنی بہن سے محبت ہے۔ لیکن صرف یہی نہیں۔ میں نے اس لئے کیا کہ مجھے آپ سے محبت ہے۔ میرا خیال تھا کہ آپ اپنی جوانی اور اپنی عزت ایک آبرو باختہ اور خودغرض عورت کی خاطر تباہ و برباد کر رہے ہیں۔ اب مجھے معلوم ہوگیا ہے کہ مسز خان خودغرض نہیں۔ باقی رہی آبرو یعنی وہ چیز جو میرے نزدیک نسائیت کا جوہر اصلی ہے تو آپ کے نزدیک غالباً اس چیز کی کوئی قدر نہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ آج کی گفتگو اور تجربے کے بعد میرے خیالات کی دنیا میں بھی ہلچل سی مچ گئی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا سمجھوں۔ ایک طرف وہ آئیڈیل ہیں جو انسانی زندگی کا نچوڑ سمجھے جاتے ہیں اور جن کو صدیوں کے تجربے نے صحیح ثابت کیا ہے۔ دوسری طرف وہ منطق ہے جو آج میرے سامنے مسز خان نے پیش کی ہے۔ اور جس کا جواب ممکن نہیں۔ شاید زندگی اسی شے کا نام ہے۔ یقیناً زندگی اسی بھیانک گورکھ دھندے کا نام ہے ورنہ آخر مجھے کیوں یہ خیال آیا۔ میں کیوں اس خیال سے بیتاب ہوگیا کہ میں یہاں آؤں اور منت سماجت سے یا روپے دے کر مسز خان کو آپ سے علیحدہ کر دوں۔ بعد میں جو کچھ ہوا کیوں ہوا۔ ریوالور کیوں نکلے۔ مسز خان مرنے کے لئے کیوں آمادہ ہوگئیں۔ میں انہیں مار کیوں نہ سکا۔ آپ عین وقت پر کیوں آگئے۔ اور پھر قیامت یہ ہے کہ یہ بھیانک۔ گھناؤنا کھیل یہاں کھیلا گیا۔ اس کی سزا اس کھیل کے شروع کرنے والے کو ملنی چاہئے تھی۔ لیکن اس کی سزا ایک ننھی سی بچی کو ملے گی جسے خبر بھی نہیں کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔

مسٹر حیدر —— (متاثر ہوکر) میں سزا نہیں دینا چاہتا۔

صغیر ہاشمی —— میں مان لیتا ہوں کہ آپ کا مقصد سزا دینا نہیں۔ لیکن نتیجہ بہر حال وہی ہے۔ سزا بہر حال ثریا کو ملے گی۔ جو یہاں موجود نہیں۔ جسے اتنا بھی معلوم نہیں کہ اس کی قسمت کا فیصلہ ہو رہا ہے۔ خدا جانے اس وقت وہ کیا سوچ رہی ہے۔ ممکن ہے

اس وقت وہ ایک پُرمسرت زندگی کے خواب دیکھ رہی ہو۔ ممکن ہے۔ اس وقت۔ عین اس وقت وہ اپنے تصور میں آپ کو مسز خان سے ہمیشہ کے لئے علیٰحدہ ہوتے دیکھ رہی ہو ــــ بھائی جان۔ خدا جانے ثریا آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہو۔ خدا جانے وہ کوئی ایسی بات کرے جس سے آپ اپنا فیصلہ بدل دینے پر مجبور ہو جائیں۔ جب میں یہاں آیا تھا میں اور آدمی تھا۔ اب میں اور آدمی ہوں۔ جن باتوں کو میں مسلّمات میں شمار کرتا تھا۔ وہ اب غیر مسلّمہ ہیں۔ وہ اب غیر مسلّمہ ہی نہیں بلکہ ان کے برعکس باتیں مسلّمات معلوم ہوتی ہیں۔ آپ ایک مرتبہ ثریا سے مل تو لیجیے۔ اس سے کہ تو دیجیے کہ آپ کیا کرنے والے ہیں۔ اس کے دل میں یہ حسرت تو نہ رہ جائے کہ ــــ

مسٹر حیدر ــــ میں ان سے ملنا نہیں چاہتا۔ مجھے ان سے مل کے تکلیف ہوگی۔

مسٹر ہاشمی ــــ وہ اس نفرت کی مستحق تو نہیں۔

مسٹر حیدر ــــ نہ ملنے کی وجہ نفرت نہیں (ذرا چک کر) مجھے ثریا سے نفرت نہیں۔

مسٹر ہاشمی ــــ پھر آپ اس کے پاس جانے سے کیوں انکار کرتے ہیں؟

مسٹر حیدر ــــ اس لئے کہ مجھے اس سے مل کے تکلیف ہوگی۔

صغیر ہاشمی ــــ (اُسے تاریکی میں پہلی مرتبہ کچھ روشنی سی نظر آتی ہے) تو مسٹر حیدر میں ثریا کو یہاں لاؤنگا۔ میں ابھی اسے یہاں لاتا ہوں۔ آپ خود اس سے کہ دیجیے۔ اپنی زبان سے کہ دیجیے کہ آپ ہمیشہ کے لئے اس سے جدا ہو رہے ہیں۔ (مشرقی دروازے سے باہر چلا جاتا ہے)

مسٹر حیدر ــــ یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ (مسز خان سے) میں یہاں سے چلا جاتا ہوں۔ میں ثریا کے ساتھ آنکھیں نہیں ملا سکتا میں اپنے منہ سے نہیں کہ سکتا کہ ــــ

مسز خان ــــ آپ جانے کی تکلیف نہ کیجیے۔ مسز حیدر یہاں نہیں آئینگی۔

مسٹر حیدر ــــ کیوں؟

مسز خان ــــ بس نہیں آئینگی۔

مسٹر حیدر ــــ یقین ہے آپ کو؟

مسز خان ــــ پکا یقین۔

مسٹر حیدر ــــ لیکن کیوں۔ خودی مانع ہوگی؟

مسز خان ــــ نہیں غرور اور خودی کی بات نہیں۔

مسٹر حیدر ــــ کیونکہ اگر خودی کی بات ہے۔ تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ چیز نہ ثریا میں ہے۔ نہ صغیر میں۔ بلکہ ان کے خاندان کے کسی رکن میں بھی نہیں۔ غرور اور خودی کی غیر موجودگی ایک خوبی ہے۔ لیکن ان لوگوں میں یہ خوبی عیب کی حد تک پہنچ گئی ہے بعض اوقات تو مجھے شبہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں میں احساس خودداری کی بھی کمی ہے۔

مسز خان ــــ نہیں محبت کی فراوانی ہے۔ کم سے کم مسٹر صغیر ہاشمی تو سر سے لے کر پاؤں تک محبت ہیں۔

مسٹر حیدر —— جو سر سے پاؤں تک محبت ہو وہ کسی پر ریوالور نہیں اٹھا سکتا۔
مسز خان —— اٹھا سکتا ہے لیکن چلا نہیں سکتا۔ اور مسٹر صغیر ہاشمی نہیں چلا سکے۔
مسٹر حیدر —— اگر وہ فائر کر دیتا!
مسز خان —— ناممکن تھا۔ آپ کوشش کر کے اپنے دل پر خوف وارد نہ کیجیے۔

ظاہر ہے کہ مسز خان اراداتاً اپنے خطرے کو کم کر کے دکھا رہی ہے۔ دونوں خاموش ہو جاتے ہیں اور کافی دیر تک خاموش رہتے ہیں ....

....

مسٹر حیدر —— آپ کیا سوچ رہی ہیں؟
مسز خان —— اور آپ کیا سوچ رہے ہیں؟
مسٹر حیدر —— کچھ نہیں۔
مسز خان —— آخر؟
مسٹر حیدر —— میں سوچ رہا ہوں کہ اگر ثریا آ گئی تو میں کیا کرونگا۔
مسز خان —— میں سوچ رہی ہوں کہ اگر وہ نہ آئیں۔ اور وہ یقیناً نہیں آئینگی تو آپ کیا کرینگے۔
مسٹر حیدر —— کیا مطلب؟
مسز خان —— مطلب کچھ ایسا پیچیدہ نہیں۔ میں جانتی ہوں کہ مسز حیدر یہاں نہیں آئینگی۔
مسٹر حیدر —— لیکن کیوں؟
مسز خان —— یہ آپ کبھی نہیں سمجھ سکتے۔ ایسی باتیں فقط ہم لوگ سمجھ سکتے ہیں۔
مسٹر حیدر —— "ہم لوگ" کون؟
مسز خان —— عورت لوگ۔ اگر آپ عورت ہوتے تو آپ بھی سمجھ لیتے۔
مسٹر حیدر —— (ہنس کر) اس قسم کے علم النفس کا میں قائل نہیں۔
مسز خان —— آپ کیونکر ہو سکتے ہیں۔

.... خاموشی ....

....

مسز خان ـــــ (معاً) آپ گاتے کیوں نہیں ؟
مسٹر حیدر ـــــ (تعجب سے) کیا مطلب ؟
مسز خان ـــــ کچھ گائیے نا۔
مسٹر حیدر ـــــ کیا خوب وقت نکالا ہے آپ نے گانے کا۔
مسز خان ـــــ اس سے بہتر وقت کیا ہوگا۔
مسٹر حیدر ـــــ کیا خوبی ہے اس وقت میں ؟
مسز خان ـــــ اور برائی کیا ہے ؟
مسٹر حیدر ـــــ معاف کیجیے میں تو اس وقت گا نہیں سکتا۔

. . . . خاموشی . . . .

. . . .

مسز خان ـــــ آپ کیا سوچ رہے ہیں ؟
مسٹر حیدر ـــــ میں الفاظ سوچ رہا ہوں۔ اس تحریر کے جو میں آج ثریا کے پاس بھیجنا چاہتا ہوں۔

کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ مسٹر صغیر ہاشمی داخل ہوتا ہے۔ اکیلا ہے۔

مسز خان ـــــ مسز حیدر نہیں آئیں ؟
صغیر ہاشمی ـــــ نہیں وہ نہیں آئیں۔ (مسٹر حیدر سے) یہ خط دیا ہے۔

مسٹر حیدر خط پڑھ رہا ہے۔ اور اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہو رہا ہے۔ وہ بالکل زرد ہوگیا ہے۔ خط ختم کرکے وہ ہاتھوں پہ ماتھا ٹیک کے بیٹھ جاتا ہے۔

مسز خان ـــــ مسٹر حیدر میں چاہتی ہوں کہ آپ یہ خط بلند آواز سے پڑھیں۔
مسٹر حیدر ـــــ کیوں ؟
مسز خان ـــــ مسٹر حیدر آپ کو یہ خط بلند آواز سے پڑھنا ہوگا۔ میں یہ خط سننا چاہتی ہوں۔
مسٹر حیدر ـــــ (مسٹر حیدر بلند آواز سے خط پڑھتا ہے) میرے مالک مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ آج میری قسمت کا

فیصلہ کرنے والے ہیں - یا شاید کر چکے ہیں - آپ جو کچھ کرنے والے ہیں یا جو کچھ کر چکے ہیں - میرے نزدیک وہی صحیح ہے جس دن سے میں آپ کے ساتھ وابستہ ہوں - اس دن سے لے کر آج تک میں نے اپنی زندگی کا مقصد یہی سمجھا ہے کہ میں آپ کے لئے موجب راحت بنوں - لیکن یہ سعادت میری قسمت میں نہ تھی - اب میرا فرض یہی ہے کہ میں آپ کی راہ میں حائل نہ ہوں - میں مٹ جانے کے لئے بالکل تیار ہوں - میں وعدہ کرتی ہوں کہ میں کبھی آپ کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کی کوشش بھی نہیں کرونگی - آپ میرا نام بھی نہیں سنیں گے - مرنا بہت آسان ہے لیکن میں مرنا نہیں چاہتی - میں زندہ رہنا چاہتی ہوں - میں اسی دنیا میں رہنا چاہتی ہوں جس دنیا میں آپ ہیں - میں اس دنیا میں آپ کی کامیابیاں اور مسرتیں دیکھنے کے لئے رہنا چاہتی ہوں - میں آپ کی مسرتوں میں شامل ہونا چاہتی ہوں - میں آپ کی کامیابیاں دور سے دیکھوں گی - بہت دور سے - لیکن آپ کی کامیابیاں میری کامیابیاں ہونگی -

میری حسرت تھی کہ بہرحال میں آپ کے دامن کے ساتھ وابستہ رہوں - لیکن میرے مالک یہ بھی نہ سہی - اگر آپ کی خواہش یہی ہے کہ آپ مجھے اپنے نام سے بھی محروم کر دیں تو میری بھی یہی خواہش ہے - اور اس سے فرق بھی کیا پڑیگا - میں بہرحال آپ کی ہوں اور آپ بہرحال میرے نہیں - میں اب بھی آپ کی ہوں اور اُس حالت میں بھی آپ ہی کی رہونگی - آپ اُس حالت میں بھی میرے نہیں ہونگے لیکن اب بھی میرے نہیں - خدا آپ کو اور مسز خان کو شاد و بامراد رکھے - خدا زندگیاں دراز کرے - خدا آپ کو کامیابیاں دے - مسرتیں دے - خدا آپ پر اپنی رحمتیں نچھاور کرے -

مسٹر حیدر خط پڑھ رہا تھا تو اس کی آواز میں لرزش سی تھی - مسٹر ہاشمی نے غالباً آنسو چھپانے کے لئے منہ دوسری سمت پھیر لیا ہے - مسز خان کسی گہری سوچ میں ہے - کچھ دیر تک سب خاموش رہتے ہیں - آخر مسز خان کرسی چھوڑ کے اس انداز سے کھڑی ہو جاتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے وہ کوئی قطعی فیصلہ کر چکی ہے -

مسز خان ــــ (مسٹر حیدر کی جانب ہاتھ بڑھا کر) خدا حافظ !

مسٹر حیدر اس خدا حافظ کا مطلب نہیں سمجھا - وہ مستفسر نگاہوں سے مسز خان کی طرف دیکھتا ہے - لیکن مسز خان کا بڑھا ہوا ہاتھ دیکھ کر وہ بھی عادت کے مطابق ہاتھ بڑھا دیتا ہے -

مسز خان ــــ (ہاتھ ملا کر) خدا حافظ - آپ مسز حیدر کے پاس جائیے - آپ ان کے ہیں - آپ میرے نہیں -

مسٹر حیدر کچھ کہنا چاہتا ہے - لیکن مسز خان سلسلہ گفتگو جاری رکھتی ہے -

مسز خان ــــ آپ میرے لئے نہیں - میں آپ کے لئے نہیں - آپ ــــ ننھی ثریا کے پاس جائیے ....

.... (آہستہ آہستہ رک رک کر) میں آپ سے محبت کرتی ہوں اور شاید آپ بھی مجھ سے محبت کرتے ہیں لیکن مسز حیدر کے دل میں جو محبت ہے ــــــ

مسٹر حیدر ــــــ آپ جانتی ہیں مجھے محبت کس سے ہے۔ لیکن آپ درست کہتی ہیں۔

مسز خان ــــــ خدا حافظ!

مسٹر حیدر ــــــ خدا حافظ! (چلا جاتا ہے)

مسز خان ــــــ مسٹر ہاشمی۔ میں دو چار روز میں ہمیشہ کے لئے یہاں سے چلی جاؤنگی۔ آپ لوگ کبھی میری صورت نہیں دیکھینگے۔ لیکن جانے سے پیشتر میں آپ سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔ دنیا کی حقیر ہستیوں کو۔ میرا مطلب ہے ان ہستیوں کو جنہیں دنیا حقارت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ آپ حقارت کی نگاہ سے نہ دیکھا کیجئے۔ اگر آپ سے لوگ بھی افتادگانِ دہر کو حقیر سمجھیں تو خدا کی اس مخلوق کا سینہ شق ہو جاتا ہے۔ زندگی ایک بھیانک گورکھ دھندا ہے۔ یہ آپ کے لفظ ہیں۔ "ایک بھیانک گورکھ دھندا"۔ لیکن یہ گورکھ دھندا کس قدر بھیانک ہے۔ اس کا اندازہ آپ کبھی نہیں لگا سکتے۔ یہ میں جانتی ہوں۔ یہ میں ہی جانتی ہوں جو اس گورکھ دھندے کے پیچوں میں پھنسی ہوئی ہوں۔

صغیر ہاشمی ــــــ مجھے معاف کر دیجئے۔

مسز خان ــــــ (ہنس کر) اس کی ضرورت نہیں۔ خدا حافظ

صغیر ہاشمی ــــــ خدا حافظ (جاتا ہے)

کیا مسز خان رو رہی ہے؟ وہ ایک بڑی کرسی پر اوندھے منہ پڑی ہے۔ لیکن نہیں وہ رو نہیں رہی۔ اب وہ اٹھی ہے اور پیانو کے سامنے جا بیٹھی ہے۔

مسز خان ــــــ (گاتی ہے)

اے خدا اے جہاں کے خالق ــــ اے زمین آسمان کے خالق
یہ ترا شاہکار کچھ بھی نہیں ــــ دہر نا پائدار کچھ بھی نہیں
اس میں جو ہے اداس رہتا ہے ــــ ہمہ تن رنج و یاس رہتا ہے
دل کے غنچے کبھی نہیں کھلتے ــــ گل و بلبل کبھی نہیں ملتے
آرزو نامرام رہتی ہے ــــ جستجو تشنہ کام رہتی ہے
دل کی دنیا عجیب دنیا ہے ــــ تیرے فردوس سے بھی اعلیٰ ہے
اس میں ہر دم بہار رہتی ہے ــــ شانِ صد لالہ زار رہتی ہے

نخل ہلتے ہیں پھول کھلتے ہیں   گل و بلبل لپٹ کے ملتے ہیں
آرزو مدعا سے ملتی ہے   جستجو منتہٰی سے ملتی ہے
وقت نغموں کا اک تسلسل ہے   جو صدا ہے صدائے بلبل ہے
مبتذل ساز باز سے بالا   ہوس و حرص و آز سے بالا
دل کی دنیا عجیب دنیا ہے
تیرے فردوس سے بھی اعلیٰ ہے

نوکر داخل ہوتا ہے۔ اور طشتری میں ایک کارڈ پیش کرتا ہے۔

مسز خان ——— احمد صاحب ہیں۔ فوراً بلا لاؤ۔۔۔ (احمد داخل ہوتا ہے تو مسز خان گا رہی ہے۔ "دل کی دنیا عجیب دنیا ہے تیرے فردوس سے بھی اعلیٰ ہے")

احمد ——— کس کے فردوس سے ؟
مسز خان ——— (ہنس کر) تیرے فردوس سے ۔
احمد ——— میرا فردوس تو یہی مکان ہے ۔
مسز خان ——— ظاہر ہے اس سے تو بہت اعلیٰ ہے ۔
احمد ——— کیا ؟
مسز خان ——— دل کی دنیا جس میں کینچلی پہننے کی ضرورت نہیں ہوتی ۔
احمد ——— کیا مطلب ؟
مسز خان ——— سانپ کی ایک کینچلی ہوتی ہے نا ۔ جسے وہ کبھی اتار دیتا ہے۔ کبھی پہن لیتا ہے ۔
احمد ——— پہنتا وہنتا نہیں ۔
مسز خان ——— نہیں پہنتا ! تو پھر یہ صرف ہمارا کمال ہے کہ ہم کینچلی پہن بھی لیتے ہیں اور اتار بھی دیتے ہیں ۔
احمد ——— کیا باتیں کر رہی ہیں آپ آج ۔
مسز خان ——— (کھلکھلا کر ہنستی ہے) آج میں بہت خوش ہوں بہت ہی خوش ہوں ۔

ڈراپ

مجید ملک

تاثیر

تاثرات

میری وفائیں یاد کروگے — روؤگے فریاد کروگے
مجھ کو تو برباد کیا ہے — اور کسے برباد کروگے
ہم بھی ہنسینگے تم پر اک دن — تم بھی کبھی فریاد کروگے
محفل کی محفل ہے غمگیں — کس کس کا دل شاد کروگے
دشمن تک کو بھول گئے ہو — مجھ کو تم کیوں یاد کروگے
ختم ہوئی دشنام طرازی؟ — یا کچھ اور ارشاد کروگے!
جا کر بھی ناشاد کیا تھا — آ کر بھی ناشاد کروگے
چھوڑو بھی تاثیر کی باتیں — کب تک اس کو یاد کروگے

محمد دین تاثیر

محمد عبداللہ چغتائی

جنٹائل بلینی

جس شخص نے کبھی وینس کی تنگ و تاریک گلیوں میں گنڈولا میں بیٹھ کر سیر کی ہے۔ اس کو ان گلی کوچوں پر "سٹراڈا ڈی گیوانی" یا "دایاڈی بلینی" یا "سٹراڈا جنٹائل بلینی" لکھے نظر آئیں گے یہ گلی کوچے قدیم بزرگوں کے اسماء پر ہیں۔ آفریں ہے اُن پر جنہوں نے اپنے بزرگوں کے کارناموں کو ابھی تک محض تاریخ کے اوراق پر یا تصاویر ہی میں زندہ نہیں رکھا۔ بلکہ جہاں جہاں وہ سکونت پذیر تھے۔ ان جگہوں کو بھی ان کے ناموں پر آباد رکھا ہے۔ جنٹائل بلینی بھی وینس کا باشندہ تھا۔ جو ۱۴۲۹ء میں پیدا ہوا۔ اس کا والد جیاکوپو (یعقوب) اور اس کے آباؤ اجداد وہیں رہتے تھے۔ اس کا بڑا بھائی گیونی بلینی بھی وینس ہی میں ۱۴۱۵ء میں پیدا ہوا۔ اگرچہ ان کا آبائی پیشہ مصوری تھا۔ مگر کچھ زیادہ اچھی حالت میں نہ تھے۔ اور بہت غیر معروف تھے۔ آہستہ آہستہ انہوں نے مصوری میں کمال پیدا کیا۔ اور وینس کے سینیٹ کی توجہ ان کی طرف منعطف ہوئی۔ انہوں نے وینس کی تاریخ کو چار چاند لگا دئیے۔ اگر آج ان کے ذکر کو اطالوی مصوری کی تاریخ اور سیاسی تاریخ سے حذف کر دیا جائے۔ تو ایک بہت بڑی کمی پیدا ہو جائے۔

یہ دونوں بھائی الگ الگ مکانوں میں رہتے تھے۔ لیکن آپس میں بےحد محبت تھی۔ اور ایک دوسرے کی عزت و تکریم کرتے تھے۔ باپ کے متواضع تھے۔ ایثار کے مالک تھے۔ سب سے بڑی بات یہ تھی۔ کہ ایک دوسرے سے اپنے آپ کو کم تصور کرتے تھے۔ ان کی یہ خوبی سب کے دلوں میں گھر کئے ہوئے تھی۔ اور یہی آخر میں ان کے لئے اعلیٰ مرتبے کے حصول کا باعث ہوئی۔

یہ دونوں بھائی وینس میں گریٹ کونسل کے ہال میں ایسی تصاویر بنانے کے لئے منتخب ہوئے۔ جو خصوصیت سے وینس شہر کی شان و شوکت عیاں کریں۔ مثلاً کارنامہائے جنگ اور وینس کے بہادروں کا ایثار وغیرہ۔ چنانچہ انہوں نے ایسی تصاویر بنائیں۔ جن کی طرف آنکھیں بھی اور دل و دماغ بھی متوجہ ہوتے تھے۔ اس کام کو انہوں نے ۱۴۷۴ء میں شروع کیا۔ جب ۱۴۷۹ء میں چھوٹے بھائی جنٹائل بلینی کو قسطنطنیہ جانے کا اتفاق ہوا۔ تو گیوانی اس کام کو برابر کرتا رہا۔ افسوس ہے۔ کہ یہ تصاویر ۱۵۷۷ء میں ضائع ہو گئیں۔ ان دونوں بھائیوں نے ان کے علاوہ بہت سی شبیہات وینس کے حکام کی بنائی تھیں۔ گیوانی کے کام کے بعض نمونے بواسطہ سفیر وینس قسطنطنیہ پہنچے۔ اور سلطان محمد ثانی فاتح قسطنطنیہ کی نظر سے گذرے۔ جو ان کو دیکھ کر بہت متاثر و متعجب ہوا سلطان محمد ثانی (فاتح قسطنطنیہ) نے ۲۳ سال کی عمر میں قسطنطنیہ کو فتح کیا۔ وہ اعلیٰ پایہ کا شاعر تھا۔ اور دیگر فنون لطیفہ سے خاصی دلچسپی رکھتا تھا۔ اگرچہ یورپین مورخین نے دل کھول کر ترکوں کے خلاف زہر اگلا ہے۔ مگر جنٹائل بلینی کے ضمن میں مشہور اطالوی مصور معمار و مصنف ویزاری (۱۵۱۱-۱۵۷۵ء) نے جو الفاظ اپنے تذکرے میں لکھے ہیں۔ وہ قابل غور ہیں۔ وہ لکھتا ہے۔ کہ باوجودیکہ مصوری ترکوں کے ہاں ممنوع تھی۔ تاہم سلطان نے تحفہ تصاویر کو بطیب خاطر قبول کیا۔ اور مصور کی بےحد تعریف کی۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ مصور کو قسطنطنیہ میں آنے کی دعوت دی۔ وینس کی سینیٹ نے فیصلہ کیا۔

کہ جنٹائل کا بھائی گیوانی عمر رسیدہ ہے۔ صعوبت سفر برداشت نہیں کرسکتا۔ علاوہ ازیں اس وقت وہ گریٹ کونسل کے ہال میں تصاویر بنانے میں مصروف تھا۔ اس لئے چھوٹے بھائی جنٹائل بلینی کو بھیجا جائے چنانچہ اس کو قسطنطنیہ پہنچایا گیا۔ اور وہ سفیر کی وساطت سے سلطان کے روبرو پیش ہوا۔ سلطان بہت عزت وتکریم سے پیش آیا۔ جنٹائل نے اپنے کام کا ایک نمونہ سلطان کے سامنے پیش کیا جسے اس نے بہت پسند کیا۔ اپنے مختصر عرصہ قیام میں بلینی نے سلطان کی شبیہ تیار کی۔ جو اس نیک نہاد ترک کے لئے گویا ایک معجزہ تھی۔ سلطان اس قدر محظوظ ہوا۔ کہ ایک روز اس نے جنٹائل سے بطور آزمائش پوچھا۔ کیا یہ ممکن ہے۔ کہ تم خود اپنی تصویر بنا سکو۔ جنٹائل نے جواب دیا۔ بہت اچھا۔ اور چند ہی روز میں ایک نہایت عجیب وغریب بالکل صحیح تصویر آئینہ کی مدد سے تیار کرکے سلطان کو دکھائی۔ وہ بہت متحیر ومسحور ہوا۔ جس سے اس کو معاً خیال ہوا۔ کہ مصور کو ضرور خدائی قوت حاصل ہے۔ اور کہا۔ کہ اگر میرے مذہب میں تصویر کشی جائز ہو۔ تو میں جنٹائل کو کبھی واپس وینس نہ جانے دوں۔

ایک روز سلطان نے جنٹائل کو اپنے محل میں طلب کیا۔ اس کے کام کی بہت تعریف کی۔ اور بحد مسرت کی حالت میں جنٹائل سے خواہش کی۔ کہ میں تمہاری ہر خواہش کو پورا کروں گا۔ خواہ کچھ ہو۔ جنٹائل چونکہ نیک فطرت تھا۔ اس نے کہا۔ آپ سینیٹ وینس کے نام اپنے اطمینان کے اظہار کے طور پر ایک مکتوب لکھ دیں۔ چنانچہ سلطان نے نہایت عمدہ الفاظ میں لکھ دیا۔ اور گراں بہا تحائف دیئے۔ ترکوں کے رواج کے مطابق اس کو "بے" کا خطاب بھی عطا کیا۔ علاوہ ازیں اس کے گلے میں ایک سونے کا دو سو پچاس کراؤن کا چندن ہار ڈالا۔ اور اسے رخصت کیا۔ یہ ہار ابھی تک وینس میں موجود ہے جنٹائل نے قسطنطنیہ کو خیرباد کہنے کے بعد نہایت خوشی سے سفر پورا کیا۔ اس کی آمد کی خبر سن کر اس کے شہر وینس کے روسا اور اس کے بھائی گیوانی نے سنٹ مارکو کے پاس نہایت شاندار استقبال کیا۔ بعدازاں وہ "ڈوج" (حاکم وینس) اور سینیٹ کے سامنے سلام کے لئے حاضر ہوا۔ اس سے عزت وتکریم کا سلوک کیا گیا۔ اس نے سلطان کا وہ مکتوب بھی ان کے سامنے پیش کیا جس سے متاثر ہوکر سینیٹ نے دو سو کراؤن سالانہ وظیفہ مقرر کیا۔ جو اس کو تاحیات ملتا رہا۔ وہ ۱۴۸۱ء کے ابتدا میں واپس آگیا تھا۔ اور اس کا انتقال ۱۵۰۷ء میں ہوا۔ مگر اس نے اس عرصے میں بہت کم تصاویر بنائیں۔ اور اسی سال کی عمر میں اس دار فانی سے رخصت ہوا۔ اور اپنے بھائی گیونی کے ہاتھوں سنٹ گیونی پاؤلو میں دفن ہوا۔ ادھر ۱۴۸۱ء میں مئی کے مہینے میں سلطان محمد کا وصال ہوا۔ جب وہ اٹلی کی فتح کی تیاریاں کر رہا تھا

اطالوی مصوری میں یہ وہ زمانہ تھا۔ جسے مورخین دور احیاء (RENAISSANCE) کہتے ہیں۔ ان مصورین نے خصوصیت سے اشاعتِ عیسائیت میں مدد کی۔ جو صدیوں میں نہیں ہوئی تھی۔ جنٹائل کے کام پر قیام قسطنطنیہ سے مشرقیت کا بہت اثر ہوا۔ جو اس کی بعد کی تصاویر سے واضح ہے۔ مثلاً "سینٹ مارکو پریچنگ ایٹ الیگزانڈریا" جو اس وقت میلان کی گیلری میں ہے۔ اور "ایڈمیریشن آف دی میگی" جو لندن کی نیشنل گیلری میں ہے ان تصاویر میں ترکی امرا کی تصاویر بھی نظر آتی ہیں۔ جو اپنے لمبے لمبے جبوں اور گنبدنما عماموں سے عیاں ہیں۔ جنٹائل کا یہ اثر اس کے بعد کی اطالوی مصوری پر بھی ہوا۔ جو پاؤلو ویرونیز وغیرہ کے کام سے واضح ہے۔ مثلاً اس کی "ایک دعوت" کی تصویر ہے۔ اور یورپی تصاویر بھی ہیں۔ جن میں مشرقی اثر نظر آئے گا۔

ویزاری کے بیان سے واضح ہوچکا ہے۔ کہ جنٹائل نے سلطان کی تصویر بنائی۔ جس سے وہ خوش ہوا۔ "پاؤلو گیاولو" جو تاریخ ترکی سے دلچسپی رکھتا تھا۔ بیان کرتا ہے۔ کہ دو تصاویر عجائب خانہ کومو (COMO) میں تھیں۔ جو اطالیہ میں جھیل لمبارڈی کے کنارے واقع تھا۔ ان تصاویر کے متعلق وہ بیان کرتا ہے۔ کہ ان میں سے ایک ضرور جنٹائل کی بنائی ہوئی ہے۔ جس کو اس نے سلطان کے سامنے بیٹھکر بنایا تھا

اور وہ یہ بھی بیان کرتا ہے۔ کہ اس کا ایک میڈل (تمغہ) بھی ہے جس پر اوپس کانسٹنٹی "مصور کے دستخط ہیں۔ مگر سلطان کی اصل تصویر جسے جنٹائل نے بنایا لنڈن نیشنل گیلری والی سمجھی جاتی ہے۔ لیکن اس تصویر سے ۵۰ یا ۵۵ سال کی عمر سے زیادہ نظر آتا ہے۔ جو عمر اس کی وفات کے وقت تھی۔ اس وقت ہمارے سامنے وہ تصویر بھی ہے۔ جو سرائے کتب خانہ استنبول سے حاصل کر کے یہاں شائع کی جاتی ہے۔ اور عرصہ سے یورپین محققین میں مشہور تھی۔ اس کے متعلق سر چارلس ہولمز سابق ایڈیٹر سٹوڈیو نے ڈاکٹر مارٹن کی وساطت سے ایک اطلاع ٹائمز لنڈن ۱۷ جولائی ۱۹۲۰ء میں شائع کی تھی۔ کہ اب وثوق سے کہا جا سکتا ہے۔ کہ سلطان محمد کی یہ اصل تصویر ہے۔ عبدالعزیز بے مہتمم عجائب خانہ آثار عتیقہ استنبول کی اجازت سے یہ تصاویر بواسطہ مسٹر باسل گرے (برٹش موزیم) کارواں میں شائع کی جاتی ہیں۔ اگرچہ یہ تصاویر کسی یورپین مصور کا کام معلوم نہیں ہوتیں۔ تاہم جنٹائل کی تصویر سے متاثر معلوم ہوتی ہیں۔ اور ان تصاویر اور نیشنل گیلری لنڈن والی تصویر میں محض پگڑی اور سر میں مشابہت نظر آتی ہے۔ سلطان محمد کا جو "میڈل" یہاں شائع کیا جاتا ہے۔ دراصل اعلیٰ فن کا نمونہ ہے۔ یہ کانسٹینٹس کا بنایا ہوا ہے۔ اس میں سلطان کی مکمل شبیہ ہے۔ سرائے کتب خانہ والا خاکہ بالکل اصل ہے۔ اور اسی کانسٹینٹس کا کام ہے۔ جسے "فرڈیننڈ" نے نیپلز سے قسطنطنیہ بھیجا تھا۔ اسی نے "میڈل" کا یہ خاکہ تیار کیا۔ اور اسی نے "میڈل" بنایا۔ یہ "میڈل" سلطان نے اپنے غازیوں کو فتح قسطنطنیہ کے ضمن میں تقسیم کیا تھا۔

یہ مشہور ہے۔ کہ جب جنٹائل بلینی قسطنطنیہ گیا۔ تو اس کے ہمراہ اس کے ایک دو تلامذہ بھی اس کی مدد کے لئے گئے تھے۔ وہاں بھی بعض ترکی مصور اس کے تلامذہ ہوئے۔ مثلاً شبلی زادہ احمد جو بروسہ کا تھا۔ اور جس کا ذکر ترکی مصنف عالی (قریب ۱۵۸۵ء) نے کیا ہے۔ جنٹائل کا نام اس کے قول کے مطابق "سنان بے" تھا۔ وہ کہتا ہے۔ "یہ فرنگی مصور سلطان محمد کے زمانہ میں یہاں آیا۔ اور یہ ماسٹر و پاؤلی کا شاگرد تھا۔ اور وہ دامیان کا تلمیذ تھا۔" ڈاکٹر مارٹن نے بھی جنٹائل اور "سنان بے" ایک ہی شخص قرار دیا ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے۔ کہ جنٹائل کو "بے" کا خطاب سلطان سے ملا تھا۔ غالباً اسی وجہ سے مورخین نے "سنان بے" لکھا ہے۔[1]

ایک امر قابل ذکر ہے۔ جنٹائل کے ترکی جانے سے وہاں اس فن میں بیداری ہوئی۔ اور مسلمانوں میں شبیہ کشی کا چرچا ہوا۔ بہت سے لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے بعد میں شبیہات ترکی رؤسا وغیرہ کی بنائیں مسلمان مصوری میں جو شبیہ کشی کے عمدہ نمونے نظر آتے ہیں۔ وہ زیادہ تر اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس سے یہ مطلب نہیں۔ کہ مسلمان مصورین شبیہ بنا ہی نہیں سکتے تھے۔ بلکہ یہ ہے۔ کہ جنٹائل کے وہاں جانے سے ان کے لئے جرأت کا ایک نیا باب مصوری میں کھل گیا۔ اس سے پیشتر ان کی مصوری زیادہ حد تک "کتابی مصوری" تک محدود رہی۔ یہاں دو نمونے برٹش موزیم سے لے کر دئے جاتے ہیں۔ جو اغلب ہے۔ کہ جنٹائل کے مو قلم سے ہیں۔ اگرچہ نامکمل ہیں کیونکہ ان پر یورپی زبان میں بعض الفاظ ملتے ہیں۔ جو غالباً لباس کے رنگوں کے اسماء ہیں۔ جنہیں مصور نے بطور احتیاط درج کر لیا ہے۔ یہ نمونے محض خاکہ ہیں۔ جو ترکی لباس سر کا بالخصوص عجیب و غریب نمونہ ہیں۔ غالباً اسی وجہ کی بنا پر ان کو کھینچا گیا ہے۔ ان کے علاوہ ایک ترکی مصور کی شبیہ ملتی ہے۔ جس پر "صورہ العبد بہزاد" لکھا ہے۔ اگرچہ یہ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا۔ کہ یہ فی الحقیقت بہزاد کا کام ہے۔ مگر یہ یقینی ہے۔ کہ بہزاد نے بھی اسی زمانہ میں شبیہات بنائیں اور اس پر مولانا جعفر کی ایک مہر بھی ہے۔

محمد عبداللہ چغتائی

[1] برلنگٹن میگزین ستمبر ۱۹۳۷ء میں ایک مضمون اسی ضمن میں میں نے دوران قیام یورپ میں لکھا تھا۔

گناہِ کیست؟

گردِ سرِ تو گشتن و مردن گناہِ من	دیدن چنین و رحم نہ کردن گناہِ کیست	نظیری
لائق بقید و بند نبودن گناہِ من	بُردن بزیرِ تیغ و نکشتن گناہِ کیست	عرفی
راضی شدن بوعدۂ فردا گناہِ من	امشب وفائے وعدہ نکردن گناہِ کیست	صائب
دل با تو خانہ سوز سپردن گناہِ من	در خانۂ خدا زدن آتش گناہِ کیست	فائز
دردِ دلِ حزیں بتو گفتن گناہِ من	دل بردن و نگاہ نہ کردن گناہِ کیست	قدسی
خود را نشانِ تیرِ تو کردن گناہِ من	نخچیر نیم کشتہ نکشتن گناہِ کیست	لا اعلم
قطعِ نظر ز غیرِ تو کردن گناہِ من	ہرگز بمن نگاہ نہ کردن گناہِ کیست	وحشی
عاشق شدن ندیدہ جمالت گناہِ من	رُخ در نقاب جلوہ نمودن گناہِ کیست	استاد
در وصلِ تو ز شوق نمردن گناہِ من	امّا بریں گناہ نکشتن گناہِ کیست	عالی
بے رحم زیرِ پائے تو مردن گناہِ من	از یک نگاہ زندہ نہ کردن گناہِ کست	لا اعلم
رنجیدن و ز بزمِ تو رفتن گناہِ من	ساغر ز دستِ غیر گرفتن گناہِ کیست	صیدی
بیخود بوقتِ ذبح طپیدن گناہِ من	دانستہ دشنہ تیز نہ کردن گناہِ کیست	(غالب)

ج۔م۔ح

مطبوعاتِ جدیدہ

انارکلی

اردو ادبیات میں اچھے ڈراموں کی اس قدر کمی ہے۔ کہ انارکلی کی اشاعت ایک تاریخی اہمیت رکھتی ہے۔ حشر، احسن اور طالب بنارسی کے ڈرامے ہندوستانی ناٹک کے آسمان کے درخشاں ستارے ہیں۔ لیکن ان بزرگوں کی تصنیف کا کل کار اردو ادب میں اضافہ نہ تھا۔ بلکہ ہمارے سٹیج کی رونق۔ چند ڈرامے انگریزی اور دیگر زبانوں سے ترجمہ ہوئے ہیں۔ جو کم و بیش ادبی خوبی رکھتے ہیں۔ لیکن نقش۔ دل اور نقش ثانی کا تفاوت بدیہی اور لازمی ہے۔ ان کے علاوہ گنتی کے ڈرامے ہیں جو طبعزاد کہے جا سکتے ہیں۔ ان میں سے دو ایک شیخ احمد علی شوق قدوائی اور مرزا محمد ہادی لکھنوی جیسے کہنہ مشق ادیبوں کے فکر کا نتیجہ ہیں۔ لیکن ان ڈراموں کی شاعرانہ حیثیت خواہ کتنی بھی بلند پایہ خیال کی جائے۔ مگر فن ڈرامہ کے اعتبار سے ان میں کوئی خصوصیت نظر نہیں آتی۔

مختصر یہ کہ جدید اردو ادب کے جملہ اصناف میں ڈرامہ سب سے پست ہے۔ لہٰذا سید امتیاز علی کی یہ سعی جو انہوں نے اردو ڈرامہ کو ادب اور فن کے اعتبار سے ایک خاص رفعت پر لانے کے لئے کی ہے۔ ہر طرح قابل داد و ستائش ہے۔

سید امتیاز علی کو میں ان کی شیرخوارگی کے زمانہ سے جانتا ہوں۔ اس کے بعد جب وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھتے تھے۔ تو علاوہ استادی شاگردی کے تعلق کے (جو ہمارے موجودہ نظام تعلیم میں بسا اوقات بالکل بے معنی نہیں۔ تو برائے نام ضرور ہوتا ہے) دوستانہ روابط بھی قائم ہو گئے۔

یہ وہ زمانہ تھا۔ جب میرے دوست شیخ نورالٰہی (حال اسسٹنٹ ڈائرکٹر تعلیمات پنجاب) کالج میں اردو ڈرامہ کو فروغ دینے کی کوشش میں مصروف تھے۔ اس کوشش میں سید امتیاز علی ان کے مستعد اور خوشدل مددگار تھے۔ غرضیکہ سید صاحب کو اوائل عمر سے ادبی ذوق اور ڈرامہ کا شوق رہا۔ اور ان کے اس ذوق و شوق کا ایک مستقل اور قابل قدر نتیجہ "انارکلی" کی شکل میں فی الحال ہمارے پیش نظر ہے

اپنے کسی معاصر کی تصنیف پر تنقید کرنا۔ اور خصوصاً ایسے معاصر کی تصنیف پر جو اپنے زمرہ احباب میں شامل ہو۔ نہایت ہی نازک اور دشوار عمل ہے۔ اگر بقدر شوق تنقید کی جائے۔ تو خوشامد کا احتمال ہوتا ہے۔ اور اگر نکتہ چیں کا شیوہ اختیار کیا جائے۔ تو تکدر مزاج کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔ لیکن لوگ کہتے ہیں۔ کہ سخن حق سے احتراز بھی ایک قسم کی معصیت ہے۔ اس لئے سید امتیاز علی کی تصنیف کے مطالعہ سے جو تاثرات میرے دل میں پیدا ہوئے ہیں۔ ان کو الفاظ میں ترجمہ کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔

مجھے یہ کہنے میں مطلق تامل نہیں۔ کہ "انارکلی" اردو زبان کا بہترین ڈرامہ ہے۔ جو اس وقت تک میرے مطالعہ میں آیا۔ اور خود ستائی کی نیت سے نہیں۔ بلکہ امر واقعہ کے طور پر اس بات کے کہنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ کہ اردو ادب کے اس شعبہ میں میرا مطالعہ خاصہ وسیع ہے۔ اس ڈرامہ میں ادبی لطافت کے باوجود اسٹیج کے لوازمات کی پوری پابندی کی گئی ہے۔ اور اس التزام کی وجہ سے اردو ادب میں

صفائی اور وضاحت کا مطلق خیال نہیں کیا۔ خط شکستہ اور نقطے بہت کم دئے گئے ہیں۔ ایسی تحریر کو پڑھنے کے لئے خاص مشق درکار ہے۔ پھر یہی نہیں۔ بلکہ نسخے کے تمام اوراق کرم خوردہ اور کٹے پھٹے ہیں۔ جس کی وجہ سے عبارت جگہ جگہ سے تلف ہوگئی ہے۔ بنظر بریں حالات متن کی تصحیح و ترمیم کچھ آسان کام نہ تھا۔ لیکن فاضل اڈیٹر ہمارے شکریئے اور مبارک باد کے مستحق ہیں۔ کہ انہوں نے اس دشوار مہم کو کامیابی کے ساتھ سر کیا۔

مقدمے میں انہوں نے مصنف حکیم میر قدرت اللہ قاسم کے حالات بالتفصیل لکھے ہیں۔ اور بتلایا ہے۔ کہ

"حکیم صاحب دشت سخن کے پرانے سیاح ہیں۔ ان کی تمام عمر شعر اور شاعروں کی صحبتوں میں گذری ہے۔ اس لئے ان کی رائیں شعرا کے کلام اور مقام کے متعلق قابل احترام ہیں۔ باوجودیکہ اس تذکرہ میں سینکڑوں شعرا کا ذکر ہے۔ ان میں ایسے بھی ہوں گے۔ جن کے ساتھ بمقتضائے بشریت معاصرانہ چشمک اختلاف و عداوت بھی ہوگی۔ لیکن ہر ایک کے ذکر میں واقعہ نگاری کے فرائض کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔ اور حق گوئی اور انصاف پسندی سے تجاوز نہیں کیا ہے تقریباً ہر شخص کو نیکی کے ساتھ یاد کیا ہے۔ یہ امر ان کی نیک دلی اور سلیم الطبعی کی روشن دلیل ہے۔"[1]

ظاہر ہے کہ ایسے انصاف پسند نقاد کے تصنیف کردہ تذکرے کو ہمارے خاص احترام کا حقدار ہونا چاہیئے۔ علاوہ اس کے انہوں نے یہ بھی ثابت کیا ہے۔ کہ مجموعۂ نغز مولانا آزاد مرحوم کی مشہور تالیف آبحیات کا ایک اہم ماخذ ہے[2]۔ آبحیات کو جو مقبولیت حاصل ہے اسکو مدنظر رکھتے ہوئے ہم اس کے ماخذ کو ایک فوق العادۃ اہمیت دئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

الغرض مجموعۂ نغز کی اشاعت سے اردو ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہوا ہے۔ آخر میں فاضل مرتب نے جو "فہرست اسماء اشخاص" بہ ترتیب ابجد دے دی ہے۔ اس نے کتاب کو اور بھی مفید بنا دیا ہے اردو میں جتنی کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ ان میں یہ فہرست (انڈکس) نہیں لگائی جاتی جس سے کتاب کے حقیقی مفاد میں ایک قابل افسوس خامی رہ جاتی ہے۔ اس لحاظ سے بھی مجموعۂ نغز ایک عمدہ مثال ہے پنجاب یونیورسٹی ہماری مبارکباد کی مستحق ہے۔ کہ اس نے ایسی مفید تالیف کو شائع کرکے دنیائے ادب پر احسان کیا ہے۔ ضرورت ہے۔ کہ ہمارے ملک میں علمی انجمنیں ایسے فائدہ مند کاموں کی طرف متوجہ ہوں۔ (ڈاکٹر محمد اقبال۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ایم۔ اے)

---

[1] مقدمہ صفحہ م

[2] قلمی نسخہ جو اب پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں ہے۔ پہلے مولانا آزاد کے ذاتی کتب خانے سے تعلق رکھتا تھا۔ ۱۲

ایرانی کتابی مصوری (PERSIAN. MINIATURE PAINTING)

لندن برلنگٹن ہوس میں جنوری ۱۹۳۱ء سے مارچ ۱۹۳۱ء تک ایک ایرانی فنون کی بین الاقوامی نمائش ہوئی تھی۔ جسے ہزاروں نفوس نے دیکھا تھا۔ تمام دنیا سے بہترین اشیاء جن کا ایرانی آرٹ کے ساتھ تعلق ہے۔ وہاں جمع کی گئی تھیں۔ اب چند ماہ ہوئے آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے ایک ضخیم بڑی تقطیع کی کتاب اس نمائش کے سلسلے میں ایرانی کتابی مصوری سے متعلق شائع کی ہے۔ اس کتاب کو نہایت سلیقہ سے مرتب کیا گیا ہے۔ اس میں دو سو بیس تصاویر ہیں۔ جن میں سے سولہ رنگین ہیں۔ اس کتاب کو برٹش موزیم کی مایہ ناز ہستیوں یعنی ڈاکٹر لارنس بنین۔ مسٹر ولکنسن اور مسٹر باسل گرے نے ترتیب دیا ہے قیمت ۱۲۶ شلنگ ہے۔ ڈاکٹر بنین نے مقدمہ میں بعض اہم مصور کتب کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جن کی وجہ سے ایرانی مصوری کے متعلق علم میں بہت

بڑا اضافہ ہوا ہے ۔ مثلاً رشید الدین کی جامع التواریخ جس کے حصص اڈنبرا یونیورسٹی کے کتب خانہ میں ہیں ۔ اور شاہنامہ انڈیا آفس لائبریری جو لندن مشرقی مجلس کے کتب خانہ میں ہے ۔ چودھویں صدی عیسوی کے بعض مصور مخطوطات جو شیراز سے آئے اور جن سے واضح ہوتا ہے ۔ کہ تیموری مصوری کس وقت جلوہ پیرا ہوئی ۔ بعض نمونے ایسے بھی تھے ۔ جو شاہ رخ اور بائسنغر کے کتب خانوں سے تعلق رکھتے تھے ۔ جن میں ایک ظفر نامہ ۱۴۳۶ء کا ہے ۔ جس پر سرارنلڈ ایک الگ کتاب تالیف کر چکے ہیں ۔ کلیلہ و منہ جو حکایات کا مجموعہ ہے شاہنامہ از رائل مشرقی مجلس لنڈن اور اسی کا ایک اور مخطوطہ از بوڈلین اور ایک گلستان از مجموعہ چیسٹر بیٹی جسے مولانا جعفر نے بائسنغر کے لئے لکھا تھا ۔ اور اسی مولانا جعفر کا ایک شاہنامہ ۱۴۳۰ء کا یہ تمام چیزیں بے حد دلچسپ تھیں ۔ مگر ہمارے نزدیک جو قدیم ترین مصور مخطوطہ اس نمائش میں آیا ۔ وہ اوراق شاہنامہ ہیں از مجموعات مسٹر اجیت گوش کلکتہ و مسٹر چیسٹر بیٹی لنڈن ۔ اگرچہ منافی کی کتاب الحیوان کے بھی قدیم مصور اوراق امریکہ سے آئے تھے ۔ مگر ان کا یہ درجہ نہیں ۔ غرضکہ ڈاکٹر بنین نے نہایت کامیابی سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے ۔ کہ ایرانی مصوری دراصل ہے کیا ؟ اور اس کا ہماری ثقافت میں کیا درجہ ہے ۔ اور کہاں تک ہماری روزانہ زندگی کی یہ آئینہ دار ہے ۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اسلام کا رجحان مصوری کے متعلق کیا رہا ہے ۔ اس سلسلہ میں انہوں نے سرارنلڈ کے نظریات پر بھی تبصرہ کیا ہے ۔ علاوہ ازیں یہ کتاب ایک بہت بڑا ذریعہ ہے ۔ کہ فن مصوری میں ایرانی تخیل کا مغربی تخیل اور چینی تخیل سے مقابلہ کرنے میں مدد دے ۔ دور وسطیٰ کی مغربی مصوری میں ہم جذبات انسانی جسم میں دیکھتے ہیں یعنی بنی نوع انسان کی خواہشات غموم ۔ کامیابی اور مایوسی کی علامات کیا ہیں ؟ یہ امر تصاویر واضح کرتی ہیں چینی مصوری میں مصور کو تمام عالم ایک کیف میں سرشار نظر آتا ہے ۔ جس میں انسان بھی شامل ہوتا ہے ۔ دراصل ایرانی تخیل ان دونوں کے درمیان ہے ۔ اور اس میں ضروری تیسری جہت نہیں ہوتی ۔ اور یہی بات مشرقی مصوری کے تخییلی ہونے کی دلیل ہے ۔

کتاب کی تقسیم یوں قائم کی ہے ۔ ۱ ۔ قبل غلبۂ چنگیزی ۔ اس میں عراقی دبستان کو بیان کیا ہے ۔ جس کے متعلق مسٹر گرے کہتا ہے ۔ کہ ابتدائی اسلامی مصوری پر ثقافت کا عنصر غالب تھا ۔ اور یہ عراقی طرز دراصل یونانی مصوری کا مسخ شدہ مظہر ہے ۔ اگر اسے بازنطینی کہا جائے ۔ تو بہتر ہے ۔ جسے بعض عربی شعرا نے بھی بیان کیا ہے ۔ اور اسے دیگر یورپین مصنفین موسیو بلوشے اور سرارنلڈ وغیرہ نے بھی بیان کیا ہے ۔ مگر یہ خصوصیت محض اسی دور میں ہے ۔ بعد میں مسلمان صناعوں نے اپنا طرز اختیار کر لیا تھا ۔

۲ ۔ ابتدائی ایرانی طرز اور چودھویں صدی عیسوی کی تبدیلیاں ۔ یہ دور دراصل ایسا ہے ۔ جبکہ صحیح معنوں میں ایرانی مصوری کی ابتدا چینی یعنی وسط ایشیائی تاثرات میں ہوئی ۔ اور یہی تیموری دبستان کا پیش خیمہ ہے ۔

۳ ۔ تیموری دور ۔ جو صحیح اور خالص ایرانی مصوری ہے ۔

۴ ۔ اخیر پندرھویں صدی عیسوی میں بہزاد اور اس کے معاصرین ۔ اس دور میں پوری شان و شوکت ایرانی مصوری کی نظر آتی ہے ۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ ہرات مصوری کا مرکز تھا ۔ اس کے گرد و نواح میں تبریز ۔ شیراز ۔ طہران وغیرہ تھے ۔ جہاں پھر بھی یہ کام کرنے والے موجود تھے ۔ ابوالغازی سلطان حسین بن منصور بن بائقرا (۱۴۶۸-۱۵۰۶ء) کی شخصیت کی بدولت بہت سے ماہرین فن شہرت تک پہنچے ۔ وہ خود بھی شاعر تھا ۔ اور اس کے دیوان کو بہزاد نے مصور بھی کیا ہے ۔ اسی سلطان کے دوستوں میں میر علی شیر نوائی تھا جس نے سلطان علی مشہدی جیسے خطاط اور بہزاد جیسے مصور کو کہیں جانے نہیں دیا غرضیکہ ہرات ہی مصوری کا بڑا مرکز تھا ۔ ان کی تصاویر کا انداز اور لباس مخصوص قسم کا ہے جس کی وجہ سے ہرات دبستان ایرانی مصوری میں مشہور ہے ۔

تیموریوں کے بعد فوراً صفویوں کا زمانہ آیا ۔ ان سلاطین نے خود بھی مصوری سیکھی اور اسے کما حقہٗ فروغ بھی دیا ۔ یہ وہ زمانہ ہے ۔ جبکہ بہزاد نے دنیا میں شہرت حاصل کی (بہزاد کے متعلق ملاحظہ ہو کاررواں کا گذشتہ نمبر جس میں اس کی حیات پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے) مگر اسکے صحیح کام سے متعلق ہمیں مصر کے مخطوطہ بوستاں کا ذکر کرنا چاہیئے ۔ جس میں بہزاد نے اپنی کمال بہزادیت کا ثبوت دیا ہے ۔ اور جو اس کی ہستی کے متعلق شکوک ہیں ان نمونوں کو دیکھکر صاف ہو جاتے ہیں ۔

اس کتاب میں خصوصیت سے خواجہ عبدالصمد اور سید میر علی تبریزی کے جو نمونے دیئے ہیں۔ وہ قابل ذکر ہیں۔ اور یہی دو مصور ہیں۔ جن کی وجہ سے مغل مصوری کو فروغ ہوا۔ آجکل جو مغل اور ہندو مصوری نظر آتی ہے وہ دراصل انہیں کی منت پذیر ہے۔ یہ بھی وثوق سے کہا جاسکتا ہے۔ کہ مجموعہ چیسٹر بیٹی نے نمایش کو چار چاند لگا دیئے۔ اس کی عدم موجودگی میں نمایش بالکل پھیکی رہتی۔ اور بہت سے نئے نظریوں پر کبھی روشنی نہ پڑتی۔ اور اسی طرح وہ نمونے جو سرائے کتب خانہ قسطنطنیہ سے آئے۔ ان کو بھی ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ کتاب کے اخیر میں ایک دو ضمیمے بھی ہیں۔ اول سر آرنلڈ کا ترجمہ مرزا حیدر کی تاریخ کے اس حصہ کا جو مصورین کے حالات پر مشتمل ہے۔ اور دوسرا ضمیمہ دوست محمد کے مخطوط مصوریں اور نقاشین کا ایک طرح سے ترجمہ ہے۔ جو پہلی مرتبہ مطالعہ میں آیا۔ اور اس کے لئے خصوصیت سے مسٹر ولکنس مستحق مبارک باد ہیں۔ کہ ان کی مساعی جمیلہ سے دستیاب ہوا۔ اور اس تحریر سے بہزاد کی زندگی کے ایسے حالات کا پتہ چلتا ہے۔ جو پہلے معلوم نہ تھے۔ مثلاً یہی کہ بہزاد کا انتقال ۹۴۲ھ میں ہوا ڈاکٹر لارنس بنین نے مقدمہ لکھا ہے۔ مسٹر گرے نے ابتدائی حصہ جو مشکل ترین تھا۔ اپنے اجتہاد کی بنا پر نہایت کامیابی سے سرانجام دیا ہے اور خاتمہ کی تمام ذمہ داری مسٹر ولکنس پر ہے۔ ان تینوں حضرات نے کمال کوشش اس امر کی کی ہے۔ کہ کتاب میں تمام نیا مواد آجائے۔ اور وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ کتاب کی جو قیمت رکھی گئی ہے اس کی تمام خوبیوں کے مقابلہ میں بے حد کم ہے یعنی چھ گنی۔

(عبداللہ چغتائی)

کشمیر کے آثار قدیمہ { ANCIENT. MONUMINTS OF KASHMIR)

از رام چندرا کاک۔ مطبوعہ انڈیا سوسائٹی لنڈن قیمت ۲۵ شلنگ۔ یہ امر محتاج بیان نہیں ہے۔ کہ انڈیا سوسائٹی لنڈن نے بیش قیمت علمی خدمات ہندوستان سے متعلق سرانجام دی ہیں۔ جو تالیفات متقدر فضلا کی اب تک شائع کی ہیں۔ ان میں اجنتا پہ ایک جامع کتاب۔ مغل مصوری۔ جنوبی ہند کے قدیم آثار۔ شاہنامہ وغیرہ وغیرہ سب قابل ذکر ہیں۔ کشمیر کے آثار قدیمہ انہیں روایات پر حال میں ہی طبع ہوئی ہے۔ کشمیر خطہ بے نظیر ہونے کی وجہ سے قدیم زمانے سے ہی آماجگاہ سیاحان عالم رہا ہے۔ بیشمار کتب و بیانات اس کے متعلق موجود ہیں۔ اور مختلف ادوار میں سلاطین نے بھی اپنے اپنے مذاق کے مطابق آثار بنوائے جو وہاں محلات۔ مناور۔ باغات۔ مساجد وغیرہ کی صورت میں ابھی تک موجود ہیں لیکن عام طور پر جو کچھ کشمیر پر لکھا گیا ہے۔ رومانی اور جمالیاتی اعتبار سے ہے۔ اور علمی تحقیقی رو سے کم لکھا گیا۔ یہ کتاب اس فن میں شاید اول ہے۔ اگرچہ اس کا بیشتر حصہ غیر مسلم آثار عتیقہ کے متعلق ہے۔ (حالانکہ شاہ میر کے زمانہ ۱۳۳۶ء سے اسلام وہاں آیا۔ اور موجودہ راجہ کے اباؤ اجداد کے زمانہ تک رہا) مگر تاہم غنیمت ہے۔ بڑی خوشی اس بات کی ہے۔ کہ مسٹر کاک کشمیر ہی کے باشندے ہیں۔ اور وہیں محکمہ آثار قدیمہ کے ناظم بھی تھے۔ اس لئے ان کے بیانات زیادہ تر ان کے مشاہدات اور ذاتی علم کا نتیجہ ہیں۔ آپ نے رواداری کا ثبوت بھی دیا ہے۔ آثار قدیمہ پر علمی کام کرنے والوں کے لئے یہ مفید کتاب ہے۔ اس پر سر فرنسیس ینگ ہسبنڈ کا تعارف نامہ ہے۔ اور دیباچہ پروفیسر فوشے کا ہے۔ دونوں حضرات ہندوستانی تہذیب و تاریخ کے ماہرین میں سے ہیں۔ اور دونوں نے ایک عرصہ ہندوستان میں گذارا ہے اس لئے ان کے بیانات اپنے اپنے رنگ میں بہت مفید ہیں۔ کل ۷۷ پلیٹ آرٹ پیپر پر عمارات وغیرہ کے فوٹوگراف کے ہیں۔ کتاب کی ترتیب یوں قائم کی ہے۔ دیباچہ وغیرہ کے بعد سیاسی تاریخ۔ طرز فن تعمیر۔ آثار سری نگر و گرد و نواح۔ آثار بالائے سری نگر۔ آثار تحت سری نگر۔ کشمیر کی تاریخ کا مطالعہ اس امر پر روشنی ڈالے گا۔ کہ کشمیر کے اصل باشندے ہمیشہ سے رعیت سلاطین غیر ملکی رہے۔ اور یہ لوگ کشمیر کے طبعی گرد و نواح سے بہت متاثر ہیں۔ یہ بات ان کی روزانہ زندگی سے بھی عیاں ہے۔ کتاب میں ایک مفید باب اکتشافات ہراون سے متعلق ہے۔ جن کے آثار افغانستان اور گندھارا سے مماثل ہیں۔ اور جن سے ساسانی اثرات عیاں ہیں۔ اسلامی فن تعمیر کے بارے میں مصنف نے اختصار سے کام لیا ہے۔

تاریخ صقلیہ جلد اول } از سید ریاست علی ندوی۔ مطبوعہ دار المصنفین اعظم گڑھ۔ عرصے سے لوگوں کو علم تھا۔ کہ دار المصنفین نے تاریخ صقلیہ کی تدوین کا بیڑا اٹھایا ہے۔ صقلیہ میں مسلمانوں کی حکومت قریب ۸۲۷ء سے قریب ۱۰۹۱ء تک نہایت شان و شوکت سے رہی۔ اس کتاب میں صقلیہ کے طبعی حالات صقلیہ۔ اٹلی و جزائر صقلیہ پر اسلامی حملہ کی ابتدا۔ اسلامی حکومت کا قیام۔ اسلامی حکومت کا عہد بعد عروج اور پھر اسلامی حکومت کا خاتمہ اور مسلمانوں کے مصائب اور جلا وطنی کا تفصیلی مرقع دکھایا گیا ہے۔ تین رنگین نقشے بھی ہیں۔ اور کتاب کو نہایت کامیابی سے ضروری محاسن طباعت سے ۵۱۶ صفحات میں مکمل کیا گیا ہے۔

لاہور میں ادارہ معارف اسلامیہ کے اجلاس کے موقع پر سید ریاست علی صاحب نے ایک بسیط مقالہ صقلیہ کے متعلق پڑھا تھا۔ جس کے بعد بعض محققین نے ان سے درخواست کی تھی۔ کہ وہ صقلیہ پر مسلمانوں کے ثقافتی اثر کے متعلق پھر کچھ ارقام فرمائیں۔ چنانچہ سید صاحب جلد دوم میں ثقافتی پہلو پر توجہ دیں گے۔

سید ریاست علی صاحب ایک عرصہ سے اس کام پر لگے ہوئے ہیں۔ ہم انہیں اس علمی کاوش و تحقیق پر مبارک دیتے ہیں۔ اور انشاء اللہ دونوں جلدوں کی موجودگی میں پھر مفصل تبصرہ پیش کریں گے۔ دار المصنفین کا یہ علمی کارنامہ دراصل عالم اسلامی پر ایک بہت بڑا احسان ہے۔

سیر الصحابہؓ جلد ششم } مطبوعہ دار المصنفین اعظم گڑھ۔ مولفہ مولوی شاہ معین الدین احمد ندوی رفیق دار المصنفین۔ دار المصنفین نے ایک سلسلہ سیر الصحابہ کا شروع کر رکھا ہے۔ جو مقبول عام ہو چکا ہے۔ اسی سلسلہ کی چھٹی کڑی یہ کتاب ہے۔ اور یہ مفید سلسلہ اس کے بعد ایک اور جلد "صغار صحابہ" کے بعد ختم ہو جائے گا۔ یہ جلد (ششم) خصوصیت سے حضرت حسن۔ حضرت امیر معاویہ اور حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ علیہم پر مشتمل ہے۔ دار المصنفین کی دیگر کتب کی طرح اچھی کتابت اور طباعت سے آراستہ ہو کر شائع ہوئی ہے۔ ہمارے نزدیک حالات صحابہ کے ضمن میں بھی ایک حصہ مشکل اور مختلف فیہ تھا۔ بہر حال شاہ معین الدین صاحب نے نہایت جانفشانی سے ہر پہلو پر بحث کی ہے۔ اور مصنف کے لباس میں مصنف کا کام کامیابی سے کیا ہے۔

مثنوی تغلق نامہ خسرو دہلوی } تہذیب و تحشیہ سید ہاشمی فرید آبادی۔ ملنے کا پتہ:۔ دفتر مخطوطات فارسیہ لال ٹیکری حیدر آباد دکن قیمت مجلد للعہ روپے۔

حیدر آباد دکن میں ایک مجلس مخطوطات فارسیہ ۱۹۳۱ء سے قائم ہے۔ جس کی غرض و غایت سالانہ رپورٹ سے واضح ہے "فارسی زبان کی علمی اور نادر کتابوں کی حفاظت و اشاعت کا کوئی مناسب انتظام کیا جائے۔ چنانچہ تغلق نامہ اس سلسلہ کا اول علمی کارنامہ ہے۔ اور واقعی بہت بڑا کارنامہ ہے۔ تغلق نامہ بالکل ناپید تھا۔ اس کا ایک ہی نسخہ دستیاب ہو سکا دیباچے میں سید ہاشمی صاحب نے علامہ فیضی کا ایک رقعہ دیا ہے۔ جو راجہ علی خاں فاروقی والئے خاندیش کو تحریر کیا تھا جس میں اس تغلق نامہ کا ذکر ہے۔ اور یہ بیان کیا گیا ہے۔ کہ نہ تو اس کا اول ہے نہ آخر۔ حیاتی کاشی نے جہانگیر کے حکم سے اس کے ابتدائی ۱۱۷۵ اشعار کی کمی کو پورا کیا۔ اور اس کامیابی کے صلہ میں حیاتی کو زر سرخ و سفید سے تلوا کر اس کے ہم وزن روپیہ انعام دیا گیا۔ ممکن ہے۔ یہ وہی نسخہ ہو جس کا ذکر ملا فیضی نے اپنے رقعہ میں کیا ہے۔ بہر حال یہ ایک نسخہ خوش قسمتی سے زمانہ کے دست برد سے محفوظ رہا۔ اور اس کی طباعت پر مجلس مخطوطات حیدر آباد مزید داد و تحسین کی مستحق ہے۔ یہ نسخہ دراصل نواب حبیب الرحمن خان شیروانی صاحب کے کتبخانہ کی ملکیت ہے

دراصل اس نسخہ کی ترتیب مولوی رشید احمد مرحوم نے شروع کی تھی لیکن حالات نے مساعدت نہ کی۔ اور وہ قبل از وقت ہی داغ مفارقت دے گئے۔ مطبوعہ کتاب میں ان کا ایک ناتمام مقدمہ بھی ہے۔ سید ہاشمی صاحب نے بہت کاوش سے ایک بات یہ پیدا کی ہے۔ کہ اپنے ذاتی مطالعہ تاریخ

سے اور اس کے متن کو خوب پڑھکر اس کا ایک خلاصہ دیگر کتب تاریخ عہد سے مقابلہ کر کے تیار کیا ہے۔ جو بذات خود ایک مستقل تصنیف کا کام دیتا ہے۔

ہمارا خیال ہے۔ کہ امیر خسرو کی یہ تصنیف تاریخی حیثیت سے بہت اہم تھی۔ کس طرح خسرو خاں نے آل علاء الدین پر ظلم ڈھانے اور پھر آخر کار کس طرح اپنی مظالم کا خود شکار ہوا۔ اور کس طرح آل تغلق وارث سلطنت ہوئی۔

یہ کتاب اورنگ آباد دکن کے مطبع اردو میں ٹائپ میں طبع ہوئی ہے نہایت دیدہ زیب ہے۔ ہمیں قوی امید ہے۔ کہ اس طرح دیگر مخطوطات کی اشاعت کا انتظام بھی کیا جائے گا۔

مرھٹی زبان پر فارسی کا اثر

نوشتہ مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے علیگ معتمد اعزازی انجمن ترقی اردو۔ اورنگ آباد۔ دکن ۱۹۳۳ء۔ اس مقالہ کو اول مولانا عبدالحق صاحب نے ۱۹۲۲ء میں رسالہ اردو میں شائع کیا تھا۔ مگر اس وقت ٹائپ کی عدم موجودگی کی وجہ سے اس میں اکثر اغلاط رہ گئی تھیں۔ اب اس کو الگ ایک کتاب کی صورت میں انجمن کی کتب کے عام سائز پر ٹائپ میں طبع کیا گیا ہے۔ اور یہ صفحہ ۱۲۳ پر مشتمل ہے۔

آغاز کتاب میں مولانا نے دکن میں مسلمانوں کی آمد کو علاء الدین کے زمانہ سے بیان کیا ہے۔ جس کے بعد جب محمد تغلق کا دکن پر تسلط ہو کر ختم ہو گیا تو حکومت بہمنی قائم ہوئی۔ جس کے انتزاع کے بعد دکن میں مختلف اسلامی سلطنتیں بیجاپور۔ احمد نگر۔ برار۔ بیدر۔ گولکنڈہ کے نام سے قائم ہو گئیں اور اس وقت سے آج تک برابر اسلامی حکومت یہاں کسی نہ کسی رنگ میں قائم رہی۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ جبکہ مسلم و غیر مسلم ایک دوسرے سے برابر کا برتاؤ کرتے تھے۔ اسی وجہ سے فارسی زبان کا اثر جو فاتحوں کی زبان تھی۔ یہاں کی دیسی زبانوں پر بہت زیادہ ہوا۔ جب سیواجی نے ۱۶۷۴ء میں خالص مرہٹی زبان کی لغت تیار کرنے کا حکم دیا۔ تو کامیابی نہ ہو سکی۔ بلکہ اس کے بعد اس قسم کی کوشش کو بے سود تصور کیا گیا۔ حکومت پناہ "شمشیر بہادر" تنیسا خاص خیل" "راجہ بہادر" وغیرہ وغیرہ بے شمار ایسے الفاظ مولانا نے اپنے دعوی کے ثبوت میں پیش کئے ہیں۔ جو مرہٹی زبان کا جزو اعظم بن چکے ہیں۔ بلکہ یہاں تک کہ فارسی کے حروف جار۔ ربط۔ عطف۔ فجائیہ وغیرہ بلا تکلف استعمال ہوتے ہیں۔ مولانا نے فارسی الفاظ کی مثالیں ۱۳۰۰ء سے لے کر آج تک متعدد مصنفین کے کلام و بیانات سے دی ہیں۔ جن میں الفاظ ہجری۔ اسلام علیکم عرضداشت۔ "زیادہ چہ نویسم" وغیرہ وغیرہ عام آتے ہیں۔ ایک مبسوط فہرست ضرب الامثال کی دی ہے۔ ایک عنوان "موڑی اور طریقہ تحریر" قائم کیا ہے۔ جس میں کاغذ کے استعمال و قدیم طرز پر بحث ہے۔ ان سب میں اسلامی اثر کو بالوضاحت دکھایا ہے۔ سب سے بڑا کارنامہ اس کتاب میں یہ ہے۔ کہ مرہٹی شاعری پر ایک نہایت محققانہ تنقید ہے۔ جس سے مولانا کے وسیع مطالعہ کا پتہ ملتا ہے۔ اس میں بعض جگہ سیواجی کے حالات زندگی پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور مرہٹوں کے متعلق کہا ہے کہ "مرہٹے بحیثیت قوم کبھی صاحب علم و فضل نہیں ہوئے"۔ کتاب کے آخر میں ایک خاتمہ بھی ہے۔

ہمارے نزدیک مولانا کا یہ شہ کار دراصل محض "لسانی" طور پر مفید نہیں بلکہ مرہٹی ثقافت پر روشنی ڈالتا ہے۔ کہ یہ قوم کس قدر مسلم ثقافت سے متاثر ہوئی اور کس طرح مسلمانوں سے متاثر ہو کر سلطنت قائم کرنے کی کوشش کی کس طرح مسلمانوں کے ہی اصول سلطنت آخر تک قائم رہے۔ اس بنا پر اگر کتاب کے عنوان کے ساتھ "اور مرہٹی تمدن" کا اضافہ ہو جاتا۔ تو نہایت موزوں ہوتا۔

"ہندوستانی لسانیات"

از ڈاکٹر سید محی الدین قادری۔ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ پروفیسر زبان اردو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن قیمت عہ دیباچہ از ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صدر شعبہ عربی، فارسی الہ آباد یونیورسٹی جس کے ابتدا میں آپ نے عنوان کتاب کی یوں تعریف فرمائی ہے "لسان زبان کو کہتے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہے۔ کہ "لسانیات" اس علم کو کہتے ہیں۔ جس کا موضوع زبان کے مسائل ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ الخ" ڈاکٹر قادری نے اپنی تمہید میں بیان کیا

ہے کہ ہمارے ہاں ایسی تالیفات مفقود ہیں۔ مگر ہمارے ہاں کی دو تصانیف کا ذکر یوں کیا ہے "تاہم یہاں ہندوستان کے دو مایۂ ناز ماہرین لسانیات پروفیسر حافظ محمود خاں شیرانی اور پروفیسر سنیتی کمار چیٹرجی کی لسانی تحقیقات کا تذکرہ ضروری ہے۔ مولانا شیرانی کی "پنجاب میں اردو" پہلی اردو کی کتاب ہے جس میں ہماری زبان سے متعلق جدید ترین طرز کا لسانی مواد پیش کیا گیا ہے ڈاکٹر چیٹرجی کا مقدمہ آغاز و ارتقائے بنگالی اور ان کا حال کا لکھا ہوا رسالہ "کلکتہ کی اردو" دونوں کتابیں ہندوستانی السنہ اور ساتھ ہماری زبان کی متعلق نہایت مستند اور عصری معلومات پیش کرتی ہیں۔"

کتاب کو دو حصوں پر منقسم کیا ہے۔ اول میں لسانیات۔ زبان نظر ارتقا۔ ارادی تشکیل۔ دنیا کی زبانیں۔ ہند آریائی ارتقا۔ جدید ہند آریائی زبانیں۔ ہند کی غیر آریائی زبانیں۔ دوم میں۔ ہندوستانی کا آغاز۔ ہندوستانی کا ارتقا۔ ادبی بولیاں۔ ہندوستانی کی ہمہ گیری۔ عہد حاضر۔ اس کے علاوہ اس میں مفید نقشے تقسیم زبان کے بھی لگائے ہیں۔ غرضیکہ لسانیات کے تحت میں اردو میں یہ ایک کامیاب کوشش ہے۔

مورخین ہند } مؤلفہ حکیم سید شمس اللہ قادری ملنے کا پتہ :۔ دفتر رسالہ تاریخ حیدر آباد دکن قیمت ۶/۔ حکیم صاحب اپنی تاریخی تالیفات کی وجہ سے کافی شہرت رکھتے ہیں۔ یہ کتاب مسلم سلاطین ہندوستان کی معتبر و مستند کتب تواریخ کی فہرست ہے۔ اور ان کے مصنفین کے تذکروں پر ایک تبصرہ ہے۔ جو صفحہ ۱۲۴ پر مشتمل ہے۔ اس پر ایک مقدمہ نواب سرامین جنگ بہادر کا ہے "کتاب تاریخ آئینۂ گذشتہ و درس حال است و فال مستقبل" نواب صاحب کے الفاظ کے مطابق مفید ہے۔ اس میں ہند کی عام تاریخیں۔ جغرافیائی تاریخیں۔ سلاطین دہلی کی تاریخیں۔ لودھی اور سوری خاندان۔ تیموریہ۔ سندھ۔ کشمیر۔ گجرات۔ بہمنیہ۔ عادل شاہیہ۔ قطب شاہیہ۔ آصفیہ۔ مرہٹہ۔ اودھ۔ افاغنہ۔ بنگالہ۔ کرناٹک۔ میسور کی کتب تاریخ کا تذکرہ درج ہے۔

مثنویات میر } مرتبہ سید محمد ایم۔ اے لیکچرار سٹی کالج حیدر آباد دکن ملنے کا پتہ :۔ حیدر آباد۔ مکتبہ ابراہیمیہ۔ قیمت ۴/۔ چھوٹی تقطیع قریب دو سو ساٹھ صفحات۔ میر تقی میر۔ سودا۔ غالب وغیرہ سب اردو شاعری کے پیش رو ہونے کی حیثیت سے زبان زد خلائق ہیں مگر میر ان سب میں سبقت رکھتے ہیں آپ کا زمانہ ۱۱۳۶ھ سے لیکر ۱۲۲۵ھ تاریخی اعتبار سے پر آشوب ہے۔ بہت سے حالات کا میر صاحب پر بھی اثر ہوا۔ مگر ان کی شاعری میں یہ سب انقلابات ان کے لئے فیضان کا باعث ہوئے۔ جو کچھ انہوں نے لکھا۔ وہ بہت حد تک ان کے اپنے ذاتی واقعات و تجربات کا آئینہ تھا۔ ویسے بھی اردو شعرا میں وہ اول ہیں۔ جنہوں نے اپنی آپ بیتی "ذکر میر" کے عنوان سے فارسی میں لکھی ہے۔ اور جسے مولوی عبدالحق صاحب نے ترتیب دے کر شائع کیا ہے۔ سید محمد صاحب نے ایک مستقل کتاب کی صورت میں ایک دیباچہ کے ساتھ ان کی مثنویات کو مرتب کیا ہے۔ اور اسی مبسوط مقدمہ میں ان کے طرز کلام اور حیات پر بحث کی ہے۔ جو اعلیٰ درجوں کے طلبہ کے لئے نہایت مفید ہے مثنویات میر تعداد میں ۳۲ ہیں۔ ان سے کم سے کم ان کے رفقا و ماحول کا ضرور پتہ ملتا ہے۔ یہ مشہور ہے۔ کہ کسی مصنف کے حالات کا صحیح مطالعہ کرنا چاہو۔ تو اس کی تصنیفات کا مطالعہ کرو۔ چنانچہ مثنویات ان کی حیات کا ایک باب ہیں۔ مثلاً سرگذشت سفر۔ صید نامہ۔ کتخدائی آصف الدولہ۔ مرغ بازاں۔ ہجو نا اہل۔ خانۂ میر وغیرہ وغیرہ

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن کی مطبوعات :۔

ملک بھر میں انجمن ترقی اردو ہی ایک انجمن ہے۔ جو اردو زبان کی خدمت خاص نہج اور اصول پر کر رہی ہے۔ اس کا بڑا مقصد یہ ہے۔ کہ اردو زبان کو جو پچھلے پانسو سال میں اہل ہند کی متحدہ کوششوں سے بنی ہے۔ اور جو قومی زبان کہلانے کی مستحق ہے۔ ادبی اور علمی زبان بنایا جائے۔ اس خیال کو مد نظر رکھکر انجمن علم و ادب کے ہر شعبے پر کتابیں لکھوا کر شائع کر رہی ہے چونکہ یہ مطبوعات ایسے وقت میں موصول ہوئی ہیں۔ جب ان پر کما حقہ تبصرہ

نہیں ہوسکتا۔ اس لئے مختصراً ان کے محاسن کو قارئین کارروان کے سامنے پیش کیا جاتا ہے :۔

داستان رانی کیتکی اور کنور اودے بھان

یہ کہانی سید انشاءاللہ خاں "انشا" کی جدت طبع کا نتیجہ ہے۔ مصنف نے یہ التزام کیا ہے۔ کہ فارسی عربی کا ایک لفظ بھی نہ آنے پائے۔ لیکن لطف یہ ہے۔ کہ آجکل کی ایسی ہندی نہیں ہے۔ کہ نہ لکھنے والا سمجھے نہ پڑھنے والا پڑھے۔ اس کتاب کی زبان کو اردو داں سمجھتا ہے۔ اور ہندی داں بھی۔ یہ کتاب مشکل سے دستیاب ہوتی تھی۔ اب انجمن نے شائع کرکے اردو داں طبقہ پر احسان عظیم کیا ہے شروع میں مولوی عبدالحق کا ایک مختصر دیباچہ ہے۔ حجم ۵۲ صفحے۔ قیمت غیر مجلد چار آنے - ۴ر

سب رس یعنی قصۂ حسن و دل

اردو نثر کی یہ نایاب اور سب سے قدیم کتاب بہت تلاش و جستجو کے بعد خاص اہتمام سے انجمن ترقی اردو نے شائع کی ہے۔ اس کے مصنف مولانا "وجہی" سلطان عبداللہ قلی قطب شاہ کے دربار کے نامور شاعر اور ادیب تھے۔ اس کتاب کا سنہ تصنیف ۱۰۴۵ھ ہے۔ اور اس میں پوری ادبی شان پائی جاتی ہے۔ قصہ بھی عجیب ہے۔ اور طرز بیان بھی عجیب۔ اردو کے دلدادہ اور زبان کے محقق کے لئے یہ کتاب مغتنمات میں سے ہے۔ کتاب کے شروع میں مولانا عبدالحق صاحب کا ناقدانہ اور عالمانہ مقدمہ ۵۲ صفحات کا ہے جس میں قصے کی تاریخ کتاب کی حقیقت اور خصوصیات پر بحث کی گئی ہے حجم ۴۰۰ صفحات قیمت مجلد چار روپے۔

جنگ نامہ عالم علی خاں

"سیدوں" اور نواب نظام الملک آصف جاہ کی جنگ کا حال ایک دکنی شاعر نے بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔ عالم علی خاں دکن کا صوبہ دار اور سید عبداللہ قطب الملک کا بھتیجا ہے۔ جب نظام الملک دکن کی طرف بڑھتے ہیں۔ تو یہ نوجوان صوبیدار ان کے مقابلہ کے لئے فوج لے کر آتا ہے۔ یہ نظم تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ اور اسی زمانے کی زبان کا پتہ دیتی ہے۔

باغ و بہار یا قصہ چہار درویش

میر امن دہلوی کی یادگار زمانہ تصنیف ہے۔ جو فصاحت اور سلاست میں اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ اور دلی کی سوا سو برس پہلے کی بول چال اور محاورے کا اعلیٰ نمونہ ہے کتاب کے شروع میں مولوی عبدالحق صاحب کا محققانہ مقدمہ اور آخیر میں الفاظ و محاورات کی فرہنگ ہے قیمت غیر مجلد دو روپے آٹھ آنے۔

ترکوں کی اسلامی خدمات اور انکی زبان و ادبیات

ڈاکٹر جولیس جرمانس پروفیسر بڈاپسٹ یونیورسٹی کے تین لیکچروں کا مجموعہ ہے۔ جو انہوں نے جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں دئے تھے۔ مولوی سید وھاج الدین صاحب نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اس کتاب میں ترکوں کی ترقی و زوال کے اسباب دکھا کر پروفیسر مذکور نے ترکی ادبیات کی تدریجی ترقی کا ذکر کیا ہے۔ اور یہ دکھایا ہے۔ کہ فرانس کے انقلابی خیالات اور یورپین باشندوں کی بیداری نے ترکوں کے تخیلات میں بھی حرکت پیدا کی۔ لیکن انہوں نے اندھی تقلید کی بجائے اجتہاد و فکر سے کام لیا۔ ۱۳۵ صفحے قیمت ایک روپیہ (عہ)

تاریخ ادبیات ایران

پروفیسر براؤن کی بے مثل اور مشہور عالم کتاب "تاریخ ادبیات ایران" کے پہلے حصے کا ترجمہ ہے۔ فارسی ادب کی تاریخ پر اب تک ایسی کتاب نہیں لکھی گئی اس حصہ کے شروع میں فارسی زبان کی اور اس کی ابتدا اور ترقی کا نہایت محققانہ بیان ہے۔ قیمت مجلد چار روپیہ۔

ریاست

افلاطون کسی تعریف یا تعارف کا محتاج نہیں۔ آج تقریباً اڑھائی ہزار برس کے بعد بھی اس حکیم اعظم کے حکمت و فلسفہ کا اثر تمام عالم پر ہے۔ ہر زبان میں اس کی تصنیفات کے تراجم موجود ہیں اور بڑے احترام سے پڑھے جاتے ہیں۔ غالباً اس کی سب سے بڑی اور قابل قدر تصنیف "ریاست" ہے۔ جس کا ترجمہ انجمن نے اردو زبان میں پیش کیا ہے۔ اور جسے نہایت خوبی سے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب شیخ جامعہ ملیہ دہلی نے سرانجام دیا ہے۔ قیمت مجلد پانچ روپے۔ (ﻌﮧ)

فاؤسٹ گوئٹے کو جرمنی کا "الہامی شاعر" کہا جاتا ہے۔ اور اس کا ڈراما فاؤسٹ دنیائے ادب و تخئیل کا وہ کارنامہ ہے۔ جو ایک صدی سے تمام عالم میں مشہور ہے۔ اور جس کا دنیا کی ہر زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اردو میں پہلی مرتبہ صحیح و مکمل ترجمہ ایک مبسوط محققانہ مقدمہ کے ساتھ ڈاکٹر عابد حسین صاحب نے کیا ہے۔ قیمت مجلد چار روپیہ۔

رہنمایان ہند مترجمہ بابو نرائن پرشاد ورما "مہر" یہ مسٹر منمتھ ناتھ کی مشہور کتاب "پرافٹس آف انڈیا" کا ترجمہ ہے تمہید کتاب میں ہندو مذہب کی اعلیٰ تعلیم وحدانیت اور پسندیدہ عقاید کا بیان عالمانہ اور دلکش پیرائے میں لکھا ہے۔ سری کرشن جی کی سوانحعمری اور ان کی ولولہ انگیز "بھگوت گیتا" سری کرشن جی کا فلسفہ نجات اور اس کی تین منازل اور گوتم بدھ کی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب کے آخری حصہ میں "شنکر اچاریہ" "رامانج" اور رامانند کے حالات درج ہیں۔ حجم ۵۱۲ صفحے قیمت دو روپے

انجمن ترقی اردو کی یہ مطبوعات ان کے اپنے مروجہ ٹائپ میں اور نہایت سلیقہ اور نفاست کے ساتھ طبع کی گئی ہیں۔ انجمن ہذا کی بعض اہم مطبوعات زیر طبع ہیں۔ ان میں سے چند لغت کی کتابیں ہیں جن کی ضرورت اہل علم کو ہمیشہ سے تھی۔ اور ان کے طبع ہونے سے بہت سی کمی پوری ہو جائے گی۔ چنانچہ ان میں سے :-

(۱) انگریزی اردو لغات کئی سال کے بعد تیار ہوئی ہے۔ اور عنقریب شائع ہوگی۔ یہ مبسوط ڈکشنری مستند حضرات کی مشترکہ محنت اور مولوی عبدالحق صاحب کی سرکردگی کا نتیجہ ہے۔

(۲) علمی اصطلاحات کی لغات۔ جو شائع ہو چکی ہے۔ اور اب ترمیم شدہ حالت میں از سر نو طبع ہوگی۔ اس میں بیش بہا اضافے کئے گئے ہیں

(۳) اصطلاحات پیشہ وراں۔ اس میں قریب ایک سو پیشوں کی اصطلاحات ہیں۔ بہت محنت سے جمع کی گئی ہیں۔

اس طرح سے (۴) لغات اردوئے قدیم اور (۵) اردو کی جامع لغات بھی بہت اعلیٰ پیمانے پر تیار ہو رہی ہیں۔ موخر الذکر کتاب مولانا مولوی عبدالحق کی نگرانی میں تکمیل تک پہنچ کر عنقریب شائع ہوگی۔

ابتدائی اسلامی فن تعمیر[1] از کیپٹن کریسویل (جلد اول متعلق بنو امیہ) مطبوعہ آکسفورڈ کلیرنڈن پریس قیمت دس گنی کیپٹن کریسویل کی شخصیت اسلامی دنیا میں فن تعمیر اسلامی کے ضمن میں محتاج تعارف نہیں۔ ممکن ہے کہ ہندوستان کے مسلمان ابھی تک آپ کی شخصیت سے ناآشنا ہوں۔ کیونکہ آپکی جدوجہد اور توجہات زیادہ تر مشرق قریب تک ہی محدود رہی ہیں آپکا یہ فنی و علمی شاہکار ہر اعتبار سے پہلی کوششوں سے خواہ وہ کسی زبان میں کی گئی ہوں سبقت لے گیا ہے۔ یہ کتاب بہت بڑی تقطیع میں کئی سو صفحات مع فوٹوگراف اور نقشوں کے مشتمل ہے۔ تمام کتاب کیپٹن کریسویل کے ذاتی کمال فن کا نتیجہ ہے۔ اس سے پیشتر بعض یورپین مصنفین نے بھی اس موضوع پر لکھا ہے۔ جو زیادہ تر تعصب پر مبنی ہے ان میں خاص طور پر سینور ریار یوریا کی کتاب اسلامی فن تعمیر تعصبات کا مجموعہ ہے لیکن کیپٹن کریسویل نے ہر اعتبار سے نہایت اچھی طرح سے اسلامیات کا مطالعہ کر کے اس کتاب کو ترتیب دیا ہے مصنف کی اعلیٰ قابلیت کا ثبوت اور جو کچھ عبور انہیں اس فن پر حاصل ہے۔ ان کی کتاب سے عیاں ہے۔ کتاب میں مسجد نبوی کی ابتدائی تاریخ یعنی ارتفاع تعمیر مسجد پر پوری بحث کی گئی ہے مسجد بیت المقدس مسجد عمر وغیرہ پر بھی نہایت محققانہ بحث کی ہے۔ اور مسلمانوں کے فن تعمیر کا نہایت درخشاں پہلو دکھایا ہے۔ یہ کتاب شاہ فواد کے نام پر معنون ہے

غرضیکہ کیپٹن کریسویل نے نہایت جامعیت اور غیر متعصبانہ جذبات کے ساتھ ابتدائی اسلامی فن تعمیر کا سنگ بنیاد رکھا ہے۔ جس کی کسی غیر مذہب کے مصنف سے توقع رکھنا بعید از قیاس ہے۔

محمد عبداللہ چغتائی

---

(1) EARLY MUSLIM ARCHITECTURE

طرحی غزلیات

بسمل

ساقی کی چشمِ مست نے دیوانہ کر دیا — دورِ نفس کو گردشِ پیمانہ کر دیا
ہوش و خرد سے عشق نے بیگانہ کر دیا — دیوانہ کر دیا مجھے دیوانہ کر دیا
اے شمعِ حسن دل تو بہت سخت چیز تھا — تیرا کرم کہ صورتِ پروانہ کر دیا
رگ رگ سے دل نے کھینچ کے سرمایۂ حیات — نذرِ ادائے نرگسِ مستانہ کر دیا
انجامِ کارِ عشق تصور نے دل مرا — آئینہ دارِ جلوۂ جانانہ کر دیا
اچھا کیا یہ طالبِ دیدار کا علاج — صورت دکھا کے آپ نے دیوانہ کر دیا
بسمل جما کے دل میں بتوں کے خیال کو — بیکار تم نے کعبہ کو بت خانہ کر دیا

نواب سجاد علی خاں بسمل نواب آف کرنال

احسن مارہروی

یوں ہم نے پیشِ حسن کا نذرانہ کر دیا — دل کو نثارِ جلوۂ جانانہ کر دیا
کیا سحر تو نے نرگسِ مستانہ کر دیا — دنیا کو اک نگاہ میں دیوانہ کر دیا
رندوں نے مل کے جھگڑے میں اور کیا کیا — برہم نظامِ شیشہ و پیمانہ کر دیا
ہم کو تری نگاہ کے اعجاز و سحر نے — ہشیار کر دیا کبھی دیوانہ کر دیا
چھلکا کے اپنے جام تری چشمِ مست نے — دنیا میں عام مشربِ رندانہ کر دیا
تم اپنے مرنے والے سے جبکو نہ سن سکے — دو ہچکیوں نے ختم وہ افسانہ کر دیا
اتنا بہا جبیں سے پسینا دمِ اخیر — لبریز جس نے عمر کا پیمانہ کر دیا

احسن کے پاس خرقہ و عمامہ اب کہاں
سب اس نے نذرِ مرشدِ میخانہ کر دیا

احسن مارہروی

وحشت

جس کو خرابِ نرگسِ مستانہ کر دیا — ساقی نے اسکے دل کو طرب خانہ کر دیا
اہلِ خرد نے دیکھ کے دنیا کا رنگ ڈھنگ — فرصت کو وقفِ ساغر و پیمانہ کر دیا
معصوم حسن تھا اُسے رسوا کیا عبث — کس نے بیانِ عشق کو افسانہ کر دیا
اچھا کیا کہ میرے دلِ مے پرست کو — ساقی نے اک نگاہ میں میخانہ کر دیا
لوٹے مزے کرشمہ و اندازہ و ناز کے — دل کو نیازِ جلوۂ جانانہ کر دیا
مقصد جو دیکھا ایک ہی ایمان و کفر کا — دل کو کبھی حرم کبھی بتخانہ کر دیا

وحشت یہ اک مرقعِ رنگینِ حسن ہے
اوراق کا رواں کو پریخانہ کر دیا

خان بہادر رضا علی وحشت

تپش

نیرنگ کیا یہ نرگسِ مستانہ کر دیا — کعبہ کو دیر دیر کو میخانہ کر دیا
ساقی نے میرے ظرف کی کیا خوب داد دی — پھوٹے ہوئے نصیب کو پیمانہ کر دیا
کھلتے ہی اُن کی آنکھ زمانہ تباہ تھا — پہنچی جہاں نظر وہیں ویرانہ کر دیا
شوقِ ستم ظریفیٔ احباب دیکھنا — روودادِ عشق کو مری افسانہ کر دیا
انجام کار نالۂ خاموش شمع نے — اعلانِ نامرادیٔ پروانہ کر دیا
پردے میں رہ گیا تری بے پردگی کا حال — پروازِ ہوش نے مجھے دیوانہ کر دیا
اللہ رے نمائش انداز دلفریب — بیگانہ ہو گئے کبھی بیگانہ کر دیا

دیکھی جو بے نیازیٔ سنگِ حرم تپش
سر کو رہینِ سجدۂ بتخانہ کر دیا

شیخ عبد اللطیف تپش

گذارشِ احوالِ واقعی

اردو میں ایک سالنامہ شائع کرنے کی تجویز جناب چغتائی اور جناب تاثیر کے درمیان کوئی آٹھ سات سال سے زیر بحث تھی لیکن وقت اور حالات نے مساعدت نہ کی۔ اس لئے یہ تجویز گذشتہ سال تک عملی صورت اختیار نہ کر سکی۔ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ "کارواں" سال میں ایک مرتبہ کیوں شائع کیا جاتا ہے؟ ایک وجہ یہ ہے۔ کہ جو "معیار" "کارواں" کے پیشِ نظر ہے۔ وہ ماہوار۔ سہ ماہی بلکہ ششماہی رسالے میں بھی ممکن نہیں لیکن سب سے پہلے ہمیں ایک اعتراف کرنا ہے۔ وہ یہ کہ کارواں پر ہم لوگ اپنے وقت اور آمدنی کا ایک محدود حصہ صرف کر سکتے ہیں۔ کارواں ہمارے لئے کسبِ معاش کا ذریعہ نہیں۔ اور نہ ہمارے لئے ذریعۂ شہرت ہی ہے۔ جس ادبی حلقے کو کارواں کے ساتھ وابستگی کا فخر حاصل ہے۔ خدا کے فضل سے وہ حلقہ دنیائے علم میں برسوں سے عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ دنیوی جاہ کے لحاظ سے بھی یہ طبقہ خدا کی مہربانیوں سے پوری طرح متمتع ہے۔ اندریں حالات کارواں کی اشاعت کا محرک محض خدمتِ اردو کا جذبہ ہے۔ اور ہر چند کہ ہم دست بدعا ہیں۔ کہ خدا ہمیں اس خدمت کے لئے زیادہ سے زیادہ ایثار کی ہمت عطا کرے۔ تاہم موجودہ صورت میں اس سے زیادہ مشکل ہے۔

ہندوستان میں مضمون نگار حلقہ اس قدر محدود ہے۔ کہ سال میں دو مرتبہ بھی اعلیٰ پائے کا رسالہ نکالنا قریب ناممکن ہے۔ وہ حضرات جن کی قابلیت مسلم ہے۔ محدودے چند ہیں۔ ان میں سے بیشتر کی مالی حالت خدا کے فضل و کرم سے ایسی ہے۔ کہ مضمون نگاری ان کا ذریعہ معاش تو کیا ان کی آمدنی کا کوئی جزو بھی مہیا نہیں کر سکتی۔ اندریں حالات وہ کسی رسالے کے لئے بار بار کیوں لکھیں؟ ہم بار بار اصرار بھی نہیں کرنا چاہتے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں۔ کہ ہمارے اصرار سے مجبور ہو کر اگر وہ لکھ بھی دینگے۔ تو غالباً وہ ان کے اور کارواں کے معیار پر پورا نہ اترے گا۔

گذشتہ سال کارواں دو ہزار پانچسو کی تعداد میں شائع کیا گیا تھا۔ اور امسال تین ہزار پانچسو۔ گذشتہ سال جو کامیابی ہوئی تھی اسے مدِ نظر رکھکر امسال بھی امید کی جاتی ہے۔ کہ ہمیں خاطر خواہ کامیابی میسر ہوگی

چند معروضات ان مضامین کے متعلق ضروری ہیں۔ جو امسال کارواں میں شائع نہیں ہوئے۔ یہ مضامین دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جن کی اشاعت مضمون نگار سے اختلافِ رائے رکھنے کی وجہ سے قرینِ مصلحت نہیں سمجھی گئی۔ اور دوسرے وہ جو وقت پر نہ ملے۔ اور اس لئے شامل نہ کئے جا سکے۔ موخر الذکر مضامین میں خاص طور پر قابلِ ذکر مولوی غلام رسول۔ مولنا متین جناب سید محمد اور جناب عبد اللطیف تپش کے مضامین ہیں۔ اول الذکر مضامین میں سے تین مضامین قابلِ ذکر ہیں۔ ایک مضمون "مسلم زندگی" پر تنقید کے رنگ میں تھا۔ ہم مضمون نگار کی قابلیت کے معترف ہیں۔ لیکن ان کی تنقید اور اس کے نتائج کو درست نہیں سمجھتے۔ دوسرا مضمون "حشر کی شخصیت" پر تھا۔ جناب حشر کاشمیری پر تنقید لکھنا بہت آسان ہے۔ اور ان کی "خامیاں" مسلم ہیں۔ لیکن اردو ڈرامہ کی جو خدمت جناب حشر نے انجام دی ہے۔ اسے نظر انداز کر دینا انتہا درجے کی بے انصافی ہے۔ تیسرا مضمون "مغل اور اردو" پر تھا۔ فاضل مضمون نگار نے کتاب کی ان خامیوں کی طرف توجہ دلائی تھی۔ جو "فنِ تحقیق کی رو سے کتاب میں موجود ہیں"۔ لیکن کیا کتاب میں خوبیاں نہیں؟

تبادلہ اور کارواں

جو رسائل اور اخبارات ہمیں سال بھر اپنا پرچہ بھیجتے رہیں گے۔ یا جو بھیجتے رہے ہیں ان کی خدمت میں کارواں شائع ہوتے ہی روانہ کیا جائے گا۔ بعض رسائل اور اخبارات یہ خیال کرتے ہیں۔ کہ ایک پرچہ بھیجکر کارواں کے حقدار بن گئے ہیں۔ انہیں خیال رکھنا چاہئے کہ کارواں ایک سالنامہ ہے۔ جو سال بھر میں ایک ہی بار شائع ہوتا ہے۔ اور سال میں ایک ہی بار بھیجا جاسکتا ہے۔

کارواں میں ریویو

کارواں میں ریویو دو قسم کی کتابوں پر کئے جائینگے ایک تو ان بہترین کتابوں پر جو دنیا کے کسی حصہ میں سال کے دوران میں شائع ہوں خصوصیت سے ان پر جو مشرقی تہذیب و تمدن اور ادب و تاریخ سے کوئی تعلق رکھتی ہوں۔ اور دوسرے ان علمی کتب پر جو ہندوستان میں شائع ہوں۔ اور مفید معلومات سے پر ہوں

مرقع چغتائی کا تیسرا ایڈیشن

ہندوستان کے اردو شاعروں میں جو درجۂ قبولیت غالب کو نصیب ہوا ہے۔ وہ کسی بیان کا محتاج نہیں۔ اگرچہ مرزا غالب کا دیوان دو ہزار شعر سے زیادہ نہیں۔ لیکن ان اشعار کے تذکرے ہزاروں زبانوں پر ہیں۔ مرزا غالب کی شعریت۔ سادگی۔ مضمون آفرینی اور موسیقیت کتنے دلوں کو تسخیر کئے ہوتے ہے۔ اس کا ثبوت وہ لاتعداد ایڈیشن ہیں۔ جو آئے دن ملک کے ہر گوشہ سے شائع ہوتے رہتے ہیں۔

دیوان غالب کے ان تمام ایڈیشنوں میں جو آج تک شائع ہوئے مرقع چغتائی ایک خاص شرف رکھتا ہے۔ مرقع چغتائی دیوان غالب کا وہ مصور ایڈیشن ہے۔ جو جناب چغتائی نے اصراف کثیر اور سالوں کی محنت کے بعد شائع کیا ہے۔ اس کتاب کا سب سے پہلا ایڈیشن ۲۱۰ کاپیوں کی تعداد میں ایک سو دس روپیہ فی جلد کے حساب سے شائع کیا گیا تھا۔ یہ پہلا ایڈیشن تین ماہ کی مدت میں تمام کا تمام فروخت ہوگیا۔ اس کے بعد ملک۔ فن اور ادب کی خدمت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کا دوسرا ایڈیشن نہایت تھوڑے تغیر و تبدل کے ساتھ تین ہزار کی تعداد میں نہایت ارزاں قیمت پر یعنی فی جلد ستر روپے کے [illegible] کیا گیا۔ چنانچہ قدردان علم و فن کی قدردانی اور [illegible] یہ [illegible] بھی نہایت قلیل مدت میں فروخت ہوگیا۔ اور [illegible] ذوق [illegible] رکھنے والے اصحاب کے لئے یہ خبر یقیناً مسرت کا [illegible] ہوگی کہ مرقع چغتائی کا تیسرا ایڈیشن دوسرے ایڈیشن سے ارزاں [illegible] پر شائع کیا گیا ہے۔ یہ تیسرا ایڈیشن (قیمت بارہ روپے فی [illegible]) اب [illegible] اہل نظر کے سامنے ہے۔ تیسرے ایڈیشن میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو دوسرے ایڈیشن میں تھیں۔ تمام کتاب اسی کاغذ پر اسی جلد میں [illegible] کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔

تمام مصور دیوان تقریباً تین سو صفحات پر [illegible] کی مجموعی خوبیوں کے مقابلے میں (قیمت بارہ روپے) [illegible] حیثیت نہیں رکھتی۔ اس تیسرے ایڈیشن کے تمام [illegible] حقوق تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور کو [illegible] صاحب ایک صاحب ذوق تاجر کتب ہیں۔ [illegible] کتابیں شائع کرتے ہیں۔ جو صاحب مرقع چغتائی [illegible] ایڈیشن [illegible] چاہیں۔ وہ شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری [illegible] خرید سکتے ہیں۔

کارواں کی تمام تصاویر

کی طباعت گزشتہ سال کی طرح زینتھ پریس [illegible] ہے

ہم مسٹر محمد حسین مالک زینتھ پریس کے بے حد شکرگزار ہیں۔ کہ انہوں نے گزشتہ سال کی طرح اس سال بھی اپنے ضروری کاموں کو روک کر شبانہ روز محنت و جانفشانی سے کارواں کی تصاویر اور سرورق کو نہایت خوشنمائی اور زینت سے طبع کیا۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ اس سے بہتر طباعت لاہور کا کوئی اور پریس انجام نہیں دے سکتا۔ [illegible] کے علاوہ ہم بابو مولاداد منیجر مسلم پرنٹنگ پریس کے بھی شکرگزار ہیں [illegible] انہوں نے کارواں کی لیتھو کی طباعت میں گزشتہ سال کی مانند نہایت سرگرمی کا اظہار کیا۔ مسلم پرنٹنگ پریس میں لیتھو کا کام [illegible] اچھا اور عمدہ ہوتا ہے

کاروان کی کتابت [illegible] صاحب نے انجام دی ہے [illegible] سی صاحب کے طرز تحریر میں بہترین فنی خوبیاں موجود ہیں سمیع اللہ صاحب کتابت کی فنی خوبیوں کے علاوہ انگریزی عربی فارسی اور اردو میں بھی کافی سے زیادہ استعداد رکھتے ہیں۔ ہم آپ کے بے حد شکر گزار ہیں۔ کہ آپ نے امسال کاروان کی کتابت کو وقت مقررہ پر انجام دیا۔ آپ منشی اسد اللہ صاحب مشہور کاتب کے فرزند رشید ہیں۔ مرقع چغتائی (دیوان غالب) کی کتابت جو فنی اعتبار سے اپنا جواب نہیں رکھتی منشی اسد اللہ صاحب کی کی ہوئی ہے۔

ہم برٹش موزیم۔ بوڈلین لائبریری آکسفورڈ عجائب خانہ آثار عتیقہ ستنبول کا بھی شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ انہوں نے کاروان کیلئے بعض تصاویر کی اشاعت کی اجازت مرحمت فرمائی۔

کاروان کا آئندہ نمبر اس سے بھی زیادہ شان و شوکت سے اور دسمبر کے بجائے اکتوبر میں شائع کیا جائے گا مضمون نگار اصحاب سے استدعا ہے۔ کہ اپنے مضامین نثر و نظم مئی ۱۹۳۴ء تک ارسال فرما کر ممنون فرمائیں تاکہ تمام مضامین نثر و نظم مناسب اور موزوں حسن و خوبی کے ساتھ ترتیب دئے جاسکیں۔

مسلم پرنٹنگ پریس بیرون اکبری دروازہ لاہور میں باہتمام مولا داد قریشی چھپا اور محمد عبد اللہ پبلشر رسالہ کاروان نے دفتر رسالہ کاروان سے شائع کیا